انگارے
PDFBOOKSFREE.PK
اقبال کاظمی
1

دُعائے مغفرت

اقبال کاظمی (مرحوم) جو اس وقت ہمارے درمیان نہیں ہیں، قلم کے دھنی تھے۔ جس موضوع پر قلم اُٹھایا اُسے تشنہ نہیں چھوڑا۔ رومان، سسپنس، جرائم، معاشرتی و سماجی جبر و استبداد، کون سا موضع ایسا تھا جسے اُنھوں نے نہ چھیڑا ہو اور پھر کون سا پہلو ان موضوعات کا ایسا تھا، جسے اُنھوں نے چھوڑا نہ ہو۔ لکھنا اُن کی زندگی تھا۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

وہ لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے...... پھر بہت ہی خوب لکھتے تھے۔

دن کو لکھتے تھے، رات کو لکھتے تھے، لکھتے لکھتے بیمار پڑ جاتے، پھر بیماری میں بھی لکھتے...... میں اُن سے کہتا۔ ''بیماری میں تو آپ آرام کر لیں، صحت یاب ہو کر لکھیے گا۔'' فرماتے۔ ''لکھنا تو زندگی ہے، لکھوں نہیں تو زندگی کا سامان کہاں سے فراہم کروں گا۔'' زندگی کے محاذ پر وہ اپنے گھر سے اکیلے مجاہد تھے۔ اصل میں اُن کی قلم کاری افلاس کے دیو سے ایک مسلسل جنگ تھی...... دل کے مریض تھے، لیکن دل کے ہاتھوں مجبور تھے۔

دل تو اسی محبوبہ قلم کے عشوہ و ناز و ادا کا اسیر تھا۔

ڈاکٹر انہیں مکمل علاج کے لئے ہسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دیتے۔

اقبال کاظمی کہتے۔ ''میں تو قلم کے زندان میں محبوس ہوں۔''

کراچی سے شائع ہونے والے ڈائجسٹوں میں اُن کی طویل سلسلہ وار کہانیاں چھپتی تھیں جو اُن سے محبت کرنے والے قارئین میں بے پناہ مقبول تھیں۔

قارئین! وہ ہمارے لئے حرفِ محبت لکھتے لکھتے گئے ہیں۔

آیئے! ہم اپنے خالق و مالک سے دُعا کریں کہ وہ اُن کے لئے مغفرت لکھ دے۔ آمین!

محمد علی قریشی

انگارے

دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے ایک نوجوان کی داستانِ شجاعت، جس کے لئے ناموسِ وطن کی حفاظت نقد جاں سے بڑھ کر عزیز تھی۔

یہ ایک ایسے نوجوان کی ہنگامہ خیز زندگی کی سرگزشت ہے جو اپنے ملک کی سرحدوں کی سلامتی کو یقینی بنانے کے لئے دشمن ملک کے شاطر ہندوؤں کی سازشوں کو ناکام بناتا رہا۔

دشمنوں کو ناکوں چنے چبواتا رہا...... سازشی ذہن رکھنے والے ہندوؤں کو اُن کی غاصبانہ فطرت کی فصل کاٹنی پڑی۔

آگ جلتی رہی، خون اُبلتا رہا......اور وہ اپنی مجاہدانہ شان سے آگے بڑھتا رہا۔ جو ہاتھ اُس کی جانب بڑھا، کٹ کے رہا۔ دشمنوں کی ہر چال خود اُنہی کے لئے شہ مات بنی......

محترم اقبال کاظمی کے قلم کی روانی اپنے جوبن پر ہے۔ قلم کیا ہے......ایک تلوار ہے جو ہندوؤں کی سازشوں کے تانے بانے کو کاٹتی چلی جاتی ہے۔

محبت کی داستانوں کو رقم کرنے والے ہمارے محبوب مصنف کا قلم اس کہانی میں بھی تشنہ نہیں رہا۔

(ادارہ)

طیارے نے سینٹرل ایشیا کی نو آزاد مسلم ریاست تاجکستان کے ایک چھوٹے سے سرحدی شہر مرغاب سے ٹیک آف کیا تھا۔ مرغاب کے ایک طرف چند میل کے فاصلے پر چین کی سرحد تھی اور جنوب میں پچیس ہزار فٹ بلند پامیر کا پہاڑی سلسلہ تھا جو پاکستان کی سرحد میں داخل ہو کر عظیم قراقرم کے سلسلہ کوہ سے جاملتا تھا۔

مرغاب چاروں طرف سے برف پوش بلند پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا، یہاں کوئی ہوائی اڈہ نہیں تھا اس لئے جہاز نے شہر سے کئی میل دُور ایک پتھریلے میدان سے ٹیک آف کیا تھا۔ آدھی رات کے وقت گھمبیر تاریکی میں کسی ایسی جگہ سے جہاز اُڑانے کی کوشش کرنا ہی خودکشی کے مترادف تھا مگر جہاز کے پائلٹ کی مہارت کی داد دینی پڑتی ہے جس نے نہ صرف کامیابی سے ٹیک آف کیا تھا بلکہ دونوں طرف بلند پہاڑوں کے درمیان بڑی کامیابی اور مہارت سے اسے اُڑا بھی رہا تھا۔

مرغاب سے ٹیک آف کرنے والے اس جہاز کی منزل ہندوستان کے زیرِ تسلط کشمیر کا سونا مارگ نامی وہ قصبہ تھا جو سطح سمندر سے تقریباً سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع وولر جھیل کے مشرق میں تقریباً سو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ دوسری طرف سرینگر سے اس قصبے کا فاصلہ صرف باون میل تھا۔

ڈکوٹا سے ملتے جلتے طاقتور جیٹ انجن والے جہاز میں صرف دو مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور یہ دونوں سیٹیں کاک پٹ میں پائلٹ کی سیٹ کے عین عقب میں تھیں۔ جبکہ جہاز کا پچھلا حصہ کارگو کے لئے مخصوص تھا اور اس وقت اس جہاز کے کارگو میں اسلحہ اور گولہ بارود کی پیٹیاں بھری ہوئی تھیں۔

جہاز کے ان دو مسافروں میں ایک میں تھا، شمروز اور دوسرا میرا ساتھی ترمیز۔ ہم دونوں کا تعلق اسی جنت نظیر خطے سے تھا جو پچھلے پچاس برسوں سے بھارتی سامراج کے ظلم کی چکی میں پس رہا تھا۔ جہاز کا پائلٹ مسٹر سلوانو اتالین تھا۔ اُس کی عمر اگرچہ تیس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن اُس کی مہارت کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اُسے خطرناک روٹس پر جہاز اُڑانے کا خاصا تجربہ تھا۔

طیارہ تقریباً تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتا ہوا پامیر کا سلسلہ کوہ پار کر کے پاکستان کی فضائی حدود میں داخل ہو گیا۔ بائیں طرف قراقرم کا برف پوش سلسلہ تھا۔ رات کی تاریکی کے

باوجود سفید برف کسی اُجلی چادر کی طرح چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ پامیر کی برف پوش چوٹیاں پار کرتے ہی طیارہ بتدریج اپنی بلندی کم کرنے لگا۔

پاکستانی فضائی حدود میں داخل ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے طیارے کو غالباً کسی پاکستانی ریڈار پر دیکھ لیا گیا تھا۔ سگنل بھی موصول ہونے لگے۔ طیارے کی شناخت طلب کی جا رہی تھی لیکن مسٹر سلوانو نے کوئی جواب دینے کی بجائے وائرلیس سسٹم ہی آف کر دیا۔

پرواز سے پہلے ہمیں بریفنگ دی گئی تھی اور یہ بتا دیا گیا تھا کہ ہم کسی راڈار کی زد میں تو آ سکتے ہیں لیکن ہمیں کسی قسم کے ہوائی یا زمینی حملے کا خطرہ نہیں ہوگا۔ سیاچن کی طرف اگرچہ اینٹی ایئر کرافٹ گنیں نصب تھیں لیکن اُنہیں استعمال کرنے کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی۔ اور پھر سیاچن سے ہم سینکڑوں میل دُور تھے۔

مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوجی دستوں سے مجاہدین کی جنگ اگرچہ برسوں سے جاری تھی مگر وہ زمینی اور چھاپہ مار جنگ تھی۔ بھارت نے مجاہدین کے خلاف ابھی تک فضائیہ استعمال نہیں کی تھی۔ مجاہدین کی طرف سے تو کسی فضائی کارروائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور پھر پاکستان کو بھی اس طرف سے کسی فضائی دراندازی کا خطرہ نہیں تھا۔ اس طرف تاجکستان اور چین جیسے دوست ممالک کی سرحدیں ملتی تھیں اس لئے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ کوئی جنگی جہاز اس طرف سے پاکستانی فضائی حدود میں داخل ہو سکتا ہے۔ البتہ اس طرف آنے والا کوئی جہاز راڈار کی آنکھ سے نہیں بچ سکتا تھا اور ہمارے جہاز کو راڈار پر دیکھ لیا گیا تھا مگر پائلٹ نے ریڈیو کا رابطہ ہی ختم کر دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ ہم تھوڑی دیر میں پاکستان کی فضائی حدود سے نکل کر بھارت کے زیرِ تسلط کشمیر کی فضائی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔

ہمارا جہاز چھبیس ہزار چھ سو فٹ بلند نانگا پربت کی برف پوش چوٹیوں کے پہلو میں پرواز کرتا ہوا بتدریج اپنی بلندی کم کر رہا تھا۔ اور پھر دفعتاً جہاز کو زوردار جھٹکے لگنے لگے۔ ہمارا جہاز ایئر پاکٹ میں آ گیا تھا۔

جہاز خزاں رسیدہ پتے کی طرح فضا میں لڑکھڑا رہا تھا۔ ہوا کا زبردست دباؤ اُسے کبھی ایک طرف دھکیل دیتا اور کبھی دوسری طرف۔

سلوانو اُسے سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن جہاز اُس کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ ہمارے دونوں طرف برف پوش چٹانیں تھیں اور خطرہ تھا کہ جہاز کسی بھی وقت کسی چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہو جائے گا۔

سلوانو چیخ چیخ کر ہمیں مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ اُس کا ایک حکم یہ بھی تھا کہ ہم جہاز سے کودنے کے لئے تیار رہیں۔ پیراشوٹ ہمارے کندھوں پر بندھے ہوئے تھے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ جہاز سے چھلانگ لگانے کے بعد بھی ہم زندہ نہیں بچ سکیں گے۔ یا تو کسی چٹان سے ٹکرا کر ہمارے ٹکڑے ہو جائیں گے یا برف میں دفن ہو جائیں گے۔

مجھے کئی سال پہلے اس علاقے پر پرواز کرنے والے پی آئی اے کے ایک مسافر بردار جہاز کو پیش آنے والا حادثہ یاد آ گیا۔ وہ جہاز انہی برف پوش پہاڑوں میں گر کر ایسا لاپتہ ہوا تھا کہ آج تک اُس کا کچھ پتہ چلا تھا اور نہ ہی اُس کے مسافروں کا کوئی سراغ ملا تھا۔

میں نے ترمیز کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ زیرِ لب کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے بھی دل ہی دل میں کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ مجھے موت کا خوف نہیں تھا۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا تھا لیکن یہ سوچ کر افسوس ضرور ہو رہا تھا کہ اگر طیارے کو کوئی حادثہ پیش آ گیا تو نہ صرف ہماری قربانی رائیگاں جائے گی بلکہ وہ مقصد بھی پورا نہیں ہوگا جس کے لئے ہم نے اپنی جانیں خطرے میں ڈالی تھیں۔

میں اُٹھ کر پائلٹ کی سیٹ کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے سیٹ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ہمارے نیچے دائیں بائیں اور سامنے برف کی سفید چادر تھی جس میں جگہ جگہ کوہان اُبھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ جہاز کبھی ایک طرف جھکتا اور کبھی دوسری طرف۔ سلوانو اب بھی اُسے سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ زوردار جھٹکے لگنے سے جہاز کے مختلف حصوں سے بڑی خوفناک سی آوازیں بھی اُبھر رہی تھیں جنہیں سن کر دل دہل رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے ہوا کے شدید دباؤ سے جہاز کسی بھی وقت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں بکھر جائے گا۔

تقریباً بیس منٹ بعد جہاز ہوا کے اس طوفان سے نکل آیا۔ قدرت کی مہربانی اور کچھ پائلٹ کی مہارت کا کمال تھا کہ جہاز کسی حادثے سے محفوظ رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ موت کے جبڑوں سے نکل آئے تھے۔ لیکن سلوانو نے یہ خوفناک انکشاف کیا کہ جہاز اپنے اصل راستے سے بھٹک کر اپنی منزل سے سینکڑوں میل دُور نکل گیا تھا اور اب اُس کا رُخ سیاچن کی طرف تھا۔

سلوانو نے فوراً ہی جہاز کو سنبھال لیا اور بتدریج اُس کا راستہ تبدیل کرتا رہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ جہاز کی پرواز ہموار ہوتی جہاز کے پچھلے حصے سے ایک خوفناک آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ ایسی ہی آواز تھی جیسے کسی درخت کی بہت بڑی شاخ ٹوٹ رہی ہو...... اس خوفناک آواز کے ساتھ ہی جہاز ایک بار پھر لڑکھڑانے لگا۔ میرا خیال تھا کہ ہم ایک بار پھر کسی ایئر پاکٹ میں پھنس گئے ہیں۔ سلوانو جہاز کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

''پیچھے جا کر دیکھو...... وہاں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔''

میں اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑا اور پھر میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا...... میں سمجھتا تھا کہ ہم ہوا کے اس طوفان سے بچ نکلے ہیں مگر وہ طوفان اپنا کام کر گیا تھا...... جہاز کا پچھلا دروازہ ٹوٹ کر لٹک رہا تھا اور کسی بھی وقت گر سکتا تھا...... ٹوٹے ہوئے دروازے سے اندر آنے والے طوفانی ہوا کے جھکڑ جہاز کا توازن بگاڑ رہے تھے اور جہاز کو لگنے والے جھٹکوں کے ساتھ اسلحہ کی بھاری پیٹیاں بھی اِدھر اُدھر لڑھک رہی تھیں۔

جہاز تیزی سے ایک طرف جھک رہا تھا۔ کڑک کی وہ خوفناک آواز ایک بار پھر سنائی دی اور لٹکا ہوا دروازہ جہاز سے الگ ہو کر تاریکی میں غائب ہو گیا...... اور پھر وہ خوفناک منظر دیکھ کر مجھے سینے میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا...... اسلحے کی بھاری پیٹیاں جہاز کے پچھلے حصے کی طرف پھسل رہی تھیں......

جہاز کا توازن کچھ اور بگڑ گیا۔ سارا بوجھ پچھلے حصے کی طرف آ رہا تھا جس سے پچھلا حصہ آہستہ آہستہ جھک رہا تھا اور کاک پٹ والا حصہ بتدریج اُوپر کی طرف اُٹھ رہا تھا...... میں کسی نہ کسی طرح دوڑتا ہوا کاک پٹ میں پہنچ گیا۔

''جہاز کا دروازہ ٹوٹ کر گر گیا ہے اور اسلحے کی پیٹیاں پھسلتی ہوئی پیچھے جا رہی ہیں۔'' میں نے چیخ کر پائلٹ کو بتایا۔

''اب جہاز کو بچانا ممکن نہیں۔'' سلوانو نے بھی چیخ کر کہا۔ ''چھلانگ لگا دو...... ہری اپ! ورنہ جہاز کے ساتھ ہم سب کے بھی ٹکڑے ہو جائیں گے۔''

میں نے ترمیز کی طرف دیکھا، اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر ہم دونوں تیزی سے جہاز کے پچھلے حصے کی طرف لپکے۔ اسی وقت کڑکڑاہٹ کی زوردار آواز پھر سنائی دی۔ دروازے کے قریب جہاز کا فرش اس طرح ٹوٹ رہا تھا جیسے زلزلے سے زمین پھٹ رہی ہو...... اس مرتبہ پیچھے آتے ہی میری نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ اسلحے کی کئی پیٹیاں غائب ہو چکی تھیں جبکہ دو پیٹیاں دروازے کے بالکل قریب پڑی تھیں۔

ہم جہاز کی سائیڈ میں لگے ہوئے راڈ کو پکڑے آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھتے رہے۔ جہاز کو ایک اور جھٹکا لگا۔ وہ دونوں پیٹیاں دروازے سے نکل کر تاریک خلا میں غائب ہو گئیں......

میں دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ مجھے چھلانگ لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جیسے ہی راڈ کو چھوڑا خود بخود پھسلتا ہوا دروازے سے باہر گرا اور ہوا میں قلابازیاں کھانے لگا......

اُس وقت جہاز تقریباً دس ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ دو اڑھائی ہزار فٹ تک تو میں قلابازیاں کھاتا رہا، میں بڑی تیزی سے نیچے آ رہا تھا اور یہ سوچ کر ہی رُوح فنا ہوئی جا رہی تھی کہ اگر پیراشوٹ نہ کھلا تو کسی چٹان سے ٹکرانے کے بعد میرے جسم کے کتنے ٹکڑے ہوں گے؟ میں نے دونوں ٹانگیں سمیٹ کر گھٹنے پیٹ سے لگا لئے اور ٹانگوں کو زوردار جھٹکا دیا۔ اس طرح میں جیسے ہی سیدھا ہوا مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا اور میرے گرنے کی رفتار ایک دم کم ہو گئی۔ پیرا شوٹ کھل گیا تھا۔ میں نے پیراشوٹ کی رسیوں کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس وقت میری بری حالت تھی۔ دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جہاز بہت دُور ایک پہاڑی کے پیچھے غائب ہو گیا۔ چند سیکنڈ اُس کی آواز فضا میں گونجتی رہی پھر ایک زوردار دھماکہ سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی پہاڑی کی دوسری طرف سے آگ کا ایک گولہ سا اُٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں بھی دھماکے ہونے لگے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

چند سیکنڈ بعد میں نے آنکھیں کھول دیں اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہر سو تاریکی تھی اور میں اس تاریک خلا میں معلق اِدھر اُدھر جھول رہا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکے مجھے کبھی ایک طرف دھکیل دیتے اور کبھی دوسری طرف۔ پیراشوٹ ہونے کے باوجود میری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ عین ممکن تھا کہ میں تاریکی میں کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا۔ میں نے گردن جھکا کر نیچے دیکھا تو نیچے بھی تاریکی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ برفانی علاقہ نہیں تھا۔ نیچے کہیں برف ہوتی تو اُس کی سفیدی ضرور نظر آتی۔

تیز ہوا کے تھپیڑے مجھے اِدھر اُدھر جھلا رہے تھے۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں ترمیز کا خیال اُبھر آیا۔ اُس نے میرے پیچھے ہی جہاز سے چھلانگ لگائی تھی۔ ترمیز کا خیال آتے ہی میں نے آنکھیں کھول دیں اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میرے خیال میں ترمیز کو میرے قرب و جوار ہی میں کہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن گھمبیر تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہوسکتا ہے تیز ہوا اُسے اُڑا کر مجھ سے دُور لے گئی ہو یا اُس کا پیراشوٹ ہی نہ کھلا ہو۔ اس خوفناک تصور سے میں کانپ اُٹھا اور اپنے آپ کو تسلی دینے لگا کہ ترمیز کا پیرا شوٹ بھی کھل گیا ہوگا۔ وہ بھی میری طرح فضا میں تیر رہا ہوگا۔ وہ مجھے دکھائی اس لئے نہیں دے رہا تھا کہ ہوا اُسے اُڑا کر مجھ سے دُور لے گئی ہوگی۔ اس تاریکی میں تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا وہ مجھے کیسے نظر آتا؟

میں نے پائلٹ سلوانو کے بارے میں بھی سوچا۔ وہ تجربہ کار آدمی تھا۔ جہاز کی صورتحال جان کر اُس نے ہمیں چھلانگ لگانے کا مشورہ دیا تھا، وہ خود کیسے جہاز میں رہ سکتا تھا؟ عین ممکن ہے جب ہم جہاز کے پچھلے حصے کی طرف آ رہے تھے تو اُس نے ہم سے پہلے ہی کاک پٹ والے دروازے سے چھلانگ لگا دی ہو۔

تاریکی میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میں ایک دم چونک سا گیا..... دائیں طرف نیچے بہت دُور کچھ دیئے ٹمٹماتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پہلے تو میں اسے اپنا واہمہ سمجھا، لیکن نہیں...... وہ میرا وہم نہیں تھا۔ وہ کوئی بستی تھی جہاں بکھری ہوئی کچھ روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ فاصلہ بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ روشنیاں بہت مدھم دکھائی دے رہی تھیں۔

میں کچھ دیر تک اُن ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں کو دیکھتا رہا پھر نیچے اپنے اطراف میں دیکھنے لگا۔ میں زمین کے قریب پہنچ رہا تھا۔ تاریک چٹانوں کے ہیولے کچھ واضح ہو رہے تھے جو بڑی تیزی سے قریب آ رہے تھے یا یا الفاظِ دیگر میں اُن کے قریب پہنچ رہا تھا۔

میں زندگی میں پہلی بار اس قسم کے تجربے سے دوچار ہوا تھا۔ مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ

پیراشوٹ سے چھلانگ لگانے کے بعد زمین پر کس طرح اُترا جاتا ہے؟ ایک مرتبہ ایک انگریزی فلم میں ایک جنگی جہاز کے پائلٹ کو اُترتے دیکھا تھا۔ وہ ہوا کے رُخ پر اُترا تھا۔ اُس کا پیراشوٹ اُس سے آگے تھا، زمین پر قدم ٹکتے ہی وہ اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے اسی طرف دوڑا تھا جس طرف پیراشوٹ زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ لیکن وہ ایک تجربہ کار پائلٹ تھا اُسے اس طرح اُترنے کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ اور پھر وہ ہموار میدان میں اُترا تھا جہاں اُسے سنبھلنے کا موقع مل گیا تھا۔ لیکن یہاں صورتحال مختلف تھی۔ مجھے نہ تو کوئی تجربہ تھا اور نہ ہی میں کسی ہموار میدان میں اُتر رہا تھا۔ نیچے سنگلاخ چٹانیں تھیں جن سے ٹکرا کر زندہ بچ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے جسم کے مسام تیزی سے پسینہ اُگلنے لگے، موت تیزی سے قریب آرہی تھی۔

اور پھر دفعتاً وہ ہوا جس کی مجھے توقع نہیں تھی...... شاید میری دُعا قبول ہوگئی تھی۔ ہوا کا رُخ بدل گیا۔ پیراشوٹ اب چٹانوں کی بجائے دائیں طرف جارہا تھا۔ اُس طرف ٹیلوں کی نسبتاً ہموار اور ڈھلوان پہاڑیاں تھیں۔ وہ روشنیاں بھی کسی پہاڑی کے پیچھے نگاہوں سے اوجھل ہو رہی تھیں۔

میں بڑی تیزی سے زمین کے قریب پہنچ رہا تھا۔ میں نے سر کے اُوپر پیراشوٹ کی دونوں رسیوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور دونوں پیر آگے کو نکال لئے۔ لیکن ایک اور خوفناک حقیقت نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ میرا پیراشوٹ جس طرف جارہا تھا وہاں درختوں کے ہیولے نظر آرہے تھے۔

درخت بڑی تیزی سے قریب آرہے تھے۔ میں ایک درخت کی شاخوں سے ٹکراتا ہوا آگے نکل گیا اور پھر مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا...... پیراشوٹ درختوں میں اُلجھ گیا تھا اور میں ایک جھٹکے سے فضا میں معلق ہوگیا۔

کئی سیکنڈ بعد میرے حواس بحال ہو چکے تھے۔ میں نے اپنے آپ کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ صورتحال زیادہ سنگین نہیں تھی۔ پیراشوٹ درخت کی اُوپر والی شاخوں میں اُلجھا ہوا تھا جبکہ میں نیچے والی شاخوں میں پھنس گیا تھا اور زمین سے دس بارہ فٹ کی بلندی پر تھا۔

میں چند سیکنڈ فضا میں معلق رہا، پھر میں نے ایک ہاتھ رسی سے ہٹا لیا اور جیکٹ کی جیب سے چاقو نکال لیا۔ پیراشوٹ کی ایک رسّی کاٹنے سے میں کچھ نیچے کھسک گیا۔ میں نے ٹانگوں سے ٹٹول کر پیر نسبتاً ایک موٹی شاخ پر جما دیئے اور پیراشوٹ کی دوسری رسّی بھی کاٹ دی۔ اس کے بعد درخت سے اُترنا میرے لئے کوئی زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔

میں زمین پر پڑا کئی منٹ تک گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ یہ میری زندگی کا خوفناک ترین تجربہ تھا جس نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں ترمیز اور سلوانو کے بارے میں سوچنے لگا کہ اگر وہ پیراشوٹ کے ذریعے نیچے اُتر گئے ہوں گے تو کس طرف ہوں گے؟ لیکن کوئی اندازہ لگانا بالکل ممکن نہیں تھا۔ ہوا اُنہیں کہیں کا کہیں لے گئی ہوگی۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ یہاں سے بچ کر کسی محفوظ جگہ تک پہنچ

بھی سکتا ہوں یا ان پہاڑوں میں بھٹکتا ہوا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا؟ پیراشوٹ کے ذریعے اُترتے ہوئے میں نے دُور کسی بستی کی روشنیاں دیکھی تھیں۔ ان بستی والوں نے جہاز کی آواز سنی ہوگی اور جہاز کو گر کر تباہ ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ اگر وہ کوئی عام بستی تھی تو ممکن ہے کسی نے توجہ نہ دی ہو۔ لیکن اگر وہ کوئی فوجی کیمپ تھا تو اُنہیں ضرور تشویش ہوئی ہوگی۔ رات کے وقت وادیٔ کشمیر کے کسی بھی حصے میں کسی ہوائی جہاز کے آنے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ دہلی پٹھان کوٹ سے سری نگر کے لئے انڈین ایئر لائن کی پرواز دن کے وقت آتی تھی۔ اور یہی پرواز کارگل اور لیہہ کا چکر بھی لگاتی تھی۔ لیکن رات کے وقت تو کسی پرواز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ روشنیاں کسی فوجی کیمپ کی تھیں تو ممکن ہے کوئی پارٹی تباہ ہونے والے جہاز کی تلاش میں روانہ بھی ہو چکی ہو یا روانہ ہونے والی ہو۔

میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا اور پھر اُٹھ کر پہاڑی پر چڑھتا چلا گیا۔ ایک جگہ رُک کر میں نشیب میں دیکھنے لگا لیکن ظاہر ہے تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں ترمیز کا نام لے کر پکارنے لگا۔ میری آواز پہاڑوں میں بازگشت پیدا کرتی رہی لیکن جواب میں کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ ترمیز شاید مجھ سے بہت دُور نکل گیا تھا۔ میں دوسری طرف نشیب میں اُترنے لگا۔

دو گھنٹوں تک چلتے رہنے کے بعد میں رُک گیا۔ اس طرح تاریکی میں مارے مارے پھرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کوئی حادثہ بھی پیش آسکتا تھا۔ اس لئے میں نے دن کی روشنی پھیلنے کا انتظار مناسب سمجھا اور ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

مجھے سب سے زیادہ افسوس اپنے اس مشن کی ناکامی کا تھا۔ ہمیں اسلحہ کی وہ پیٹیاں سونامارگ کے قریب ایک خاص مقام پر گرا کر واپس چلے جانا تھا۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق مقررہ مقام پر زمین سے ہمیں روشنی کے مخصوص سگنل ملتے۔ ہم اسلحہ کی وہ پیٹیاں جن کے ساتھ پیراشوٹ بھی تھے، جہاز سے گرا دیتے اور چکر کاٹتے ہوئے واپس چلے جاتے۔ لیکن ہمارا جہاز ایئر پاکٹ میں پھنس گیا۔ اس سے بچ کر نکلے تو انکشاف ہوا کہ ہم اپنی منزل سے بہت دُور نکل گئے تھے اور واپس آتے ہوئے وہ حادثہ پیش آیا جس سے نہ صرف اسلحہ کی پیٹیاں نیچے گر گئیں بلکہ ہمیں بھی اپنی جانیں بچانے کے لئے جہاز سے چھلانگ لگانی پڑی اور جہاز بھی کسی جگہ گر کر تباہ ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اسلحہ کی پیٹیاں کس علاقے میں گری تھیں؟ ترمیز کہاں تھا اور میں کہاں تھا؟ لیکن سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ ہمارا مشن ناکام ہو گیا تھا اور کروڑوں ڈالر مالیت کا وہ اسلحہ بھارتی درندہ صفت فوجیوں سے برسرِ پیکار مجاہدین تک پہنچنے کی بجائے ضائع ہو گیا تھا۔ اس مشن کی ناکامی سے جہاں ایک طرف بھاری مالی نقصان ہوا تھا وہاں مجاہدین کی سرگرمیاں بھی متاثر ہونے کا اندیشہ تھا۔

بات کو آگے بڑھانے سے پہلے میں اپنے بارے میں مختصر طور پر بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ آپ اس داستان میں میرے کردار کا صحیح تعین کر سکیں۔

میں 1966ء میں سوپور میں پیدا ہوا تھا۔ سرینگر سے تقریباً پچاس میل دُور اور وولر جھیل کے قریب یہ ایک بہت ہی خوبصورت قصبہ ہے، خدا نے اس قصبے کے لوگوں کو زندگی کی ہر نعمت سے نوازا ہے۔ زرخیز زمینیں، ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے، مرغزار اور گنگناتی ہوئی شفاف پانی کی ندیاں۔ قدرتی حسن سے مالا مال یہ علاقہ ہر قسم کی پیداوار کے لئے بھی پوری وادی میں مشہور ہے۔ چاول اور زعفران کے علاوہ یہاں دنیا کی ہر نعمت موجود ہے۔ لیکن وادی کے دوسرے باشندوں کی طرح یہاں کے لوگ بھی آزادی کی نعمت سے محروم ہیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنے لوگوں کو ظلم کی چکی میں پستے ہوئے ہی دیکھا ہے۔ بھارتی سامراج وادی کے باشندوں کو پچھلے پچاس برسوں سے جس طرح ظلم و بربریت کا نشانہ بنا رہا ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

میرے والد رسول بخش لون سوپور کی ایک مسجد کے پیش امام تھے۔ گاؤں میں اُن کی بڑی عزت تھی۔ آس پاس کی بستیوں میں اُنہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اُن کی تھوڑی بہت زمین بھی تھی جس پر وہ بڑی محنت سے کھیتی باڑی کرتے اور اُس پر پیدا ہونے والے اناج کی ساری آمدنی مجاہدین کے حوالے کر دیتے جو برسوں سے کشمیر کی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔

مجھ سے بڑی دو بہنیں تھیں۔ زینت دو سال اور رابعہ مجھ سے چار سال بڑی تھی۔ اُنہیں صرف پرائمری سکول تک تعلیم دلائی گئی تھی البتہ دینی تعلیم میں کوئی کمی نہیں چھوڑی گئی تھی۔ دونوں حافظ قرآن تھیں۔ والد صاحب نے اُنہیں فقہہ و حدیث کے علم سے بھی آراستہ کیا تھا۔

والد صاحب مجھے اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے تھے لیکن بھارت کے متعصب ہندو حکمرانوں نے کشمیر کے مسلمانوں پر تو عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کا حصول ایک خواب بن کر رہ گیا تھا۔ میں قصبے کے ہائی سکول سے صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کر سکا اور اس کے بعد کھیتی باڑی سنبھال لی۔ میں جانتا تھا کہ زمین کی آمدنی کا ایک ایک پیسہ مجاہدین کو دے دیا جاتا تھا اس لئے میں نے محنت سے کبھی جی نہیں چرایا تھا۔

بعض اوقات مجاہدین کسی بھارتی فوجی دستے سے جھڑپ کے بعد پناہ لینے کے لئے ہمارے قصبے کی طرف بھی آ جاتے۔ گاؤں والوں نے اُنہیں کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ کئی کئی روز تک اُنہیں نہ صرف چھپائے رکھا جاتا بلکہ اُن کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کا خیال بھی رکھا جاتا۔ ایسے معاملات میں میرے والد صاحب ہمیشہ پیش پیش رہتے۔ کوئی بھی مسئلہ ہوتا اُن سے مشورہ ضرور لیا جاتا۔

مجاہدین جب ہمارے قصبے میں چھپے ہوتے تو میں اُن سے ملتا اور اُن کی باتیں سنتا۔ اُن کی ولولہ انگیز باتوں سے میرے اندر ایک تحریک سی پیدا ہوتی...... خون جوش مارنے لگتا اور میرا بھی دل چاہتا کہ میں بھی ان کے ساتھ جہاد میں حصہ لوں۔ اپنی سرزمین سے ہندو بھیڑیوں کے

ناپاک وجود کو مٹانے کے لئے اُن پر گولیاں برساؤں۔ میں نے ایک دو مرتبہ اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا لیکن مجاہدین کے خیال میں، میں ابھی بہت چھوٹا تھا۔

یہ 1981ء کی بات تھی۔ کشمیر کی تحریک زور پکڑ گئی تھی۔ جوش و ولولے کی ایک نئی لہر اُٹھی تھی جس نے پوری وادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بھارتی فوج کا کوئی بھی دستہ مجاہدین کے حملوں سے محفوظ نہیں تھا۔ فوجی قافلوں پر حملے ہو رہے تھے۔ بھارتی فوجیوں کا کوئی بھی کیمپ مجاہدین کے حملوں سے محفوظ نہیں تھا۔ وادی کے مختلف علاقوں میں روزانہ بیسیوں فوجی مجاہدین کے ہاتھوں جہنم واصل ہو رہے تھے۔ اُن کی لاشیں جب دِلی پہنچتیں تو کہرام سا مچ جاتا تھا۔ صف ماتم بچھ جاتی۔

بھارتی سورما مجاہدین سے تو مار کھا جاتے مگر اس کا انتقام لینے کے لئے نہتے اور بے گناہ و کمزور لوگوں کو اپنی بربریت کا نشانہ بناتے۔ وہ چھوٹی چھوٹی بستیوں پر ٹوٹ پڑتے۔ بوڑھوں اور معصوم بچوں تک کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اُتار دیتے، بھوکے اور خونخوار بھیڑیوں کی طرح عورتوں پر ٹوٹ پڑتے۔ اجتماعی آبرو ریزی کے واقعات عام ہو چکے تھے۔

درندہ صفت بھارتی فوجیوں کے ان مظالم اور اوچھے ہتھکنڈوں سے وادی کے مسلمانوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ مجاہدین نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ اپنی عورتوں کی بے حرمتی کا انتقام لینے کے لئے وہ قہر بن کر بھارتی فوجیوں پر ٹوٹ پڑتے، کسی فوجی قافلے کو گھیرے میں لیتے تو ایک بھی فوجی بچ کر نہ نکل پاتا۔ کسی کیمپ پر حملہ آور ہوتے تو اُسے راکھ کا ڈھیر بنا دیتے۔

میں پندرہ سال کا ہو چکا تھا۔ رائفل کا بوجھ اُٹھا سکتا تھا۔ میں بھی چاہتا تھا کہ مجاہدین کے شانہ بشانہ بھارتی سامراجیوں کے خلاف لڑوں مگر قصبے کے لوگوں نے مجھے اور چند لڑکوں کو روکے رکھا تھا۔ اُن کے خیال میں فی الحال ہم قصبے میں رہ کر ہی مجاہدین کے لئے بہتر خدمات انجام دے سکتے ہیں اور جب وقت آئے گا تو وہ اپنے ہاتھوں سے ہمیں رائفلیں دے کر رخصت کریں گے۔

چھوٹی سے چھوٹی بستی میں بھی پوری وادی کی خبریں پہنچ جاتی تھیں۔ سوپور تو ایک قصبہ تھا۔ سرینگر اور مختلف شہروں میں لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ انہی لوگوں سے وادی کے حالات سن سن کر میں کڑھتا رہتا میرا خون کھولتا۔

آزادی ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور ہمارا یہ حق بھارت کے متعصب ہندو حکمرانوں نے غصب کر رکھا ہے۔ وہ طاقت کے بل بوتے پر ہمیں اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن دنیا نے بھی دیکھ لیا تھا کہ ہم غلام بن کر نہیں آزاد اور خود مختار انسانوں کی طرح جینا چاہتے ہیں اور وادی کے غیور مسلمان اپنا یہ حق چھیننے کے لئے ہی طویل عرصے سے جدوجہد کر رہے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ کشمیر کے مسئلے کو اُلجھانے میں سیاسی عوامل کارفرما ہیں۔ میں سیاست میں نہیں جاؤں گا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ وادی کے بعض بااثر مسلمان رہنما کشمیر کاز سے غداری نہ

کرتے تو آج یہ مسئلہ بڑی حد تک سلجھ چکا ہوتا۔ لیکن المیہ تو یہی ہے کہ 'شیر کشمیر' کہلوانے والوں نے اپنوں کو دھوکہ دیا اور اپنی سرزمین سے غداری کی۔ ذاتی اقتدار کے لالچ میں اُنہوں نے معصوم کشمیریوں کی پشت میں چھرے گھونپ دیئے اور اُن کی قسمت کی ڈور متعصب ہندو حکمرانوں کے ہاتھوں میں دے دی۔ لیکن بھارتی حکمرانوں کو بھی بخوبی یہ اندازہ ہو چکا ہے کہ کشمیر اتنا تر نوالہ نہیں جسے آسانی سے ہضم کیا جاسکے۔

بھارتی حکمرانوں کی توسیع پسندی بھی کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں۔ مثل مشہور ہے کہ لنکا سے جو بھی نکلا باون گز کا ہی نکلا۔ بھارت میں جو بھی برسرِ اقتدار آیا رہنا پچاری ہی نکلا۔ زبان سے امن اور بھائی چارے کا درس دینے والے جنگی جنون میں مبتلا ہی پائے گئے۔ پچھلے پچاس برسوں میں اُنہوں نے حالات کے بل بوتے پر آس پاس کی چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں پر جس طرح قبضہ کیا اس کے بارے میں دنیا جانتی ہے۔ گور کو پرتگال سے آزادی دلانے کے بہانے بغاوت کرائی اور بالآخر طاقت کے بل بوتے پر خود گور پر قبضہ کرلیا۔ برما کی ریاست آسام پر بھی طاقت کے زور پر تسلط جمایا۔ ناگا قبائل پچاس سال گزرنے کے بعد آج بھی بھارتیوں کے لئے لوہے کا چنا بنے ہوئے ہیں۔ سکم اور بھوٹان پر طاقت کے ذریعے قبضہ کیا۔ 1971ء میں پاکستان کا ایک بازو کاٹ دیا۔ اندرا کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان کو بھی طاقت کے زور پر بھارت میں ضم کرلیا جائے گا مگر بنگالیوں نے ٹھینگا دکھادیا۔ کشمیر پچاس سال سے سانپ کے منہ میں چھچھوندر بنا ہوا ہے اور بھارتی حکمران جان چکے ہیں کہ وادی میں بعض غداروں کی موجودگی کے باوجود کشمیر پر مکمل قبضے کا خواب کبھی پورا نہیں ہوسکے گا۔

میں یہ سب کچھ سوچتا رہتا اور کڑھتا رہتا۔ میں اپنی سرزمین کو ان بھارتی بھیڑیوں کے ناپاک وجود سے پاک کرنا چاہتا تھا لیکن بچہ سمجھ کر میری بات کو نظر انداز کر دیا جاتا۔ لیکن بالآخر ایک روز قسمت مجھ پر مہربان ہوگئی۔

ہوا یوں کہ میرے والد صاحب جن مجاہدین کو زمین کی آمدنی بھیجا کرتے تھے وہ کچھ مصروفیات کی وجہ سے نہیں آسکے تھے۔ مجاہدین کی اُسی جماعت کے لیڈر عبدالرشید عباسی نے پیغام بھیج دیا کہ رقم سرینگر بھیج دی جائے۔ اُس نے یہ پیغام ایک عورت کے ہاتھ بھیجا تھا۔

والد صاحب کو گل ناز نامی اُس عورت پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی دو تین مرتبہ یہاں آچکی تھی لیکن ہر مرتبہ اُس کے ساتھ کوئی نہ کوئی آدمی ضرور ہوتا تھا۔ مگر اس مرتبہ وہ اکیلی آئی تھی اور والد صاحب اُس اکیلی کو اتنی بڑی رقم دے کر نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ اس لئے مجھے اور سلطان نامی ایک لڑکے کو اُس کے ساتھ جانے کو تیار کیا گیا۔

گل ناز ایک ادھیڑ عمر اور صحت مند عورت تھی۔ بس میں وہ میرے ساتھ بیٹھی تھی جبکہ سلطان ہم سے پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ راستے میں ہم نے کوئی بات نہیں کی۔

سرینگر میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میں پہلے بھی کئی مرتبہ یہاں آچکا تھا۔ لیکن آج کچھ اور بات

تھی میں ایک اہم مشن پر تھا اور اپنے آپ میں ایک عجیب سنسنی کی سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔

سرینگر میں اڈے پر لاری سے اُترتے ہی میں نے شہر میں گڑبڑ کا اندازہ لگا لیا تھا۔ بس اڈے کے آس پاس کی دُکانیں بند تھیں اور فضا میں آنسو گیس کی بو رچی ہوئی تھی۔ ہم بس سے اُتر کر چند قدم ہی چلے تھے کہ ایک آدمی کسی طرف سے آکر ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے اور سلطان نے باڈی گارڈز کی طرح گل ناز کو اپنے درمیان لے رکھا تھا۔ وہ آدمی چند قدم تک ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا، پھر شاید اُس نے ہمارے بارے میں کوئی رائے قائم کر لی تھی۔ پھر اُس نے جیسے ہی مجھے ایک طرف ہٹا کر گل ناز کے قریب آنے کی کوشش کی میں چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا اُس شخص نے گل ناز کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

''لاہوری محلے کی طرف گڑبڑ ہے۔ بند کی طرف چلی جاؤ! کمانڈر پوسٹ نمبر تین پر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔''

وہ شخص ہم سے الگ ہٹ گیا، میں نے اُسے تیزی سے بائیں طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر گل ناز کی طرف دیکھنے لگا۔ گل ناز کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اُس نے سرگوشی کی۔ ''پریشان مت ہو...... اپنا ہی آدمی تھا۔''

لاہوری محلہ شہر کے اندرونی علاقے میں تھا۔ مگر اُس شخص سے یہ پیغام ملنے کے بعد گل ناز نے اپنا راستہ بدل دیا۔ میں اور سلطان اب بھی اُس کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔

ہم ایک طویل چکر کاٹ کر زیرو برج پر پہنچ گئے۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ دریائے جہلم سرینگر شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک طرف پرانا شہر ہے جس کی آبادی گنجان ہے۔ آڑھی ترچھی گلیاں کسی قدیم شہر کا منظر پیش کرتی ہیں۔ دریا کے دوسری طرف ماڈرن آبادی ہے۔ سیکریٹریٹ، سینٹرل پوسٹ آفس، ریذیڈنسی اور زیادہ تر سرکاری عمارتیں اُسی علاقے میں ہیں۔ سیاستدان اور وزراء کے بنگلے بھی اُسی طرف ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں تو یہ سب سے جدید اور بارونق علاقہ ہوا کرتا تھا۔ بڑے بڑے سپر اسٹور اور ہینڈی کرافٹس کی بے شمار بڑی بڑی دُکانیں اس علاقے میں ہیں۔ یہ بند کا علاقہ کہلاتا ہے۔ شہر کے دونوں حصوں کو ملانے کے لئے دریائے جہلم پر کئی پل بنے ہوئے ہیں جنہیں نمبروں یا ناموں سے پہچانا جاتا ہے۔ ہم جس پل کی طرف آئے تھے وہ زیرو برج کہلاتا تھا۔

راستے میں ہمیں ایک تانگہ مل گیا۔ دو آدمی پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک آگے ایک پیچھے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کی عمر پچپن کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ مشت بھر سفید داڑھی، سر پر کھڑے کی سفید ٹوپی اور ہاتھ میں تسبیح، اُس کے چہرے پر خوف نمایاں تھا۔ خوف و دہشت کشمیر کی وادی کے باسیوں کا مقدر بن چکا تھا۔ اگر مقابلہ انسانوں سے ہوتا تو اس خوف سے نجات حاصل کی جاسکتی تھی مگر وہ تو بھیڑیئے تھے۔ درندے...... جو رحم کرنا تو جانتے ہی نہیں

تھے۔ بچہ، بوڑھا جو بھی اُن کے ہاتھ لگ جاتا اُسے بیدردی سے مار ڈالتے۔ عورتوں پر بھی بے پناہ تشدد کیا جاتا۔

گل ناز تانگے کی پچھلی سیٹ پر سفید داڑھی والے اُس بوڑھے کے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں اور سلطان اگلی سیٹ پر ٹک گئے۔ تانگے میں جتا ہوا گھوڑا بھی مریل سا تھا جو بڑی مشکل سے ہمارا بوجھ کھینچ رہا تھا۔

زیرو برج پر پولیس کے ساتھ درندہ صفت فوجی بھی رائفلیں تانے کھڑے تھے جو خونخوار نظروں سے آنے جانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ کئی لوگوں کو پوچھ گچھ کے لئے روک رکھا تھا۔ ہمارے تانگے کو بھی روک لیا گیا۔ ایک پولیس والا اور دو فوجی تھے۔ اُنہوں نے پہلے گہری نظروں سے ہم سب کا جائزہ لیا پھر ایک فوجی نے ہمیں نیچے اُترنے کا حکم دیا۔ بوڑھے کا چہرہ خوف کی شدت سے سفید پڑ گیا تھا۔

پہلے اُس بوڑھے سے ہی کچھ سوال کئے گئے۔ پولیس والے نے اُس کی جامہ تلاشی لی اور اُسے اس طرح ایک طرف دھکا دے دیا کہ وہ گرتے گرتے بچا تھا۔ پھر وہی فوجی گل ناز کی طرف متوجہ ہو گیا۔

گل ناز کی عمر چالیس اکتالیس سال رہی ہوگی۔ اُس کی نہ صرف شکل صورت بہت اچھی تھی بلکہ جسمانی طور پر بھی اُس میں بڑی کشش تھی۔ بھارتی فوجی اُس سے سوالات کرتے ہوئے اُسے اُوپر سے نیچے تک گھور رہا تھا۔ اُس کی نظروں میں ہوس جھلک رہی تھی۔ گل ناز بڑے مطمئن لہجے میں اُس کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔

''اس تھیلے میں کیا ہے......؟'' فوجی نے اُس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔

''سیب ہیں...... اسلحہ نہیں ہے۔'' گل ناز نے تھیلا اُس کے سامنے کر دیا۔

اس مرتبہ فوجی نے بڑی خونخوار نظروں سے اُس کی طرف دیکھا تھا۔ اُس نے گل ناز کے ہاتھ سے تھیلا جھپٹ لیا۔ اندر ہاتھ ڈال کر اچھی طرح چیک کیا اور اپنے قریب کھڑے ہوئے پولیس والے کی طرف بڑھا دیا۔

''دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھاؤ!'' فوجی نے گل ناز کو حکم دیا۔

عورتوں کی جامہ تلاشی لینا اور تلاشی کے دوران بدتمیزی کرنا روز کا معمول بن چکا تھا۔ احتجاج کی پرواہ کسے تھی؟ گل ناز نے گہرے نیلے رنگ کی ٹخنوں تک لمبی چوغہ نما قمیض پہن رکھی تھی۔ سر پر رُومال بندھا ہوا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا دیئے۔ میرا خیال تھا کہ گل ناز نے میرے والد سے لی ہوئی رقم قمیض کے اندر کہیں چھپا رکھی تھی اور اب وہ رقم اُس فوجی کے ہاتھ لگ جائے گی۔ اُس فوجی کو شاید شبہ تھا کہ گل ناز نے ڈھیلے ڈھالے لباس کے اندر کوئی اسلحہ چھپا رکھا ہوگا اور وہ لباس کو محض تھپتھپا کر اپنا اطمینان کر لے گا۔ لیکن وہ ایک ہاتھ سے گل ناز کے

سینے کو ٹٹولنے لگا تو میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں نے لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ٹھیک اُسی لمحہ گل ناز نے بھی اپنے دونوں ہاتھ نیچے گرا دیئے تھے۔

''اپنے گندے ہاتھ دُور رکھو!'' میں چیخا۔ ''اگر اس کی تلاشی لینی ہے تو کسی لیڈی کانسٹیبل کو بلاؤ!''

گل ناز نے بھی چیختے ہوئے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ گل ناز کی مزاحمت اور میرا طرزِ عمل اُس فوجی کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ اُس نے بھیڑیئے کی طرح غراتے ہوئے میرے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ میرے منہ سے بے اختیار ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا اُس نے میرے کندھے پر رائفل کا بٹ رسید کر دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ میں چیخ کر نیچے گرا تو اُس نے میرے جسم پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ میں سڑک پر لوٹ رہا تھا۔ اُس کے بوٹ کی ٹھوکریں میرے جسم کے ہر حصے پر لگ رہی تھیں۔ ہر ٹھوکر کے ساتھ میں بلبلا اُٹھتا۔

پُل پر ٹریفک رُک گیا۔ لوگ جمع ہو رہے تھے لیکن آگے کوئی نہیں آ رہا تھا۔ گل ناز چیخ چیخ کر مجھے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسرے فوجی نے گل ناز کو بازو سے پکڑ کر زوردار دھکا دیا۔ وہ بھی چیختی ہوئی ایک طرف گری۔ اُس وقت چند آدمیوں نے جرات سے کام لیتے ہوئے مداخلت کی۔ اُن بھارتی درندہ صفت فوجیوں کے کام میں مداخلت کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اتفاق سے ایک پولیس آفیسر بھی جیپ پر اُس طرف نکل آیا تھا۔ لوگوں نے اُس پولیس آفیسر کو گھیر لیا۔

گل ناز اب بھی چیخ چیخ کر اُن فوجیوں کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ وہ پولیس آفیسر بھی اگرچہ ہندو ہی تھا لیکن صورتحال کی نزاکت کو تاڑ گیا تھا۔ وہ مجھے فوجی کے چنگل سے چھڑا کر ایک طرف لے گیا۔ میرے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ میں قمیض کے دامن سے خون صاف کرنے لگا۔ گل ناز بھی ہمارے قریب آ گئی۔ اُس نے سر پر بندھا ہوا رومال کھول لیا اور میرا ہاتھ ہٹا کر ناک اور ہونٹوں سے خون پونچھنے لگی۔ ساتھ ہی وہ چیخ چیخ کر اُن فوجیوں کو گالیاں بھی دے رہی تھی۔

''اب تم لوگ جاؤ!'' پولیس آفیسر نے ہمارے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''میں اُس کے خلاف یونٹ میں رپورٹ کروں گا۔ اُسے اس کی سزا ضرور ملے گی۔''

''کیا سزا ملے گی؟'' گل ناز غرائی۔ ''اس کا تبادلہ کر دیا جائے گا کسی اور جگہ بھیج دیا جائے گا جہاں اسے مزید کھل کر کھیلنے کا موقع ملے گا۔ ان بھیڑیوں کو وادی سے نکلنا ہوگا۔ ہم جب تک وادی کو ان کے ناپاک وجود سے پاک نہیں کر دیں گے اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ آج اس بے گناہ اور معصوم بچے کو تشدد کا نشانہ بنایا ہے کل اس کے ہاتھ میں رائفل ہوگی اور یہ انتقام لے گا...... انتقام......''

پولیس آفیسر کا خیال تھا کہ گل ناز اسی طرح چیختی رہی تو آس پاس کھڑے ہوئے لوگ بگڑ

جائیں گے اور صورتحال قابو سے باہر ہو جائے گی۔ اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر جیپ میں بٹھایا اور گل ناز کو بھی ہاتھ سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔

''چلو...... جیپ میں بیٹھو! اس لڑکے کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ضروری ہے۔ ورنہ تکلیف بڑھ جائے گی۔''

گل ناز اب بھی فوجیوں کو گالیاں بک رہی تھی۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ برج پر موجود تمام پولیس والے اور فوجی رائفلیں سنبھالے الرٹ کھڑے تھے۔ گل ناز جیپ پر بیٹھی تو اُس نے سلطان کو بھی پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ سلطان اب تک ایک طرف کھڑا رہا تھا۔ اُس کا چہرہ خوف سے دھواں ہو رہا تھا۔ وہ تو مجھ سے زیادہ جوشیلا تھا لیکن میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ اب تک خاموش کیوں رہا تھا اور بزدلوں کی طرح ایک طرف کیوں دُبکا کھڑا رہا تھا؟ مجھے اُس پر غصہ تو آیا تھا لیکن پھر سوچا کہ اس نے الگ رہ کر عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اگر وہ مداخلت کرتا تو اُس کا حشر بھی مجھ سے مختلف نہ ہوتا۔

جیپ بند کے علاقے میں ایک شاپنگ سنٹر کے قریب رُک گئی۔ پرانے شہر میں ہنگامے کا اثر یہاں بھی ہوا تھا اور بہت ساری دُکانیں بند تھیں۔ پولیس اور فوجیوں کا گشت یہاں بھی جاری تھا۔ وہ پولیس آفیسر ہمیں جیپ سے اُتار کر ایک کلینک میں لے گیا جس کے دروازے کے اُوپر ڈاکٹر غلام نبی کے نام کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

پولیس آفیسر مجھے ڈاکٹر کے حوالے کر کے چلا گیا۔ اُس نے ڈاکٹر کو ہدایت کر دی تھی کہ ہم سے کوئی فیس نہ لی جائے۔ کلینک میں اس وقت دو تین مریض اور بھی تھے لیکن ڈاکٹر فوراً ہی میری طرف متوجہ ہو گیا۔

میرا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ جسم کے ہر حصے پر ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ بائیں کندھے میں زیادہ تکلیف تھی۔

آدھے گھنٹے بعد ہم کلینک سے باہر نکلے تو میرے پورے جسم میں درد کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے اگرچہ مجھے درد رفع کرنے کی دو گولیاں کھلا دی تھیں لیکن فوری طور پر درد میں کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا بلکہ تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک مختلف سڑکوں اور گلیوں میں چلتے رہے۔ اس علاقے میں بڑے بڑے عالیشان بنگلوں اور چمچماتی کاروں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کشمیریوں کی تحریک آزادی نے ان دولت مندوں کی زندگی کو کسی پہلو سے بھی متاثر نہیں کیا تھا۔ وہ پہلے بھی عیش کر رہے تھے اور آج بھی سکون و اطمینان کی زندگی گزار رہے ہیں۔ آگ اور خون کا کھیل تو غریبوں کا مقدر بن چکا ہے۔ آزادی کی لگن تو انہی لوگوں کو ہے جو ایک وقت کی روٹی سے بھی محروم ہیں۔ جو اپنا حق حاصل کرنے کے لئے ہندو سامراج کو وادی سے نکالنا چاہتے ہیں۔ یہی لوگ سروں پر کفن باندھ کر اور جان ہتھیلی پر رکھ کر پھر رہے ہیں۔ یہی لوگ بھارتی درندوں کے ظلم و

تشدد کا شکار ہوتے ہیں۔ یہی دیوانے گولیوں کی باڑھ اپنے سینوں پر روکتے ہیں۔ انہی کے گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے۔ انہی کے معصوم بچوں کو چیر کر پھینک دیا جاتا ہے اور انہی کی عورتوں کی بے حرمتی کی جاتی ہے۔ کوئی دولت مند مجاہدین کی کسی تحریک میں شامل نہیں۔ ان کے نرم اور گداز ہاتھوں میں کبھی رائفل نہیں دیکھی گئی۔ یہ لوگ گھروں سے نکلتے ہیں تو درجنوں گارڈ ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ صرف دولت سمیٹتے ہیں اور بیانات جاری کرتے ہیں۔

ہم سرینگر کلب کے پیچھے سے ہوتے ہوئے ایک اور سڑک پر مُڑ گئے اور تقریباً بیس منٹ تک مختلف گلیوں میں چلتے رہنے کے بعد ایک بنگلے کے گیٹ میں داخل ہو گئے۔ گیٹ کی دوسری طرف تقریباً پانچ ہزار مربع گز کھلی جگہ تھی جس میں سیب اور اخروٹ کے لاتعداد درخت تھے۔ خودرو جھاڑیوں اور بے ترتیب گھاس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس جگہ کی دیکھ بھال پر توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ ایک طرف بنگلے کی عمارت تھی۔ عمارت کی حالت دیکھ کر اسے بڑی آسانی سے آثارِ قدیمہ میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ برسوں پہلے شاید رنگ و روغن کیا گیا ہو گا۔ اب تو دیواروں کا پلستر بھی جگہ جگہ سے اُکھڑا ہوا تھا۔ برآمدے کے سامنے اخروٹ کے دو بہت اُونچے درخت تھے جن کی گھنی شاخوں نے بنگلے کی چھت پر سایہ کر رکھا تھا۔ برآمدے کے سامنے تین کشادہ سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں اور برآمدے کا فرش جگہ جگہ سے اُکھڑا ہوا تھا۔ برآمدے کے ستونوں کا پلستر بھی اُکھڑا ہوا تھا۔

برآمدے میں ہمارا استقبال ایک بوڑھی عورت نے کیا۔ گل ناز کے ساتھ مجھے اور سلطان کو دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ میرے ہونٹ اور ناک پر بینڈیج دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں تشویش اُبھر آئی۔ وہ ہمیں ایک کمرے میں لے گئی جہاں بچھی ہوئی دری پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

اُن میں سے ایک کی داڑھی، سر کے بال بھی بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ سر پر چترالی ٹوپی تھی۔ اُس نے سرمئی رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور اُوپر سیاہ رنگ کی واسکٹ تھی۔ اُس کے قریب ہی فرش پر سب مشین گن اور گولیوں سے بھرا ہوا بیلٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنے مجاہدین کی تنظیم کا کمانڈر عبدالرشید عباسی تھا۔ اُس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ دوسرے کی عمر بھی پچیس چھبیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ کلین شیو تھا۔ کمانڈر رشید کئی مرتبہ سوپور آ چکا تھا، اُس نے فوراً ہی مجھے پہچان لیا۔ میری حالت دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں تشویش اُبھر آئی۔

''کیا ہوا اسے...... اس کی یہ حالت کیسے ہوئی؟'' اُس نے پوچھا۔

''بتاتی ہوں۔'' گل ناز دری پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر زیرو برج پر پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں بتانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ''میرے پاس پستول ہوتا تو اُس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیتی۔ لیکن افسوس تو یہی ہوا کہ اُس وقت میں خالی تھی۔''

''گھبراؤ نہیں شمروز!'' کمانڈر رشید میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم پر بھارتی بھیڑیوں

کا یہ پہلا حملہ ہے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے اس کا بدلہ تو میں لوں گا۔ لیکن تم اس مار کو نہیں بھولو گے۔ ایک ایک چوٹ کو یاد رکھو گے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تم بھی ہاتھ میں رائفل اُٹھالو!"

"ہاں......اب مجھ سے بھی زیادہ برداشت نہیں ہوتا۔" میں نے جواب دیا۔

ہم باتیں کر رہے تھے اور گل ناز نے اپنی چوغہ نما قمیض کے اندر ہاتھ ڈال کر نوٹوں کے بنڈل کمانڈر رشید کے سامنے رکھ دیئے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اُس نے نوٹ کہاں چھپائے تھے حالانکہ میرے سامنے اُس فوجی نے تلاشی لی تھی۔ گل ناز نے مسکرا کر میری طرف دیکھا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اُس نے نوٹ لباس میں کہاں چھپائے تھے؟

"صبح جب میں گئی تھی تو شہر کے حالات بالکل پُرسکون تھے۔" گل ناز نے کمانڈر رشید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا گڑبڑ ہوگئی؟ پرانے شہر میں ہنگامے ہو رہے ہیں۔"

"ان ہنگاموں کی وجہ سے ہی مجھے یہاں آنا پڑا اور اپنا ایک آدمی بھی لاری اڈے پر بھیج دیا تھا تاکہ تمہیں اُس طرف جانے سے منع کر دیا جائے۔" کمانڈر رشید نے کہا۔ "پولیس نے آج صبح سویرے اسٹوڈنٹ لیڈر عبدالشکور کو اُس کے گھر سے گرفتار کر لیا تھا۔ دس بجے کے قریب یہ خبر پھیل گئی کہ اُسے فوجی کیمپ میں تشدد کر کے ہلاک کر دیا گیا ہے۔ اسٹوڈنٹس نے احتجاجی جلوس نکالا تو پولیس نے پہلے لاٹھی چارج کیا اور پھر گولی چلا دی جس سے دو لڑکے اور شہید ہو گئے۔ پرانے شہر میں ابھی ہنگامے ہو رہے ہیں لیکن کل کے لئے پوری وادی میں ہڑتال کی کال دے دی گئی ہے۔ یہ لڑکے......" اُس نے میری اور سلطان کی طرف دیکھا۔ "یہ دونوں بھی تین چار دن تک واپس نہیں جا سکیں گے۔ انہیں یہیں رہنا ہوگا۔ میں آج ہی مولوی رسول بخش کو پیغام بھجوا دیتا ہوں کہ وہ پریشان نہ ہو۔"

اس دوران اُس بوڑھی عورت نے ہمارے سامنے چائے لا کر رکھ دی۔ کشمیری چائے کا کچھ اپناہ ہی مزہ ہوتا ہے لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ ایسی خوش ذائقہ اور لذیذ چائے میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں پی تھی۔

"اماں فاطمہ! یعقوب کہاں ہے......؟" کمانڈر رشید نے بوڑھی عورت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"باہر گیا ہوا ہے......ابھی آ جائے گا تھوڑی دیر میں۔" فاطمہ نے جواب دیا۔

"وہ آ جائے تو میرے پاس بھیج دینا۔" کمانڈر رشید نے کہا۔

بوڑھی فاطمہ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد گل ناز بھی خالی پیالیاں لے کر کمرے سے چلی گئی۔ کمانڈر رشید ہم سے باتیں کرنے لگا۔ وہ وادی کے مختلف علاقوں میں درندہ صفت بھارتی فوجیوں کے ظلم و تشدد کی باتیں سنا رہا تھا۔ یہ کوئی فرضی یا من گھڑت کہانیاں نہیں تھیں۔ سب کچھ اسی طرح ہو رہا تھا جس طرح کمانڈر رشید بتا رہا تھا۔ اس کی ایک مثال تو میں خود تھا جسے اُس بھیڑیا صفت نے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ میرا جرم کیا تھا؟ میں نے اُسے ایک عورت کو چھونے سے منع کیا تھا۔ اور آج صبح پرانے شہر میں ہونے والے ہنگامے، فوجیوں نے ایک اسٹوڈنٹ کو تشدد کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ احتجاج کرنے پر دو اور لڑکوں کو گولیوں سے اُڑا دیا گیا تھا۔

یہ بات اب میری سمجھ میں بھی آ گئی تھی کہ ظلم مظلوم کو سر اُٹھانے پر مجبور کیوں کر دیتا ہے۔ اور یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ آزادی کی تڑپ تھی۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا یہی سب کچھ دیکھتا ہوا آ رہا تھا۔ میرے اندر بچپن سے جو چنگاری سلگ رہی تھی وہ اب شعلہ بن کر بھڑکنے والی تھی۔ میری ناک اور ہونٹوں پر بینڈیج، جسم کے ہر حصے میں اُٹھنے والی ٹیسیں میرے جوش اور جذبے کو مہمیز کر رہی تھیں۔ کمانڈر رشید نے ٹھیک کہا تھا مجھے یہ چوٹیں یاد رکھنی ہوں گی اور ان کا درد محسوس کرنا ہوگا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ میں بھی ہاتھوں میں رائفل اُٹھا لوں۔

آدھے گھنٹے بعد ایک ادھیڑ عمر آدمی اندر داخل ہوا۔ وہ فاطمہ کا شوہر یعقوب تھا۔ کمانڈر رشید نے اُسے یہ پیغام دے کر سوپور بھیج دیا کہ میں اور سلطان تین چار دن تک یہیں رہیں گے۔ ہمارے گھر والوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یعقوب اسی وقت روانہ ہو گیا۔

میں اس ویران بنگلے کے بارے میں سوچ رہا تھا اور جب میں نے کمانڈر رشید سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ یہ وسیع و عریض بنگلہ دو دولت مندوں کے درمیان جھگڑے کی بنیاد بنا ہوا ہے۔ ان میں ایک ہندو سیٹھ ہے اور دوسرا مسلمان۔ اُن میں پچھلے دس سال سے بنگلے کی ملکیت کا مقدمہ چل رہا ہے۔ عدالت نے یہ بنگلہ اپنی تحویل میں لے رکھا ہے۔ یعقوب اس بنگلے کا چوکیدار ہے جو دس سال سے یہاں رہ رہا ہے۔ وہ مجاہدین کی بعض تنظیموں کے لئے انفارمر کا کام بھی کرتا ہے۔ مجاہدین اُس سے ملنے کے لئے یہاں بھی آتے رہتے ہیں۔ کسی کو آج تک یعقوب یا اُس کے مہمانوں پر شبہ نہیں ہو سکا۔ اسی طرح یہ ویران بنگلہ مجاہدین خصوصاً کمانڈر رشید کی تنظیم کی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز بھی بنا ہوا ہے۔

کمانڈر رشید کے اس خفیہ ٹھکانے کے بارے میں اُس کے دو چار آدمی ہی جانتے تھے۔ اور پھر یہ کوئی ایک خفیہ ٹھکانا نہیں تھا۔ شہر کے اندر ورنواح میں کئی ایسی جگہیں تھیں جنہیں وہ ضرورت کے وقت استعمال کرتے تھے۔

کمانڈر رشید اُس وقت بنگلے سے چلا گیا تھا۔ میرے اور سلطان کے علاوہ اس بنگلے میں گل ناز، فاطمہ رہ گئے تھے۔ یعقوب سوپور چلا گیا تھا اور کل دوپہر سے پہلے اُس کی واپسی کی توقع نہیں تھی۔

وہ رات میں نے بڑی اذیت میں گزاری۔ میرے جسم پر جگہ جگہ نیل پڑے ہوئے تھے اور درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ گل ناز نے مضروب جگہوں پر مالش بھی کر دی تھی اور ڈاکٹر کی دی ہوئی گولیاں بھی کھلا دی تھیں مگر تکلیف کم نہیں ہوتی تھی۔ گل ناز اور فاطمہ رات بھر میرے پاس بیٹھی رہی تھیں۔ سلطان بھی خاصا پریشان تھا۔

یعقوب اگلے روز دوپہر کے بعد واپس آیا تھا۔ اُس سے باہر کے حالات بھی معلوم ہوئے۔ پوری وادی میں ہڑتال تھی۔ سرینگر شہر میں جگہ جگہ پولیس اور سٹوڈنٹس میں جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ مجاہدین بھی اس لڑائی میں شامل ہو گئے تھے۔ سرینگر سے بتیس میل دُور بارہ مولا شہر میں دو پولیس والے اور تین فوجی مجاہدین کے ہاتھوں مارے گئے تھے جس پر فوجی مزید مشتعل ہو گئے تھے۔ وہ مجاہدین کی تلاش میں گھروں میں گھس کر عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔

ہنگامے بڑھتے جا رہے تھے۔ چار دن بعد کچھ سکون ہوا تو سلطان کو یعقوب کے ساتھ سوپور بھیج دیا گیا۔ مجھے تکلیف کی وجہ سے اسی بنگلہ ہی میں روک لیا تھا۔

میں مزید ایک ہفتہ اُس بنگلے میں رہا۔ اس دوران کمانڈر رشید دو مرتبہ تھوڑی دیر کے لئے وہاں آیا تھا۔ گل ناز ہر لحاظ سے میرا خیال رکھے ہوئے تھی۔ وہ دن میں دو تین مرتبہ ہلدی تیل سے میری مالش کرتی رہی جس سے میری اندر کی چوٹیں ٹھیک ہو رہی تھیں اور تکلیف بھی بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔

اور پھر ایک روز کمانڈر رشید مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ اُس روز سرینگر شہر کے حالات کسی قدر پُرسکون تھے۔ دُور تک دریا کے ساتھ ساتھ کھیتوں میں چلتے رہے اور بالآخر ایک جگہ رُک گئے۔ ایک گھنٹے بعد ایک اور آدمی وہاں پہنچ گیا۔ وہ کچھ دیر تک سرگوشیوں میں کمانڈر رشید سے باتیں کرتا رہا پھر ہم اُس کے ساتھ چل پڑے۔ اُونچے نیچے پہاڑی راستوں پر دو گھنٹے چلتے رہنے کے بعد ہم پھر ایک جگہ پر رُک گئے۔ یہاں دو آدمی ہمارے منتظر تھے۔

''کیا رپورٹ ہے بالے؟'' کمانڈر رشید نے علیک سلیک کے بعد اُن میں سے ایک کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''خبر ہے کہ بھارتی فوجیوں کا ایک کانوائے آج رات گلمرگ کی طرف جانے والا ہے۔ کمانڈر رفیق علی نے اُس فوجی قافلے پر حملے کی تیاری مکمل کر لی ہے۔ اُس نے پیغام بھیجا تھا کہ آپ کو اطلاع دے دی جائے۔'' بالے نے جواب دیا۔

''کمانڈر رفیق علی کہاں ہے...... اُس کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟'' کمانڈر رشید نے پوچھا۔

''وہ آٹھ مجاہدوں کے ساتھ پوائنٹ تھری پر آپ کا منتظر ہے۔'' بالے نے کہا۔

''فوجی کانوائے کے بارے میں کوئی اطلاع...... گاڑیوں اور فوجیوں کی تعداد کیا ہے؟'' کمانڈر رشید نے پوچھا۔

''یہ ساری تفصیل آپ کو کمانڈر رفیق علی سے ہی معلوم ہوگی۔'' بالے نے جواب دیا۔ ''ویسے میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ فوجی قافلہ رات آٹھ بجے وہاں سے گزرنے والا ہے۔''

کمانڈر رشید اس مرتبہ فوری طور پر جواب دینے کی بجائے چند سیکنڈ تک کچھ سوچتا رہا۔ اُس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں اُبھر آئی تھیں۔

''ٹھیک ہے......'' وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ''تمہاری پھٹ پھٹی کہاں ہے؟''

''وہ اُدھر...... اُس چٹان کے پیچھے درختوں کے نیچے کھڑا ہے۔'' بالے نے ایک طرف اشارہ کیا۔

کمانڈر رشید نے دوسرے جوان کو کچھ ہدایات دے کر وہاں سے رُخصت کر دیا اور ہم بالے کے ساتھ اُس چٹان کی طرف چل پڑے۔ میں چلتے ہوئے بار بار کن انکھیوں سے بالے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی عمر بیس اکیس سال رہی ہوگی۔ سر کے بال اور شیو بڑھا ہوا تھا، قد میں وہ مجھ سے تھوڑا ہی نکلتا ہوا تھا لیکن صحت قابل رشک تھی۔

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کشمیر کے یہ بیٹے وادی کے سپوت جو وادی میں بھارتی غاصبوں سے برسرپیکار تھے کئی کئی وقت فاقوں میں گزار دیتے تھے۔ اپنے گھروں کو تو شاید وہ بھول ہی گئے تھے۔ اُن کے دن بھارتی بھیڑیوں کے خلاف چھاپہ مار کارروائیوں میں اور راتیں کھلے آسمان تلے گزرتی تھیں۔ وادی میں پھیلی ہوئی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہنے والے لوگ اُن کی مدد کرتے تھے۔ لیکن وہ کبھی کسی جگہ ٹک کر نہیں رہتے تھے۔ آج یہاں کل وہاں...... وہ بھارتیوں کے لئے چھلاوہ تھے جو اچانک ہی کسی جگہ نمودار ہوتے اور کسی فوجی کیمپ یا قافلے پر تباہی نازل کر کے آناً فاناً غائب ہو جاتے۔

وہ چٹان وہاں سے تقریباً سو گز دُور تھی۔ ہم اُس کے اُوپر سے گھومتے ہوئے چنار کے درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچ گئے جہاں ایک پرانی سی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔

''ہم تینوں اس پر بیٹھ جائیں گے نا؟'' کمانڈر رشید نے قریب پہنچ کر سوالیہ نگاہوں سے بالے کی طرف دیکھا۔

''اس نے مجھے کبھی دھوکہ نہیں دیا کمانڈر!'' بالے نے موٹر سائیکل کی سیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اُس نے موٹر سائیکل کو اسٹینڈ سے اُتار کر کک لگائی۔ موٹر سائیکل پہلی ہی کک پر سٹارٹ ہو گئی۔ وہ موٹر سائیکل پر آگے کو ہو کر اس طرح بیٹھ گیا کہ پٹرول والی ٹینکی آدھی سے زیادہ اس طرح چھپ گئی۔

''چل بھئی شمروز...... بیٹھ جا!'' کمانڈر رشید نے مجھے اشارہ کیا۔ آج اس پھٹ پھٹی کا بھی امتحان ہے اور تیرا بھی۔''

میرے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اُن کی باتوں سے تو میں سمجھ گیا تھا کہ کسی چھاپہ مار کارروائی کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ اور یہ سوچ کر میں عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا تھا کہ میں بھی اس معرکے میں حصہ لینے والا تھا۔

میں بالے کے پیچھے بیٹھ گیا اور کمانڈر رشید میرے پیچھے۔ بالے کے گلے میں آٹومیٹک رائفل لٹکی ہوئی تھی جس کی نال میرے چہرے کے عین سامنے تھی۔ میں اُس فولادی نال کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس سے نکلنے والی گولیوں نے اب تک کتنے بھارتی سورماؤں کو ڈھیر کیا ہوگا۔

موٹر سائیکل حرکت میں آ گئی اور پتھریلے راستوں پر اُچھلتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ کچھ دیر تک ہم دریا کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور پھر موٹر سائیکل کا رُخ چٹانوں کی طرف مُڑ گیا۔ ایک تو راستہ غیر ہموار اور پتھریلا تھا اور ستم یہ کہ موٹر سائیکل پر ہم تین آدمی سوار تھے اس لئے رفتار بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔

موٹر سائیکل کی آواز چٹانوں میں بازگشت سی پیدا کر رہی تھی اور میں دُور بلند پہاڑوں پر قطار در قطار ایستادہ چنار کے فلک بوس درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان درختوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وادی کے محافظ چاق و چوبند اور مستعد کھڑے ہوں...... میں بھی چشم تصور سے اپنے آپ کو ایک ایسے مجاہد کے رُوپ میں دیکھ رہا تھا جو دونوں ہاتھوں میں رائفل تھامے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر گولیاں برساتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھستا چلا جا رہا ہو۔

یہ سوچ ہی سنسنی خیز تھی کہ آج میں بھی ایک مجاہد کی طرح وادی کے دشمنوں پر موت برسانے جا رہا تھا۔ رائفل میرے لئے اجنبی نہیں رہی تھی۔ مجاہدین کسی کارروائی کے بعد پناہ لینے کے لئے ہمارے گاؤں میں آتے رہتے تھے۔ میں نے اُن سے رائفل چلانا سیکھ لی تھی۔ کمانڈر رشید بھی کئی مرتبہ ہمارے گاؤں آ چکا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے مجھے رائفل اُٹھانا سکھائی تھی۔ اُس نے بتایا تھا میگزین کس طرح لوڈ کیا جاتا ہے، نشانہ کس طرح لیا جاتا ہے اور ٹرائیگر کیسے دبایا جاتا ہے؟ اور آج وہی کمانڈر رشید مجھے ایک محاذ پر لے جا رہا تھا۔

موٹر سائیکل پتھریلے راستوں پر اُچھلتی ہوئی چلتی رہی اور میں تصورات میں دشمن پر بجلی بن کر ٹوٹتا رہا...... کشتوں کے پشتے لگاتا دشمن کی صفوں کو روندتا آگے بڑھتا رہا۔

اور پھر میرے تصورات کا یہ تسلسل ٹوٹ گیا...... موٹر سائیکل اس قدر زور سے اُچھلی تھی کہ میں جھٹکا لگنے سے ایک طرف جھکتا چلا گیا۔ میرے پیچھے بیٹھا ہوا کمانڈر رشید اگر مجھے نہ سنبھال لیتا تو میں اُسے بھی ساتھ لے کر نیچے گرتا۔ ہمیں اُن پہاڑیوں میں سفر کرتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ ایک موقع پر ہم پہاڑیوں سے باہر آ گئے۔ دائیں طرف نشیب میں پھیلی ہوئی وادی میں بل کھاتی ہوئی ایک سرمئی سی لکیر چمک رہی تھی۔ یہ وہ سڑک تھی جو سرینگر سے گلمرگ کی طرف چلی گئی تھی۔

OOO

یہاں میں آپ کو تھوڑا سا گلمرگ کے بارے میں بتاتا چلوں۔ سرینگر سے بتیس میل دُور شمال مغرب میں سطح سمندر سے آٹھ سو ساٹھ فٹ کی بلندی پر یہ نہایت خوبصورت وادی ہے۔ میلوں دُور تک پھیلے ہوئے مرغزار، صنوبر اور چنار کے درختوں کے جھنڈ، پھل دار درختوں کے باغات اور اُن کے پس منظر میں سپید برف سے ڈھکے ہوئے سر بہ فلک پہاڑ۔

کچھ عرصہ پہلے تک یہ خوبصورت وادی بھارتی فلم انڈسٹریز کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ کوئی بھی بھارتی فلم کشمیر میں شوٹنگ کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ لیکن جب تحریک آزادی نے زور پکڑا تو ہندوستانی سیاحوں اور فلم انڈسٹری والوں نے کشمیر کا خیال ذہن سے نکال دیا۔

گلمرگ میں بھارتی فوج کی ایک چھاؤنی بھی تھی۔ پہلے یہ چھاؤنی بہت محدود ہوا کرتی تھی لیکن جیسے جیسے مجاہدین کی سرگرمیاں بڑھتی گئیں یہ چھاؤنی بھی پھیلتی گئی۔

سرینگر اور گلمرگ کے درمیان فوجی قافلوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ یہ قافلے عام طور پر دن کے وقت سفر کرتے تھے۔ رات کے وقت بھارتی فوج کا کوئی قافلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر نہیں کرتا تھا۔ لیکن پچھلے دو اڑھائی مہینوں سے اس علاقے میں مجاہدین کی کوئی کارروائی دیکھنے میں نہیں آئی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ اب کشمیر میں ہائی کمان نے رات کے وقت بھی اس طرح کوئی قافلہ بھیجنے کا پروگرام بنایا تھا جس کی اطلاع مجاہدین کو مل گئی تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک مزید سفر کرنے کے بعد بالے نے موٹر سائیکل ایک چٹان کے پیچھے لے جا کر درختوں میں روک لی۔ یہاں شفاف پانی کی ایک ندی بھی بہہ رہی تھی۔

کمانڈر رشید کے فوراً ہی بعد میں بھی موٹر سائیکل سے اُتر گیا۔ میں اس قسم کے سفر کا عادی نہیں تھا۔ مسلسل جھٹکوں اور سیدھا بیٹھے رہنے سے میری کمر اکڑ گئی تھی۔ کمانڈر رشید نے مُڑ کر میری طرف دیکھا اور میری پیٹھ تھپتھپانے لگا۔

''ایسی باتوں کا عادی ہو جاؤں گا پھر کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو گی۔'' میں نے اپنے کندھے پر لٹکی ہوئی سب مشین گن درست کرتے ہوئے کہا۔

بالے نے موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کر دی اور ہم اُس کی رہنمائی میں چلتے ہوئے ایک تنگ سے راستے میں داخل ہو گئے۔ راستہ بتدریج بلندی کی طرف چلا گیا تھا۔ میں انہی وادیوں میں پلا تھا...... پہاڑی راستوں کی اُونچ نیچ میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ میں بے تکان چلتا رہا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم ایک ایسے غار کے دہانے پر پہنچ گئے جو بہت بڑے پتھروں اور درختوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ارد گرد اونچی جھاڑیاں تھیں۔ غار کا دہانہ اس طرح چھپا ہوا تھا کہ اُسے نہ تو فضا سے دیکھا جا سکتا تھا اور نہ ہی وادی سے۔

میرے اندازے کے مطابق اس وقت سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ چٹانوں پر دُھوپ چمک رہی تھی۔

ہم جیسے ہی غار کے قریب پہنچے دو آدمی کہیں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ اُن دونوں کے پاس سب مشین گنیں تھیں اور اُن دونوں کے حلیے بھی بالے سے مختلف نہیں تھے۔ بڑھے ہوئے شیو، لمبے اور بے ترتیب بال اور لباس بھی خاصے میلے اور مسلے ہوئے تھے۔ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کئی دنوں سے یہ کپڑے اُن کے جسموں سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اُنہیں نہ تو کپڑوں کی پرواہ تھی اور نہ اپنے حلیوں کی۔ اُنہیں اپنے آپ سے نہیں اپنے کاز سے محبت تھی۔ کشمیر کی آزادی، اس وادی جنت نظیر کو غاصب اور درندہ فطرت ہندوؤں کے ناپاک وجود سے پاک کرنا۔ اُن کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ اپنی جانیں تو قربان کر دیں گے لیکن اس کاز سے منہ نہیں موڑیں گے۔

اُن دونوں نے بڑی گرمجوشی سے ہم تینوں سے ہاتھ ملایا پھر ایک تو وہیں کھڑا رہا اور دوسرا ہمیں اشارہ کرتا ہوا غار میں داخل ہو گیا۔ یہ تنگ سا غار تھا جو کئی فٹ تک سیدھا چلا گیا تھا۔ آگے کسی جگہ مدھم سی روشنی ہو رہی تھی اور اُس جگہ سے یہ غار دائیں طرف مُڑ گیا تھا۔ اس طرف سے یہ غار خاصا کشادہ تھا۔

اُس غار کو دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ فرش پر دو تین چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف بڑے سے پتھر پر رکھا ہوا اسپرٹ لیمپ مسلسل جل رہا تھا۔ اُس کے قریب ہی مٹی کے تیل کا ایک چولہا اور کچھ برتن وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ تین کنستر اور کچھ ڈبے بھی رکھے ہوئے تھے جن میں غالباً راشن تھا۔ ایک کونے میں لکڑی کی تین پیٹیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

وہ سات آدمی تھے جو چٹائیوں پر نیم دراز تھے یا بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کا اسلحہ بھی اُن کے قریب پڑا ہوا تھا۔ وہ سب ہمیں دیکھ کر اُٹھ گئے اور بڑی گرمجوشی سے ہم تینوں سے ہاتھ ملایا۔ میں نے کمانڈر فیض علی کو پہچان لیا۔ وہ صحت مند اور دراز قامت آدمی تھا۔ بال اور شیو بڑھا ہوا، آنکھوں میں سرخی تھی جیسے کئی راتوں سے نہ سویا ہو۔

کمانڈر فیض علی بھی کئی مرتبہ ہمارے گاؤں آ چکا تھا۔ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اُس نے مجھے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''تو مولوی رسول بخش لون کا بیٹا بھی ہماری صف میں شامل ہو گیا۔''

''ہاں بھئی...... اب یہ اس قابل ہو گیا ہے کہ دھرتی کے دشمنوں پر کاری ضرب لگا سکے۔'' کمانڈر رشید نے جواب دیا۔ ''ہمیں ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جن میں دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ ہو۔ اور اس میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ایک مجاہد میں ہونی چاہئیں۔

''ماشاء اللہ......'' کمانڈر فیض علی بولا۔

اپنے بارے میں کمانڈر رشید کی رائے جان کر جو خوشی ہوئی اس کا اندازہ صرف میں ہی لگا سکتا ہوں۔

ہم لوگ چٹائیوں پر بیٹھ گئے۔ یہ مجاہدوں کی زندگی تھی۔ یہاں نہ کوئی بستر تھا نہ کوئی دوسری آسائش۔ پتھریلا فرش ہی اُن کا بستر تھا۔ کمانڈر فیض علی نے ایک لڑکے کو اشارہ کیا اُس نے اُٹھ کر مٹی کے تیل والا چولہا جلایا اور کیتلی میں چائے کا پانی رکھ دیا۔ کیتلی دُھوئیں سے بالکل سیاہ ہو رہی تھی۔

کمانڈر رشید، فیض علی کو سرینگر کے حالات سے آگاہ کر رہا تھا۔ اور میں اُن کی باتوں سے اندازہ لگا رہا تھا کہ فیض علی نہ صرف سرینگر بلکہ وادی کے دوسرے علاقوں کے حالات سے بھی بخوبی واقف تھا۔ اُن دنوں اننت ناگ اور پہل گام کی طرف بھارتی فوجیوں اور مجاہدین میں کچھ جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ ان کے بارے میں اُسے پوری معلومات حاصل تھیں۔ کس جھڑپ میں بھارتیوں کا کتنا نقصان ہوا، کتنے فوجی مجاہدین کے ہاتھوں جہنم واصل ہوئے اور کتنے مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا۔

میں بڑے غور سے اُن کی باتیں سنتا رہا۔ اس دوران چائے بھی تیار ہو گئی۔ بغیر دودھ کا قہوہ بڑے ناپ تول سے بنایا گیا تھا اور بے حد خوش ذائقہ تھا۔

''ہاں...... اب بتاؤ! کیا صورتحال ہے؟ وہ فوجی کانوائے کس وقت پہنچ رہا ہے اور اس میں کیا کچھ شامل ہے؟'' کمانڈر رشید نے قہوے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

''گولہ بارود سے بھرے ہوئے چار ٹرک جن کی حفاظت کے لئے دو ٹرکوں پر مسلح فوجی بھی ہوں گے۔ ایک ٹرک آگے اور ایک پیچھے۔ اُن دونوں ٹرکوں پر لائٹ مشین گنیں فٹ ہوں گی۔'' کمانڈر فیض علی نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''پہلے اطلاع یہ تھی کہ یہ قافلہ آٹھ بجے یہاں سے گزرے گا لیکن اب تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ وہ قافلہ رات کو ٹھیک بارہ بجے سرینگر چھاؤنی سے روانہ ہو گا اور ایک بجے کے قریب اس جگہ سے گزرے گا۔ مصدقہ اطلاع ہے۔'' فیض علی نے جواب دیا۔ ''قافلے کے آگے پیچھے دو ٹرکوں پر چوبیس فوجی ہوں گے۔ بارہ آگے والے ٹرک پر اور بارہ پیچھے والے ٹرک پر۔''

''تم نے حملے کے لئے کون سی جگہ منتخب کی ہے؟'' کمانڈر رشید نے پوچھا۔

''یہاں سے چار میل آگے تقریباً ڈیڑھ سو گز طویل ایک تنگ سا راستہ ہے جس کے اختتام پر برساتی نالے کا پل ہے۔'' فیض علی نے جواب دیا۔ ''ہم اُس قافلے کو اُس راستے ہی میں گھیر لیں گے۔ اس طرح اُنہیں آگے یا پیچھے جانے کا موقع نہیں ملے گا۔''

''اچھا آئیڈیا ہے۔'' کمانڈر رشید نے سر ہلایا۔ ''لیکن کیا تمہارے پاس آدمی کم نہیں ہیں؟''

"آٹھ ہم لوگ ہیں اور تین آپ لوگ۔" فیض علی نے جواب دیا۔ "ہمارا ہر مجاہد دس دس بھارتی فوجیوں پر بھاری ہے۔ تم جانتے ہو ہم نفری کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔ جنگ کے لئے نفری سے زیادہ جذبے اور شوقِ شہادت کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمارا ہر مجاہد اس جذبے سے سرشار ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس وادی میں مٹھی بھر مجاہدوں نے اپنے سے کئی گناہ طاقتور دشمن کو خاک وخون میں لوٹایا ہے۔"

"جانتا ہوں میرے بھائی۔" کمانڈر رشید نے کہا۔ "یہ جذبہ جہاد اور آزادی کی لگن ہی تو ہمیں آگے بڑھا رہی ہے۔ اگر یہ لگن اور جذبہ نہ ہوتا تو تحریک بہت عرصہ پہلے دم توڑ چکی ہوتی۔ لیکن اب وہ وقت دُور نہیں جب ہم ان غاصبوں کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں گے۔"

"انشاءاللہ......" قریب بیٹھے ہوئے مجاہدین نے بیک زبان کہا۔

"آپ سب لوگ ایک بات سن لیں!" فیض علی نے مجاہدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کانوائے پر حملے کی منصوبہ بندی اس جگہ پر پہنچ کر کی جائے گی اور آپ سب لوگ کمانڈر رشید کے احکامات کے پابند ہوں گے اور اس مہم میں جام شہادت نوش کرنے والا ہم میں سب سے زیادہ خوش نصیب ہوگا۔" وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہوا پھر بولا۔ "ایک بات آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ جنگ ہم اپنے کسی ذاتی مفاد کے لئے نہیں لڑ رہے۔ ہم آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ زنجیریں توڑ دینا چاہتے ہیں جن میں ہمیں برسوں سے جکڑ کر رکھا گیا ہے۔ ہم آزاد پیدا ہوئے ہیں اور آزاد رہیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں غلام نہیں بنا سکتی۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اُس کی نظریں مجاہدین کے چہروں پر پھسل رہی تھیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اُس کی آواز میری سماعت سے ٹکرانے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ہندو بنیئے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ طاقت کے بل بوتے پر ہمیں اپنا غلام بنا لیں گے۔ ہماری قوم پر ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ بچوں اور بوڑھوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، نوجوانوں کو گولیوں سے چھلنی کیا جا رہا ہے اور ہماری ماؤں اور بہنوں کی عصمتیں تار تار کی جا رہی ہیں۔ لیکن اب یہ سب کچھ نہیں ہونے دیا جائے گا۔ ماؤں اور بہنوں کے دوپٹوں کی طرف اُٹھنے والا ہر ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ہمارے نوجوان اپنے سے کئی گناہ زیادہ طاقتور دشمن کے سامنے سینہ سپر ہو رہے ہیں۔ نفری اور سامان کے حوالے سے ہمارا اُن کا کوئی مقابلہ نہیں لیکن ہمارے پاس جہاد کا جذبہ ہے۔ شوقِ شہادت ہے اور آزادی کی لگن ہے۔ یہی ہمارے وہ ہتھیار ہیں جن کا دشمن مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسی جذبے نے ہمیں پہلے بھی کامیابیاں بخشی ہیں اور آج بھی ہم کامیاب وکامران ہوں گے۔ انشاءاللہ۔"

"انشاءاللہ......!" میرے منہ سے بھی بے اختیار نکلا۔

"ایک بات اور۔" کمانڈر رفیق علی بولا۔ "اس کارروائی کے بعد کم از کم ایک ہفتے تک کوئی اس طرف کا رُخ نہیں کرے گا۔ یہ غار ہمارے چند محفوظ ترین ٹھکانوں میں سے ایک ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ دشمنوں کی نظروں میں آ جائے۔ کارروائی کی تکمیل کے بعد سب لوگ مختلف علاقوں میں نکل جائیں گے اور آج سے ٹھیک آٹھویں دن ہم یہاں جمع ہوں گے۔"

سب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ غار کے کونے میں رکھی ہوئی وہ تینوں پیٹیاں کھول لی گئیں۔ اُن میں ایمونیشن بھرا ہوا تھا۔ فیض علی مجاہدین میں ایمونیشن اور دستی بم تقسیم کرنے لگا۔

کمانڈر رشید نے ایک بیلٹ میری کمر پر باندھ دیا۔ اُس نے پہلے ایک سب مشین گن اُٹھائی اور مجھے اُس کے استعمال کا طریقہ سمجھانے لگا۔ سب مشین گن میرے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ پھر وہ ایک دستی بم اُٹھا کر مجھے سمجھانے لگا۔

"تمہارا ہاتھ اس پتری کے اُوپر ہونا چاہئے۔" اُس نے ہینڈ گرنیڈ پر اُوپر سے نیچے کی طرف لگی ہوئی ایک فولادی پتری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "گرفت بہت مضبوط ہونی چاہئے۔ یہ پن کھینچنے کے بعد گرفت ڈھیلی ہوئی تو بم تمہارے ہاتھ میں ہی پھٹ جائے گا اور تمہارے پرخچے اُڑ جائیں گے۔" وہ صحیح پن کھینچنے اور بم پھینکنے کا طریقہ سمجھانے لگا۔

مجھے دو ہینڈ گرنیڈ دیئے گئے تھے جو میں نے بیلٹ کے ہکوں میں اڑس لئے۔ سب مشین گن لوڈ تھی، چار فاضل میگزین بھی مجھے دے دیئے گئے۔ مجاہدین روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔ سب سے آخر میں غار سے نکلنے والے مجاہد نے اسپرٹ لیمپ بجھا دیا تھا۔ میں جتنی دیر تک غار میں بیٹھا رہا اُن مجاہدین کی شکلیں دیکھتا رہا تھا۔ کمانڈر رفیق علی کی عمر تینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی جبکہ دوسروں میں سے کسی کی عمر بھی چوبیس پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک لڑکا میرا تقریباً ہم عمر تھا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اور میں بھی اُس سے کچھ بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ دو سال سے چھاپہ مار کارروائیوں میں حصہ لے رہا تھا اور مجھے اپنے پچھلے کارناموں کے بارے میں بتا رہا تھا۔

راستہ بہت ہی کٹھن اور دُشوار تھا۔ ہم تقریباً تین گھنٹے تک چلتے رہے۔ فاصلہ اگرچہ زیادہ نہیں تھا لیکن ہم پہاڑیوں میں طویل چکر کاٹتے ہوئے چل رہے تھے اور بالآخر اُس جگہ پہنچ گئے جو کمانڈر رفیق علی نے فوجی قافلے پر حملے کے لئے منتخب کی تھی۔

کسی قافلے کو گھیرنے کے لئے یہ واقعی بہت آئیڈیل اور لاجواب جگہ تھی۔ وہ تنگ سا راستہ تقریباً ڈیڑھ سو گز طویل تھا۔

کمانڈر رشید اور فیض علی کچھ دیر تک اُس راستے، اُس کے گردونواح کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر کمانڈر رشید مجاہدین کو مختلف جگہوں پر تعینات کرنے لگا۔ کچھ مجاہدین کو سڑک کے دوسری طرف بھیج دیا گیا تھا۔ دو لڑکوں کو راستے کے اختتام پر برساتی نالے کے پل کے دونوں طرف تعینات کر دیا گیا تھا۔ جبکہ دو مجاہدین نے راستے کے دوسری طرف پوزیشنیں سنبھال لیں تاکہ واپسی کا راستہ بھی مسدود کیا جا سکے۔

راستے کو پوری طرح گھیرے میں لے لیا گیا تھا۔ قافلے کے اس راستے میں داخل ہونے کے بعد کسی کے زندہ بچ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تمام مجاہدین کو سختی سے یہ ہدایت کر دی گئی

تھی کہ جب تک کمانڈر رشید سگنل نہ دے کوئی بھی فائر نہ کھولے۔ میں کمانڈر رشید کے ساتھ تھا۔ ہم نے بیٹھنے کے لئے سڑک سے تقریباً آٹھ فٹ اُوپر پتھروں میں ایسی جگہ منتخب کی تھی کہ اگر سڑک پر سے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپ کی روشنی بھی پڑ جاتی تو ہم نظروں میں نہیں آسکتے تھے۔

ہمارے چاروں طرف گہری تاریکی اور سناٹا تھا۔ کمانڈر رشید تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُچک کر سڑک کی طرف دیکھ لیتا تھا۔

تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا اور پل پر کسی گاڑی کے انجن کی مدھم سی آواز سن کر میں چونک گیا۔ کمانڈر رشید نے بھی یہ آواز سن لی تھی۔ وہ ایک بار پھر اُچک کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ ایک سے زیادہ گاڑیوں کی آوازیں تھیں جو کبھی تو قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوتیں اور کبھی ہوا کے دوش پر بہت دُور چلی جاتیں۔ اور پھر بہت دُور متحرک روشنیاں دکھائی دینے لگیں...... اُس طرف سڑک غالباً بل کھائی ہوئی تھی جس کی وجہ سے روشنیوں کے زاویئے بھی بار بار بدل رہے تھے۔ میں پوزیشن لے کر بیٹھ گیا اور سب مشین گن کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ وہ روشنیاں بتدریج قریب آتی جا رہی تھی۔ اُس وقت مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ سنسنی کی لہریں پورے بدن پر برقی رو کی طرح دوڑ رہی تھیں۔ رائفل پر میری گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی...... کمانڈر رشید نے میری طرف دیکھا، میرا کندھا تھپتھپایا اور مجھ سے چند گز دُور چلا گیا۔

روشنیاں قریب آتی جا رہی تھیں۔ اور پھر یہ قافلے کا پہلا ٹرک راستے میں داخل ہو گیا۔ پچھلے ٹرک کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں ایک ٹرک پر سوار بھارتی فوجی صاف نظر آ رہے تھے۔ ایک لائٹ مشین گن ٹرک کے سامنے کے رُخ پر نصب تھی، ایک دائیں اور ایک بائیں طرف۔ گن مین مستعد کھڑے تھے۔ باقی فوجی بھی سب مشین گنیں سنبھالے چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔

پچھلے چار ٹرکوں پر ترپالیں پڑی ہوئی تھیں۔ سب سے آخر والے ٹرک پر بھی اُسی طرح چاروں طرف لائٹ مشین گنیں فٹ تھیں۔ پہلا ٹرک راستے کے اختتام کی طرف بڑھ رہا تھا کہ آخری ٹرک بھی راستے میں داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی کمانڈر رشید کی چنگھاڑتی ہوئی آواز فضا میں گونج اُٹھی۔

''فائر......''

فضا ایک دم فائرنگ اور دھماکوں کی آواز سے گونج اُٹھی...... کانوائے کے ٹرکوں پر چاروں طرف سے آگ برسنے لگی۔ برساتی نالے کے پل کے ساتھ تعینات مجاہدین کی فائرنگ سے قافلے کے اگلے ٹرک کے ٹائر دھماکوں سے پھٹ گئے۔ وہ ٹرک لڑکھڑایا اور پیچھے آنے والے ٹرک ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے......

ہماری طرف سے اچانک فائرنگ شروع ہوتے ہی ٹرکوں کے ڈرائیور گڑبڑا گئے تھے۔ ٹرک بے قابو ہو کر ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے تو ٹرکوں پر سوار فوجی بھی اس اچانک افتاد پر بدحواس

ہو گئے۔ مجاہدین کی طرف سے اس قسم کی کوئی کارروائی اُن کے لئے غیر متوقع نہیں رہی ہو گی۔ وہ یقیناً بہت محتاط تھے مگر ہمارا یہ حملہ اس قدر اچانک تھا کہ اُنہیں فوری طور پر سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور جب وہ سنبھلے تو اُن کے کئی ساتھی جہنم رسید ہو چکے تھے۔

میں سینے کے بل لیٹا ہوا تھا۔ رائفل پر میری گرفت بہت مضبوط تھی۔ میں نے ٹرائیگر دبا دیا...... تڑتڑاہٹ کی آواز میرے کانوں کے قریب گونجتی چلی گئی۔ میری رائفل سے نکلنے والے انگارے ٹرکوں کی طرف لپک رہے تھے۔ ایک ٹرک کا ڈرائیور نیچے اُترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے رائفل کا رُخ اُس طرف موڑ دیا کئی گولیاں اُس کے جسم میں پیوست ہو گئی تھیں...... وہ ٹرک کے کھلے ہوئے دروازے سے قلابازی کھاتا ہوا نیچے گرا اور خاک و خون میں لوٹنے لگا۔

وہ میرا پہلا شکار تھا۔ اس پہلی کامیابی پر میرا دل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگا۔

ٹرکوں پر نصب مشین گنیں بھی اب لڑکھڑا رہی تھیں۔ کئی گولیاں میرے سر کے اُوپر سے گزرتی ہوئی چٹان میں لگ رہی تھیں۔ پتھر کے ٹکڑے اُڑ اُڑ کر میرے اُوپر گر رہے تھے۔

کمانڈر رشید فائرنگ کرتا ہوا مجھ سے کئی گز دُور نکل گیا تھا۔ میں اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔ بھارتی فوجی اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ایک گنر نے میری پوزیشن کا اندازہ لگا کر اپنی گن کا رُخ اس طرف موڑ دیا اور لاتعداد گولیاں میرے پاس بڑے پتھروں پر لگنے لگیں۔ پتھر کا ایک اُڑتا ہوا ٹکڑا بائیں کندھے سے ذرا نیچے میرے بازو پر لگا۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں نے اُس ہاتھ سے اپنا زخمی بازو تھام لیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید گولی لگی ہے۔ لیکن اگر گولی لگتی تو میرا بازو حرکت کے قابل نہ رہتا۔ گولیاں اب بھی میرے چاروں طرف برس رہی تھیں۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ دل کی دھڑکن قابو سے باہر ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اُٹھ کر یہاں سے بھاگ جاؤں۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تو میرا جسم گولیوں سے چھلنی ہو جائے گا۔

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ہر طرف فضا میں انگارے سے ناچتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں نے کمانڈر رشید کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے ایک بار پھر قدرے زور سے پکارا۔ میری آواز حلق میں اٹکی ہوئی سی تھی لیکن اس مرتبہ مجھے مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ کمانڈر رشید کی چیختی ہوئی آواز چند گز کے فاصلے سے سنائی دی۔ ''ٹھہرو...... ری ٹریٹ۔'' وہ چیختے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''پیچھے ہٹتے جاؤ! اُوپر جانے کی کوشش کرو!''

میں نے رائفل سنبھال لی اور رینگتا ہوا آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اب مجھے پتہ چلا تھا کہ جنگ کا محاذ کیا ہوتا ہے اور ہمارے مجاہدین کس طرح اپنی زندگیاں داؤ پر لگا کر آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں؟ اب مجھے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ آزادی کس طرح حاصل کی جاتی ہے۔ اس کے لئے خون بہانا پڑتا ہے۔ نسلیں قربان کرنی پڑتی ہیں۔

میں سینے کے بل رینگتا ہوا پتھروں کی آڑ میں تقریباً دس گز پیچھے چلا گیا۔ اب آگے ایسی جگہ تھی کہ کھڑے ہونا ضروری تھا۔ اور جیسے ہی میں نے اپنی جگہ سے اُٹھنے کی کوشش کی ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے کان کے قریب سے گزر گئی۔ میں ایک دم نیچے گر گیا۔ میرا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا تھا۔ موت مجھ سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی تھی لیکن میں اب بھی محفوظ نہیں تھا۔

دفعتاً ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا...... ہمارے کسی مجاہد نے ہینڈ گرنیڈ پھینکا جو ایک ٹرک کے قریب سڑک پر گر کر پھٹا لیکن وہ بم ٹرک کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکا تھا۔ مجھے بھی دستی بم کا خیال آ گیا۔ میرے پاس دو دستی بم تھے۔ میں نے ایک بم بیلٹ سے نکال لیا، رائفل کو زمین پر رکھ دیا۔ سیدھے ہاتھ میں بم کو مضبوطی سے گرفت میں لیا۔ اُلٹے ہاتھ کی اُنگلی پن کے رنگ میں ڈال کر اُسے ایک جھٹکے سے باہر کھینچا۔ بم پر میری گرفت اور مضبوط ہو گئی تھی۔ میرے جسم کے مسام بڑی تیزی سے پسینہ اُگل رہے تھے۔ پھر میں نے بم کو پوری قوت سے ایک ٹرک کی طرف اُچھال دیا...... فولادی پتری کے بم سے الگ ہونے سے ایک آواز اُبھری۔ میں دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر نیچے جھک گیا اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی ایک زوردار دھماکہ ہوا...... اس دھماکے میں کئی انسانی چیخیں بھی شامل تھیں۔

میرا پھینکا ہوا ہینڈ گرنیڈ اُس ٹرک پر گرا تھا جس پر مشین گنیں فٹ تھیں۔ میرے بم نے نہ صرف اُن کی مشین گنیں خاموش کرا دیں بلکہ اُس ٹرک میں موجود فوجیوں کے بھی چیتھڑے اُڑا دیئے۔ میں نے اپنی رائفل اُٹھائی اور پہاڑی پر اُوپر کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ اور پھر ایک اور زوردار دھماکہ ہوا...... اور پھر یوں لگا جیسے اُس جگہ پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو...... پے در پے دھماکے ہونے لگے...... دھرتی کانپ اُٹھی۔

میں لڑکھڑا کر گرا، لیکن دوسرے ہی لمحہ سنبھل کر چٹانوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ گولہ بارود سے لدے ہوئے چاروں ٹرک دھماکوں سے پھٹ پڑے تھے۔ ٹرکوں پر لدے ہوئے گولہ بارود آتش بازی کی طرح پھٹ کر چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ راکٹ چل رہے تھے...... آگ کے شعلے چاروں طرف اُترتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

میں ایک چٹان نما پتھر کی آڑ میں رُک کر نیچے دیکھنے لگا۔ بہت دُور کئی روشنیاں متحرک نظر آئیں۔ گولہ بارود سے لدے ہوئے یہ ٹرک اُس طرف سے آئے تھے۔

''شمروز! کہاں ہو تم؟'' چند قدم کے فاصلہ پر کمانڈر رشید کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

''میں یہاں ہوں کمانڈر!'' میں نے بھی چیخ کر جواب دیا۔

چند سینڈ بعد ہی کمانڈر رشید دوڑتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا۔

''بھاگو شمروز!'' وہ چیخا۔ ''اس طرف......''

پے در پے دھماکے بدستور ہو رہے تھے۔ آسمان پر بھی شعلے پھیلتے جا رہے تھے پہاڑیوں لرز رہی تھیں...... میرے اُوپر کچھ ایسی دہشت سی طاری ہوئی تھی کہ مجھ سے دوڑا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اور پھر کمانڈر رشید نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا اُس کے ساتھ دوڑتا رہا۔

''بھارتی فوجیوں کا ایک اور کانوائے سرینگر کی طرف سے آ رہا ہے۔'' کمانڈر رشید دوڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''اُس کانوائے میں گولہ بارود کا کوئی ٹرک نہیں ہو گا۔ صرف فوجی ہوں گے۔ رات کو تو وہ کچھ نہیں کر سکیں گے مگر صبح کی روشنی ہوتے ہی چاروں طرف پھیل جائیں گے۔ اُس وقت تک ہمیں یہاں سے بہت دُور نکل جانا ہو گا۔''

''اور ہمارے دوسرے ساتھی کمانڈر!'' میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''وہ لوگ نکل جائیں گے۔ تم اُن کی فکر مت کرو!'' کمانڈر رشید نے کہا۔

دھماکے بدستور ہو رہے تھے۔ چار ٹرکوں میں بھرا ہوا گولہ بارود پھٹ رہا تھا۔ آسمان پر پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ اور پھر ایک فائر کی آواز سنائی دی جو اُن دھماکوں سے مختلف تھی۔ میں نے مُڑ کر دیکھا ایک گولی روشنی کی لکیر سی چھوڑتی ہوئی بلندیوں کی طرف جا رہی تھی۔ اور پھر وہ گولی بہت اُوپر جا کر پھٹ گئی۔ میرا خیال تھا کہ چنگاریاں سی پھوٹیں گی اور پھر تاریکی چھا جائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

وہ لائٹ فائر تھا۔ زرد روشنی کا ایک پنڈولہ سا جو آسمان پر تیرنے لگا تھا۔ روشنی کافی تیز تھی۔ آس پاس کی پہاڑیاں روشن ہو گئیں اور پھر فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بعد میں آنے والے بھارتی فوجی لائٹ فائر کی روشنی میں آٹومیٹک ہتھیاروں سے فائرنگ کرتے ہوئے پہاڑیوں پر چڑھ رہے تھے۔

مگر کمانڈر رشید کا یہ خیال درست ثابت ہوا کہ بھارتی فوجی رات کے وقت کچھ نہیں کر سکیں گے۔ فائرنگ ایک ہی جگہ پر محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ بزدل بھارتیوں نے پہاڑیوں میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں کمانڈر رشید کے ساتھ دوڑتا رہا۔ اب اُس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور میں اُس سے چند گز پیچھے رہ گیا تھا۔ ایک گھنٹے تک مسلسل دوڑتے رہنے سے میرا سانس پھول گیا اور قدم لڑکھڑانے لگے۔ میں کمانڈر رشید کا ساتھ دینے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے ایک پتھر سے ٹھوکر لگی۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور دھڑام سے پتھروں پر گرا......

میرے گرنے کی آواز سن کر کمانڈر رشید رُک گیا۔ اُس نے پہلے مُڑ کر دیکھا اور تیز قدم اُٹھاتا ہوا میرے قریب آ گیا۔

''کیا ہوا شمروز؟'' وہ مجھے اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''اب مجھ سے بالکل نہیں چلا جاتا کمانڈر!'' میں نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ ''چند منٹ...... صرف چند منٹ یہاں رُک جاؤ!''

''یہاں نہیں......'' کمانڈر رشید نے جواب دیا۔ ''یہاں سے کچھ آگے ایک چشمہ ہے۔ ہم

وہاں تھوڑی دیر کے لئے رُک جائیں گے۔''

مگر میری ٹانگوں میں تو کھڑے رہنے کی بھی طاقت نہیں رہی تھی۔ چلنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری یہ حالت دیکھ کر کمانڈر رشید کو چند منٹ وہاں رُکنا پڑا اور وہ بھی ایک پتھر پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ مسلسل بھاگتے رہنے سے میرے پھیپھڑے جیسے پھٹے جا رہے تھے۔ سینے میں درد ہونے لگا تھا۔ منہ سے کف بہہ رہا تھا...... میں تقریباً پانچ منٹ تک بے سدھ سا پڑا گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔

میری حالت کسی قدر سنبھلی تو میں نے آستین کے ساتھ منہ سے بہنے والا کف صاف کیا اور رائفل سنبھالتے ہوئے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کمانڈر رشید نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور ہم ایک بار پھر چلنے لگے۔

وہ چشمہ تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ دُور دُور تک چنار کے درخت تھے۔ چشمہ کے آس پاس کچھ پھل دار درخت بھی تھے لیکن رات کی تاریکی میں اُن درختوں کی شناخت ممکن نہیں تھی۔ چشمے کے کنارے پر بیٹھ کر میں نے پہلے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور پھر جی بھر کے پانی پیا اور ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

کمانڈر رشید چشمہ کے کنارے پر بیٹھا منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ رات کا آخری پہر تھا۔ سبزے کی وجہ سے خنکی بڑھ گئی تھی۔ مجھے کچھ ٹھنڈ سی لگنے لگی۔

''بیٹھے رہو گے تو سردی لگے گی...... چلتے رہو گے تو خون میں کچھ گرمی پیدا ہو گی۔'' کمانڈر رشید نے کہا۔ میں اُس کا مطلب سمجھ گیا اور اُٹھ کر اُس کے ساتھ چلنے لگا۔

دو گھنٹوں تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد ہم نشیب میں پھیلی ہوئی ایک وادی میں نکل آئے۔ تھوڑی دیر کے لئے ایک جگہ پر رُکے اور پھر چلنے لگے۔

ایک بڑی خوشگوار سی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ہمارے آس پاس دھان کے کھیت ہیں۔ جس کا مطلب تھا کہ کوئی آبادی بھی قریب ہی تھی۔

مگر ڈیڑھ گھنٹے تک مزید چلتے رہنے کے بعد بھی کسی آبادی کے آثار دکھائی نہیں دیئے۔ ہم رُکے بغیر چلتے رہے۔

صبح کا اُجالا پھیلنے لگا۔ اب کچھ فاصلے کی چیزیں دکھائی دینے لگیں۔ روشنی نمایاں ہوتی گئی۔ ہمارے چاروں طرف دھان کے کھیت تھے اور اُن کھیتوں میں کہیں کہیں درخت بھی کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔

سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ بہت دُور ایک جگہ سے دُھوئیں کی سرمئی لکیر سی اُٹھتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ میں نے کمانڈر رشید کو اُس کی طرف متوجہ کیا تو وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''وہی ہماری منزل ہے......''

''میں سمجھا نہیں......؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے کمانڈر رشید کی طرف دیکھا۔

''اُس پہاڑی کے پیچھے ایک مکان ہے۔ اور وہ مکان ہی ہماری منزل ہے۔'' کمانڈر رشید نے جواب دیا۔

اُس منزل تک پہنچنے کے لئے ہمیں مزید ایک میل کا فاصلہ طے کرنا پڑا۔ وہ پہاڑی ایک ٹیلے کی طرح تھی جیسے کوئی بہت بڑا پیالہ اوندھا کر کے رکھ دیا گیا ہو۔ اس کے دوسری طرف ڈھلان پر لکڑی کا ایک مکان بنا ہوا تھا۔ اُس سے ذرا ہٹ کر بہت بڑی جگہ کانٹے دار جھاڑیوں کی باڑ سے گھری ہوئی تھی، جس کے ایک حصے میں دو خچر اور ایک گائے بندھی ہوئی تھی۔ جبکہ دوسرے حصے میں لاتعداد بھیڑیں اور چند بکریاں نظر آ رہی تھیں۔

مکان کے آس پاس اخروٹ اور خوبانی کے چند درخت تھے۔ اخروٹ کے درخت کے نیچے ایک گدھا بھی بندھا ہوا تھا۔ مکان دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصہ سنگل تھا اور دوسرا ڈبل سٹوری۔ سنگل حصے کی چھت پر ایک جگہ چمنی سے دُھواں خارج ہو رہا تھا۔

ہم جیسے ہی آگے بڑھے پتہ نہیں کہاں سے ایک کتا نکل کر خونخوار انداز میں بھونکتا ہوا ہماری طرف لپکا۔ میں ایک دم گھبرا سا گیا۔ وہ خاصا قد آور کتا تھا اور دیکھنے میں بھی بڑا خوفناک اور خونخوار لگ رہا تھا۔

کمانڈر رشید کتے سے بالکل خوفزدہ نہیں ہوا، اُس نے ٹائیگر کہہ کر کتے کو پکارا، کتے نے بھونکنا بند کر دیا اور کمانڈر رشید کے قریب پہنچ کر اُس کے آگے پیچھے دُم ہلانے لگا۔ البتہ میری طرف دیکھ کر وہ اب بھی ہولے ہولے غرانے لگتا تھا۔

مکان کا دروازہ دوسری طرف تھا۔ اُس طرف عقبی کھڑکیاں تھیں۔ کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر اندر سے کسی نے کھڑکی کھول کر جھانکا اور پھر کھڑکی بند ہو گئی۔

ہم مکان کے دوسری طرف آ گئے۔ ایک طرف مکان سے کچھ فاصلے پر بہت بڑا شیڈ بنا ہوا تھا جس میں بھوسے کی بوریاں اور کھیتی باڑی میں استعمال ہونے والے آلات رکھے ہوئے تھے۔ میں اُس شیڈ کی طرف دیکھ رہا تھا کہ بوڑھا مکان سے نکل کر باہر آ گیا۔ اُس کی عمر ساٹھ سے کچھ اُوپر ہی ہو گی۔ سفید نوک دار داڑھی، سر کے بال بھی برف کی طرح سفید تھے جو سیاہ کپڑے کی ٹوپی سے جھانک رہے تھے۔

اُس بوڑھے نے بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں اندر لے گیا۔ اندر ایک ادھیڑ عمر عورت نے ہمارا استقبال کیا۔ اُس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہو گی۔ ڈھیلا ڈھالا سا لباس پہن رکھا تھا، سر پر سیاہ رنگ کا ایک تکونا اسکارف بندھا ہوا تھا۔ عمر سے قطع نظر جسمانی طور پر وہ خاصی پُرکشش تھی۔

وہ ہمیں اُس مکان کے ایک ایسے کمرے میں لے آئے جہاں فرش پر بھیڑ کے بالوں سے بنے گدے بچھے ہوئے تھے۔ ایک طرف سات آٹھ سال کا ایک بچہ سو رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔

ایک طرف آتش دان میں آگ روشن تھی۔قریب ہی چائے کی ایک کیتلی رکھی ہوئی تھی اور پیالوں میں چائے بھی موجود تھی۔میرا خیال ہے وہ دونوں ہمارے آنے سے پہلے چائے پی رہے تھے۔ ہم اُن کے ساتھ آتش دان کے سامنے گدے پر بیٹھ گئے۔عورت نے ہمارے سامنے پیالیاں رکھ کر اُن میں چائے اُنڈیل دی۔

ہمارا یہاں جس طرح استقبال ہوا تھا اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ کمانڈر رشید اُن لوگوں کے لئے اجنبی نہیں تھا۔کمانڈر رشید نے میرا بھی اُن سے تعارف کرا دیا اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ بوڑھا میرے والد مولوی رسول بخش کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

''بہت عرصہ ہو گیا رسول بخش سے ملے ہوئے۔'' اُس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اب تو بوڑھا ہو گیا ہو گا میری طرح۔''

''جی ہاں......آپ نے ٹھیک کہا۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہم نے نویں اور دسویں جماعتیں سرینگر کے مسلم ہائی سکول میں اکٹھے ہی پڑھی تھیں۔'' بوڑھے نے کہا۔''اس کے بعد میں دِلّی چلا گیا اور وہ سوپور کا ہو کر رہ گیا۔میرا خیال تھا کہ میں دِلّی میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کروں گا لیکن یہاں ایک حادثے میں میرے والد کا انتقال ہو گیا اور مجھے واپس آنا پڑا۔اس کے بعد بھی رسول بخش سے چند ملاقاتیں ہوئی تھیں۔مگر اب تو کئی برسوں سے ہم نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔''

وہ عبدالغنی تھا۔دیر تک پرانے وقتوں کی یادیں تازہ کرتا رہا۔

''جب ہندوستان اور پاکستان کا بٹوارہ ہوا تو میں تمہاری عمر کا تھا'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔''کشمیری مسلمان پاکستان سے الحاق کرنا چاہتے تھے۔مگر مہاراجہ گلاب سنگھ تو کشمیر کا سودا پہلے ہی کر چکا تھا۔اگر کشمیر کے مسلمانوں میں اُس وقت اتحاد ہوتا تو آج کشمیر اور جموں بھی پاکستان کا حصہ ہوتا۔مگر بعض کشمیری لیڈر ہی غدار نکلے۔اپنے ذاتی مفاد اور اقتدار کے لئے وہ ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے لگاتے اور ہندو لیڈروں کی چاپلوسی کرتے رہے۔اُن کشمیری مسلمان لیڈروں کی غداری کی وجہ سے آج یہ وادی جل رہی ہے۔یہ تو نسل در نسل غدار ہیں۔ان کی اولاد آج بھی اپنے اقتدار کے لئے ہندوؤں کی غلامی کر رہی ہے۔وہ کشمیر کے سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔مگر کشمیری اب بیدار ہو چکے ہیں۔اب وہ کسی فریب میں نہیں آئیں گے۔اب تو آزادی سے کم کسی بات پر سمجھوتہ نہیں ہو گا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم جیسے نوجوان آزادی کی اس تحریک میں شامل ہیں۔جذبہ زندہ ہو تو منزل تک پہنچنا مشکل نہیں ہوتا۔''

عبدالغنی کے بارے میں انکشاف ہوا کہ وہ خود بھی ماضی میں تحریک آزادی کا سرگرم کارکن رہ چکا ہے۔اُس کے جسم پر زخموں کے کئی نشان تھے۔تحریک کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہوئے وہ کئی مرتبہ پکڑا گیا تھا۔بے پناہ تشدد برداشت کیا تھا مگر اپنے کاز سے غداری نہیں کی تھی۔

عبدالغنی میں بھاگ دوڑ کی سکت نہ رہی تو اُس نے اپنے دو جوان بیٹے تحریک کے سپرد کر دیئے۔دونوں کئی برسوں تک بھارتی بھیڑیوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔چند سال پہلے بڑا بیٹا ایک چھاپہ مار کارروائی میں شہادت کے رتبے پر فائز ہوا اور تین سال پہلے چھوٹا بیٹا بھی ایسی ہی ایک کارروائی میں وطن کی آن پر قربان ہو گیا۔

سکینہ عبدالغنی کی بہو تھی۔اور بستر پر گہری نیند سویا ہوا چھ سات سال کی عمر کا وہ بچہ اُس کا پوتا تھا۔عبدالغنی بڑی بے چینی سے اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب اپنے پوتے کے ہاتھ میں بندوق تھما کر بھارتی غاصبوں کے گندے وجود سے اس دھرتی کو پاک کرنے کے لئے اپنی دُعاؤں کے سائے میں رخصت کر سکے۔

چائے پینے کے تھوڑی دیر بعد سکینہ نے ناشتہ بنا دیا۔اس دوران وہ بچہ بھی جاگ گیا تھا۔ سکینہ اُسے اُٹھا کر باہر لے گئی، وہ پندرہ منٹ بعد اُسے منہ دُھلا کر واپس لے آئی۔عبدالغفور نام کا وہ بچہ کمانڈر رشید سے بھی خاصا بے تکلف تھا۔وہ اُس کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا۔

رات بھر جاگنے اور بھاگ دوڑ میں بری طرح تھک گیا تھا۔نیند کے جھونکے آ رہے تھے مگر میں بڑی مشکل سے آنکھیں کھولے بیٹھا تھا۔

یہ میری زندگی کا خوفناک ترین تجربہ تھا۔مجاہدین اور بھارتی فوجیوں کی جھڑپوں کے بارے میں تو آئے دن سنتا ہی رہتا تھا۔یہ بھی پتہ چلتا رہتا تھا کہ کس جھڑپ میں کتنے بھارتی فوجی مجاہدین کے ہاتھوں جہنم واصل ہوئے اور کتنے مجاہدین شہید ہوئے اور گزشتہ رات میں خود ایک ایسی چھاپہ مار کارروائی میں شریک تھا جس کے بارے میں خبر وادی میں پھیل گئی ہو گی۔

ہم نے بھارتی فوج کے اُس قافلے کو مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا۔گولہ بارود کے لدے ہوئے چار ٹرک تباہ ہوئے تھے اور کم از کم چوبیس فوجی تھے جو سب کے سب ختم ہو گئے تھے۔ممکن ہے ایک دو فوجی بچ بھی گئے ہوں۔

میں اپنے آپ میں فخر و انبساط کی ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔اس قسم کی کسی چھاپہ مار کارروائی میں حصہ لینے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔میرے چاروں طرف موت برس رہی تھی اور میں نے کسی بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ٹرک ڈرائیور پہلا بھارتی فوجی تھا جو میری گولیوں کا نشانہ بنا تھا اور پھر میرے پھینکے ہوئے ہینڈ گرنیڈ نے ٹرک سے مجاہدین پر فائرنگ کرنے والے کئی فوجیوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔

''تمہیں نیند آ رہی ہے۔'' سکینہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔''میرے ساتھ اُوپر آؤ! اُوپر کمرہ خالی ہے۔آرام سے سو جانا۔''

میں نے کمانڈر رشید کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر سکینہ کے ساتھ چل پڑا۔ میں نے اپنی رائفل بھی اُٹھا لی تھی۔اُوپر جانے کے لئے سیڑھیاں مکان کے اندر ہی سے تھیں۔سکینہ مجھے جس کمرے میں لے کر آئی اُس کی کھڑکیاں مشرق کی طرف تھیں جو کھلی ہوئی تھیں اور باہر دُھوپ

چمک رہی تھی۔ میں بہت تھکا ہوا تھا۔ بستر پر گرتے ہی سو گیا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر تک سویا ہوں گا کہ سکینہ نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔

''اُٹھو...... جلدی کرو!'' وہ مجھے بازو سے پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے چیخی۔ ''وہ درندے اِس طرف آ رہے ہیں۔''

میں ایک جھٹکے سے اُٹھ گیا۔ کھڑکی کے باہر دیکھا تو بہت دُور ایک ٹیلے کی ڈھلان سے دھول اُڑتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ دو جیپیں تھیں جو دھول اُڑاتی ہوئی ٹیلے کی ڈھلان سے اُتر رہی تھیں۔ میرے خیال میں فاصلہ نصف میل سے کچھ زیادہ ہی تھا۔

میں نے جلدی سے اپنے جوتے پیروں میں پھنسائے، بیلٹ اُٹھا کر کمر سے باندھا اور رائفل اُٹھاتے ہوئے سکینہ کے ساتھ دروازے کی طرف لپکا اور تیزی سے سیڑھیاں اُترنے لگا۔

جب ہم مکان سے باہر نکلے تو کمانڈر رشید اور بوڑھا عبدالغنی سامنے والے شیڈ میں ایک جگہ رکھی ہوئی بھوسے کی بوریاں ہٹا رہے تھے۔ سکینہ بھی اُن کی مدد کرنے لگی۔ میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

بھوسے کی بوریوں کے نیچے ایک تختہ تھا جسے عبدالغنی اور کمانڈر رشید نے ہٹا دیا۔ اُس تختے کے نیچے تنگ سی سیڑھیاں تھیں۔ پہلے میں نیچے اُترا اور پھر کمانڈر رشید اندر آ گیا۔ عبدالغنی نے تختہ اُوپر رکھ دیا اور پھر شاید وہ اور سکینہ بھوسے کی بوریاں تختے کے اُوپر رکھنے لگے۔

تہہ خانہ بہت بڑا تھا اور یہ جگہ بھی کمانڈر رشید کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ کیونکہ سیڑھیوں سے اُترتے ہی اُس نے ایک طرف رکھی ہوئی لالٹین جلا لی تھی۔ ہم دونوں تہہ خانے کے آخری حصے میں چلے آئے۔ یہاں اسلحے سے بھری ہوئی سات آٹھ پیٹیاں دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہم دونوں ایک بار پھر سیڑھیوں کے قریب آ کر کھڑے ہوئے۔ رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں تیار تھیں۔

کمانڈر رشید کے کہنے کے مطابق یہ تہہ خانہ اگرچہ محفوظ تھا لیکن میں سمجھتا تھا کہ اگر بھارتی فوجیوں کو اس کا پتہ چل گیا تو یہ ہمارے لئے چوہے دان ثابت ہو گا۔

بند ہونے کے باوجود اس تہہ خانے میں گھٹن کا احساس نہیں تھا۔ کہیں نہ کہیں ہوا کی آمد و رفت کا راستہ ضرور تھا۔

تقریباً دو گھنٹے گزر گئے۔ باہر کی کوئی آواز ہمیں سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ اُوپر کیا ہو رہا ہے؟ اور پھر اپنے سروں پر آہٹ سن کر ہم چونک گئے۔ ہم دونوں نے سیڑھیوں کے دونوں طرف پوزیشن سنبھال لی۔ میں دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا تھا۔ میری رائفل کا رُخ اُوپر کی طرف تھا۔

آہٹ کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو رہی تھی۔ رائفل پر میری گرفت سخت ہو گئی۔ اُنگلی ٹریگر پر جمی ہوئی تھی اور نظریں اُوپر تختے پر تھیں۔

تختہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے حرکت کرنے لگا اور پھر سکینہ کی آواز سنائی دی۔

''بابا! تم چھوڑ دو...... میں اُٹھا رہی ہوں۔''

اُس کی آواز پُرسکون تھی جس کا مطلب تھا کہ اُوپر صورتحال نارمل تھی اور خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ تختہ اُوپر سے پوری طرح ہٹ گیا اور روشنی اندر تک آ گئی۔

''باہر آ جاؤ...... وہ لوگ چلے گئے۔'' سکینہ کی آواز سنائی دی۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا اور رائفل پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ کمانڈر رشید نے مجھے اشارہ کیا۔ میں دوڑ کر لالٹین اُٹھا لایا اور اُسے سیڑھیوں کے قریب رکھ دیا...... ہم دونوں باہر آ گئے۔ تختہ برابر کر کے اُس پر ایک بار پھر بھوسے کی بوریاں رکھ دی گئیں۔

عبدالغنی اور سکینہ کی حالت دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ عبدالغنی کی دائیں آنکھ کے نیچے سیاہ دھبہ سا نظر آ رہا تھا۔ سکینہ کی قمیض دائیں کندھے سے پھٹی ہوئی تھی اور اُس کا ایک جبڑا بھی سوجا ہوا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ہمارے بارے میں پوچھنے کے لئے اُنہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

''عبدالغفور کہاں ہے؟'' میں نے بے اختیار پوچھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''وہ محفوظ ہے بیٹا! تم اُس کی فکر مت کرو۔'' عبدالغنی نے جواب دیا۔

ہم مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ عبدالغنی ہمیں اُن فوجیوں کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگے۔ اُن فوجیوں کو ایسے اگروادیوں (دہشت گرد) کی تلاش تھی جنہوں نے گزشتہ رات سرینگر گلمرگ ہائی وے پر ایک کانوائے پر حملہ کر کے ایک میجر سمیت اُنتیس فوجیوں کو ہلاک اور گولہ بارود کے چار ٹرکوں کو تباہ کر دیا تھا۔

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اس قافلے میں چوبیس فوجی شامل تھے اور پانچ ڈرائیوروں کو ملا کر اُن کی تعداد اُنتیس ہو جاتی تھی جو سب کے سب جہنم واصل ہو چکے تھے۔

ہمارا کوئی مجاہد نہ تو زخمی ہوا تھا نہ شہید۔ کمانڈر رشید نے قافلہ پر حملہ کی پلاننگ اس طرح کی تھی کہ ہمارے کسی آدمی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ سب کے سب محفوظ ٹھکانوں پر پہنچ چکے ہوں گے۔ لیکن یہ بھارتی درندے جس طرح ہماری تلاش میں بستیوں میں گھوم رہے تھے اس سے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ کئی بے گناہ اُن کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔ یہ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو بھی نہیں بخشیں گے۔ اُنہیں بھی تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا۔ عبدالغنی اور سکینہ کی مثال تو میرے سامنے تھی۔ اُنہیں مارا پیٹا گیا تھا۔ سکینہ کی زبان پر حرف شکایت تک نہیں آیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد عبدالغفور بھی آ گیا۔ وہ ذہین بچہ تھا۔ بھارتی فوجیوں کی آمد پر سکینہ نے اُسے کھیتوں کی طرف بھگا دیا تھا اور وہ اپنے کتے کے ساتھ اڑھائی تین گھنٹوں تک کھیتوں میں چھپا رہا تھا۔

عبدالغنی کی اپنی زندگی جہاد کرتے ہوئے گزری تھی۔ اُس نے اپنے دو بیٹے بھی وطن کی آزادی کے لئے قربان کر دیئے تھے۔ اُس کا جذبہ جہاد اب بھی کم نہیں ہوا تھا۔ وہ مجاہدین کو پناہ دیتا رہتا تھا اور ہر ممکن طور پر اُن کی مدد کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اپنے شیڈ والے تہہ خانے میں اسلحہ بھی جمع کرتا رہتا تھا جو وقتاً فوقتاً مجاہدین تک پہنچا دیا جاتا تھا۔

ہمیں تین دن تک وہاں رہنا پڑا۔ اس دوران اُس طرف آنے والے مختلف لوگوں سے ہمیں خبریں ملتی رہیں۔ اُس معرکہ میں حصہ لینے والا کوئی بھی مجاہد تو بھارتیوں کے ہاتھ نہیں آیا البتہ بھارتی درندے بے گناہوں کو ظلم وتشدد کا نشانہ بناتے رہے۔

اور پھر چوتھے روز ہمیں یہ افسوس ناک اطلاع ملی کہ سرینگر سے پانچ میل دُور ایک چھوٹی سی بستی میں کمانڈر رفیق علی اور اُس کے دو ساتھی بھارتی فوجیوں کے ساتھ ایک جھڑپ میں شہید ہو گئے تھے...... شہادت سے پہلے اُنہوں نے مقابلہ کرتے ہوئے آٹھ بھارتی فوجیوں کو جہنم رسید کر دیا تھا۔

بھارتی فوجی وہ بھیڑیئے تھے جن کے منہ کو انسان کا خون لگ چکا تھا اور وہ وادیٔ کشمیر میں انسانوں کا شکار کھیل رہے تھے۔ لیکن میرے خیال میں اب وہ وقت زیادہ دُور نہیں رہا جب وادی کو اُن کے گندے وجود سے پاک کر دیا جائے گا۔

اس دوران دو دن اور گزر گئے۔ اب فوجیوں سے مجاہدین کی جھڑپیں اننت ناگ اور پہلگام کی طرف ہو رہی تھیں۔ وہ علاقے سرینگر کے دوسری طرف تھے۔ گلمرگ کی طرف قدرے سکون ہو گیا تھا۔

مجھے گھر سے نکلے ہوئے دو ہفتے ہو چکے تھے اور اب مجھے گھر کی یاد ستانے لگی تھی۔ کمانڈر رشید نے بھی میری اس کیفیت کو بھانپ لیا۔

''اب اس طرف کے حالات قدرے پُرسکون ہیں۔'' ایک روز کمانڈر رشید نے مجھ سے کہا۔ ''تم سوپور چلے جاؤ! تمہاری ضرورت ہوگی تو تمہیں پیغام بھیج دیا جائے گا۔''

اور پھر اگلے روز میں صبح سویرے ہی خچر پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں نے رائفل اور ہر چیز وہیں چھوڑ دی تھی جس سے میرا مجاہدین سے کوئی تعلق ثابت ہو سکتا۔ میں نے عبدالغنی کے دیئے ہوئے ڈھیلے ڈھالے سے کپڑے پہن رکھے تھے اور حلیے سے میں کوئی کاشتکار ہی لگتا تھا۔

وہاں سے تقریباً آٹھ میل دُور ایک بستی میں پہنچ کر میں نے سلمان احمد نامی اُس آدمی کو تلاش کیا جس کے بارے میں عبدالغنی نے بتایا تھا۔ میں نے خچر اُس کے حوالے کر دیا اور تقریباً ایک گھنٹے بعد گلمرگ کی طرف جانے والی بس پر سوار ہو گیا۔

دو گھنٹے بعد میں گلمرگ پہنچ گیا۔ لیکن اُس روز میں آگے نہ جا سکا۔ عبدالغنی نے مجھے گلمرگ کے ایک دُکاندار کا پتہ بتایا تھا۔ شہر کی آدھی سے زیادہ دُکانیں بند تھیں۔ حمید نامی اُس شخص کی دُکان بھی بند تھی مگر ایک آدمی نے مجھے اُس کے گھر پہنچا دیا۔

حمید نے مجھے صبح آگے نہیں جانے دیا۔

''آگے کچھ گڑبڑ ہے۔'' اُس نے بتایا۔ ''قدم قدم پر فوجی دندناتے پھر رہے ہیں۔ تم آج کا دن یہاں رُک جاؤ! کل صبح چلے جانا۔''

مجھے وہ دن اور وہ رات بھی گلمرگ میں گزارنی پڑی اور پھر اگلی صبح میں بس کے ذریعے سوپور کی طرف روانہ ہو گیا۔

میرے گھر اور قصبے والوں کو پتہ چل چکا تھا کہ ایک ہفتہ پہلے مجاہدین کی جس پارٹی نے سرینگر گلمرگ روڈ پر فوجی قافلے کو تباہ کیا تھا اُس میں، میں بھی شامل تھا۔ میرے گھر والے تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ قصبے کے لوگ بھی چوری چھپے میرے گھر آ کر میرے والدین کو مبارکباد دیتے رہے۔

تین دن سکون سے گزر گئے۔ میں بھی معمولات میں مصروف ہو گیا۔ چوتھے روز تین مجاہدین ہمارے قصبے میں داخل ہوئے۔ وہ بارہ مولا کی طرف کوئی کارروائی کر کے فرار ہوئے تھے۔ اُن کی اس کارروائی میں چار بھارتی فوجی مارے گئے تھے جبکہ اُن کا ایک ساتھی بھی شہید ہوا تھا۔

مجاہدین کو فوراً ہی مختلف گھروں میں پہنچا دیا گیا۔ میں نے بھی اُن سے جا کر ملاقات کی تھی۔

اور پھر اُس روز عصر سے ذرا پہلے پورے قصبے میں یہ سنسنی خیز خبر پھیل گئی کہ تین فوجی ٹرک بڑی تیز رفتاری سے قصبے کی طرف آ رہے ہیں...... ہمارے قصبے میں بھارتی فوجیوں کا آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ مجاہدین کی تلاش کے بہانے یہاں آتے رہتے تھے اور لوٹ مار کر کے چلے جاتے تھے۔ لیکن آج بات کچھ اور تھی۔ تین مجاہدین قصبے میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ چوتھا میں خود تھا۔

تین ٹرکوں پر فوجیوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ لہٰذا اُن سے مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گاؤں والوں کے پاس اسلحہ نہیں تھا۔ وہ مجاہدین ہمارے قصبے میں پناہ لئے ہوئے تھے اُن کے پاس اگرچہ رائفلیں موجود تھیں مگر تین رائفلیں کیا کر سکتی تھیں؟

دو فوجی ٹرک قصبے کے باہر مختلف جگہوں پر اور ایک قصبے کے مرکزی چوک پر پہنچ کر رُک گیا۔ اُس ٹرک سے ڈیڑھ درجن فوجی اُتر کر اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ ایک لیفٹیننٹ نے میگا فون پر یہ اعلان کیا کہ قصبے میں چھپے ہوئے مجاہدین کو اُن کے حوالے کر دیا جائے ورنہ قصبے کو جلا کر راکھ کر دیا جائے گا۔

تیسری مرتبہ دہرایا جانے والا یہ اعلان ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ کسی مکان کی چھت سے فائرنگ شروع ہو گئی...... ایک فوجی ڈھیر ہو گیا، تین چار زخمی ہو کر گرے۔ بھگدڑ مچ گئی۔ اور پھر بھارتی فوجیوں نے بھی فائر کھول دیا۔ وہ اندھا دُھند چاروں طرف گولیاں برسا رہے تھے۔ فائرنگ کے ساتھ چاروں طرف چیخوں اور آہ و فغاں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

قصبے کے باہر سے بھی فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میرے والد اس سے چند منٹ پہلے ہی عصر کی اذان دینے کے لئے مسجد کی طرف گئے تھے۔ میں نے بھی گھر سے نکل کر مسجد کی طرف دوڑ لگا دی۔ ابھی میں مسجد کے پہلو والے دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ فضا اللہ اکبر کی صدا سے گونج اُٹھی۔ میرے والد اذان شروع کر چکے تھے۔

اُس وقت مسجد کے مرکزی گیٹ کی طرف فائرنگ ہونے لگی۔ ادھر سے میں پہلو والے دروازے سے مسجد میں داخل ہوا اور ادھر تین بھارتی فوجی جوتوں سمیت دندناتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے اور اندھا دُھند فائر کھول دیا۔

اُس وقت مسجد میں پانچ چھ نمازی تھے۔ وہ گولیوں سے چھلنی ہو کر گرے۔ ایک فوجی نے رائفل کا رُخ میرے والد کی طرف کر دیا۔ کئی گولیاں اُن کے جسم میں پیوست ہو گئیں...... وہ تیورا کر گرے۔ اُن کے جسم سے خون کے کئی فوارے پھوٹ پڑے تھے...... اُن کے منہ سے نکلنے والی آخری آواز ''اللہ اکبر'' تھی۔

میں اپنی جگہ سے اُچھلا اور ہوا میں اُڑتا ہوا ایک فوجی پر جا گرا اور اُسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اُس کے ہاتھ سے رائفل چھین لی اور تینوں بھارتی فوجیوں کو ڈھیر کر دیا۔

دوسرے ہی لمحے میں مسجد کے دروازے کی طرف لپکا۔ پہلو والی گلی سے نکلتے ہی میں ٹھٹھک گیا۔ دو عمارتوں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ فضا میں پٹرول کی بو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ آگ اتفاقیہ نہیں لگی تھی بلکہ جان بوجھ کر لگائی گئی تھی...... چاروں طرف فائرنگ اور چیخوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں اپنے گھر کی طرف دوڑا اور گلی کے موڑ پر پہنچ کر رُک گیا۔ میرے مکان اور اُس کے ساتھ دوسرے دو مکانوں سے آگ کے شعلے اُٹھ رہے تھے۔

دو فوجی ایک لڑکی کو گھسیٹتے ہوئے ایک طرف لے جا رہے تھے۔ لڑکی اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہی تھی۔ وہ رابعہ تھی...... مجھ سے دو سال بڑی میری بہن......

میں نے فوجیوں کا نشانہ لے کر رائفل کا ٹرائیگر دبا دیا...... رائفل کھٹ کھٹا کر رہ گئی۔ وہ خالی ہو چکی تھی...... میں دھاڑتا ہوا اُن فوجیوں کی طرف لپکا اور اُسی وقت مجھے یوں لگا جیسے میری ایک ٹانگ میں انگارے بھر گئے ہوں...... میں لڑکھڑاتا ہوا سنبھل کر آگے دوڑتا رہا۔ میرے چاروں طرف آگ تھی اور گولیاں برس رہی تھیں...... مگر میں رُکا نہیں، آگے بڑھتا رہا۔ ایک فوجی نے مجھے دیکھ لیا اور اپنی رائفل کا رُخ میری طرف موڑ دیا......!

○○○

میں رائفل کی زد پر تھا اور ہمارے درمیان فاصلہ بھی چند منٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ رائفل کسی بھی لمحے شعلے اُگل سکتی تھی۔ اور یہ شعلے میرے دل میں پیوست ہو کر میری زندگی کا چراغ گل کر سکتے تھے۔ میں نے مسجد میں چھینی ہوئی بھارتی فوجی کی رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ لیا اور دائیں پیر پر زور دے کر پوری قوت سے اُچھلا۔

سامنے والے فوجی کی رائفل کا رُخ میری طرف تھا۔ مجھے اس طرح اُچھلتے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی ...... چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔ میں کسی پرندے کی طرح ہوا میں اُڑتا ہوا اُس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ اور پھر میں نے دھاڑتے ہوئے اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی رائفل کو لٹھ کی طرح گھما دیا......

رائفل کا بٹ اُس فوجی کے سر پر لگا۔ اُس کے منہ سے عجیب سی آواز خارج ہوئی۔ وہ اُس کی آخری آواز تھی۔ رائفل کے بٹ کی ضرب سے اُس کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے تھے۔ رائفل ابھی تک اُس کے ہاتھوں میں تھی اور یہ شاید اُس کے جسم میں پیدا ہونے والے تشنج کا نتیجہ تھا کہ ٹرائیگر دب گیا...... رائفل کا رُخ اُس وقت اُوپر کی طرف تھا۔ نال سے نکلنے والی گولیاں آسمان کو چھونے کی کوشش کرنے لگیں۔ وہ فوجی کٹے ہوئے درخت کی طرح لہرایا اور ڈھیر ہو گیا۔ اُس کی کھوپڑی سے خون فوارے کی طرح اُچھلنے لگا۔ بھیجہ بھی پانی کی طرح کھوپڑی سے بہہ نکلا۔

دوسرا فوجی میری بہن رابعہ کو گھسیٹتا ہوا چند گز دُور جا چکا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اپنے ساتھی کی چیخ سن کر اُس نے مُڑ کر دیکھا اور پھر اُس کا چہرہ بھی خوف کی شدت سے دُھواں ہو گیا۔ اُس نے رابعہ کو چھوڑ دیا اور رائفل کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر میری طرف سیدھی کرنے لگا لیکن میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور ایک بار پھر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتا ہوا پوری قوت سے اپنی جگہ سے اُچھلا۔

یہ اُس نعرۂ تکبیر کا اثر تھا کہ وہ بھارتی فوجی دہشت زدہ ہو گیا۔ وہ اگر چاہتا تو بڑی آسانی سے مجھے چھلنی کر سکتا تھا۔ لیکن وہ بزدل تھا۔ بری طرح بدحواس ہو کر چیختا ہوا ایک طرف بھاگ نکلا۔ وہ اس قدر خوفزدہ ہوا تھا کہ رائفل بھی ایک بوجھ سمجھ کر پھینک دی تھی۔

میں چھلانگ لگا کر رابعہ کے قریب گرا۔ رابعہ اب بھی بری طرح چیخ رہی تھی۔ اُس کی قمیض ایک کندھے سے پھٹ گئی تھی اور وہ وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

رابعہ باجی! بھاگ جاؤ...... اُس گلی میں...... چاچی زلیخا کے گھر کی طرف......'' میں نے چیخ کر کہا مگر رُکا نہیں اور اُس فوجی کے پیچھے دوڑ لگا دی جو اپنی جان بچانے کے لئے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ فوجی دوسری گلی میں مُڑ چکا تھا۔ مگر میں نے اُسے زیادہ دُور نہیں جانے دیا۔ میں نے چند فٹ دُور ہی سے چھلانگ لگا دی اور نیچے گرتے ہوئے اپنی ایک ٹانگ اُس کی ٹانگوں میں اُلجھا دی۔ بھارتی فوجی چیختا ہوا لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کر پھر گرا۔ اس دوران میں سنبھل چکا تھا۔ وہ رائفل ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی جسے میں نے ایک بار پھر لٹھ کی طرح نال کی طرف سے پکڑ لیا اور فوجی کے جسم پر ضربیں لگانے لگا۔

پہلی ضرب اُس کے بائیں کندھے پر لگی۔ وہ بری طرح بلبلا اُٹھا۔ دوسری ضرب اُس کی پسلیوں پر لگی...... توقف کئے بغیر تیسری ضرب اُس کے دائیں گھٹنے پر لگائی۔ وہ چیختا ہوا زمین پر لوٹنے لگا۔ لیکن اُس کی چیخوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میرے ہاتھ نہیں رُکے۔ مجھ پر جنون سا طاری تھا۔ اس وادی میں روزانہ ہماری معصوم خواتین اور بچوں کی چیخیں گونجا کرتی تھیں...... یہ بے رحم درندے جب ان بے گناہوں پر ظلم کے پہاڑ توڑتے تھے تو اُن کی چیخوں سے آسمان تھرا اُٹھتے تھے۔ زمین کانپ اُٹھتی تھی۔ لیکن اُن خونخوار بھیڑیوں پر ان معصوموں کی چیخوں اور آہ و فغاں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا تو میں اس درندے کی چیخوں سے کیسے متاثر ہوسکتا تھا؟

مجھ پر جنون سا طاری تھا۔ نجانے میرے اندر اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ میرے ہاتھ مشینی انداز سے چل رہے تھے۔ رائفل کے بٹ کی ہر ضرب سے وہ بھیڑیا پہلے سے بھی زیادہ شدت سے بلبلا اُٹھتا۔

وہ اُس وقت اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میرے ہاتھ بھی ایک بار پھر حرکت میں آ گئے تھے۔ اس مرتبہ ضرب اُس کے جبڑے پر لگی۔ اُس کا جبڑا ٹوٹ گیا...... منہ سے خون بہہ نکلا اور وہ زمین پر اُس بکرے کی طرح تڑپنے لگا جس کے گلے پر چھری پھیر کر چھوڑ دیا گیا ہو۔

میں نے ایک بار پھر رائفل اُوپر اُٹھائی لیکن اُس وقت ایک نسوانی چیخ کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ رابعہ کی چیخ تھی...... میں نے ہاتھ روک لیا۔ چنگاریاں برساتی ہوئی نظروں سے خاک میں تڑپتے ہوئے بھارتی فوجی کی طرف دیکھا۔ وہ خون میں لت پت تھا اور اُٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے اُسے اُٹھنے کے قابل چھوڑا ہی نہیں تھا۔ دونوں گھٹنے توڑ دیئے تھے۔ دو چار پسلیاں بھی ٹوٹ گئی ہوں گی۔ ہنسلی کی ایک ہڈی بھی رائفل کی ضرب کا شکار ہوئی تھی اور جبڑا ٹوٹ جانے سے وہ منہ بھر کر خون اُگل رہا تھا۔ ایسی صورت میں تو اُس کا زندہ بچ جانا بھی ایک معجزہ ہی کہلاتا۔

رابعہ کی چیخ دوبارہ سنائی دی تو میں مُڑ کر اُس طرف دوڑا۔ یہ چیخ اُس گلی کی طرف سے آئی تھی جہاں چاچی زلیخا کا گھر تھا۔ میں اُس طرف مُڑتے ہی رُک گیا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

وہ دو فوجی تھے۔ جن میں ایک نے رابعہ کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا۔ رائفل اُس کے بائیں ہاتھ میں تھی۔ دوسرے نے رائفل کندھے پر لٹکا رکھی تھی اور رابعہ کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے بری طرح مچل رہی تھی۔ اس کھینچا تانی میں اُس کی قمیض تار تار ہو چکی تھی اور اُس کا بالائی جسم برہنہ ہو رہا تھا۔

میں چنگھاڑتا ہوا اُن کی طرف لپکا۔ رائفل کو اس مرتبہ بھی میں نے نال کی طرف سے لٹھ کی طرح پکڑ رکھا تھا۔ وہ دونوں فوجی میری چنگھاڑ سن کر میری طرف مُڑے۔

ایک فوجی نے رابعہ کے بال چھوڑ دیئے اور رائفل کو دونوں ہاتھوں میں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اس سے پہلے ہی میں اُس سے ٹکرا گیا اور اُسے گھسیٹتا ہوا دُور تک لے گیا۔ رائفل اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی اور اتفاق سے میری رائفل بھی میرے ہاتھ سے گر گئی۔ دوسرا فوجی اب رابعہ کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا تھا۔ وہ شاید موقع سے فائدہ اُٹھا کر رابعہ کو وہاں سے نکال لے جانا چاہتا تھا۔

میرے حریف فوجی نے سنبھل کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ اُس کے وزنی بوٹ کی ٹھوکر میری پنڈلی پر لگی۔ میں بے اختیار چیخ اُٹھا اور لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا...... میری سنبھلنے کی کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ اُس کے بوٹ کی ٹھوکریں میرے جسم کے مختلف حصوں پر پڑتی رہیں۔ ہر ٹھوکر کے ساتھ میں چیخ اُٹھتا۔ لیکن بالآخر مجھے سنبھلنے کا موقع مل گیا۔

فوجی نے اُس وقت میرے منہ پر زوردار گھونسہ جما دیا...... میرا جبڑا ہل کر رہ گیا۔ دانتوں سے خون بہہ نکلا...... اپنے منہ میں ہی خون کا ذائقہ محسوس کر کے مجھ پر جنون سا طاری ہو گیا۔

میں تو ابھی نوعمر ہی تھا۔ اس میں شبہ نہیں جسمانی لحاظ سے میں اپنی عمر سے کچھ زیادہ ہی لگتا تھا۔ مگر وہ مجھ سے زیادہ قد آور اور کہیں طاقتور تھا۔ اگر وہ میری گردن پکڑ لیتا تو شاید ہڈی ٹوٹ جاتی۔ میرا اور اُس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ لیکن میرے اندر نجانے اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ ایک جذبہ تھا، جنون تھا جو میرے اندر چھپی ہوئی قوت کو تقویت دے رہا تھا......

میں نے نتائج کی پرواہ کئے بغیر اُس ہٹے کٹے بھارتی سورما پر چھلانگ لگا دی اور اُسے رگیدتا ہوا دُور تک لے گیا۔ یہ گلی تنگ سی تھی۔ وہ ایک دیوار سے ٹکرا گیا۔ میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر اُس کے پیٹ میں سر سے زوردار ٹکر مار دی۔ وہ چیختا ہوا دوہرا ہو گیا۔ اُس نے سیدھا ہونے کی کوشش کی تو میں نے سر کی دوسری ٹکر اُس کے چہرے پر ماری۔ وہ ایک بار پھر بلبلا اُٹھا۔ اُس کی ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔ میں نے تیسری ٹکر مارنا چاہی تو وہ بڑی تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا میں اپنی جھونک میں دیوار سے ٹکرایا مگر فوراً سنبھل گیا۔

پتھر کی مورتیوں کو بھگوان مان کر اُن کی پوجا کرنے والے اُس سورما کی بانہوں میں شاید دم نہیں رہا تھا۔ اُس نے مجھ پر حملہ کرنے کی بجائے زمین پر پڑی ہوئی اپنی رائفل کی طرف

چھلانگ لگا دی۔ لیکن میں نے اُسے رائفل تک پہنچنے نہیں دیا۔ میں نے اپنی جگہ سے اُچھل کر اُس کے کولہے پر زوردار ٹھوکر لگا دی۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ میں رائفل کی طرف لپکا۔ اُس فوجی نے بھی بڑی پھرتی سے سنبھل کر رائفل پر قبضہ کرنے کی ایک اور کوشش کی تھی۔ لیکن میں اس سے پہلے رائفل پر ہاتھ ڈال چکا تھا۔

رائفل کے آگے سنگین لگی ہوئی تھی۔ وہ بھارتی سورما جیسے ہی میری طرف جھپٹا میں نے رائفل کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر پوری قوت سے سنگین اُس کے پیٹ میں گھونپ دی...... اُس بھارتی سورما کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے رائفل پیچھے کھینچ لی۔ وہ پیٹ پکڑ کر دوہرا ہو گیا...... تکلیف اور خوف کی شدت سے اُس کی آنکھیں حلقوں سے اُبل پڑ رہی تھیں۔

رابعہ کی چیخوں کی آوازیں اب دوسری گلی سے آ رہی تھیں۔ دوسرا فوجی رابعہ کو گھسیٹتا ہوا دوسری گلی میں مُڑ گیا تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس طرف سے کچھ اور لوگوں کے چیخنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں دوڑتا ہوا گلی کے موڑ پر پہنچ گیا۔

اُس طرف کی صورتحال بہت سنگین تھی۔ تقریباً پچاس گز آگے ایک مکان کو آگ لگی ہوئی تھی۔ عورتیں، بچے اور مرد چیختے ہوئے باہر آ رہے تھے۔ اُس جلتے ہوئے مکان سے فائرنگ کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

تین بھارتی فوجی فائرنگ کرتے ہوئے اُس مکان سے باہر آ گئے۔ اُن میں سے ایک نوعمر لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لا رہا تھا۔

میرے خون کی گردش خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔ وہ چاچی زلیخا کا مکان تھا اور وہ لڑکی چاچی زلیخا کی بیٹی تھی...... چاچی زلیخا سے ہمارا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا لیکن ایسا رشتہ ضرور تھا جو خونی رشتوں سے بھی زیادہ مقدس اور مضبوط ہوتا ہے۔ انسانیت اور مذہب کا رشتہ...... وہ ہم میں سے ایک تھی۔ اُس کا شوہر کئی سال پہلے کشمیر کی آزادی کی جنگ لڑتے ہوئے شہید ہو گیا تھا۔ پندرہ سالہ شمو اُس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بے حد حسین۔ اُس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا اور اس وقت خونخوار بھیڑیوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔

رابعہ بھی اُن بھیڑیوں کے چنگل میں تھی۔ میں نے رائفل سیدھی کر لی اور اُس فوجی کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبا دیا جس نے شمو کو بالوں سے جکڑ رکھا تھا۔

مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ گولی اُس فوجی کے سر میں لگی اور اُس کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے۔ اُس کی گرفت سے نجات ملتے ہی شمو دروازے کے اندر کی طرف گری۔

بھیڑیا صفت فوجیوں نے اندھا دُھند فائر کھول دیا۔ بستی کے لوگ اپنے آپ کو بچانے کی جدوجہد تو کر رہے تھے مگر وہ نہتے تھے اور بھارتی فوجیوں کو اس قسم کی جوابی کارروائی کی توقع نہیں تھی کہ رائفل کی گولی سے اُن کے ایک ساتھی کی کھوپڑی اُڑا دی جائے گی۔

جس فوجی نے میری بہن رابعہ کو دبوچ رکھا تھا وہ بھی رابعہ کو چھوڑ کر دوڑتا ہوا آگے جا کر اپنے ساتھیوں سے مل گیا تھا۔

اُن کی رائفلیں آگ برسا رہی تھیں۔ میں نے چاچی زلیخا اور ایک بوڑھے آدمی کو گولیوں سے چھلنی ہو کر گرتے دیکھا اور پھر کسی فوجی کی ایک گولی نے معصوم شمو کو بھی چاٹ لیا......

میں بھی ایک مکان کے دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ کھڑا فائرنگ کر رہا تھا۔ مگر میرے مقابلے پر تین چار فوجی تھے جو پوزیشن لے کر فائرنگ کر رہے تھے۔

میں جس دیوار کے سہارے کھڑا تھا اُس کا ایک حصہ آگے کو نکلا ہوا تھا جس سے مجھے کچھ آڑ مل گئی تھی۔ گولیاں میرے آس پاس سے گزر رہی تھیں۔ اس دوران میرے قریب والا دروازہ بڑی آہستگی سے کھلا اور ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''شمروز! اندر آ جاؤ...... جلدی کرو۔''

میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ چاچی زینب تھی۔ میرا گھر اسی محلے میں تھا۔ سب ایک دوسرے کے شناسا تھے۔ گھروں میں آنا جانا تھا۔ میں ادھیڑ عمر مردوں کو چاچا اور عورتوں کو چاچی کہا کرتا تھا۔

''نہیں چاچی...... تم اندر جاؤ اور دروازہ بند کر لو!'' میں نے جواب دیا اور مُڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

ایک آٹھ نو سال کی عمر کا بچہ اور ایک ادھیڑ عمر عورت بھی بھارتی سورماؤں کی بربریت کا شکار ہو چکی تھی۔ اُس معصوم بچے کو دو گولیاں لگی تھیں۔ خون بہہ رہا تھا اور وہ مرغِ بسمل کی طرح خاک میں لوٹ رہا تھا۔

اور پھر میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا...... میری بہن رابعہ نے اُٹھ کر ایک مکان کے دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی مگر چیختی ہوئی ڈھیر ہو گئی اور خاک میں لوٹنے لگی...... اُس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا......

میں سناٹے میں آ گیا۔ ایک لمحہ کو سوچنے سمجھنے کی قوتیں جیسے سلب ہو گئیں۔ دماغ پر برف سی جم گئی۔ میں پھٹی پھٹی سی نظروں سے خاک میں تڑپتی ہوئی رابعہ کو دیکھتا رہا...... میری نظریں کبھی تڑپتے ہوئے اُس معصوم بچے کی طرف اُٹھ جاتیں اور کبھی رابعہ کی طرف۔ اور پھر جیسے میں ہوش میں آ گیا۔ میں نے رائفل کو آگے نکال کر ٹرائیگر دبا دیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں ایک فوجی کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ میں نے ٹرائیگر سے اُس وقت تک اُنگلی نہیں ہٹائی جب تک میگزین خالی نہیں ہو گیا۔

دوسری طرف سے بھی گولیاں برسائی جا رہی تھیں...... میں نے خالی رائفل ایک طرف پھینک دی اور نتائج سے بے نیاز ہو کر آڑ سے نکل کر رابعہ کی لاش کی طرف دوڑنا چاہتا تھا کہ پیچھے کھڑی ہوئی چاچی زینت نے مجھے قمیض کے کالر سے پکڑ کر دروازے میں کھینچ لیا۔

''پاگل ہو گئے ہو......؟'' وہ چیخی۔ ''تم دو قدم بھی آگے نہیں جا سکو گے۔ وہ تمہیں چھلنی کر

دیں گے۔''

''اُنہوں نے رابعہ کو مار دیا چاچی...... معصوم خالد کو خاک وخون میں لوٹا دیا...... چاچی زلیخا کو مار ڈالا...... شمو کو گولی سے اُڑا دیا...... مجھے چھوڑ دو چاچی! میں اُن وحشیوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میں چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

''پاگل مت بنو شمروز!'' چاچی زینب نے چیخ کر کہا۔ ''تم رابعہ اور دوسروں کی اب کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ وہ تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔ لیکن یاد رکھو! تمہیں زندہ رہنا ہے۔ اس خون کا حساب لینا ہے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے اس خاک میں جذب ہو رہا ہے۔ وادی کی سرزمین کو ان خونخوار بھیڑیوں کے گندے وجود سے پاک کرنا ہے۔ اور یہ سب کچھ تم زندہ رہ کر ہی کر سکتے ہو اس طرف سے چھت پر چڑھ کر دوسری طرف نکل جاؤ! یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ دیر مت کرو!'' چاچی زینب نے مجھے اندر کھینچ کر دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ مگر چاچی زینب کی بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چاچی زینب نے ٹھیک کہا تھا۔ میں رابعہ، خالد، چاچی زلیخا یا اُن لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا جو بھارتی فوجیوں کی گولیوں سے چھلنی ہو گئے تھے۔ میں زندہ رہ کر ہی اُن کے خون کا بدلہ لے سکتا تھا اور اس سرزمین کو بھارتیوں کے گندے وجود سے پاک کرنے کے لئے ان مجاہدین کے لئے مددگار ثابت ہو سکتا تھا جنہوں نے اس مقصد کے لئے اپنی زندگیاں داؤ پر لگا رکھی تھیں۔ میں فرار کا راستہ تلاش کرنے لگا۔

''اُس طرف......'' چاچی زینب چیخی۔ ''سیڑھیوں پر چڑھ کر عباسی بھائی کی چھت پر کود جاؤ۔ اُس طرف سے تمہیں بھاگنے کا راستہ مل جائے گا۔''

گلی میں فائرنگ کے ساتھ اب دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں صحن میں سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔

سیڑھیاں لکڑی کے تختوں کی تھیں...... ابھی میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ باہر سے دروازے پر ضربیں لگائی جانے لگیں۔ وہ لوگ شاید رائفلوں کے بٹ مار مار کر دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں رُک کر پیچھے دیکھنے لگا۔

''بھاگ جاؤ...... جلدی کرو!'' چاچی زینب چیخی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے دروازے پر دباؤ ڈال رکھا تھا تا کہ بھارتی فوجیوں کو زیادہ سے زیادہ دیر تک روکا جا سکے۔

دروازے پر زوردار ضربیں لگائی جا رہی تھیں۔ میں سیڑھیوں پر دوڑنے لگا۔ اور پھر چاچی زینب کی چیخ سنائی دی۔ دروازہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ پشت کے بل گری تھی......

''کہاں چھپایا ہے تم نے اُس اگروادی کو؟ بتاؤ...... جلدی کرو!''

میرے سامنے اُس وقت تین چار سیڑھیاں رہ گئی تھیں۔ یہ گرجدار آواز سن کر میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ چاچی زینب پشت کے بل زمین پر پڑی تھی۔ ایک فوجی نے اپنا پیر اُس کے پیٹ پر رکھا ہوا تھا اور دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی رائفل کی سنگین اُس کے سینے سے لگا رکھی تھی۔

''نہیں...... نہیں بتاؤں گی کچھ بھی۔'' چاچی زینب نے جواب دیا۔ اُس کے لہجے میں تھرتھراہٹ تھی لیکن اُس میں خوف کا عنصر شامل نہیں تھا۔

ایک لمحہ کو میرا دل چاہا کہ میں سیڑھیوں پر سے اُن درندوں پر چھلانگ لگا دوں...... لیکن اس طرح میں چاچی زینب کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا بلکہ خود اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا۔

سیڑھیوں کے ایک طرف مکان کی دیوار تھی اور دوسری طرف پتلی سی دیوار ہی کی طرح ڈھائی تین فٹ اُونچی ریلنگ تھی۔ میں اُس کی آڑ میں آہستہ آہستہ اُوپر چڑھنے لگا۔ ابھی آخری سے پہلے والی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ فائر کے ساتھ چاچی زینب کی چیخ سنائی دی...... میں بے اختیار اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اُس بے رحم بھارتی فوجی نے چاچی زینب کے سینے پر گولی چلا دی تھی...... چاچی زینب کے سینے سے خون کا فوارہ اُبل پڑا۔ فوجی نے اپنا پیر اُس کے پیٹ سے ہٹا لیا۔ چاچی تڑپنے لگی۔

''وہ رہا...... چھت پر۔'' ایک فوجی کی چیختی ہوئی آواز سن کر میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ اُس فوجی نے مجھے دیکھ لیا تھا اور چیختے ہوئے رائفل سیدھی کر لی۔ میں نے آخری سیڑھی پر قدم رکھ کر چھت پر چھلانگ لگا دی۔ ایک فائر ہوا اور ایک دہکتا ہوا انگارہ میری پنڈلی میں اُترتا چلا گیا...... میری بائیں ٹانگ پہلے ہی زخمی تھی۔ اور اب بھی وہی ٹانگ زد میں آئی تھی۔ گولی پنڈلی کا گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی......

میں منہ کے بل گرا لیکن دوسرے ہی لمحے اُٹھ کر لنگڑاتا ہوا چھت کے دوسرے کنارے کی طرف دوڑا۔

چھت پر دوڑتے ہوئے میں نے ایک طائرانہ نظر اپنے اطراف میں بھی ڈالی تھی۔ چاچی زلیخا کے گھر سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے...... میرا گھر بھی اب مکمل طور پر آگ کی لپیٹ میں تھا۔ بستی کے دوسرے کئی گھروں سے اُٹھنے والے شعلے اور سیاہ دُھویں کے بادل آسمان سے باتیں کرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

لکڑی کے تختوں کی سیڑھیوں پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی...... میں چھت کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ اُس طرف ایک تنگ سی گلی تھی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا، بھارتی فوجی کا سر سیڑھیوں پر نمودار ہو رہا تھا...... میں نے مُڑ کر چھت سے چھلانگ لگا دی۔

چھت تقریباً پندرہ فٹ اُونچی اور نیچے گلی کچی تھی۔ میں بھد کی آواز کے ساتھ گرا مگر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ایک طرف لڑھکتا چلا گیا......

میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اُدھر دیکھا...... گلی سنسان پڑی تھی۔ چند گز آگے بائیں طرف ایک تنگ سی گلی تھی۔ میں نے اُٹھ کر اُس طرف دوڑنے کی کوشش کی مگر

کراہ کر رہ گیا۔ میری بائیں ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ تکلیف بڑھ رہی تھی اور ٹانگ پر بوجھ نہیں پڑ رہا تھا۔ لیکن یہاں رُکنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ وہ بھیڑیا صفت فوجی کسی بھی لمحے چھت کے اُس کنارے پر پہنچ سکتے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی فائر کھول دیتے۔

میں اُٹھ کر لنگڑاتا ہوا اگلے موڑ کی طرف دوڑا...... میں اپنی انہی پیچ وخم کھاتی ہوئی تنگ سی گلیوں میں پل کر جوان ہوا تھا۔ ان گلیوں سے میں اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح واقف تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں اگلی گلی میں داخل ہو جاؤں تو میرا تعاقب کرنے والے فوجی مجھے تلاش نہیں کر سکیں گے۔

گلی کا وہ موڑ تقریباً بیس گز کے فاصلے پر تھا۔ میں لنگڑاتا ہوا اُسی طرف دوڑتا رہا۔ بستی میں ہر طرف فائرنگ اور چیخ و پکار، آہ و فغاں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

موڑ کے قریب پہنچ کر میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ چاچی زینب والے مکان کی چھت پر اب دو فوجی نظر آ رہے تھے۔ وہ رائفلیں سنبھالے گلی میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اور پھر اُن میں سے ایک نے مجھے دیکھ لیا اور رائفل سیدھی کرتے ہوئے فائر کھول دیا......

میں نے دوسری گلی میں چھلانگ لگا دی۔ لاتعداد گولیاں میرے پیروں کے آس پاس زمین پر لگیں۔ دُھول اُڑنے لگی...... میں نے پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا، لنگڑاتا ہوا ایک طرف دوڑتا رہا اور چند گز آگے ایک اور گلی میں داخل ہو گیا...... آگے بھی فائرنگ اور چیخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں ان پیچ وخم کھاتی ہوئی گلیوں میں دوڑتا رہا۔

میری ٹانگ کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن میں رُکا نہیں۔ کہیں رُکنے کا مطلب موت تھا...... صرف موت......

ایک اور گلی میں مُڑتے ہی میں ٹھٹھک کر رُک گیا...... آگے کشادہ بازار تھا۔ سڑک کے دوسری طرف ایک فوجی جیپ کھڑی تھی جس کے قریب ایک میجر اور دو فوجی کھڑے تھے۔ دونوں فوجی آٹو میٹک رائفلوں سے مکانوں کی چھتوں کی طرف فائرنگ کر رہے تھے۔ میجر کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ یہ جیپ غالباً بعد میں قصبے میں آئی تھی۔

قصبے میں ہر طرف فوجی دندناتے پھر رہے تھے۔ اُن کے بھاری بوٹوں کی دھمک اور گونج چاروں طرف سنائی دے رہی تھی۔ آگ اور خون کا یہ شیطانی کھیل اپنے عروج پر پہنچ رہا تھا...... یہ وحشی بھیڑیے اس قصبے کو پوری طرح تباہ کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔

''ارے وہ اُس لڑکے کو پکڑو...... اُس گلی میں۔'' میجر کی چیختی ہوئی آواز سن کر میں چونک گیا۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں مُڑ کر گلی میں دوڑنے لگا۔ دو فوجی میرے پیچھے آ رہے تھے۔ ٹانگ سے بہت زیادہ خون بہہ رہا تھا جس سے میں نقاہت سی محسوس کرنے لگا تھا...... وہ پیر بھی پوری طرح زمین پر نہیں پڑ رہا تھا۔ لیکن میں مینڈک کی طرح پھدکتا ہوا دوڑنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر ایک موڑ گھومتے ہی میں ٹھٹھک کر رُک گیا......

سامنے والی گلی سے بھی دو فوجی دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے...... میرے سامنے بھی موت تھی اور پیچھے بھی فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ گلی میں تمام گھروں کے دروازے بند تھے۔ کہیں پناہ ملنے کی توقع نہیں تھی۔ میرا پیچھا کرنے والے فوجی بھی اُس گلی میں آ گئے۔ اُن سب کے پاس رائفلیں تھیں۔ وہ بڑی آسانی سے مجھے چھلنی کر سکتے تھے۔ ایک فوجی نے رائفل سیدھی بھی کی تھی لیکن مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر اُس نے فائر کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور چنگھاڑتا ہوا میری طرف لپکا۔

میں دونوں طرف سے گھر چکا تھا۔ میں یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ وہ لوگ مجھے زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ میں نے بھی اُن سے بھڑ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ زندہ پکڑے جانے کا مطلب میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ جو مجاہدین یا نوجوان لڑکے شبے میں پکڑے جاتے تھے، اُنہیں اس طرح تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا کہ وہ مرنے کی دُعائیں مانگتے تھے مگر اُنہیں مرنے بھی نہیں دیا جاتا تھا۔

سامنے سے آنے والا ایک فوجی جیسے ہی قریب پہنچا میں نے اُس پر چھلانگ لگا دی اور اُسے ساتھ لیتا ہوا نیچے گرا۔ میں نے گرتے ہی دونوں ہاتھ اُس کے گلے پر رکھ کر پوری قوت سے اُس کا نرخرہ دبانے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے مجھ پر ٹھوکروں کی بارش ہو گئی......

تینوں فوجی میرے جسم پر ٹھوکریں برسا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اُن کے منہ سے غلیظ گالیاں بھی نکل رہی تھیں۔ ایک فوجی نے رائفل کا بٹ میرے کندھے پر مارا۔ میرا یہ کندھا پہلے ہی زخمی تھا۔ میں تکلیف سے چیخ اُٹھا لیکن اپنے نیچے دبے ہوئے فوجی کا گلا نہیں چھوڑا۔

میرے جسم پر ٹھوکریں برستی رہیں...... کندھے پر پڑنے والی ایک اور ضرب سے میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اور پھر دو فوجیوں نے مجھے کھینچ کر الگ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے جسم پر ٹھوکروں کی بارش میں شدت آ گئی۔ میں چیختے ہوئے اپنے بچاؤ کی کوشش کرتا رہا۔ اور پھر سر پر پڑنے والی ایک ٹھوکر سے میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ پہلے تو میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرتی رہیں، پھر دُھندسی چھانے لگی جو بتدریج دبیز ہوتی چلی گئی......

میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ مجھے پیروں سے پکڑ کر مُردہ کتے کی طرح گھسیٹا جا رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا...... تاریکی نے میرے ذہن کو مکمل طور پر لپیٹ میں لے لیا تھا۔

آنکھ کھلی تو میں پتھریلی زمین پر پڑا ہوا تھا...... ہوش میں آنے کے بعد بھی کچھ دیر تک میری آنکھوں کے سامنے دبیز دُھند سی چھائی رہی۔ میں نے سر کو ایک دو جھٹکے دیئے۔ دماغ میں ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ لیکن آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی دُھند بتدریج چھٹتی چلی گئی۔

میں نے اپنے آپ کو حرکت دینے کی کوشش کی تو بے اختیار بلبلا اُٹھا۔ میرا پورا جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ پورے بدن میں درد کی لہریں بجلی کے کوندے کی طرح لپک رہی تھیں۔ بائیں ٹانگ لکڑی کے تختے کی طرح اکڑی ہوئی تھی اور شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

چند منٹ بعد میں نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں اور حرکت کئے بغیر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ماحول پر ملگجا اُجالا تھا۔ میں پچھلے واقعات یاد کرنے لگا...... میرے دماغ میں اگرچہ دھماکے ہو رہے تھے مگر ایک ایک بات مجھے یاد آ رہی تھی۔ درندہ صفت بھارتی فوجیوں نے جب قصبے پر حملہ کیا تو عصر کا وقت تھا۔ میرے والد کو مسجد میں اذان دیتے ہوئے شہید کر دیا گیا تھا اور پھر وہ شیطانی کھیل شروع ہو گیا تھا جسے دیکھ کر آسمان بھی کانپ اُٹھا ہو گا۔ ایک ایک واقعہ میری آنکھوں کے سامنے گھومتا چلا گیا۔ میری بہن رابعہ، چاچی زلیخا، اُس کی بیٹی شمو، معصوم خالد اور چاچی زینب...... اُن سب کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا۔ بستی کے نجانے اور کتنے گھروں کو جلا کر راکھ کیا ہو گا؟ مجھے وہ آخری لمحات بھی یاد تھے جب میں اُن فوجیوں سے بھڑ گیا تھا۔ اور پھر ہوش و حواس نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

وحشت اور بربریت کا یہ کھیل عصر کے وقت شروع ہوا تھا اور میرا خیال تھا کہ اب شام ہو رہی تھی۔ میں شاید کسی فوجی کیمپ میں تھا اور میرے چاروں طرف پہرہ ہو گا۔

میں نے گردن گھما کر دائیں طرف دیکھا۔ اور پھر میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا...... یہ فوجی کیمپ نہیں تھا...... مجھے اُس طرف نہ تو کوئی فوجی نظر آیا اور نہ ہی کیمپ کی کوئی حفاظتی باڑ وغیرہ دکھائی دی تھی۔ مجھے ہوش میں آئے ہوئے تین چار منٹ ہو چکے تھے اور اس دوران کوئی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔ میں نے گردن گھما کر دوسری طرف دیکھا، اُس طرف بھی دُور تک کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دی جس سے سمجھا جاتا کہ میں بھارتی فوجیوں کی قید میں ہوں۔

میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس بے احتیاطی کا نتیجہ مجھے کندھے اور بدن کے دوسرے حصوں میں شدید ٹیسوں کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ میرے منہ سے بے اختیار کراہ خارج ہو گئی۔ میں نے تکلیف ضبط کرنے کے لئے دانت بھینچ لئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

تقریباً ایک منٹ بعد میں نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں اور زخمی ٹانگ گھسیٹ کر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا لئے تھے۔ اس اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں اپنی جگہ پر گھوم گیا تھا اور پھر سامنے نظر پڑتے ہی میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا...... سینے میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ چند لمحوں تک تو میں اس طرح بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا تھا جیسے پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو گیا ہوں...... اور پھر تکلیف کی پرواہ کئے بغیر ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑا خوفناک منظر تھا...... میرے سامنے پتھریلی زمین پر دو جوان لڑکیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اُن کے جسموں پر ایک چیتھڑا تک نہیں تھا...... اُن کے کپڑے اِدھر اُدھر جھاڑیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

ایک لڑکی کی لاش پشت کے بل پڑی تھی۔ اُس کی ٹانگیں خون میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ چہرے پر خوف و دہشت کے تاثرات جیسے منجمد ہو کر رہ گئے تھے...... آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جیسے

وہ پھٹی پھٹی سی نظروں سے آسمان کو دیکھ رہی ہو۔

وہ قصبے کے ایک دُکاندار احمد علی کی بیٹی نیلم تھی...... اُس کی عمر سترہ کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ دو مہینے پہلے ہی اُس کی منگنی ہوئی تھی اور اگلے مہینے تو اُس کی شادی ہونے والی تھی۔ بھارتی بھیڑیوں نے اُسے بربریت کا نشانہ بنا کر اُس کی زندگی کا چراغ ہی گل کر دیا تھا......

دوسری لاش اوندھی پڑی تھی۔ اُس کا چہرہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اپنی زخمی ٹانگ کو گھسیٹتا ہوا اُس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ بالکل برہنہ تھی اور میں اُسے ہاتھ لگاتے ہوئے جھجک رہا تھا......

میں چند لمحے اُس کی طرف دیکھتا رہا، پھر جھک کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے پلٹ دیا...... اس کے ساتھ ہی میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا...... مجھے اُبکائی آ گئی اور میں بڑی مشکل سے قے روک سکا۔

وہ حمیدہ تھی۔ اُس کا باپ عرصہ پہلے انتقال کر چکا تھا اور بڑا بھائی بھی کچھ عرصہ پہلے وطن کی آن پر قربان ہو گیا تھا۔ حمیدہ کی عمر بھی اُنیس بیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ بہت زیادہ حسین تو نہیں تھی لیکن قبول صورت کہا جا سکتا تھا۔ اُس کے فگر غیر معمولی طور پر بڑے تھے۔ وہ جب چلتی تو جسم کا بالائی حصہ تھل تھل کرتا اور لوگ مڑ مڑ کر اُس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتے۔

حمیدہ کا پیٹ چاک تھا۔ آنتیں باہر نکلی ہوئی تھیں...... چھاتیوں پر بھی زخم تھے، جیسے دانتوں سے بھنبھوڑا گیا ہو...... اُس کی ٹانگیں بھی خون آلود تھیں۔

میں زیادہ دیر تک اُس کی طرف نہ دیکھ سکا اور اپنا رُخ بدل لیا۔ مجھ پر اس وقت عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ جسم میں جیسے جان نہیں رہی تھی۔ اس صورت حال نے نڈھال سا کر دیا تھا۔ میں بڑی مشکل سے ایک ٹانگ پر جسم کا بوجھ اُٹھائے کھڑا تھا۔ دوسرا پیر تو زمین پر رکھا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے مینڈک کی طرح پھدکتے ہوئے جھاڑیوں میں اٹکے ہوئے اُن کے کپڑے اُٹھائے اور لاشوں پر ڈال دیئے۔ میں اس وقت اس کے علاوہ اُن کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

اب تک میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ بھارتی بھیڑیوں نے چونکہ عصر کے وقت قصبے پر حملہ کیا تھا اور اب شام ہونے والی تھی۔ لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔ کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شام کا اندھیرا گہرا ہونے کی بجائے اُجالا پھیل رہا تھا۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ شام نہیں صبح ہو رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ میں رات بھر یہاں اس ویرانے میں بے ہوش پڑا رہا تھا۔

میرے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ جب میں قصبے کی ایک گلی میں اُن بھارتی درندوں کے ساتھ آخری بار گتھم گتھا ہوا تھا تو اُس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ لوگ مجھے اُٹھا کر اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ قصبے کی دو معصوم لڑکیوں کو بھی اُٹھا لائے تھے اور شاید رات بھر اُنہیں بربریت کا نشانہ بناتے رہے تھے۔ وہ چیخی ہوں گی، چلائی ہوں گی...... مگر اس ویرانے میں ان کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن مجھے حیرت تو اس

بات پر تھی کہ میں بھی رات بھر بے ہوش پڑا رہا تھا۔ مجھے ایک لمحے کو بھی ہوش نہیں آ سکا تھا۔

وادی میں پھیلے ہوئے لاکھوں بھارتی فوجیوں کے ظلم اور بربریت میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پچاس سال سے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ عورتوں کی اجتماعی آبرو ریزی روز کا معمول بن چکی تھی۔ معصوم بچوں کو سنگینوں پر ٹانگ دیا جاتا تھا۔ بوڑھوں کو گھائل کر کے اُنہیں پتھروں پر گھسیٹا جاتا اور نوجوانوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیئے جاتے۔ جو زندہ پکڑا جاتا اُسے اس طرح تشدد کا نشانہ بنایا جاتا کہ وہ موت کی دُعائیں مانگنے لگتا۔

معصوم اور بے گناہ کشمیریوں پر بھارتی غاصبوں کا یہ ظلم کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ پوری دنیا ظلم کی ان داستانوں سے واقف ہو چکی تھی۔ مگر انسانیت کے ٹھیکیداروں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ انسانوں کی فلاح و بہبود کا دعویٰ کرنے والے اقوام عالم کے نمائندے بہرے ہو گئے تھے۔ معصوم اور مظلوم کشمیری عورتوں اور بچوں کی چیخیں اُن کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ اس کے برعکس انڈونیشیا کے مشرقی صوبے تیمور میں آباد عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کا تصادم ہوا تو پوری دنیا چیخ اُٹھی۔ اقوام متحدہ کے ادارے میں جیسے طوفان آ گیا......

پوری دنیا میں انڈونیشیا کے مسلمان حکمرانوں کی مذمت کی جانے لگی۔ مشرقی تیمور کے مسلمانوں کو ظالم، جابر اور غاصب قرار دیا جانے لگا۔ اقوام متحدہ نے تیمور کے عیسائیوں کی مدد کے لئے امن فوج بھیج دی اور بالآخر عیسائی آبادی کی اکثریت کی بنیاد پر مشرقی تیمور کو انڈونیشیا سے الگ کر کے وہاں عیسائیوں کی خودمختار حکومت قائم کر دی۔

یہ سب کچھ چند مہینوں بلکہ چند ہفتوں کے اندر اندر ہو گیا۔ مشرقی تیمور کے عیسائیوں کا درد پوری دنیا نے محسوس کیا۔ اقوام متحدہ نے جس تیزی سے مشرقی تیمور کے عیسائیوں کو مسلمانوں کے "ظلم" سے نجات دلانے کے لئے کارروائی کی تھی اُس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ لیکن گزشتہ نصف صدی سے کشمیری مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے غاصب ہندوؤں کے مظالم پر اس اقوام متحدہ نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

میں اس ویرانے میں پڑی ہوئی دو معصوم لڑکیوں کی نچی ہوئی برہنہ لاشوں کے قریب کھڑا یہ سب کچھ سوچتا رہا۔ کب کسی کے دل میں ہمارا درد جاگے گا؟

میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا کچھ آگے بڑھ گیا اور پھر ایک جگہ ٹھٹھک کر رُک گیا۔ نشیب میں بہت دُور سیاہ دُھواں اُٹھتا ہوا نظر آیا تو میں چونک گیا۔ وہ میرا گاؤں تھا جہاں اب بھی جلتے ہوئے مکانوں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ جگہ قصبے سے تقریباً تین میل دُور سرینگر جانے والی سڑک سے ذرا ہٹ کر تھی۔ اب مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ گزشتہ شام بھارتی فوجی اُن لڑکیوں کو اور مجھے اُٹھا کر یہاں لے آئے تھے۔ اُن کی تعداد کیا ہو گی؟ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ رات بھر خونخوار بھیڑیوں کی طرح اُن لڑکیوں کو نوچتے اور بھنبھوڑتے رہے

تھے اور صبح ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے چلے گئے تھے۔ میں چونکہ رات بھر بے ہوش پڑا رہا تھا اور شاید وہ مجھے مُردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔

میں خاموش کھڑا بستی سے اُٹھتے ہوئے دُھویں کو دیکھتا رہا۔ مشرقی اُفق پر سرخی پھیلنے لگی۔ وہ طلوع ہونے والے سورج کی نہیں بلکہ اُن بے گناہوں کے خون کی سرخی تھی جو بھیڑیا صفت اور متعصب ہندو فوجیوں کی بربریت کا شکار ہوئے تھے۔

بستی سے اُٹھنے والے دُھویں کی طرف دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ بستی کے کتنے لوگ مارے گئے ہوں گے اور کون کون بچا ہو گا؟ میرا باپ مسجد میں میرے سامنے شہید کر دیا گیا تھا۔ میری بہن رابعہ کو بستی کی ایک گلی میں گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا تھا۔ اپنی ماں اور دوسری بہن ثمینہ کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ دونوں زندہ بھی تھیں یا...... میں نے سر جھٹک دیا۔ میں اس سے آگے نہیں سوچنا چاہتا تھا۔

سورج اب پہاڑی کی بلندی سے جھانکنے لگا تھا۔ سنہری کرنیں وادی پر نچھاور ہونے لگیں۔ میں رات بھر سردی میں بے ہوش پڑا رہا تھا۔ میرا جسم اکڑا ہوا تھا۔ جیسے رگوں میں خون منجمد ہو گیا ہو...... اور مجھے حیرت تھی کہ میں اب تک زندہ کیسے تھا اور نقل و حرکت کس طرح کر رہا تھا؟

دُھوپ کی حرارت سے مجھے اپنے بدن میں خون کی روانی محسوس ہونے لگی۔ میں اس وقت بھی اس جگہ پر کھڑا ویران سی نظروں سے نشیب میں دیکھ رہا تھا۔ جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے سو گز نیچے سڑک دکھائی دے رہی تھی۔ قصبے کی طرف سے آنے والی یہ سڑک اسی پہاڑی کے اُوپر سے گھومتی ہوئی سرینگر کی طرف چلی گئی تھی۔

میں نے مُڑ کر حمیدہ اور نیلم کی لاشوں کی طرف دیکھا۔ میں نے اُن لاشوں کو کپڑوں سے ڈھک دیا تھا مگر ہوا کے جھونکوں سے کپڑے اُڑ کر دُور چلے گئے تھے اور لاشیں برہنہ ہو گئی تھیں جن پر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں دُور ہی سے نظر آ رہی تھیں۔

میں نے رُخ پھیر لیا اور ڈھلان پر آہستہ آہستہ نیچے اُترنے کی کوشش کرنے لگا۔ یوں تو میرا پورا جسم بری طرح دُکھ رہا تھا مگر کندھے اور بائیں ٹانگ میں شدید تکلیف تھی۔ پیر زمین پر نہیں رکھا جا رہا تھا۔ میں بڑی مشکل سے زخمی ٹانگ کو گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کسی طرح سڑک پر پہنچ جاؤں۔ کوئی نہ کوئی وہاں سے ضرور گزرے گا تو اُنہیں اُن لاشوں کے بارے میں بتاؤں گا۔ لیکن سو گز کا یہ فاصلہ بھی مجھے سو میل سے زیادہ لگ رہا تھا اور محسوس ہو رہا تھا جیسے میں یہ فاصلہ کبھی طے نہ کر سکوں گا۔

ڈھلان خاصی عمودی تھی۔ میں بہت سنبھل کر نیچے اُتر رہا تھا۔ لیکن دفعتاً ایک چھوٹے پتھر پر میرا پیر رپٹ گیا اور مجھے یوں لگا جیسے زمین میرے قدموں کے نیچے سے نکل گئی ہو...... میں ایک پیر پر لڑکھڑا کر رہ گیا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور نیچے گر کر بڑی تیزی سے ڈھلان پر لڑھکنے لگا......

گرتے ہوئے میرے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ میں ڈھلان پر کانٹے دار جھاڑیوں میں بڑی تیزی سے قلابازیاں کھاتا ہوا لڑھک رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے جھاڑیوں کو گرفت میں لینے کی کوشش بھی کی تھی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور لڑھکتا چلا گیا۔

اور پھر میرا سر ایک پتھر سے ٹکرا گیا...... کھوپڑی کے پچھلے حصے پر چوٹ بڑی زوردار لگی تھی۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی ناچنے لگیں اور پھر میرا سر تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا......

○

اس مرتبہ میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو ایک نرم بستر پر پڑے ہوئے پایا۔ آنکھوں کے سامنے کچھ دھندسی چھائی ہوئی تھی جو بتدریج چھٹتی چلی گئی۔ میں آنکھیں میچ کر سامنے دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنے گھر میں ہوں۔ لیکن وہ میرا گھر نہیں تھا۔ وہ ایک غار تھا جس میں شاید کسی طرف رکھا ہوا سپرٹ لیمپ جل رہا تھا۔ وہ سپرٹ لیمپ تو نظر نہیں آ رہا تھا مگر اُس کی روشنی میں غار کی ناہموار چھت دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو کراہ اُٹھا۔ درد کی لہریں پورے بدن میں برقی رو کی طرح پھیلتی چلی گئی تھیں۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش ترک کر دی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ میرا جسم کمبل سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور کمبل کے نیچے میرے جسم پر لباس نہیں تھا۔ میں نے کمبل کے اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولا تو پتہ چلا کہ میرے جسم پر صرف نیکر تھی۔ اور وہ بستر بھی کوئی پلنگ یا چارپائی نہیں تھی۔ فرش پر پیال پھیلی ہوئی تھی جس پر ایک کمبل بچھا ہوا تھا۔ میں نے گردن کو حرکت دینا چاہی تو سر میں شدید ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ میرا ایک ہاتھ بے اختیار سر پر پہنچ گیا۔ کھوپڑی کے پچھلے حصے پر ایک بڑا سا گومڑہ اُبھرا ہوا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ تھی اور میں یہاں کیسے آ گیا تھا؟ مجھے یہ تو یاد آ گیا کہ اُس پہاڑی ڈھلان سے اُترتے ہوئے میں گر پڑا تھا اور لڑھکتے ہوئے میرا سر ایک پتھر سے ٹکرا گیا تھا۔ سر پر لگنے والی شدید چوٹ کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ مگر مجھے اس غار میں کون لایا تھا......؟

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ قدموں کی ہلکی سی آہٹ سن کر چونک گیا۔ اُس وقت میں کمبل کے اندر ہاتھ ڈالے اپنے جسم پر لپٹی ہوئی پٹیوں کو ٹٹول رہا تھا۔ میں نے ہاتھ کمبل سے باہر نکال لیا اور آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ قدموں کی آہٹوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ دو یا دو سے زیادہ آدمی تھے۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند سیکنڈ بعد ہی تین افراد غار کے دوسرے حصے سے نکل کر سامنے آ گئے۔ اُن میں ایک ادھیڑ عمر عورت تھی اور دو آدمی۔ ایک ادھیڑ عمر تھا اور دوسرا جوان۔ اُن دونوں کے کندھوں پر آٹومیٹک رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں اور تینوں چہرے میرے لئے اجنبی تھے۔

وہ تینوں میرے قریب آ کر رُک گئے۔ چند لمحے کھڑے میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر دونوں آدمی گھٹنوں کے بل میرے سامنے بیٹھ گئے۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' ادھیڑ عمر شخص نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ اُس کے لہجے میں شفقت نمایاں تھی۔

''ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ حالانکہ میں ٹھیک نہیں تھا۔ یہ جملہ تو اخلاقاً کہا تھا۔ بخار میں تپتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے جسم کے ساتھ میں اپنے آپ کو ٹھیک کس طرح کہہ سکتا تھا؟

میں گہری نظروں سے اُس شخص کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لمبا قد اور مضبوط ہاتھ پیر۔ داڑھی اور مونچھوں کے بال آپس میں تقریباً ملے ہوئے تھے جس سے منہ کا دہانہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ سر کے بال بھی بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے۔ کتھئی رنگ کی گالف کیپ اُس کی پیشانی کے قریب سر پر ٹکی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرے پر سختی کے تاثرات اس بات کی عکاسی کر رہے تھے کہ وہ بڑی کٹھن زندگی گزار رہا ہے۔

اُس نے نظریں ہٹا کر میں نے دوسرے آدمی کی طرف دیکھا۔ اُس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اُس کا بھی شیو اور سر کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے۔ اُس نے کمر پر کپڑے کا ایک پٹکا سا باندھ رکھا تھا جس میں آٹومیٹک رائفل کے چار میگزین اڑسے ہوئے تھے۔ میری نظریں عورت کی طرف اُٹھ گئیں جو اُس کے قریب کھڑی تھی۔ اُس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لمبے قد کی مالک وہ عورت خاصی حسین تھی۔ اُس نے ڈھیلا ڈھالا سا چوغہ پہن رکھا تھا اور سر پر سیاہ رُومال بندھا ہوا تھا۔ میں اُس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ایک بار پھر ادھیڑ عمر شخص کی طرف دیکھنے لگا۔

''گھبراؤ نہیں......تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔'' اُس شخص نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''ایک مجاہد کی زندگی میں ایسے لمحات ایک بار نہیں بار بار آتے ہیں۔ مجاہد گھبراتا نہیں۔ ایسے واقعات تو اُس کے جذبات کو مہمیز کرنے کے لئے رُونما ہوتے ہیں۔ اور پھر ہر مرتبہ وہ ایک نئے جوش، ولولے اور عزم کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑتا ہے۔''

''نہ میرے جذبات سرد ہوئے ہیں اور نہ ہی حوصلہ کم ہوا ہے۔ لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ کون ہیں اور یہ کون سی جگہ ہے؟ میں یہاں کیسے پہنچا؟''

''آفرین......'' وہ شخص میرے حوصلے کی داد دیتے ہوئے بولا۔ ''چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر کہنے لگا۔ ''میں کمانڈر محب اللہ ہوں۔ یہ محمد اعظم ہے اور یہ مریم ہے۔'' اُس نے اپنے ساتھی اور اُس عورت کا تعارف کرایا۔ ''ہم بھی اس وادی کو آزاد کرانے کے لئے بھارتی سامراج سے برسرِ پیکار ہیں۔ ہمارے مجاہدین پوری وادی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جہاں بھی موقع ملتا ہے دشمن پر کاری ضرب لگا دی جاتی ہے۔''

میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ کمانڈر محب اللہ بھارتی درندوں کے خلاف برسرِ پیکار مجاہدین

میں ایک معتبر نام تھا۔ وہ وادی میں چھلاوہ کے نام سے مشہور تھا۔ اور وہ واقعی چھلاوہ تھا۔ اگر وہ رات دس بجے بارہ مولا کے آس پاس بھارتی فوجیوں کے خلاف کوئی چھاپہ مار کارروائی کرتا تو چند گھنٹوں بعد وہاں سے میلوں دُور سرینگر کے دوسری طرف اننت ناگ میں کسی فوجی دستے پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑتا۔ بعض اوقات کئی مقامات پر بیک وقت ہونے والی چھاپہ مار کارروائیوں میں بھی اُس کا نام لیا جاتا۔

یوں تو کشمیر کی آزادی کے لئے مجاہدین کی کئی تنظیمیں بھارتی سامراج کے خلاف برسر پیکار تھیں۔ ہر تنظیم اپنی جگہ نہایت اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ ہر مجاہد بھارتی فوجیوں کے لئے خوف کی علامت بنا ہوا تھا۔ لیکن کمانڈر محبّ اللہ کے نام میں وہ دہشت تھی جس کی مثال نہیں ملتی تھی۔ بھارتی فوجی اُس کا نام سن کر ہی تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔ اور وہی کمانڈر محبّ اللہ اُس وقت میرے سامنے بیٹھا ہوا بڑی محبت اور شفقت بھرے لہجے میں میری خیریت دریافت کر رہا تھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟ میں تو......''

''میں تمہارے بارے میں سب کچھ جان چکا ہوں۔'' کمانڈر محبّ اللہ نے میری بات کاٹ دی۔ گزشتہ رات میں بارہ مولا میں تھا جب مجھے تمہارے قصبے پر بھارتی فوجیوں کے حملے کی اطلاع ملی۔ میں اپنے ساتھ چند مجاہدین کو لے کر فوراً ہی روانہ ہو گیا۔ لیکن بارہ مولا کے قریب ہی ایک فوجی دستے سے تصادم ہو گیا۔ ہمارا مقابلہ تقریباً دو گھنٹوں تک جاری رہا۔ اس تصادم میں ہم نے اسلحہ سے لدا ہوا ایک ٹرک تباہ کرنے کے علاوہ ایک میجر اور بارہ فوجیوں کو جہنم رسید کر دیا جبکہ ہمارا ایک مجاہد شہید اور ایک زخمی ہوا۔ ہم صبح سے ذرا پہلے تمہارے قصبے میں پہنچے تھے۔ بھارتی سورما وہاں سے جا چکے تھے لیکن اپنے پیچھے تباہی اور بربادی کی ایک المناک داستان چھوڑ گئے تھے۔ یہ کوئی بات نہیں خونخوار درندوں سے کسی بھلائی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ مگر یہ سب کچھ دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ معصوم اور بے گناہ لوگوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ ایک نہ ایک دن ہم بھی اس سرزمین کو غاصب ہندوؤں کے ناپاک وجود سے پاک کرا لینے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر دھیمے لہجے میں قصبے کی تباہی کے بارے میں بتانے لگا۔

کمانڈر محبّ اللہ کے کہنے کے مطابق قصبے میں اڑتالیس افراد کو شہید کیا گیا تھا جن میں عورتیں، بوڑھے مرد اور بچے شامل تھے۔ بیشتر کو گولیوں سے چھلنی کیا گیا تھا جبکہ بعض لوگوں کو اذیتیں دے کر سنگینوں سے ہلاک کیا گیا تھا۔ ستائیس مکان جلا کر راکھ کر دیئے گئے تھے جن میں میرا مکان بھی شامل تھا۔ مسجد کو بھی آگ لگا کر شہید کر دیا گیا تھا۔ قصبے کی چھ جوان لڑکیاں لاپتہ تھیں جن کے بارے میں یقین تھا کہ اُنہیں بھارتی فوجی اُٹھا کر لے گئے تھے۔

''دو لڑکیوں کی اُدھڑی ہوئی لاشیں......''

''لاپتہ ہونے والی چھ لڑکیاں اُن دو کے علاوہ ہیں جن کے بارے میں تم بتانا چاہتے

ہو۔'' کمانڈر محبّ اللہ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''وہ دو لاشیں ہم نے اُس پہاڑی پر دفن کر دی تھیں۔''

''اوہ..!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''لیکن آپ لوگوں کو اُن لاشوں کا پتہ کیسے چلا؟''

''صبح ہم تمہارے قصبے سے واپس جا رہے تھے۔ ہماری جیپ اُس پہاڑی کے قریب سے گزر رہی تھی کہ ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ میں نے جیپ رُکوائی اور محمد اعظم کو صورتحال معلوم کرنے کے لئے اُس طرف بھیج دیا۔ اُس نے تمہیں ڈھلان پر جھاڑیوں میں بے ہوش پڑے دیکھا تو اُٹھا لایا۔ تمہاری حالت دیکھ کر میں بھی کانپ اُٹھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید تم گزشتہ رات قصبے پر بھارتی فوجیوں سے جھڑپ میں زخمی ہو کر پناہ لینے کے لئے اس طرف آ گئے تھے۔ اور ہو سکتا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہو۔ یہ سوچ کر میں جیپ کو اُوپر سے گھما کر اُس پتھریلے میدان کی طرف لے آیا اور تب ہم نے اُن دونوں لڑکیوں کی لاشوں کو دیکھا۔ اُن لڑکیوں کے حوالے سے تو میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ اُن وحشیوں نے اُن کے ساتھ کیا کیا تھا۔ لیکن تم......''

''میں پناہ کی تلاش میں قصبے سے نہیں بھاگا تھا کمانڈر!'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اُسے قصبے پر بھارتی فوجیوں کے حملہ کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ آخر میں، میں کہہ رہا تھا۔ ''وہ شیطان اُن معصوم لڑکیوں کے ساتھ مجھے بھی اُٹھا لائے تھے۔ میں چونکہ رات بھر بے ہوش رہا تھا اس لئے شاید وہ مجھے مُردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔'' میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر ہوش میں آنے کے بعد کی تفصیل بتانے لگا۔

''وہ تمہاری ہی چیخ تھی جو میں نے سنی تھی۔'' کمانڈر محبّ اللہ نے میرے خاموش ہونے پر کہا۔ ''بیشک تم بہت حوصلہ مند، آہنی اعصاب کے مالک اور بڑی مضبوط قوتِ ارادی کے مالک ہو۔ تمہاری ٹانگ میں دو گولیاں لگی تھیں۔ بدن پر اور بھی کئی زخم تھے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو بہت پہلے دم توڑ چکا ہوتا۔ مگر تم نے بڑی ہمت کا ثبوت دیا اور تمہارے سانس کی ڈور کو ٹوٹنے سے بچانے کے لئے ڈاکٹر مریم نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔'' اُس نے قریب کھڑی ہوئی عورت کی طرف اشارہ کیا جس کا تعارف اُس نے پہلے صرف مریم کے نام سے کرایا تھا۔

''ڈاکٹر......؟'' میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ہاں......'' کمانڈر محبّ اللہ مسکرا دیا۔ ''مریم فزیشن اور سرجن ہے۔ کئی سال پہلے اس نے پاکستان کے ایک میڈیکل کالج سے طب اور سرجری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ دو سال پہلے یہ پونچھ کے ہسپتال میں خدمات انجام دے رہی تھی۔ ایک روز تین زخمی مجاہدین کو اُس ہسپتال میں پہنچایا گیا۔ اُن میں سے دو کو تو بچا لیا گیا مگر تیسرے کا بہت زیادہ خون ضائع ہو چکا تھا وہ نہیں بچ سکا۔ مریم نے اُسی روز فیصلہ کر لیا کہ وہ مجاہدین کے لئے کام کرے گی۔ یہ پونچھ کے ہسپتال کی نوکری چھوڑ کر چوری چھپے کنٹرول لائن پار کر کے دلمیہ نامی ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ گئی۔ اتفاق سے میں اُس روز اُس بستی میں موجود تھا۔ ڈاکٹر مریم کی باتیں سن کر میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ

سکا۔ لیکن مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ یہ غاصب بھارتیوں کی کوئی چال تو نہیں تھی۔ بھارتی فوجی مجاہدین کے ٹھکانے معلوم کرنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اُن کی ایک سازش ہوسکتی تھی۔ یہ مجاہدین کی خدمت کے بہانے ہمارے ساتھ رہتی اور بھارتی فوجیوں کو ہمارے بارے میں معلومات فراہم کرسکتی تھی۔ میں اسے اپنے ساتھ بارہ مولا لے گیا اور اپنے ایک دوست کی فیملی کے حوالے کر دیا اور اُس کے بارے میں پونچھ اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں تحقیقات کے لئے ایک آدمی بھیج دیا۔ میں اگرچہ مریم کے بارے میں ملنے والی رپورٹوں سے خاصا مطمئن تھا لیکن تین مہینوں تک میں نے کوئی خدمت اس کے سپرد نہیں کی اور خود بھی اس سے دُور ہی رہا۔

بالآخر مجھے یقین ہوگیا کہ مریم واقعی کشمیر کی آزادی کے لئے لڑنے والے مجاہدین کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ یہ اپنے ساتھ جراحی کے بہت سے آلات بھی لے کر آئی تھی جو شروع ہی سے میرے قبضے میں تھے۔ مطمئن ہونے کے بعد ہم دونوں نے مل کر ایک باقاعدہ منصوبہ بنایا اور وادی میں کئی مقامات پر ایسے ہی غاروں میں ایسے انتظامات کر دیئے کہ ان علاقوں میں زخمی ہونے والے مجاہدین کو فوری طور پر طبّی امداد فراہم کی جا سکے۔ ڈاکٹر مریم نے واقعی اپنی زندگی مجاہدین کے لئے وقف کر رکھی ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''مریم کا تعلق لاہور کے ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔ یہ اگر چاہتی تو عیش و آرام کی زندگی گزار سکتی تھی لیکن مجاہدین کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہوکر اس نے سب کچھ تج دیا۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ ان پہاڑوں میں اسے کتنی تکلیفیں اُٹھانی پڑتی ہوں گی۔ اس نے ہمارے ساتھ کئی کئی روز فاقے بھی کئے ہیں لیکن کبھی اُف تک نہیں کیا۔ یہ بے سروسامانی کی حالت میں مجاہدین کی جس طرح مسیحائی کر رہی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ دواؤں کی کمی کی شکایت رہتی ہے لیکن پاکستان میں ہمارے ہمدرد اور دوست وقتاً فوقتاً ضروری دوائیں ہمیں مختلف ذرائع سے بھیجتے رہتے ہیں۔'' میں توصیفی نظروں سے ڈاکٹر مریم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

''یہ غار کہاں پر ہے......؟'' میں نے پوچھا۔ ''سوپور کے آس پاس تو میں نے ایسا کوئی غار نہیں دیکھا۔

''یہ غار بارہ مولا سے تقریباً دس میل دُور دریائے اوری کے قریب واقع ہے۔'' کمانڈر محب اللہ نے جواب دیا۔ ''یہ غار ہر لحاظ سے محفوظ ہے۔ کسی عام آدمی کے لئے اسے تلاش کر لینا ممکن نہیں۔ اور ویسے بھی ہم نے اس کی حفاظت کا معقول انتظام کر رکھا ہے۔ جب کوئی اجنبی اس طرف آتا ہے تو ہمیں فوراً اطلاع مل جاتی ہے۔''

میں حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہ لوگ مجھے سوپور کے قریب سے اُٹھا کر میلوں دُور بارہ مولا لے آئے تھے اور یہاں میرا علاج کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر مریم نے بتایا کہ پنڈلی میں لگنے والی گولی گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی جبکہ ران میں لگنے والی گولی اندر ہی رہ گئی تھی جسے مریم نے آپریشن کر کے نکال دیا تھا۔ اور میرے جسم کے دوسرے حصوں پر بھی مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔

ڈاکٹر مریم نے یہ انکشاف بھی کیا کہ مجھے دوپہر کے قریب بے ہوشی کی حالت میں یہاں لایا گیا تھا۔ اُس وقت میرا بدن تیز بخار سے پھنک رہا تھا۔ یہاں آنے کے بعد میں چند منٹ کے لئے ہوش میں ضرور آیا تھا مگر حواس میں نہیں تھا۔ اُس نے مجھے انجکشن لگا دیا تھا جس کے بعد میں پھر بے ہوش ہو گیا تھا یا گہری نیند سو گیا تھا۔ یہ انکشاف بھی میرے لئے خاصا دلچسپ ثابت ہوا کہ اس وقت آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔

آخر وہ سوال بھی میری زبان پر آ ہی گیا جو میں بہت دیر پہلے اُس سے پوچھنا چاہتا تھا۔ کمانڈر محب اللہ نے پہلے ڈاکٹر مریم کی طرف دیکھا، پھر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''مجھے افسوس ہے...... تمہارے گھر کے حوالے سے میرے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔'' اُس نے ایک بار پھر مریم کی طرف دیکھا اور پھر مدہم لہجے میں گویا ہوا۔ ''قصبے کے جو اڑتالیس افراد گزشتہ شام شہادت کے رُتبے پر فائز ہوئے ہیں اُن میں تمہاری والدہ بھی شامل ہیں......''

میرے سینے پر گھونسا سا لگا۔ والد اور بہن کو تو میں نے اپنی آنکھوں سے گولیوں سے چھلنی ہوتے دیکھا تھا۔ اور اب والدہ کے بارے میں بھی یہ خبر سن لی تھی کہ وہ بھی اس دنیا میں نہیں رہیں۔

''اور میری بہن ثمینہ......؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ یہ سوال کرتے ہوئے میرا دل ایک بار پھر پوری شدت سے دھڑک اُٹھا تھا۔

○○○

''ثمینہ لاپتہ ہے۔'' کمانڈر محب اللہ نے نظریں جھکا کر پہلے سے بھی زیادہ دھیمی آواز میں جواب دیا۔'' وہ بھی اُن چھ لڑکیوں میں شامل ہے جن کے بارے میں شبہ ہے کہ انہیں فوجی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ جب قصبے پر حملہ ہوا تھا تو یہ لڑکیاں اپنی عزت اور جان بچانے کے لئے قصبے سے بھاگ کر کھیتوں میں چھپ گئی ہوں یا کسی اور قریبی بستی میں پہنچ گئی ہوں۔ انہیں بہرحال تلاش کیا جا رہا ہے اور اچھی اُمید رکھنی چاہئے۔''

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں جانتا تھا کہ اُس نے آخری الفاظ میری دلجوئی کے لئے کہے تھے۔ ورنہ وہ بھی جانتا تھا کہ حقیقت کیا ہوسکتی ہے۔ میں نے صرف رابعہ کو اپنے گھر والی گلی میں فوجیوں کے چنگل میں دیکھا تھا۔ اُس وقت صورتحال ایسی تھی کہ فوجیوں نے گلیوں کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ کسی کو بھاگنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ثمینہ یا دوسری لڑکیاں بھاگ کر کہاں جا سکتی تھیں؟

دو لڑکیوں کی نچی اور کھسوٹی ہوئی لاشیں میں نے قصبے سے تین میل دُور اُس پہاڑی پر دیکھی تھیں جہاں میں بھی رات بھر بے ہوش پڑا رہا تھا۔ ثمینہ اور دوسری لڑکیاں شاید فوجیوں کی دوسری پارٹی کے ہاتھ لگ گئی تھیں اور وہ اُنہیں دوسری طرف لے گئے تھے۔

اُن دو لڑکیوں کی لاشیں دیکھ کر میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ ثمینہ اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ اُن کی نچی کھچی لاشیں بھی پہاڑیوں میں کہیں پڑی ہوں۔

میں اندر سے کانپ رہا تھا اور ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ہچکیاں میرے قابو میں نہیں رہیں اور نہ ہی میں آنسوؤں پر قابو پا سکا۔ میرا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا۔

مریم میرے قریب بیٹھ گئی۔ اُس نے مجھے سہارا دے کر اُٹھایا اور اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ اُس وقت میں اپنی تکلیف بھول گیا تھا۔

''بس مائی سن!'' مریم نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور میرے رخساروں پر بہنے والے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''تم ایک بہت دلیر اور حوصلہ مند نوجوان ہو۔ مجاہد...... اور مجاہد رویا نہیں کرتے...... تم ایک بہت بڑے مقصد کے لئے لڑ رہے ہو۔ اور جب مقصد بڑا ہو تو ایسی قربانیاں دینی ہی پڑتی ہیں۔ اس وقت کے بارے میں سوچو جب تم ان خونخوار بھیڑیوں کو وادی سے نکال پھینکو گے۔ اُن کے غلیظ وجود کے بغیر وادی کتنی حسین لگے گی...... کتنا سکون ہوگا یہاں...... پھر یہاں کسی کا خون نہیں بہے گا۔ کسی لڑکی کی عزت نہیں لٹے گی۔ آنے والی نسلیں یاد کریں گی اُن لوگوں کو جنہوں نے اپنی عزت و آبرو اور جان کے نذرانے پیش کر کے اُنہیں آزادی کا تحفہ دیا۔ تم ایک باہمت نوجوان ہو...... حوصلہ ہار گئے تو یہ قربانیاں ضائع ہو جائیں گی۔ نہیں مائی سن...... تم ان قربانیوں کے امین ہو۔ انہیں ضائع نہیں ہونے دو گے۔''

مریم مجھے اپنے سینے سے لگائے بار بار میرا منہ چوم رہی تھی۔ کبھی میرے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگتی۔ گاہے بگاہے کمانڈر محبّ اللہ اور محمد اعظم کے ہمدردانہ بول بھی میری سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔ میری ہچکیاں سسکیوں میں بدل گئیں اور پھر میں بتدریج پُرسکون ہوتا چلا گیا۔ مریم کافی دیر تک مجھے اپنی آغوش میں لئے بیٹھی رہی پھر اُس نے آہستگی سے مجھے دوبارہ بستر پر لٹا دیا اور اُٹھ کر غار کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ کمانڈر محبّ اللہ اپنی جگہ سے سرک کر میرے اور قریب آ گیا اور ہمدردانہ باتیں کرنے لگا۔

تقریباً بیس منٹ بعد مریم بغیر دودھ کی چائے بنا کر لے آئی۔ مٹی کے مگ تھے۔ کثرت استعمال سے ان کا رنگ بھی اُڑ چکا تھا۔ ایلومینیم کی کیتلی بھی دھوئیں سے بالکل کالی ہو رہی تھی۔ اُس نے چائے انڈیل کر ایک ایک مگا کمانڈر محبّ اللہ اور محمد اعظم کو دے دیا اور مجھے سہارا دے کر بٹھا دیا۔ وہ ایک ہاتھ سے مجھے سہارا دیئے رہی اور دوسرے ہاتھ سے قہوے کا مگا میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔

قہوے میں الائچی کی خوشبو تھی۔ پتی اور چینی کا تناسب بھی بہت مناسب تھا جس سے چائے خوش ذائقہ ہونے لگی۔ چائے پلانے کے بعد مریم نے مجھے لٹا دیا اور خود چائے کی چسکیاں لینے لگی۔ کمانڈر محبّ اللہ اور محمد اعظم تقریباً دو گھنٹے وہاں رہے اور پھر اگلے روز آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ مریم غار کے دہانے تک اُن کے ساتھ گئی تھی اور پھر واپس آ کر میرے پاس بیٹھ گئی اور دیر تک باتیں کرتی رہی۔ پھر کچھ فاصلے پر بچھی ہوئی پیال پر لیٹ گئی۔ اُس کے قریب ہی دیوار کے ساتھ ایک سب مشین گن بھی ایستادہ تھی۔

میرا خیال تھا کہ ہم دونوں یہاں اکیلے رہ گئے ہیں۔ لیکن مریم نے بتایا کہ تین آدمی غار کے باہر مختلف جگہوں پر موجود ہیں۔

مریم کافی دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اور پھر میری پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکنے لگیں۔ مریم کی آواز مجھے بہت دُور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

صبح میری آنکھ کھلی تو سات بج رہے تھے۔ وقت مریم نے بتایا تھا۔ غار کے اندر میرے لئے تو یہ اندازہ لگانا ہی ممکن نہیں تھا کہ دن کا وقت ہے یا رات کا؟ مریم نے مجھے اُٹھا کر منہ ہاتھ دُھلایا، اس دوران دو اور آدمی غار میں آ گئے تھے۔ اُن دونوں کی عمریں پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوں گی۔ دونوں کے قد لمبے اور ہاتھ پیر مضبوط تھے۔ دونوں کے کندھوں پر سب مشین گنیں لٹکی ہوئی تھیں۔ دونوں کی آنکھیں سرخ تھیں اور شیو بڑھے ہوئے تھے۔ اُن دونوں نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میرے قریب ہی بیٹھ گئے۔

ان میں سے ایک کا نام ضیغم تھا اور دوسرا چن پیر۔ وہ رات کو غار کے باہر ڈیوٹی دے رہے تھے۔ اُن کا ایک ساتھی اب بھی باہر موجود تھا۔

مریم غار کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ اُس کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اُس نے چائے کی کیتلی اور مگّے میرے قریب ہی فرش پر رکھ دیئے اور دوسرے ہاتھ میں میلا سا دستر خوان بھی فرش پر ہی رکھ دیا جس میں روٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ مریم نے مگوں میں قہوہ اُنڈیل کر دستر خوان کھول دیا۔

روٹیاں موٹی موٹی تھیں اور آٹے میں نمک بھی ملا ہوا تھا۔ قہوے کے ساتھ یہ نمک والی روٹیاں واقعی مزہ دے گئیں۔ مجھے تو قہوے کے ساتھ نمک ملی روٹی کھانے میں مزہ آ رہا تھا، اس لئے کہ میں پہلی بار کھا رہا تھا۔ لیکن مجاہدین تو عرصہ سے اس چیز پر گزارہ کر رہے تھے۔ یہی اُن کے لئے من وسلویٰ تھا اور یہ خوراک بھی کبھی اُنہیں نصیب ہوتی تھی اور کبھی دو دو دن فاقے کرنے پڑتے تھے۔

ضیغم اور چن پیر ناشتہ کر کے میرے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے، پھر ایک طرف فرش پر پڑ کر سو گئے۔ اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد اُن کا تیسرا ساتھی بھی آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ بارہ مولا سے دو لڑکے آ گئے ہیں جنہوں نے غار کے باہر ڈیوٹی سنبھال لی ہے۔ وہ نوجوان بھی ناشتہ کر کے سو گیا۔

ڈاکٹر مریم نے برتن سنبھالے اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ وہ دھیمے لہجے میں مجھے اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی مجاہدین کے لئے وقف کر دی تھی۔ ان پچھلے دو برسوں کے دوران اُسے بڑے سنگین تجربات سے گزرنا پڑا تھا۔ کئی مرتبہ موت سے آمنا سامنا بھی ہوا تھا۔ ایک مرتبہ وہ خود بھی زخمی ہوئی تھی۔ اور پھر ایک اور موقع پر وہ اس سے بھی زیادہ سنگین صورتحال میں پھنس گئی تھی۔ اس موقع پر کمانڈر محب اللہ نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ وہ پاکستان واپس چلی جائے۔ مگر مریم نے صاف انکار کر دیا تھا کہ مجاہدین کو اس کی ضرورت ہے اور وہ اُنہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ جس طرح مجاہدین کی تنظیموں کے بعض لیڈر بھارتی فوج کو سب سے زیادہ مطلوب تھے، اسی طرح ڈاکٹر مریم بھی موسٹ وانٹڈ تھی۔

بھارتی فوج کی کشمیری ہائی کمان کو پتہ چل گیا تھا کہ مریم نام کی ایک عورت زخمی ہونے والے مجاہدین کی مسیحائی کر رہی ہے۔ اُنہیں نئی زندگی دے رہی ہے اور وہی مجاہدین صحت یاب ہو کر بھارتی فوجیوں پر قہر بن کر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ فوج کی ہائی کمان نے بعض مجاہدین کے ساتھ ڈاکٹر مریم کے سر کی قیمت مقرر کر رکھی تھی۔

لیکن ڈاکٹر مریم اس صورتحال سے خوفزدہ نہیں تھی۔ اُس نے نہ تو کبھی یہاں سے بھاگنے کا سوچا تھا اور نہ ہی کہیں چھپ کر بیٹھی تھی۔ وہ کسی ایک جگہ ٹک کر بھی نہیں بیٹھتی تھی۔ ہر جگہ اُس کی ضرورت رہتی تھی۔ کبھی وہ بارہ مولا میں ہوتی، کبھی گلمرگ میں، کبھی پہل گام اور کبھی اننت ناگ میں، کبھی سرینگر اور کبھی جموں میں، جہاں اُس کی ضرورت ہوتی وہ پہنچ جاتی۔ ان علاقوں میں بعض غار تو ایسے تھے جو چھوٹے چھوٹے ہسپتالوں کا منظر پیش کرتے تھے۔ کہیں تین زخمی مجاہدین زیر علاج تھے اور کہیں اُن کی تعداد نصف درجن سے بھی زیادہ ہوتی۔ یوں اُن زخمی مجاہدین کی دیکھ بھال کے لئے ہر جگہ کوئی نہ کوئی موجود ہوتا۔ مگر ڈاکٹر مریم بھی بلا خوف وخطر ان علاقوں کے چکر لگاتی رہتی تھی۔ اور ڈاکٹر مریم کے حق میں ایک اچھی بات یہ تھی کہ بھارتیوں کے پاس اُس کی کوئی شناخت نہیں تھی۔

''میں ایک مرتبہ بڑی دلچسپ صورتحال سے دوچار ہو گئی تھی۔'' ڈاکٹر مریم مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی۔ ''میں اُن دنوں پہلگام گئی ہوئی تھی۔ اُس علاقے میں سکھوں کی آبادی کچھ زیادہ ہے۔ لیکن وقتاً فوقتاً وہ بھی بھارت کے متعصب ہندو فوجیوں کے عتاب کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ دو دن پہل گام میں رہنے کے بعد اننت ناگ کی طرف جا رہی تھی کہ راستے میں ہماری بس روک لی گئی۔ بھارتی فوج کی ہائی کمان کو اطلاع ملی تھی کہ مجاہدین اس طرف کوئی بڑی کارروائی کرنے والے ہیں اس لئے پہلگام سے اننت ناگ تک فوجی پارٹیاں جگہ جگہ بسوں کو چیک کر رہی تھیں۔ ہمیں جس پارٹی نے روکا تھا اُس میں آٹھ فوجی شامل تھے جن کا انچارج ایک نوجوان سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔ اُن کی جیپ سڑک کے عین وسط میں کھڑی تھی۔ مسلح فوجیوں نے بس کو گھیرے میں لے لیا اور تمام مسافروں کو نیچے اُترنے کا حکم دیا اور اُنہیں لائن میں کھڑا کر کے تلاشی لی جانے لگی۔

بس کے مسافروں میں میرے ساتھ کچھ اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ فوجی بلا لحاظ اُن کے جسموں کو بھی ٹٹول رہے تھے کہ اُنہوں نے اپنے لباس کے نیچے کوئی اسلحہ تو نہیں چھپا رکھا؟ میرے کندھے پر کپڑے کا ایک میلا سا تھیلا لٹکا ہوا تھا جس میں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ کچھ ضروری ادویات اور انجکشن وغیرہ بھی تھے۔ میں مسافروں کی قطار میں ساتویں نمبر پر تھی۔ نوجوان ہندو لیفٹیننٹ چند گز دور کھڑا بڑی ہوس بھری نظروں سے قطار میں کھڑی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری باری بھی آ گئی۔ میرے سامنے کھڑے ہوئے فوجی نے تلاشی لینے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ لیفٹیننٹ اچانک ہی کراہ اُٹھا اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر جھکتا چلا گیا۔ تمام فوجی اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

لیفٹیننٹ پہلے نیچے بیٹھا اور پھر سڑک پر لیٹ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ دبائے ہوئے تھا۔ چہرے پر بے پناہ کرب کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اُسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ دو فوجی اُسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ بری طرح پیر پٹخ رہا تھا۔

''کیا تم میں کوئی ڈاکٹر ہے؟'' ایک فوجی نے بس کے مسافروں کی طرف دیکھتے ہوئے چیخ کر کہا۔ میں غیر ارادی طور پر آگے بڑھ گئی۔ لیفٹیننٹ کی حالت واقعی بہت ابتر تھی۔ سینے میں بہت شدید درد اُٹھا تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے سینے کو دبائے ہوئے دوہرا ہوا جا رہا تھا۔

میں نے اُس کے قریب جھک کر چند سوال کئے جن کا جواب اُس نے بڑی مشکل سے کراہتے ہوئے دیا تھا۔ اُس کی باتوں سے مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ وہ انجائنا کا مریض تھا لیکن اُس نے کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ تاہم اس قسم کی ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لئے اُس کی جیب میں انجی سڈ کی گولیاں موجود رہتی تھیں۔

میں نے اُس کی جیب سے ایک گولی نکال کر اُس کی زبان کے نیچے رکھ دی اور اپنا تھیلا کندھے سے اُتار کر ٹٹولنے لگی۔ اتفاق سے تھیلے میں والٹران کے دو انجکشن موجود تھے۔ میں نے ایک انجکشن اُس کی وین (نس) میں لگا دیا۔ ایک فوجی میری مدد کر رہا تھا۔

میں اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ بھارتی فوج کا لیفٹیننٹ ہے۔ یہی بھیڑیئے ہمارے مجاہدین پر گولیاں برساتے ہیں اور ان کے جسموں میں انگارے بھر دیتے ہیں۔ بس کی تلاشی کے دوران بھی یہ کسی بے گناہ نوجوان کو تشدد کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ اُس کے سینے میں اُٹھنے والا درد جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ میں اگر چاہتی تو اُسے تڑپ تڑپ کر مر جانے دیتی۔ مگر میں ڈاکٹر ہوں۔ مسیحائی میرا کام ہے۔ میں زندگی دیتی ہوں چھینتی نہیں۔ اور پھر طب کا پیشہ دین دھرم نہیں دیکھتا۔ میں اُس ہندو لیفٹیننٹ کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''اسے ہسپتال پہنچانا ضروری ہے۔'' میں نے ایک فوجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دل کا دورہ پڑا ہے۔ میں نے انجکشن دے دیا ہے مگر صرف یہ انجکشن کافی نہیں ہے۔''

بات اُن فوجیوں کی سمجھ میں آ گئی۔ اُنہوں نے اپنے آفیسر کو اُٹھا کر جیپ کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ لیفٹیننٹ اُس وقت اگرچہ کسی حد تک پُرسکون ہو چکا تھا مگر اُس کی حالت تشویش ناک تھی۔ تکلیف دوبارہ شدت اختیار کر سکتی تھی۔

''دیوی جی......!'' وہی فوجی جس نے انجکشن لگانے میں میری مدد کی تھی میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی بڑی کرپا ہے۔ وقت پر کام آ گئیں۔ لیکن اگر راستے میں ہمارے صاحب کو تکلیف ہو گئی تو ہم کیا کریں گے؟ آپ کی مہربانی ہوگی دیوی جی! آپ ہمارے ساتھ چلیں۔''

میں نے بس کے دوسرے مسافروں کی طرف دیکھا۔ بعض کے چہروں پر شدید ناگواری کے تاثرات تھے لیکن میں کسی کو اس طرح بے بسی کی موت مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لئے اپنا تھیلا سنبھال کر خاموشی سے جیپ میں بیٹھ گئی۔ وہ بڑی جیپ تھی۔ تمام فوجی اُس میں لد گئے اور جیپ حرکت میں آ گئی۔ اُس کا رُخ اننت ناگ کی طرف تھا جو وہاں سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر تھا اور یہ دس میل بڑے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ کسی بھی موڑ پر کسی بھی وقت مجاہدین کی کوئی پارٹی اُس جیپ پر حملہ کر سکتی تھی۔ ایسی صورت میں، میں بھی لپیٹ میں آ جاتی۔

فاصلہ اگرچہ دس میل تھا مگر پہاڑوں میں بل کھاتا ہوا راستہ بڑا خوفناک تھا اس لئے جیپ کی رفتار بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔ راستے میں ہمیں دو اور فوجی ٹرک ملے۔ وہاں سے ایک راستہ پہاڑیوں میں کسی دوسری طرف نکلتا تھا۔ اُس طرف سے مجاہدین کے حملے کا زیادہ خطرہ تھا اس

لئے فوجی ٹرک اُس راستے کی ناکہ بندی کئے ہوئے تھے۔ ہماری جیپ ایک منٹ کو اُن ٹرکوں کے پاس رُکی اور پھر آگے روانہ ہو گئی۔ اور تقریباً ایک گھنٹے میں دس میل کا فاصلہ طے کر کے ہم اننت ناگ کے چھوٹے سے ہسپتال میں پہنچ گئے۔

لیفٹیننٹ کو فوراً ہی ایمرجنسی میں پہنچا دیا گیا۔ دو ہندو ڈاکٹر فوراً ہی اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں اُنہیں بتا رہی تھی کہ میں نے لیفٹیننٹ کو ٹریٹمنٹ دیا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''یہ انجکشن تو کوئی ڈاکٹر ہی دے سکتا ہے۔ اور پھر تمہارے پاس وہ انجکشن کہاں سے آیا؟'' اُس ڈاکٹر کی آنکھوں میں شبے کی جھلک تھی۔

''میں بھی ڈاکٹر ہوں......'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''بعض ادویات اپنے پاس رکھتی ہوں۔ کسی ایسے ہی موقع پر کسی کی زندگی بچانے کے کام آ جاتی ہیں۔''

ڈاکٹر کو مجھ پر شبہ ہو چکا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ سوالات کرتا رہا۔ مجھ پر کچھ گھبراہٹ سی طاری ہو رہی تھی۔ مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔ اور پھر موقع پاتے ہی میں ہسپتال سے نکل گئی۔

میں خیریت سے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئی۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ پورے شہر میں میری تلاش ہو رہی تھی۔ فوجی پارٹیوں نے محض شبہ کی بناء پر کئی گھروں پر چھاپے مارے تھے اور میرے بارے میں پوچھ گچھ کے لئے عورتوں اور بچوں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اُنہیں ڈاکٹر مریم کی تلاش تھی جو کشمیر کی آزادی کے لئے لڑنے والے مجاہدین کی مددگار تھی اور جس کے سر کی قیمت مقرر کی جا چکی تھی۔''

مریم خاموش ہو گئی۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ کہہ رہی تھی۔ ''دیکھا تم نے...... یہ ہندو کس گندی فطرت اور گندی ذہنیت کے مالک ہیں۔ میں نے اُن کے ایک آفیسر کو موت کے منہ سے بچایا تھا اور وہ مجھے تلاش کر رہے تھے میرا جسم گولیوں سے چھلنی کرنے کے لئے۔''

میں گہرے گہرے سانس لے رہا تھا...... یہ بنیا قوم واقعی بڑی گندی فطرت کی مالک تھی۔ احسان فراموش اور محسن کش۔

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ غار کے دوسرے حصے سے بھاری قدموں کی آواز سن کر اُس طرف دیکھنے لگا۔ مریم بھی اُس طرف دیکھ رہی تھی۔ قدموں کی آواز قریب آ رہی تھی۔ اور پھر دو آدمی سامنے آ گئے۔ ایک کمانڈر محب اللہ تھا اور دوسرا کمانڈر رشید۔

کمانڈر رشید کو دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کمانڈر رشید نے جھک کر بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میرے قریب ہی زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میری خیر خیریت دریافت کی اور میرے اُوپر سے کمبل ہٹا کر میرے زخم دیکھنے لگا۔ میری حالت دیکھ کر اُس کے جبڑے بھنچ گئے تھے۔ قریب بیٹھے ہوئے کمانڈر محب اللہ نے بھی اُس کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔

''بڑا حوصلہ مند اور آہنی اعصاب کا مالک ہے یہ نوجوان۔'' اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جب یہ ہمیں بے ہوشی کی حالت میں ملا تھا تو مجھے اُمید نہیں تھی کہ یہ زندہ بچے گا۔ لیکن اس کے حوصلے اور قوتِ ارادی کی داد دینی پڑتی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ نوجوان آگے چل کر بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے گا۔''

اس کا حوصلہ میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔'' کمانڈر رشید نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''سرینگر گلمرگ شاہراہ پر فوجی کانوائے تباہ کرنے میں اس نے جس طرح ہمارا ساتھ دیا تھا وہ قابل تعریف ہے۔ اس کے حوصلے کی داد دینی چاہئے۔ اتنا بڑا صدمہ جس طرح جھیل گیا ہے وہ بڑے جگرے کی بات ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے قصبے میں جو کچھ بھی ہوا ہے اُسے یاد رکھنا اور اُن لوگوں کو بھی یاد رکھنا جو وادی میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جگہ پر غاصب بھارتیوں کے ظلم وستم کا شکار ہو رہے ہیں۔ اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنا کہ آزادی قربانی کی بانہوں میں ملتی ہے۔ اگر تم یہ سب کچھ یاد رکھو گے تو ہمارے ان بہن بھائیوں، بزرگوں اور بچوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔''

''میں یاد رکھوں گا کمانڈر!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ کیسے بھلا سکتا ہوں؟''

''شاباش......!'' کمانڈر رشید نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ اُس نے ہاتھ میرے مضروب کندھے پر مارا تھا۔ میں بڑی مشکل سے اپنی تکلیف کو ضبط کر سکا تھا۔

ڈاکٹر مریم مہمان نوازی کی رسم پوری کرتے ہوئے قہوہ بنا لائی۔ کمانڈر قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے مریم سے میرے بارے میں دریافت کرنے لگا۔

''کسی بیمار کے صحت یاب ہونے میں اس کی اپنی قوتِ ارادی کا بڑا دخل ہوتا ہے۔'' مریم نے جواب دیا۔ ''اور شمروز تو بہت ہی مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر تو میں سمجھی تھی کہ یہ کئی ہفتوں تک اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت نہیں دے سکے گا۔ لیکن آج دوسرا ہی دن ہے اور یہ خود سے اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔'' وہ چند لمحے کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''زخم مندمل ہونے میں چند روز لگیں گے۔ اس کے بعد بھی چند روز آرام کی ضرورت محسوس ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے یہ آرام نہیں کرے گا۔'' بات ختم کرتے ہوئے اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''ہاں......!'' کمانڈر محب اللہ بھی مسکرا دیا۔ ''میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ اس کے ہاتھ رائفل اُٹھانے کے لئے بے چین ہو رہے ہیں۔''

میں خاموش بیٹھا دل ہی دل میں مسکراتا رہا۔ اپنے بارے میں ان تجربہ کار اور کہنہ مشق مجاہدین کی آراء سن کر مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ میں واقعی ایک بار پھر رائفل اُٹھانے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔

اور پھر اُن کی گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

''بھارتی درندوں نے سوپور میں جو تباہی پھیلائی ہے اُس کی جوابی کارروائی کے لئے تم نے کیا سوچا ہے محب اللہ؟'' کمانڈر رشید نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے۔ مگر میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔'' کمانڈر محب اللہ نے جواب دیا۔ ''تم جانتے ہو یہ بھارتی فوجی اس قسم کی کوئی بڑی کارروائی کرنے کے بعد بہت محتاط ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم ان کے فوجی کیمپوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ یوں تو فوجی کیمپوں کے اردگرد اُن کا پہرہ بڑا سخت ہوتا ہے لیکن ایسے موقعوں پر وہ کچھ زیادہ ہی محتاط ہو جاتے ہیں اور کسی اجنبی کو کیمپ کے آس پاس دیکھتے ہی گولی سے اُڑا دیتے ہیں اس لئے ہمیں جلد بازی سے کام لینے کی بجائے چند روز انتظار کرنا پڑے گا۔''

''ویسے تمہارے ذہن میں کیا منصوبہ ہے؟'' کمانڈر رشید نے پوچھا۔

''گلمرگ......!'' کمانڈر محب اللہ نے جواب دیا۔ ''تم جانتے ہو گلمرگ ایک بہت بڑی چھاؤنی بن چکا ہے۔ یہ چھاؤنی شہر کے مشرق میں پہاڑ کے دامن تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ اور شاید اس طرف وہ مزید آگے نہیں بڑھنا چاہتے اس لئے وہ شہر کے جنوب کی پہاڑیوں میں بھی ایک بہت بڑا کیمپ بنا رہے ہیں۔ ایک مہینہ پہلے میں نے ان چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر بہت دُور تک اُنہیں خاردار تاریں لگاتے دیکھا تھا۔ خاردار تاروں کی اُس باڑ میں جگہ جگہ نگران چوکیاں بھی بنا رہے ہیں تاکہ کیمپ کے باہر دُور تک نگاہ رکھی جا سکے۔ اُس طرف کی پہاڑیاں زیادہ اُونچی نہیں ہیں۔ کیمپ بنانے کے لئے وہ یقیناً بہت اچھی جگہ ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میرے آدمی اُس علاقے پر مسلسل نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور مجھے ان کی رپورٹس بھی ملتی رہتی ہیں۔ مجھے ملنے والی اطلاعات کے مطابق اُس کیمپ میں فوجی ٹرکوں کی آمدورفت شروع ہو چکی ہے۔ لیکن ہمیں چند روز اور انتظار کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ وہاں اُن کی سرگرمیاں کیا رُخ اختیار کرتی ہیں؟''

''اس طرف سے میں بھی غافل نہیں ہوں۔'' کمانڈر رشید نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''میرے آدمی بھی علاقے پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور مجھے ملنے والی اطلاعات کے مطابق وہاں اسلحہ اور گولہ بارود کا ڈپو قائم کیا جا رہا ہے۔''

''یہ بڑی تشویشناک خبر ہے۔'' کمانڈر محب اللہ نے کہا۔ ''گلمرگ کی چھاؤنی پہلے ہی ہمارے لئے بہت بڑا خطرہ بنی ہوئی ہے۔ اُس چھاؤنی کی وجہ سے اس علاقے میں ہماری سرگرمیاں محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ اگر یہ ڈپو بن گیا تو ہمارے لئے مزید مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اس لئے ہمیں جلد سے جلد اس کا حل سوچنا ہوگا۔'' وہ خاموش ہو کر داڑھی کھجانے لگا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا منصوبہ یہی تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں کوئی کیمپ قائم کیا جا رہا ہے۔ اور میں اس کے خلاف کارروائی کے لئے چند روز انتظار کرنا چاہتا تھا۔ انتظار تو اب بھی کرنا پڑے گا۔ میرے

خیال میں ابھی وہاں اسلحہ جمع ہونا شروع نہیں ہوا۔ ہمیں اس علاقے کی نگرانی سخت کر دینی چاہئے۔ اور جیسے ہی وہاں گولہ بارود جمع ہونا شروع ہو، ہلہ بول دینا چاہئے۔''

''میں نے بھی یہی سوچ رکھا ہے اور اس کے لئے اپنے طور پر تیاری بھی شروع کر دی ہے۔'' کمانڈر رشید نے کہا۔

''کیسی تیاری؟'' محبّ اللہ نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''اُس علاقے کے آس پاس اسلحہ جمع کرنے کی۔'' کمانڈر رشید نے کہا۔ ''ہم رائفلوں یا سب مشین گنوں سے اُس کیمپ کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اس کے لئے ہمیں ایسی چیزوں کی ضرورت پڑے گی جس سے گولہ بارود کے اُس ڈپو کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جا سکے۔''

''مثلاً......؟'' کمانڈر محبّ اللہ نے پوچھا۔

''راکٹ......'' کمانڈر رشید نے جواب دیا۔ ''میرے پاس بھارتی فوجیوں ہی سے چھینے گئے تین بزوکا (کندھے پر رکھ کر راکٹ فائر کرنے والا لانچر) اور پانچ راکٹ موجود ہیں۔ لیکن ان سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں زیادہ راکٹوں کی ضرورت ہوگی۔ اس کے علاوہ اگر دو تین ایل ایم جی (لائٹ مشین گنیں) بھی مل جائیں تو ہمارے لئے آسانی ہو جائے گی۔''

''ایک ایل ایم جی میرے پاس ہے۔ لانچر اور راکٹ کون سے ہیں؟'' محبّ اللہ نے پوچھا۔

''روسی ساخت کے ہیں۔'' کمانڈر رشید نے کہا اور راکٹوں کے بارے میں بتانے لگا۔

''ٹھیک ہے......'' کمانڈر محبّ اللہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں بھی ان چیزوں کا بندوبست کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ کارروائی اس طرح بھرپور انداز میں ہونی چاہئے کہ وہ لوگ گلمرگ سے اپنی چھاؤنی اُٹھانے پر بھی مجبور ہو جائیں۔''

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' کمانڈر رشید بولا۔ ''ایک نہ ایک روز گلمرگ تو کیا انہیں وادی میں ہر جگہ سے اپنا بوریا بستر سمیٹنا پڑے گا۔''

چند لمحے خاموشی رہی اور پھر وہ لوگ وادی کی مجموعی صورتحال کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ میں بڑی توجہ سے اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ دوپہر کے وقت وہ دونوں واپس چلے گئے۔ اُن کے جانے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد اسی غار میں ایک طرف ننگے فرش پر سوئے ہوئے ضیغم اور چن پیر بھی جاگ گئے۔ اُنہوں نے رات بھر غار کے باہر پہرے کی ڈیوٹی دی تھی اور اس قدر گہری نیند سوئے تھے کہ اُنہیں محبّ اللہ اور کمانڈر رشید کے آنے اور جانے کا بھی پتہ نہیں چلا تھا۔

ڈاکٹر مریم نے اُن کے لئے روٹیاں دسترخوان میں لپیٹ کر رکھی تھیں۔ البتہ قہوہ تازہ بنا دیا۔ وہ لوگ روٹی کھا کر چار بجے کے قریب اپنی رائفلیں سنبھال کر باہر چلے گئے۔ کیونکہ اُن کی جگہ جو مجاہد ڈیوٹی دے رہے تھے اُنہیں شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے بارہ مولا واپس پہنچنا تھا۔

ڈاکٹر مریم مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ وہ نہ صرف زخمی مجاہدین کی مسیحائی کرتی تھی بلکہ اُن کے لئے کھانا بھی وہی پکاتی تھی۔ کھانے میں وہی نمک والی روٹیاں ہوتی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی مجاہد بارہ مولا سے گوشت وغیرہ بھی لے آتا تھا یا کہیں دُور جا کر کوئی جانور شکار کر لیا جاتا تھا۔ اسطرح کبھی کبھار گوشت بھی کھانے کو مل جاتا۔

دن گزرتے رہے۔ میں ڈاکٹر مریم کی مسیحائی اور کچھ اپنی ول پاور کی بدولت بڑی تیزی سے روبصحت ہو رہا تھا۔ جسم کے مختلف حصوں پر بعض چھوٹے زخم تو بالکل ٹھیک ہو چکے تھے۔ ٹانگ کے دونوں زخم بھی مندمل ہو رہے تھے۔ البتہ کندھے کی تکلیف میں کچھ زیادہ کمی نہیں آئی تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ ہڈی میں فریکچر نہ ہو گیا ہو۔ اُس غار میں ایکسرے کا تو ظاہر ہے کوئی بندوبست نہیں تھا مگر ڈاکٹر مریم ایک ماہر اور تجربہ کار سرجن تھی۔ وہ کئی برسوں تک آزاد کشمیر اور پاکستان کے مختلف ہسپتالوں میں خدمات انجام دے چکی تھی اور دو سال سے مجاہدین کی مسیحائی کر رہی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ ہڈی میں فریکچر نہیں تھا کیونکہ اُس کے خیال میں فریکچر ہوتا تو میں اپنے کندھے یا اُس بازو کو بھی حرکت نہیں دے سکتا تھا۔

آٹھ دن بعد میں اُٹھ کر آہستہ آہستہ غار ہی میں تھوڑا بہت چلنے پھرنے لگا تھا۔ اور پھر ایک روز ڈاکٹر مریم کو بڈگام جانا پڑ گیا۔ یہ قصبہ بارہ مولا سے تقریباً چالیس میل اور سرینگر سے چند میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ بڈگام کی نواحی پہاڑیوں میں بھی ایک ایسا ہی خفیہ غار تھا جہاں زخمی مجاہدین کا علاج اور دیکھ بھال کی جاتی تھی۔

بارہ مولا سے بڈگام تک جانے کے لئے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ پہلے سرینگر جایا جائے اور وہاں سے بڈگام کا رُخ کیا جائے۔ اور دوسرا راستہ کروڑ اور ماگام نامی قصبوں سے ہو کر جاتا تھا۔ اس راستے سے فاصلہ نسبتاً کم تھا۔ اس طرف کوئی باقاعدہ اور پختہ سڑک بھی نہیں تھی۔ پتھریلے راستے تھے جن پر کھٹارہ سی بسیں یا جیپیں چلتی تھیں۔ لیکن اس طرف بھی بھارتی فوجیوں کے دستے پیٹرولنگ کرتے رہتے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وادی کشمیر کا کوئی بھی علاقہ اُن کے ناپاک قدموں سے محفوظ نہیں تھا۔ مگر فوجیوں کی کڑی پیٹرولنگ کے باوجود مجاہدین اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔

بارہ مولا سے بڈگام پہنچنے کا ایک تیسرا راستہ بھی تھا جسے باقاعدہ راستہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ پہاڑوں میں بل کھاتی ہوئی تنگ سی پگڈنڈیاں تھیں جن پر پیدل یا صرف خچروں پر سفر کیا جا سکتا تھا۔ اور کوئی سواری ان راستوں پر سفر نہیں کر سکتی تھی۔ مجاہدین عام طور پر ایسے ہی راستوں پر پیدل، خچروں پر یا پھر کبھی کبھار موٹر سائیکل پر سفر کیا کرتے تھے۔ ایسے راستے مجاہدین کے لئے سب سے زیادہ محفوظ تھے کیونکہ بھارتی سورما ان تنگ راستوں کی طرف آنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر مریم نے یہی تیسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ اُسے لینے کے لئے ایک موٹر سائیکل سوار مجاہد غار میں پہنچ گیا تھا۔

ڈاکٹر مریم نے اپنا کپڑے کا میلا سا تھیلا کندھے پر لٹکا لیا۔ میرے قریب بیٹھ کر کئی منٹ تک ہدایات دیتی رہی میں زیادہ نہ چلوں پھروں، کندھے کو زیادہ حرکت نہ دُوں وغیرہ

وغیرہ......اُس نے چن پیر اور ضیغم کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ میرا ہر طرح سے خیال رکھیں۔

ڈاکٹر مریم کے جانے کے بعد اُن دونوں نے واقعی میرا بہت خیال رکھا۔ مجھے وقت پر روٹی اور چائے ملتی رہی۔ ضیغم باقاعدگی سے صبح شام میرے کندھے کی مالش بھی کرتا رہا۔ تیسرے روز چن پیر بہت دُور جا کر ایک پہاڑی بکرا شکار کر لایا تھا۔

اُس نے بڑی مہارت سے بکرے کی کھال اُتاری اور گوشت کے بڑے بڑے پارچے بنا ڈالے۔ یہ کام وہ اس غار کے دوسرے حصے میں کر رہا تھا اور میں بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے قریب آ گیا تھا۔

چن پیر نے بکرے کی دونوں رانیں الگ کر لیں اور باقی گوشت نمک لگا کر اس طرح سنبھال کر رکھ دیا کہ کم از کم ایک ہفتے تک خراب نہ ہو سکے۔ اُس نے غار کے ایک کونے میں آگ جلا لی اور رانیں بھوننے لگا۔ لکڑیوں کا دُھواں اُوپر جا کر غار کی چھت میں کہیں غائب ہو رہا تھا۔

میں الاؤ کے قریب ایک پتھر پر بیٹھا بڑی دلچسپ نظروں سے روسٹ ہوتی ہوئی بکرے کی رانوں اور کبھی ضیغم کی طرف دیکھتا رہا۔

مریم چار دن بعد لوٹی تھی۔ وہ بڈگام سے واپسی پر سرینگر بھی ہو کر آئی تھی جہاں سے کچھ دوائیں وغیرہ خریدی تھیں۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ اس دوران کمانڈر محب اللہ بھی دو تین چکر لگا چکا تھا۔ اُس سے مجھے وادی کے مختلف مقامات پر مجاہدین کی سرگرمیوں کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ بھارتی وحشیوں کے خلاف اُن کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ بھارتی فوجیوں سے چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں جن میں بھارتیوں کو قابل قدر جانی و مالی نقصان پہنچایا جا رہا تھا۔ مجاہدین چھاپہ مار کارروائی مکمل کر کے پہاڑوں میں روپوش ہو جاتے اور بھارتی فوجی اُن کی تلاشی کے بہانے قرب و جوار کی بستیوں پر ہلہ بول دیتے اور بے گناہ بوڑھوں، معصوم بچوں اور عورتوں کو تشدد کا نشانہ بناتے۔ عورتوں کے ساتھ زیادتی اُن کا معمول بن چکا تھا۔ اس قسم کی خبریں بھی ملتی رہتی تھیں کہ فلاں بستی سے بھارتی فوجی کسی عورت کو اُٹھا کر لے گئے اور اجتماعی آبروریزی کے بعد اُسے جنگل میں پھینک کر چلے گئے۔ اس قسم کی خبریں سن کر میرا خون کھول اُٹھتا۔ میں نیلم اور حمیدہ کی نچی ہوئی لاشیں دیکھ چکا تھا جنہیں اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا۔ میری بہن زینب لاپتہ تھی۔ اُس کے بارے میں بھی میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ اُسے بھی ہوس کا نشانہ بنا کر یا تو ختم کر دیا گیا ہوگا اور یا اُن کی قید میں پڑی سسکیاں بھر رہی ہوگی۔

میں اب غار میں پڑے پڑے اُکتا چکا تھا۔ میری ٹانگ اور دوسرے زخم بالکل ٹھیک ہو چکے تھے۔ مجھے اب چلنے پھرنے یا حرکت کرنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ تاہم کندھے میں کچھ تکلیف ابھی باقی تھی۔ لیکن میرا خیال تھا کہ اپنی معمول کی سرگرمیاں شروع کر دوں گا تو یہ

تکلیف بھی ختم ہو جائے گی۔

اُس روز ایک اور خبر نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ گزشتہ رات ایک جھڑپ میں بھارتی فوج کا ایک میجر اور سات فوجی مجاہدین کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ اس جھڑپ میں دو مجاہد بھی شہید ہوئے تھے۔ جبکہ دوسرے مجاہدین پہاڑیوں میں روپوش ہو گئے تھے۔

بھارتی فوجیوں کا ایک دستہ شہید ہونے والے مجاہدین کی لاشیں لے کر پتن پہنچ گیا۔ پتن زیادہ بڑا قصبہ نہیں تھا۔ بھارتیوں نے مجاہدین کی لاشیں قصبے کے مرکزی چوک پر ڈال دیں اور اعلان کر دیا کہ یہاں پناہ لینے والے مجاہدین کو اُن کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر کسی مجاہد نے پتن کا رُخ نہیں کیا تھا۔

بھارتی فوجیوں نے سنگدلی اور بربریت کا ایک اور مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں شہید مجاہدین کی آنکھیں نکال دیں اور سنگینوں سے اُن کے پیٹ چاک کر دیئے اور لاشوں کو ٹانگوں سے پکڑ کر چوک میں گھسیٹنے لگے۔

مجاہدین کی لاشوں کی یہ بے حرمتی قصبے والوں کے لئے ناقابل برداشت تھی مگر وہ سب نہتے تھے۔ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن دو نوجوانوں کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ وہ اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے بھارتی فوجیوں پر ٹوٹ پڑے۔ بھارتی فوجی یہ سمجھے کہ گاؤں میں چھپے ہوئے مجاہدین نے اُن پر حملہ کر دیا ہے۔ فوجیوں نے اندھا دُھند فائر کھول دیا۔ اُن پر جھپٹنے والے دونوں نوجوان چھلنی ہو کر گر پڑے۔ اندھا دُھند برسائی جانے والی گولیوں نے کئی اور بیگناہوں کو بھی چاٹ لیا۔ بھارتی درندے کئی بے گناہوں کی لاشیں گرا کر بھاگ گئے۔

اس قسم کے واقعات روز کا معمول بن چکے تھے۔ میری قوت برداشت بھی اب جواب دیتی جا رہی تھی۔ اور اُس روز جب کمانڈر محب اللہ کچھ دیر کے لئے آیا تو میں نے اُس پر اپنی اُکتاہٹ اور بیزاری کا اظہار کر ہی دیا۔ کمانڈر نے سوالیہ نگاہوں سے ڈاکٹر مریم کی طرف دیکھا۔

''اب یہ بالکل ٹھیک ہے......اور میرا خیال ہے کہ آپ کا ساتھ دے سکتا ہے۔'' ڈاکٹر مریم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی اور میں اُچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''میرے خیال میں تمہیں کچھ اور آرام کی ضرورت تھی۔ لیکن ایک اہم مشن میں مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ اس لئے مریم کی بات بھی مان لیتا ہوں۔ تم تیار ہو جاؤ! ہم آدھے گھنٹے بعد یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔'' کمانڈر محب اللہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میرے جسم پر اُس وقت ایک لمبا سا کرتہ اور گھٹنوں تک نیکر تھی۔ مجھے یاد تھا کہ ایک مہینے پہلے جب بھارتی فوجیوں نے ہمارے قصبے پر حملہ کیا تھا تو میں نے پینٹ اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ جبکہ میری ٹانگ کے زخموں کی مرہم پٹی کرنے کے لئے میری پتلون کو کاٹ کر نیکر بنا دیا گیا تھا۔ بعد میں، میں نے ایک ساتھی مجاہد کا کرتہ پہن لیا تھا جبکہ جسم کے نچلے حصے پر وہی نیکر تھی۔

"ایک منٹ...... میں تمہیں ضیغم کے کپڑے دیتی ہوں...... وہ پہن لو!" مریم کہتے ہوئے غار کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ میں بھی اُس کے پیچھے ہی چل پڑا۔ یہ غار بہت بڑا اور کئی حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصے میں راشن اور ضروریات کا دیگر سامان رکھا ہوا تھا۔ ایک حصہ کچن بنا ہوا تھا۔ اُس طرف کی چھت اور دیواریں دُھویں سے کالی ہو رہی تھیں۔ باقی دو حصے رہائش کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ یہ غار اگرچہ پہاڑ کے اندر خاصی گہرائی میں تھا لیکن یہاں گھٹن کا احساس بالکل نہیں تھا۔ تازہ ہوا کسی نہ کسی طرف سے آتی رہتی تھی۔ میں ڈاکٹر مریم کے ساتھ غار کے جس حصے میں آیا تھا وہ مجاہدین کی رہائش کے لئے استعمال ہوتا تھا اور یہ حصہ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ یہاں فرش پر ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ چند رائفلیں رکھی ہوئی تھیں۔ اُن میں دو ایس ایم جی بھی تھیں۔ اُن کے قریب ہی فاضل میگزینز کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اُس دیوار پر ٹھکی ہوئی کیلوں پر کپڑوں کے تین چار جوڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر مریم نے ایک جوڑا اُتار کر میری طرف بڑھا دیا۔ کپڑا کھدر کی طرح موٹا اور کھردرا تھا۔

"یہ کپڑے میں نے کل ہی دھو کر یہاں ٹانگے تھے۔ یہ پہن لو! اور تمہیں رائفل کی بھی ضرورت ہوگی۔" اُس نے یہ کہتے ہوئے رائفلوں کی طرف اشارہ کیا۔ "ان میں سے جو رائفل تمہیں پسند ہو لے لینا اور میگزین بھی۔ تم تیار ہو جاؤ! میں چائے بناتی ہوں۔" ڈاکٹر مریم باہر چلی گئی۔ میں نے کپڑے بدلے اور رائفلیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ مجھے ایک ایس ایم جی پسند آ گئی۔ گلمرگ شاہراہ پر جب ہم نے فوجی قافلے پر حملہ کیا تھا تو اُس وقت بھی میرے پاس سب مشین گن ہی تھی۔

ایس ایم جی چیک کرنے کے بعد میں نے دو میگزین بھی اُٹھا لئے اور غار کے اُس حصے میں آ گیا جہاں کمانڈر محب اللہ بیٹھا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایس ایم جی دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ڈاکٹر مریم قہوہ لے کر آ گئی۔ قہوہ پینے کے دوران زیادہ تر خاموشی ہی رہی۔ کمانڈر محب اللہ نے قہوہ کا آخری گھونٹ بھرا اور خالی مگ فرش پر رکھتے ہوئے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں بھی اُٹھ گیا اور قریب پڑی ہوئی ایس جی ایم اُٹھا کر کندھے پر لٹکا لی۔

ڈاکٹر مریم غار کے دہانے تک ہمارے ساتھ آئی تھی۔ اُس نے میری پیشانی پر بوسہ دے کر اس طرح رخصت کیا جیسے ماں اپنے بیٹے کو اپنی دُعاؤں کے سائے میں محاذِ جنگ پر جانے کے لئے رخصت کرتی ہے۔

میں دو تین مرتبہ پہلے بھی غار کے دہانے تک آ چکا تھا لیکن اس سے آگے کبھی نہیں گیا تھا۔ غار کا دہانہ بہت تنگ اور خاصی بلندی پر تھا۔ اُس کے سامنے چھوٹی چھوٹی چٹانیں تھیں جن کے درمیان بہت تنگ سا راستہ تھا جس میں سے ایک آدمی بمشکل گزر سکتا تھا۔

اُن چٹانوں اور تنگ سے راستے کی وجہ سے یہ غار خاصا پوشیدہ ہو گیا تھا۔ ایک تو کسی اجنبی

کے اس طرف آنے کا امکان نہیں تھا۔ اگر کوئی آ بھی جاتا تو غار تک پہنچ جانا ممکن نہ ہوتا۔ لیکن مجھے حیرت تھی کہ مجاہدین نے یہ غار کس طرح تلاش کیا تھا؟ یہ اُن کے لئے محفوظ ترین پناہ گاہ تھی۔ غار کے باہر ڈیوٹی دینے والے مجاہدین بھی اس طرح اپنی کمین گاہوں میں کھڑے تھے کہ وہ تو کسی کی نظروں میں نہیں آ سکتے تھے البتہ وہ خود نشیب میں دُور دُور تک دیکھ سکتے تھے۔

کمانڈر محب اللہ آگے تھا اور میں اُس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ راستہ خاصا دُشوار گزار تھا۔ کبھی کسی چٹان پر چڑھنا پڑتا اور کبھی نہایت خطرناک تنگ راستوں پر نشیب میں اُترنا پڑتا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ زخمی مجاہدین کو غار تک کس طرح لے جاتے ہوں گے؟

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک اُن پہاڑیوں میں چلتے رہے اور پھر ایک جگہ رُک گئے۔ تقریباً دو سو گز نشیب میں دریا بہہ رہا تھا۔ ہم ایک بلند چٹان پر کھڑے تھے جس سے آگے عمودی ڈھلان تھی۔ تیز ہوا مجھے دھکیل رہی تھی اور میں بڑی مشکل سے چٹان پر قدم جمائے کھڑا تھا۔ کمانڈر محب اللہ میرے قریب کھڑا متجسس نگاہوں سے نشیب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہمارے چاروں طرف چنار اور یوکلپٹس کے فلک بوس درخت تھے جو تیز ہوا میں جھوم رہے تھے۔ نشیب میں بہتا ہوا دریا، جھومتے ہوئے درخت اور سبزے کے فرش پر مسکراتے ہوئے رنگ برنگے خود رو پھول...... خدا نے اس وادی کو جی بھر کر حسن دیا تھا۔ اس کا اعتراف تو غیر ملکی سیاحوں نے بھی کیا تھا کہ یہ دنیا کی حسین ترین وادی تھی۔ لیکن متعصب اور غاصب ہندوؤں کے گندے وجود نے اس وادی کے حسن کو گہنا دیا تھا۔ اُن کا وجود اس وادی کے حسن پر ایک بدنما دھبہ تھا اور کشمیر کے غیور عوام وادی کو ان کے گندے وجود سے پاک کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اور مجھے خوشی تھی کہ اب میں بھی آزادی کی اس جدوجہد میں شریک ہو گیا تھا۔

کمانڈر محب اللہ اب بھی چٹان پر کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ راستہ بھول گیا ہو۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا تو جیسے اُس نے میرا ذہن پڑھ لیا ہو۔ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں راستہ نہیں بھولا ہوں۔ ان پہاڑی راستوں سے تو میں اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح واقف ہوں۔" اُس نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے گویا ہوا۔ "عام طور پر ہم دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں جو قدرے طویل ہے۔ تمہاری وجہ سے آج میں اس طرف سے آیا ہوں۔ یہ راستہ کٹھن ضرور ہے مگر آدھے کا فرق پڑ جاتا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ چٹان کی عمودی ڈھلان سے نیچے اُترنے لگا۔ میں بھی سنبھل کر اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ ڈھلان ختم ہو گئی مگر ہم سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں میں مسلسل نشیب کی طرف جا رہے تھے اور بالآخر تقریباً آدھے گھنٹے بعد چٹانوں سے نکل کر ہم دریا کے سامنے پہنچ گئے۔

دریا کا منہ زور پانی بڑے بڑے پتھروں سے ٹکراتا، اُچھلتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ہم دریا کے ساتھ ساتھ پتھروں کی آڑ میں چلتے رہے۔ اور پھر بتدریج کنارے سے دُور ہٹتے ہوئے ایک بار پھر

چٹانوں میں داخل ہو گئے۔ اس مرتبہ ہمیں چٹانوں میں زیادہ اندر تک نہیں جانا پڑا۔ محب اللہ چٹانوں میں ایک تنگ سی دراڑ کے قریب رُک گیا۔ اُس نے مُڑ کر میری طرف دیکھا اور اُس دراڑ میں داخل ہو گیا۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی۔

دراڑ اتنی تنگ تھی کہ ایک آدمی بمشکل اس میں سے گزر سکتا تھا۔ میری کمر دیوار کے ساتھ رگڑ کھا رہی تھی۔

تقریباً دس گز آگے جا کر دراڑ بائیں طرف مُڑ گئی۔ اس جگہ دونوں طرف کی دیواریں ایک دوسرے سے دُور ہٹ گئی تھیں اور راستہ کافی کشادہ ہو گیا تھا۔ چلتے چلتے میں نے سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا اور میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا...... اُوپر سے دونوں چٹانیں ایک دوسرے سے اس قدر قریب تھیں کہ اُن کے بیچ میں ایک فٹ چوڑی روشن لکیر سی نظر آ رہی تھی۔ لیکن روشنی زمین تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

''یہاں اندھیرا ہے...... مگر راستہ بالکل صاف ہے۔ میرے پیچھے پیچھے چلتے آؤ!'' کمانڈر محب اللہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور میں اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

راستہ مسلسل ڈھلوان تھا اور پھر میں نے محسوس کیا کہ اندھیرا کچھ بڑھ گیا تھا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا، اُوپر بلندی پر روشنی کی وہ لکیر بھی اب نظر نہیں آ رہی تھی۔ محب اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں اُس کے پیچھے چلتا رہا۔ میرے چلنے کے انداز میں جھجک سی تھی جیسے اندیشہ ہو کہ میرا کوئی قدم مجھے حادثے سے دوچار نہ کر دے۔ لیکن اس کے برعکس کمانڈر محب اللہ بلا جھجک چلتا جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں یا تو بلی کی طرح اندھیرے میں بھی دیکھ لینے کی صلاحیت موجود تھی یا وہ اس راستے سے اتنی اچھی طرح واقف تھا کہ گہری تاریکی میں بھی قدم اُٹھانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

کمانڈر محب اللہ ایک جگہ رُک گیا۔ اُس جگہ ایک مانوس سی آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ میں غور سے اُس آواز کو سننے لگا جیسے آس پاس کہیں پانی بہہ رہا ہو۔

محب اللہ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا مگر تاریکی اس قدر گہری تھی کہ مجھے اپنے بالکل ساتھ کھڑا ہوا کمانڈر محب اللہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

اور پھر دفعتہً میرے قریب ہی روشنی چمک اُٹھی۔ میں اُچھل پڑا...... پھر میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ روشنی محب اللہ کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی تھی۔ وہ اب تک اندھیرے میں چلتا رہا تھا۔ اُس کے قدم اُٹھانے میں ذرا بھی جھجک نہیں تھی۔ لیکن اب شاید آگے راستہ مخدوش تھا جس وجہ سے اُسے ٹارچ روشن کرنی پڑی تھی۔

ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر حرکت کر رہی تھی۔ میں گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے روشنی کے ساتھ ساتھ دیدے گھما رہا تھا۔ ہم ایک تنگ سی دراڑ کے راستے چٹانوں میں داخل ہوئے مسلسل نشیب کی طرف چلتے رہے تھے۔ اب یہ جگہ ایک بہت کشادہ سرنگ کا منظر پیش کر رہی تھی اور سماعت سے ٹکرانے والی اُس آواز کے بارے میں شبہ درست نکلا۔

یہ سرنگ تقریباً ڈیڑھ سو فٹ کشادہ تھی۔ اور اُس کے آدھے سے زیادہ حصے میں جو نسبتاً نشیب کی طرف تھا، پانی بہہ رہا تھا اور اُس کی گنگناہٹ کی آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

کمانڈر محب اللہ نے اشارہ کیا اور ہم ایک بار پھر سرنگ کی دیوار کے ساتھ ساتھ آگے چلنے لگے۔ اُس راستے میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے گڑھے تھے۔ اور اندھیرے میں یہ گڑھے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے اور اسی لئے کمانڈر محب اللہ نے ٹارچ روشن کر لی تھی۔

راستہ مسلسل نشیب کی طرف جا رہا تھا اور مجھے لگتا تھا جیسے ہم تحت الثریٰ میں اُتر رہے ہوں۔

''یہ اس دریا کا حصہ ہے جس کے قریب سے ہم گزر کر آئے ہیں۔'' کمانڈر محب اللہ بتا رہا تھا۔ ''یہ دریا صدیوں سے یہاں بہہ رہا ہے اور یہ چٹانیں بھی صدیوں سے یہاں موجود ہیں۔ کسی جگہ پانی نے چٹانوں کو کاٹ کر راستہ بنا لیا ہے۔ چٹانوں کو کاٹنے کا یہ عمل بھی سال دو سال میں نہیں صدیوں میں پایہ تکمیل کو پہنچا ہو گا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''یہ غار یا سرنگیں بھی صدیوں سے یہاں موجود ہیں۔ ان کے اندر اب بھی شکست و ریخت ہوتی رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی یہ چھت بیٹھ جائے اور یہ پُراسرار غار بھی عام لوگوں کی نظروں میں آ جائیں۔ لیکن فی الحال تو یہ صرف مجاہدین کے استعمال میں ہیں۔ شاید قدرت نے صدیوں پہلے یہ غار ہمارے لئے ہی بنائے تھے۔''

میں کمانڈر کی باتیں سنتا ہوا خاموشی سے اُس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ چٹانوں کے نیچے پھیلے ہوئے یہ غار ایسے تھے کہ اُن میں فوج کی پوری بٹالین چھپائی جا سکتی تھی یا مجاہدین اپنا اڈہ بنا سکتے تھے۔ لیکن شاید یہ سرنگیں ان دونوں مقاصد کے لئے مناسب نہیں تھیں اسی لئے یہاں کوئی خفیہ پناہ گاہ قائم کرنے کی بجائے ان سرنگوں کو محض گزرگاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

''یہ سرنگیں صرف ہمارے علم میں نہیں ہیں...... بھارتی فوجی بھی ان سے واقف ہیں۔'' کمانڈر محب اللہ جیسے میرے دل کی بات جان کر کہہ رہا تھا۔ ''لیکن وہ صرف ایک راستے سے واقف ہیں اور اس طرف سے بھی وہ کبھی زیادہ اندر تک نہیں آئے کیونکہ اس دہانے سے تقریباً پچاس گز آگے پانی خاصا گہرا ہے۔ وہ اس دہانے میں چند گز آگے آ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اُن کے خیال میں فرار ہونے والے مجاہدین اس طرف نہیں آ سکتے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن مجاہدین نے بھی فرار کے ایسے ایسے راستے تلاش کر رکھے ہیں جن کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور یہ راستے تقریباً چالیس سال سے مجاہدین کے استعمال میں ہیں۔ ہمارے خفیہ دہانے کے آس پاس کئی مرتبہ اِکا دُکا مجاہدین پکڑے بھی گئے ہیں۔ اُن پر بے پناہ تشدد بھی کیا گیا لیکن اُنہوں نے اپنی جان تو دے دی لیکن یہ راز فاش نہیں کیا۔''

ہم ان پُراسرار سرنگوں میں تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے اور مجھے حیرت ہو رہی تھی

کہ یہ سرنگیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔نصف میل کا مزید فاصلہ طے کرنے کے بعد یہ سرنگ دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔غلیل کے دو شاخ کی طرح ہم دائیں طرف والی سرنگ میں مُڑ گئے۔

اُس طرف سامنے بہت دُور روشنی کا ایک نقطہ سا نظر آرہا تھا۔کمانڈر محبّ اللہ نے ٹارچ بجھا دی اور تاریکی میں اُس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''وہ سامنے اس سرنگ کا وہ دہانہ ہے جس کے بارے میں بھارتی فوجی بھی جانتے ہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔''آگے چند گز تک راستہ ذرا دُشوار ہے لیکن خطرناک نہیں...... دیوار کا سہارا لے کر چلتے رہو!''

گھپ تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔یہاں پانی دیوار کے ساتھ تھا۔ میرے پیر ٹخنوں تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔میں دونوں ہاتھوں سے دیوار کا سہارا لے ٹٹول ٹٹول کر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔سامنے سرنگ کے دہانے کا وہ روشن نقطہ شیطان کی آنکھ کی طرح مجھے گھورتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

تقریباً بیس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ سرنگ ایک بار پھر دائیں طرف مُڑ گئی۔میں بھی دیوار کے ساتھ چلتا ہوا اُس طرف مُڑ گیا تھا۔کمانڈر محبّ اللہ نے ٹارچ روشن کر لی۔وہ مجھ سے چند گز آگے تھا۔

اُس سرنگ میں زیادہ پانی نہیں تھا۔ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے پانی کم ہوتا جا رہا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس مرتبہ ہم نشیب کی بجائے بلندی کی طرف جا رہے تھے۔اب آگے پانی بھی نہیں رہا تھا اور سرنگ بھی بتدریج تنگ ہوتی جا رہی تھی۔

کمانڈر محبّ اللہ ایک بار پھر رُک گیا۔آگے سرنگ بند ہوگئی تھی۔دیوار ناہموار تھی۔پتھر باہر کو اُبھرے ہوئے تھے۔وہ چند لمحے ٹارچ کی روشنی میں اُن پتھروں کو دیکھتا رہا پھر بڑی پھرتی سے اُن پتھروں کے سہارے اُوپر چڑھتا چلا گیا۔تقریباً پندرہ فٹ اُوپر جا کر وہ آگے کو نکلی ہوئی ایک کارنس پر ٹک گیا اور ٹارچ کا رُخ نیچے کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

''آجاؤ...... ڈرو نہیں! تمہیں اُوپر آنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔''

میں نے کندھے پر لٹکی ہوئی رائفل کو درست کیا اور اُبھرے ہوئے پتھروں کا سہارا لے کر اُوپر چڑھنے لگا۔مجھے واقعی کوئی مشکل پیش نہیں آرہی تھی۔سکول کے زمانے میں، میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلتا ہوا قصبے کے باہر پہاڑیوں پر چلا جاتا تھا۔خطرناک چٹانوں پر چڑھنا میری ہابی تھی۔ہم دوستوں میں شرطیں لگ جاتیں کہ کون پہلے چٹان کی چوٹی پر پہنچتا ہے؟ میں کبھی پہلے نمبر پر آتا اور کبھی دوسرے نمبر پر۔میرا وہ تجربہ اب میرے کام آرہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ آئندہ بھی بچپن اور لڑکپن کے وہ تجربات میرے کام آتے رہیں گے۔

میں کافی اُوپر پہنچ چکا تھا۔کارنس پر گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے کمانڈر محبّ اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اُوپر کھینچ لیا۔اس سے آگے بھی ہم چٹان کے سینے میں واقع ان گھپ پہاڑوں م

اُوپر چڑھتے رہے۔اب تازہ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے میرے چہرے سے ٹکرا رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ ہم کھلی جگہ پر نکلنے والے ہیں۔

اور پھر ویسی ہی ایک تنگ سی دراڑ سے نکل کر کھلی جگہ پر آگئے...... ہمارے چاروں طرف سبزہ تھا اور درختوں کے جھنڈ تھے۔درختوں کے جھنڈ سے نکل کر تقریباً سو گز آگے ہم ایک چٹان کے قریب رُک گئے۔سامنے نشیب میں بہت دُور بارہ مولا شہر تھا۔میرے خیال میں اس چٹان سے شہر کا فاصلہ دو میل کے لگ بھگ ضرور ہوگا۔

''اگر ہم دوسرے راستے سے آتے تو اس طرف نکلتے۔'' کمانڈر محبّ اللہ نے نیلے پتھروں والی ایک چٹان کی طرف اشارہ کیا۔''لیکن اس طرف سے فاصلہ بہت زیادہ ہے۔جبکہ ہم نے اس راستے سے آکر آدھا وقت بچا لیا ہے۔وہ سامنے بارہ مولا ہے......لیکن ہم شہر کی طرف نہیں جائیں گے۔اس طرف آجاؤ!''

میں کمانڈر محبّ اللہ کے ساتھ دائیں طرف کی چٹانوں پر اُترنے لگا۔نوکدار چٹانوں کا سلسلہ جلد ہی ختم ہوگیا۔آگے ڈھلوان سبزہ زار تھا جس کے اختتام پر نشیب میں دُور تک خوبصورت وادی پھیلی ہوئی تھی۔وہاں باغات بھی تھے اور کھیت بھی جن میں کہیں کہیں اِکا دُکا مکان بھی نظر آرہے تھے۔ہم اُس ڈھلان پر اُترتے ہوئے بارہ مولا شہر سے بائیں طرف ہٹتے جا رہے تھے۔

ہم کھیتوں اور باغوں میں سے گزرتے ہوئے ایک مکان کے سامنے پہنچ گئے۔دو آدمی اچانک ہی کسی طرف سے نکل کر ہمارے سامنے آگئے...... وہ ادھیڑ عمر تھے مگر اُن کے ہاتھ پیر خاصے مضبوط تھے۔

''باقی لوگ کہاں ہیں غفورے......؟'' کمانڈر محبّ اللہ نے اُن میں سے ایک سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں......'' غفور نامی اُس شخص نے جواب دیا۔''دراصل ایک گھنٹہ پہلے پولیس کی ایک جیپ اِدھر آئی تھی۔میں نے لڑکوں کو کھیتوں میں اِدھر اُدھر نکال دیا۔''

''پولیس......کیوں؟'' محبّ اللہ کی آنکھوں میں اُلجھن سی تیر گئی۔

''ایک ملزم پولیس کی حراست سے بھاگ نکلا تھا۔'' غفورے نے جواب دیا۔''تقریباً چار ہفتے پہلے اُسے اپنے ایک دوست کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔آج اُسے پہلی مرتبہ عدالت میں پیش کرنے کے لئے لے جایا جا رہا تھا کہ راستے میں موقع ملتے ہی ایک پولیس والے کو زخمی کر کے بھاگ نکلا۔وہ پولیس کی رائفل بھی لے گیا تھا۔پولیس والوں کا کہنا ہے کہ اُسے فرار ہو کر اس طرف آتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔میرا خیال ہے وہ پہاڑوں کی طرف نکل گیا ہوگا۔اور ظاہر ہے پولیس والے اس کے پیچھے ان پہاڑوں میں نہیں جا سکتے۔یہیں سے پوچھ کر دوسری طرف چلے گئے۔''

''ہوں......'' کمانڈر محبّ اللہ ہنکارہ بھر کر رہ گیا۔

غفور اور اُس کا ساتھی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن محبّ اللہ نے اُن سے میرا تعارف کرانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ مکان کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''تم ہمارے لئے چائے بناؤ! اور تم لڑکوں کو اطلاع کر دو کہ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی یہاں جمع ہو جائیں۔ ہمیں آج رات گلمرگ کی طرف جانا ہے۔''

غفور سر ہلاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ اُس نے محبّ اللہ کا پیغام دوسرے آدمی کے گوش گزار کر دیا جو کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

آدھے گھنٹے بعد غفورا چائے بنا کر لے آیا۔ میں اُس وقت فرش پر بچھے ہوئے نمدے پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کٹھن سفر نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ اگر مہینہ بھر بیمار نہ رہا ہوتا تو مجھے اس سفر کی پرواہ بھی نہ ہوتی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ چائے کے ساتھ ایک پلیٹ میں تلے ہوئے بھیڑ کے گوشت کے قتلے بھی تھے۔

کئی روز بعد دودھ کی چائے نصیب ہوئی تھی۔ گوشت کے تلے ہوئے قتلے بھی مزیدار تھے۔ ہم اپنے ٹھکانے سے دوپہر بارہ بجے کے قریب روانہ ہوئے تھے اور اس وقت چار بجنے والے تھے۔ بھوک لگ رہی تھی اس لئے میں نے خوب پیٹ بھر کر گوشت کھا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیٹ بھرتے ہی مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور میں وہیں ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔

شدید تھکن کی وجہ سے میں نیند میں بھی بے چین سا رہا اس لئے زیادہ دیر تک سو بھی نہ سکا۔ جب میری آنکھ کھلی تو اُس وقت کمرے میں کمانڈر محبّ اللہ کے پاس دو اور آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن میں ایک کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی جبکہ دوسرا پچیس چھبیس سال سے زیادہ کا نہیں تھا۔ دونوں نے لمبے لمبے چوغے پہن رکھے تھے اور سروں پر ٹوپیاں تھیں۔ محبّ اللہ اُن سے شاید کوئی پروگرام طے کر رہا تھا۔ اس وقت وہ اُن دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تم دونوں اسی وقت ماندر کی طرف روانہ ہو جاؤ! کمانڈر رشید کے آدمی وہاں انتظار کر رہے ہوں گے۔ اُن سے کہنا کہ کمانڈر رشید کو میرا پیغام پہنچا دیں کہ ہم صبح چار بجے طے شدہ مقام پر ملیں گے۔''

وہ دونوں اُٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں نے محبّ اللہ کا وہ ایک جملہ سنا تھا جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ ایک مہینہ پہلے گلمرگ کے قریب جس بھارتی فوجی کیمپ کے بارے میں بات ہوئی تھی اُس پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا لیا گیا ہے۔

''میں تمہیں اس لئے ساتھ لایا ہوں......'' کمانڈر محبّ اللہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک مہینہ پہلے تم نے میری اور کمانڈر رشید کی باتیں سنی تھیں۔ گلمرگ کے قریب اُس ڈپو میں اسلحہ اور گولہ بارود کے انبار لگنا شروع ہو گئے ہیں۔ یہی گولہ بارود وادی کے بے گناہ اور معصوم کشمیری عوام پر برسایا جائے گا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان شیطانوں کو گولہ بارود استعمال کرنے کا موقع ملے ہم اُس ڈپو کو تباہ کر دیں گے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''یوں تو اس وسیع و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے کیمپ پر حملہ کرنے کے لئے بہت سے آدمیوں کی ضرورت ہوگی لیکن میں نے اور کمانڈر رشید نے طے کیا ہے کہ زیادہ بھیڑ بھاڑ اکٹھی نہیں کی جائے گی۔ صرف گنتی کے چند نوجوان ہوں گے جن کا انتخاب ہم دونوں نے کیا ہے اور اُن میں تمہارا نام بھی شامل ہے۔ تمہارا انتخاب اگرچہ میں نے کیا تھا مگر تمہارے نام کی سفارش کمانڈر رشید اور عبدالغنی لون نے بھی کی تھی۔''

''یہ میری خوش قسمتی ہے کہ......''

''ایک منٹ...... پہلے میری پوری بات سن لو!'' کمانڈر محبّ اللہ نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''ہم نے کیمپ پر حملہ کرنے کے لئے جو پارٹی تیار کی ہے اُسے ڈیتھ اسکواڈ کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا اس کارروائی میں خود اپنے زندہ بچ جانے کے امکانات بھی ایک فیصد سے زیادہ نہیں ہیں۔ بالفاظ دیگر تم لوگ موت کے منہ میں چھلانگ لگانے جا رہے ہو۔ اس لئے اگر تم......''

''میں سمجھ گیا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں کمانڈر!'' اس مرتبہ میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''لیکن اس حقیقت سے آپ بھی بخوبی واقف ہیں کہ مجاہد کا اُٹھا ہوا قدم پیچھے نہیں ہٹتا۔ وہ آگے اور صرف آگے بڑھنا جانتا ہے۔ اگر میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے اُن بھیڑیوں کے بھٹ کو تباہ کر کے اپنے لوگوں کو اور وادی کو ایک بڑی تباہی سے بچا لوں تو میں سو مرتبہ موت کے منہ میں کودنے کو تیار ہوں۔ میں اپنا نام واپس نہیں لوں گا کمانڈر!''

کمانڈر محبّ اللہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر اُس نے بے اختیار ہو کر میری پیشانی چوم لی۔ ''تم جیسے نوجوانوں میں یہ جذبہ ہو تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی اور ہماری منزل ہے آزادی...... وہ زنجیریں ایک روز ضرور ٹوٹیں گی جنہوں نے کشمیریوں کی آزادی سلب کر رکھی ہے۔ ہم اس جنت سے اُن شیطانوں کو نکالنے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔''

''انشاءاللہ......'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اسی لمحہ تین اور آدمی کمرے میں داخل ہوئے...... اُنہوں نے بھی کاشتکاروں کی طرح موٹے کپڑے کے لمبے لمبے چوغے پہن رکھے تھے۔ وہ ہم دونوں سے ہاتھ ملا کر ہمارے قریب بیٹھ گئے۔ وہ دونوں گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''یہ شمروز ہے......'' کمانڈر محبّ اللہ نے اُن سے میرا تعارف کرایا۔ اس کا نام تم لوگوں کے لئے اجنبی نہیں ہے۔ یہ بھی اس مشن میں ہمارے ساتھ ہوگا۔ مقبول اور حسن!'' اُس نے باری باری دونوں جوانوں کی طرف دیکھا۔ ''تم دونوں کھانا کھا کر شمروز کے ساتھ گلمرگ کی طرف روانہ ہو جاؤ! لیکن تم لوگوں کو گلمرگ نہیں جانا۔ بسال پور بستی میں ہمارا انتظار کرو گے۔ ہم بھی رات کے پچھلے پہر وہاں پہنچ جائیں گے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے

کہنے لگا۔ ''ایسی کوئی توقع تو نہیں...... لیکن اگر کوئی گڑبڑ محسوس کرو تو گلمرگ کے اُوپر سے ہوتے ہوئے فیروز پور پہنچنے کی کوشش کرنا۔''

''سمجھ گیا کمانڈر!'' مقبول نامی نوجوان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور موسیٰ تم......'' کمانڈر محب اللہ نے تیسرے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی کھانا کھا کر رحمن کو ساتھ لے کر عبدالغنی لون کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ تمہیں معلوم ہے عبدالغنی لون سے کہاں ملاقات ہوگی۔''

''جانتا ہوں کمانڈر!'' موسیٰ نے بھی گردن ہلا دی۔

میں تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر باہر آ گیا۔ شام کا دھندلکا سا پھیلنے لگا۔ مکان سے تقریباً بیس گز آگے شفاف پانی کی ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ میں ندی کے کنارے پر بیٹھ گیا اور جوتے اُتار کر پیر پانی میں ڈال دیئے اور آگے جھک کر منہ پر پانی کے چھپکے مارنے لگا۔

مکان کے ساتھ دائیں طرف ایک سائبان سا بنا ہوا تھا اور شاید وہاں باورچی خانہ تھا۔ چاول اُبالے جا رہے تھے۔ اُس وقت بڑی اشتہا آمیز خوشبو آ رہی تھی۔

میں کافی دیر تک ندی کے کنارے پر بیٹھا رہا۔ سبزے دار تاریکی کی وجہ سے مچھر مجھے مالِ غنیمت سمجھ کر نوچ رہے تھے۔ میں اُٹھ کر اندر آ گیا جہاں اب کیروسین لیمپ روشن کر دیا گیا تھا۔ وہ تینوں نوجوان اب بھی کمانڈر کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں بھی خاموشی سے بیٹھ گیا اور اُن کی باتیں سننے لگا۔

آٹھ بجے کے قریب غفور نے ہمارے سامنے دستر خوان بچھا کر کھانا لگا دیا۔ اُبلے ہوئے چاول اور مسور کی پتلی سی دال تھی لیکن یہ دال چاول کھا کر بھی مزہ آ گیا۔ کھانے کے بعد چائے بھی پی گئی اور پھر اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں، مقبول اور حسن روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔ محب اللہ نے بڑی گرمجوشی سے ہمیں رخصت کیا تھا۔

ہم تینوں کھیتوں میں ایک پگڈنڈی پر چل پڑے۔ مقبول آگے تھا، میں بیچ میں اور حسن پیچھے۔ ان دونوں کے ڈھیلے چوغوں کے نیچے بھی آٹومیٹک رائفلیں چھپی ہوئی تھیں۔

بارہ مولا سے گلمرگ کا فاصلہ بیس بائیس میل کے لگ بھگ تھا اور میں سمجھ رہا تھا کہ شاید یہ فاصلہ ہمیں پیدل ہی طے کرنا ہوگا۔ لیکن تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کر کے ہم رُک گئے۔ سامنے ایک جگہ لالٹین کی مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ بہت بڑا چھپر تھا جس کے نیچے بھیڑوں اور بکریوں کا ایک بہت بڑا باڑہ تھا۔ اور ایک طرف چند خچر بھی بندھے ہوئے تھے۔ لالٹین زمین میں گڑھی ہوئی لکڑی کی بلی کی ایک کھونٹی پر لٹکی ہوئی تھی۔ ہم جیسے ہی وہاں پہنچے ایک آدمی تاریکی سے نکل کر سامنے آ گیا...... یہ وہی آدمی تھا جسے میں نے شروع میں غفور کے ساتھ دیکھا تھا۔ ہماری آوازیں سن کر بھیڑیں اور بکریاں بھی ممیانے لگی تھیں اور پھر ایک خچر بھی ہنہنا اُٹھا۔ اُس نے شاید بھیڑوں اور بکریوں کو اس طرح شور مچانے پر سرزنش کی تھی اور حیرت انگیز طور پر

بھیڑیں اور بکریاں خاموش ہو گئیں۔

''خچر تیار ہیں...... تم لوگ روانہ ہو جاؤ!'' اُس شخص نے مقبول کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہاں کئی خچر تھے۔ اُس شخص نے تین خچروں کی رسیاں کھول کر ہمارے حوالے کر دیں۔ یہی رسیاں لگام کا بھی کام دے رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ خچروں پر پوری زینیں کسی ہوئی ہوں گی۔ مگر ہر خچر کی پیٹھ پر نمدے یا پرانے کمبل کا ایک ایک ٹکڑا پڑا تھا اور دونوں طرف رکابیں لٹکی ہوئی تھیں۔ مجھے تو خچر کی ننگی پیٹھ پر بھی سفر کرنے کا تجربہ تھا۔ میں اُچھل کر اپنے خچر پر سوار ہو گیا اور لگام تھام لی۔

ہماری فارمیشن وہی تھی۔ یعنی آگے مقبول، اُس کے پیچھے میں اور آخر میں حسن۔ خچر خاصے صحت مند تھے۔ شروع میں تو رفتار کچھ کم رہی، پھر مقبول نے خچر دوڑانا شروع کر دیا۔ ان علاقوں میں جہاں دن کے وقت قدم قدم پر بھارتی فوجیوں کی کسی نہ کسی گشتی پارٹی سے آمنا سامنا ہو جاتا تھا مجاہدین کے لئے رات کے وقت سفر کرنا زیادہ محفوظ تھا۔ بھارتی فوجی رات کے وقت اپنی چھاؤنیوں اور کیمپوں سے باہر نکلنے کی حماقت نہیں کرتے تھے۔ جبکہ مجاہدین بلا خوف و خطر اپنی نقل و حرکت جاری رکھتے تھے۔ بھارتی فوجی کیمپوں پر اُن کی چھاپہ مار کارروائیاں بھی رات ہی کو ہوتی تھیں۔ وہ بھارتی فوجیوں پر موت برسا کر رات کی تاریکی میں پہاڑوں میں روپوش ہو جاتے تھے۔

بعض مقامات ایسے تھے جہاں بھارتی فوجیوں نے چوکیاں قائم کر رکھی تھیں۔ لیکن یہ چوکیاں آبادیوں کے قریب عام گزرگاہوں پر تھیں۔ جبکہ ہم پہاڑیوں میں ایسے تنگ راستوں پر سفر کر رہے تھے جہاں کسی فوجی پارٹی سے آمنا سامنا ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔

راستہ اگرچہ خاصا کٹھن تھا لیکن ہماری رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ اس طرح ہم ساڑھے گیارہ بجے کے قریب بسال پور پہنچ گئے۔

بسال پور گلمرگ سے تقریباً پانچ میل دُور تیس چالیس گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ پہاڑ کے دوران میں آباد اس بستی کے اطراف میں گھنا جنگل تھا۔ ایک طرف کی زمین کاشت کے قابل تھی جہاں موسم کے مطابق فصلیں اُگائی جاتی تھیں۔ مختصر سی کھیتی باڑی کے علاوہ جنگل کی کٹائی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اصل کمائی تو اُن لوگوں کی تھی جو جنگل کی کٹائی کا ٹھیکہ لیتے تھے۔ مقامی لوگ تو بیچارے دن رات محنت کر کے بمشکل دو وقت کی روٹی کھاتے تھے۔

بستی کے باہر دُور تک کٹے ہوئے درختوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ دو تین دیو قامت آرا مشینیں تھیں جن پر صبح سے شام تک کام ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت ہر طرف سناٹا تھا۔ بستی میں داخل ہوتے ہوئے بھی مقبول کا خچر آگے تھا۔ اور بالآخر وہ ایک مکان کے دروازے پر رُک گیا۔ ہلکی سی دستک کے جواب میں دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی جس نے ہاتھ میں لالٹین اُٹھا رکھی تھی۔ ہم خچروں سے اُتر آئے

تھے۔ اُس عورت نے لالٹین کی روشنی میں ہمارے چہرے دیکھے۔ مقبول اور حسن کو تو وہ شاید پہچانتی تھی لیکن میری طرف دیکھتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں اُلجھن سی تیر گئی۔

''پریشان نہ ہو ماسی...... یہ ہمارا ہی ساتھی ہے۔'' مقبول نے اُس کی اُلجھن کو تاڑتے ہوئے بتایا۔

عورت نے اندر کی طرف دیکھ کر ہلکی آواز میں کسی کو پکارا۔ فوراً ہی ایک آدمی دروازے پر پہنچ گیا۔ وہ بھی اُس کی طرح ادھیڑ عمر تھا۔

''نور محمد!'' عورت اُس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''حسن اور تینوں خچروں کو احمد بھائی کی طرف لے جاؤ! اور تم دونوں اندر آ جاؤ۔'' آخری الفاظ اُس نے مجھے اور مقبول کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے۔ نور محمد تینوں خچروں اور حسن کو لے کر گلی میں آگے چلا گیا۔ میں اور مقبول مکان میں داخل ہو گئے۔ اُس عورت نے دروازہ بند کر دیا اور ہمیں اشارہ کرتے ہوئے صحن میں ایک طرف چلنے لگی۔ صحن خاصا وسیع و عریض تھا۔ سامنے دو کمرے تھے۔ ایک کمرہ بائیں طرف تھا۔ ''ایل'' شکل کے بنے ہوئے ان کمروں کے سامنے کشادہ برآمدہ بھی تھا۔

ایک کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری نظر اندر کی طرف اُٹھ گئی۔ سامنے ہی فرش پر ایک جوان اور خوبصورت لڑکی بیٹھی مٹی کے تیل کے لیمپ کی روشنی میں کپڑے پر کڑھائی کر رہی تھی۔ میں رُکے بغیر دروازے کے سامنے سے گزرتا ہوا ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ ادھیڑ عمر عورت بھی ہمارے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اُس نے لالٹین کمرے کے ایک کونے میں رکھ دی۔

''تم لوگ کھانا کھاؤ گے یا چائے پیو گے؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہ کھانا نہ چائے۔'' مقبول نے جواب دیا۔ ''بہت تھکے ہوئے ہیں ماسی! اس وقت تو سو جانا چاہتے ہیں۔''

عورت واپس چلی گئی۔ میں کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ فرش کے آدھے حصے پر دری بچھی ہوئی تھی اور آدھے حصے پر چٹائی تھی۔ دری پر ایک بستر بھی بچھا ہوا تھا اور دو کمبل پڑے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی میلے سے تکیے بھی رکھے ہوئے تھے۔ دیوار پر لگی ہوئی کھونٹیوں پر چند کپڑے ٹنگے ہوئے تھے جن میں دو زنانہ جوڑے بھی تھے۔ بستر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اہل خانہ کو ہماری آمد کی اطلاع پہلے سے تھی اور ہمارے لئے سونے کا بندوبست کر رکھا تھا۔

میں نے اپنے کندھے پر لٹکی ہوئی ایس ایم جی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی، جوتے اُتار کر ایک طرف ڈالے اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ خچر پر تقریباً چار گھنٹوں کے سفر نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ میں لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو کھلے ہوئے دروازے کے باہر آنگن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ مقبول کمرے میں موجود نہیں تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میری ایس ایم جی غائب تھی اور

مقبول کی رائفل بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر باہر سے مقبول کی آواز سن کر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ مقبول اُس ادھیڑ عمر عورت سے باتیں کر رہا تھا۔ عورت نے میری طرف دیکھا اور پھر صحن کے باہر والے دروازے کی طرف چلی گئی۔ میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا مقبول کے قریب پہنچ گیا۔

''مقبول...... ہماری رائفلیں غائب ہیں۔'' میں نے اُس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔

OOO

"پریشان مت ہو...... رائفلیں محفوظ ہیں۔" مقبول نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "دن میں بھارتی فوجیوں کی کوئی نہ کوئی پارٹی اس طرف آ جاتی ہے۔ اور وہ لوگ اسلحہ کی تلاش میں گھروں کی تلاشی بھی لیتے ہیں۔ ہماری رائفلیں بھی چھپا دی گئی ہیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ تم منہ ہاتھ دھو لو! کھانا تیار ہو رہا ہے۔"

مقبول کمرے میں چلا گیا اور میں صحن میں اس طرف چلا گیا جہاں پانی کا ڈرم رکھا ہوا تھا۔ قریب ہی پانی سے بھری ہوئی ایک بالٹی اور پلاسٹک کا لوٹا بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے نل کی ٹونٹی کھول دی اور منہ ہاتھ دھونے لگا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے قمیض کے دامن ہی سے منہ صاف کیا اور جیسے ہی مڑا میرے دماغ میں ایک جھماکہ سا ہوا...... سانس کی رفتار تیز ہو گئی اور دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ لڑکی ہمارے کمرے سے نکل رہی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے رات کو میں نے لیمپ کی روشنی میں کڑھائی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ رات کو تو دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُس پر صرف ایک نظر ڈالی تھی اور اب وہ تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ میرے سامنے کھڑی تھی...... لمبا قد، سڈول جسم، گلاب جیسی رنگت، غزال جیسی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں جن میں ستاروں جیسی چمک تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب سی مسکراہٹ تھی۔

اُس نے کالے رنگ کا ٹخنوں تک لمبا کرتا پہن رکھا تھا۔ وی شیپ کے گلے پر سفید اور پیلے دھاگے کی کڑھائی تھی۔ اُس کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ رہی ہو گی لیکن جوانی کا ثمر خاصا نمایاں تھا۔ سینے پر سے کرتا تنا ہوا تھا۔ سیاہ بالوں کی دو چوٹیاں تھیں اور دونوں چوٹیاں سینے پر جھکی ہوئی تھیں۔

"میں نے کھانا رکھ دیا ہے۔ مقبول بھائی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

مجھے یوں لگا جیسے میرے کانوں میں چاندی کی ننھی ننھی سی گھنٹیاں گنگنا اُٹھی ہوں۔ میں نے چونک کر ایک بار پھر اُس کی طرف دیکھا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

وہ انگوری تھی۔ خادم حسین کی بیٹی جو تین سال پہلے بڈگام کے قریب بھارتی فوجیوں کے ساتھ ایک جھڑپ میں شہید ہو گیا تھا۔ انگوری کی ماں عائشہ نے بڑی محنت سے اُسے پالا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ شوہر کی شہادت کے بعد عائشہ اپنی جوان بیٹی کو لے کر کہیں دبکی رہتی اور خاموشی سے زندگی بتا دیتی۔ مگر وہ کشمیر کی بیٹی تھی۔ وطن کی آزادی کی لگن نے اُسے بھی تڑپا رکھا تھا۔ وہ

دشمن کے خلاف رائفل نہیں اُٹھا سکتی تھی مگر مجاہدین کا ساتھ بھرپور انداز میں دے رہی تھی۔

خادم حسین جب زندہ تھا تو ٹھیکیدار کے پاس کام کیا کرتا تھا۔ وہ شام تک آرا مشین پر کٹے ہوئے درختوں کے تنوں کو کانٹ چھانٹ کر کے بڑے بڑے شہتیروں میں ڈھالتا رہتا۔ یہ شہتیر ٹرکوں میں لاد کر سرینگر بھیج دیئے جاتے جہاں سے ہندوستان کے مختلف شہروں کو روانہ کر دیئے جاتے۔ خادم حسین کی شہادت کے بعد آمدنی کا یہ ذریعہ ختم ہو گیا۔ عائشہ اور انگوری کشیدہ کاری کا کام کرنے لگیں جس سے اُن کا گزارہ ہو رہا تھا۔

وادی کشمیر کو اللہ تعالیٰ نے قدرتی حسن سے تو نوازا ہی ہے یہاں کے باسیوں کو بھی ایسی صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اغیار اُن کی صلاحیتوں اور ہنرمندی سے تو بھرپور فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور وہ خود فاقہ کشی کا شکار ہیں۔

قالین، دھسے اور شالیں اس نفاست سے تیار کی جاتی ہیں کہ دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ قالین، دھسے اور شالوں کی تیاری گھریلو صنعت کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کام فیکٹریوں میں نہیں چھوٹی چھوٹی بستیوں کے گھروں میں ہوتا ہے۔

زخمی بھیڑوں کی اُون پشمینہ سے دنیا کی بہترین شالیں تیار ہوتی ہیں جو شاہ توش کہلاتی ہیں۔ یہ شالیں بہت مہنگی ہوتی ہیں اور اس قدر نفیس اور باریک ہوتی ہیں کہ انگوٹھی میں سے گزاری جا سکتی ہیں۔ گھروں میں اُون کے نمدے بھی بڑے خوبصورت تیار ہوتے ہیں۔ اور اخروٹ کی لکڑی سے اس قدر خوبصورت اور نازک نقش فرنیچر تیار ہوتا ہے جس کی دنیا بھر میں مثال نہیں ملتی۔

ہنرمندی میں کشمیری خواتین بھی مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ یہ کام زیادہ تر گھروں میں خواتین نے سنبھال رکھا ہے۔ کپڑوں پر کشمیری کشیدہ کاری کی مانگ تو پوری دنیا میں ہے۔ کاروباری لوگ وادی کی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں خواتین سے یہ کام کرواتے ہیں۔ خود تو وہ لاکھوں کماتے ہیں لیکن کیروسین لیمپ کی مندمل روشنی میں دیدوں کا پانی نچوڑنے والی ہنرمند خواتین کو معاوضہ برائے نام ہی دیا جاتا ہے۔

میں اور مقبول دیر تک کمرے میں لیٹے باتیں کرتے رہے۔ پھر اُٹھ کر باہر آ گئے۔ ماسی عائشہ اُس وقت باہر سے آئی تھی۔ اُس نے بغل میں ایک پوٹلی دبا رکھی تھی۔

"کھانا کھا لیا بیٹا؟" اُس نے ہمارے قریب آ کر باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"ہاں ماسی......" مقبول نے جواب دیا۔ "میں ذرا عبدالحق سے ملنے جا رہا ہوں۔ ڈیڑھ دو گھنٹوں میں واپس آؤں گا۔ وہ آرے پر ہی ہو گا نا؟"

"ہاں...... میں نے تھوڑی دیر پہلے ہی اُسے اُس طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا" ماسی نے جواب دیا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اور بیٹا تم اُدھر پچھلی طرف چلے جاؤ۔ وہاں درخت کا سایہ بھی ہے۔ لیکن اگر تم کمرے میں آرام کرنا چاہو تو تمہاری مرضی۔"

ماسی عائشہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مقبول، عبدالحق سے ملنے کے لئے چلا گیا۔ عبدالحق کا کمانڈر محب اللہ اور کمانڈر رشید جیسے مجاہد لیڈروں سے رابطہ رہتا تھا۔ یہاں مجاہدین کو پیغام بھی اُس کے توسط سے ملتے تھے اور مقبول یہی معلوم کرنے جا رہا تھا کہ کمانڈر محب اللہ کی طرف سے کوئی پیغام آیا یا نہیں؟

اُس کے جانے کے بعد میں تنہا صحن میں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ میری نظریں انگوری کو تلاش کر رہی تھیں۔ نجانے کیا بات تھی کہ صبح اُسے دیکھنے کے بعد سے میں اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ بقول شخصے جب میں اُس کے بارے میں سوچتا تو دل میں کچھ کچھ ہونے لگتا تھا۔ میں بار بار اُس کمرے کی طرف دیکھتا جہاں ماسی عائشہ گئی تھی۔ لیکن نہ تو ماسی کمرے سے باہر آئی اور نہ ہی انگوری کی صورت دکھائی دی۔

کمروں کے پچھلی طرف بھی ایک صحن تھا۔ اُس طرف جانے کا راستہ دائیں طرف سے تھا۔ اُس طرف جانے کے لئے میں جان بوجھ کر ماسی عائشہ والے کمرے کے سامنے سے گزرا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے اندر جھانکا لیکن مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ کمرے میں ماسی عائشہ کسی کام میں مصروف تھی لیکن انگوری دکھائی نہیں دی۔ وہ شاید گھر میں ہی نہیں تھی۔

میں کمروں کے اُوپر سے گھوم کر پہلو کی طرف آ گیا۔ دائیں طرف تقریباً آٹھ فٹ اُونچی کچی باؤنڈری وال تھی۔ اس طرح یہاں ایک گلیارہ سا بن گیا تھا۔ اس گلیارے سے گزر کر میں جیسے ہی دوسری طرف پہنچا ٹھٹھک کر رُک گیا۔ سامنے ہی اخروٹ کے بہت بڑے درخت کے گھنیرے سائے میں بچھے ہوئے لکڑی کے تخت پر بیٹھی ہوئی وہ کسی کپڑے پر کڑھائی کر رہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی سینے میں میرا دل مچل اُٹھا اور دھڑکن بے قابو ہو گئی۔

انگوری نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سر جھکائے سوئی سے کپڑے پر ٹانکے بھرتی رہی۔ اور پھر شاید سوئی میں دھاگہ ختم ہو گیا تھا۔ اس وقت اُس نے جیسے ہی چہرہ اُوپر اُٹھایا مجھے سامنے دیکھ کر اُس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی اور اسی وقت عقب سے مجھے ماسی عائشہ کی آواز سنائی دی تھی۔

''ارے بیٹا! تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ بیٹھ جاؤ نا وہاں جا کر۔ دوسرا تخت خالی پڑا ہے۔''

میں تصورات کی دنیا سے باہر آ گیا اور ماسی عائشہ کے ساتھ ہی آگے بڑھ گیا۔

یہ عقبی آنگن بھی بہت کشادہ تھا۔ اخروٹ کا درخت بہت اُونچا اور بہت پھیلا ہوا تھا۔ اُس کے گھنیرے سائے نے آنگن کے بیشتر حصے کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ چارپائی سائز کے لکڑی کے تین تخت قریب قریب پڑے ہوئے تھے۔ ایک پر انگوری بیٹھی کڑھائی کر رہی تھی۔ قریب ہی سوئی دھاگوں والا ڈبہ رکھا ہوا تھا اور کچھ کپڑے پھیلے ہوئے تھے۔ دوسرے دونوں تخت خالی تھے۔

انگوری نے سوئی کپڑے میں کھونچ دی، کپڑے کو ایک طرف رکھا اور اُٹھ کر دوسرے تخت پر چادر بچھا دی۔

''بیٹھ جائیے!'' اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اُس کی نظریں فوراً ہی جھک گئیں...... اُس کی جھکی جھکی سی پلکیں مجھے بہت اچھی لگیں۔ میں پیر لٹکا کر تخت پر بیٹھ گیا۔ انگوری بھی اپنی جگہ پر بیٹھ چکی تھی۔ اُس کا رُخ میری طرف تھا اور میں کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے سر پر رُومال باندھ رکھا تھا اور بالوں کی دونوں چوٹیاں اس وقت بھی اُس کے سینے پر دونوں طرف ٹکی ہوئی تھیں۔ اُسے شاید چوٹیاں آگے ڈالے رکھنے کی عادت تھی۔

انگوری کی کیفیت بھی اس وقت شاید مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ اُس کے چہرے پر سرخی گہری ہو گئی تھی اور سینے کا زیر و بم نمایاں ہو رہا تھا۔ کپڑے پر ٹانکا بدلتے ہوئے اُس نے جھکی جھکی سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اُس کے ہونٹوں سے سی کی آواز نکل گئی۔ سوئی اُس کی اُنگلی میں چبھ گئی تھی۔ میں بھی بے چین سا ہو اُٹھا۔ مجھے لگا جیسے سوئی انگوری کی اُنگلی میں نہیں میرے دل میں چبھی ہو۔ وہ اُنگلی کو منہ میں داب کر چوسنے لگی۔

''اے لڑکی دھیان سے......'' قریب بیٹھی ہوئی ماسی عائشہ نے اُسے گھورا۔

انگوری نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر بہت خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

ماسی عائشہ نے وہ پوٹلی کھول لی جو وہ باہر سے لے کر آئی تھی۔ اُس میں بن سلے زنانہ کپڑے اور رنگ برنگے ریشمی دھاگوں کی لچھیاں تھیں۔ ان کپڑوں پر ڈیزائن بھی ٹریس کئے ہوئے تھے۔ ماسی عائشہ کپڑے کے ساتھ دھاگوں کی لچھیاں بھی الگ الگ کر کے رکھتی رہی اور اس کے ساتھ ہی وہ انگوری سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔ پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''شمروز بیٹا! تمہیں پہلی بار دیکھا ہے۔ اپنے بارے میں کچھ بتاؤ! کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''یہ پوری وادی میرا گھر ہے ماسی!'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے میری پیدائش سوپور کی ہے۔ وہیں پلا بڑھا اور میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ میرے والد رسول بخش لون قصبے کی مسجد کے پیش امام تھے۔ ہماری تھوڑی بہت زمین بھی تھی لیکن ایک روز......'' میں ایک لمحہ کو خاموش ہوا پھر قصبے پر بھارتی فوجی دستے کے حملے اور اُن کی قتل و غارت کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں، میں کہہ رہا تھا۔ ''میں بھی اس جھڑپ میں شدید زخمی ہوا تھا۔ بھارتی فوجی مجھے مُردہ سمجھ کر پھینک گئے۔ ہوش آیا تو اپنے قریب قصبے کی دو لڑکیوں کی نچی ہوئی لاشیں دیکھیں۔'' میں ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اس مرتبہ خاموشی کا وقفہ قدرے طویل تھا۔ وہ دونوں ماں بیٹی افسردہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''اتفاق سے کمانڈر محب اللہ اپنے آدمیوں کے ساتھ اُس طرف آ نکلا اور مجھے اُٹھا لایا۔ میں شاید مر ہی چکا ہوتا مگر ڈاکٹر مریم نے مجھے نئی زندگی دی۔ اگر وہ نہ ہوتی تو......''

''مریم تو فرشتہ ہے بیٹے!'' ماسی عائشہ نے کہا۔ ''اُس نے تو اپنے آپ کو مجاہدین کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ جہاں اُس کی ضرورت ہوتی ہے پہنچ جاتی ہے۔ گھر کا عیش و آرام

چھوڑ کر اُس نے پہاڑوں میں خطرناک زندگی اپنائی ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ اُس نے بھی مجاہدین کی طرح اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی ہے۔ بڑی دلیر لڑکی ہے۔''

''حوصلے اور جذبے کی بات ہے ماسی!'' میں نے کہا۔ ''اور انشاء اللہ یہ جذبہ ہی ہمیں آزادی کی منزل تک لے جائے گا۔''

''انشاء اللہ.....'' انگوری کی آواز سن کر میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اس بار وہ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر شرمائی نہیں۔ اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بھی واضح ہو گئی تھی۔ اس وقت مجھے اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آئی تھی۔ ایسی چمک تو میں نے اُن مجاہدوں کی آنکھوں میں دیکھی تھی جو مادرِ وطن کی آزادی کے لئے بھارتی درندوں کے خلاف برسر پیکار تھے۔

میں نے اور ماسی عائشہ نے بھی بیک وقت انشاء اللہ کہا تھا۔

''ارے بیٹی جا، چائے تو بنا کر لا! بڑا جی چاہ رہا ہے۔'' ماسی عائشہ نے انگوری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

انگوری نے سوئی دھاگہ اور کپڑا اسمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور تخت سے اُتر کر میری طرف دیکھتی ہوئی گلیارے میں چلی گئی۔ ماسی عائشہ اپنا کام کرتے ہوئے مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اُس نے بھرپور انداز میں میرے قصبے کی تباہی اور میرے گھر والوں کی شہادت پر اظہار ہمدردی کیا تھا۔

تقریباً بیس منٹ بعد انگوری گلیارے کی طرف سے نمودار ہوئی۔ اُس نے پلاسٹک کی ایک ٹرے اُٹھا رکھی تھی جس میں شیشے کے دو چھوٹے گلاس قہوے سے بھرے ہوئے رکھے تھے۔ میں گہری نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اگرچہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے ہوئے چل رہی تھی لیکن ڈھیلے ڈھالے کرتے کے اندر اُس کے گداز سینے کے اُبھار اس طرح متحرک تھے جیسے جوانی چھلک رہی ہو۔

قریب آ کر اُس نے میری طرف دیکھا تو مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اُس کی نظریں جھک گئیں۔ اُس نے ایک گلاس میرے قریب تخت پر رکھ دیا اور دوسرا اماں کی طرف بڑھا دیا۔

''تو اپنے لئے چائے بنا کر نہیں لائی؟'' ماسی عائشہ نے کہا۔

''نہیں ماں... میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' انگوری کہتے ہوئے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور سوئی دھاگہ سنبھال کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

چائے پیتے ہوئے بھی میں بار بار انگوری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کا ہاتھ بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ کپڑا اُس کے گھٹنے پر پھیلا ہوا تھا۔ بڑی نفیس اور عمدہ کڑھائی ہو رہی تھی۔

ابھی میری چائے ختم نہیں ہوئی تھی کہ مقبول بھی آ گیا۔ وہ بھی میرے قریب ہی تخت پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

''چائے پیو گے مقبول بھائی؟'' انگوری نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم جانتی ہو میں چائے سے تو انکار نہیں کر سکتا۔'' مقبول نے جواب دیا۔ انگوری مسکراتے ہوئے اُٹھ کر گلیارے کی طرف چلی گئی۔

''پیغام آ گیا ہے۔'' مقبول نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم شام پانچ بجے یہاں سے روانہ ہوں گے۔ کچھ اور لوگ بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔ اُنہوں نے روانگی کی تیاری شروع کر دی ہے۔''

''تیاری؟ میں سمجھا نہیں۔'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''سمجھ جاؤ گے۔'' مقبول مسکرا دیا۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ انگوری مقبول کے لئے قہوہ لے آئی۔ وہ دونوں جس طرح آپس میں بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ مقبول اکثر یہاں آتا رہتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد تین چار لڑکیاں پوٹلیاں اُٹھا کر پچھلے دروازے سے اندر آ گئیں۔ یہ گاؤں کی لڑکیاں تھیں جو یہاں بیٹھ کر کڑھائی کیا کرتی تھیں۔ میں اور مقبول اُٹھ کر کمرے میں آ گئے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر میں سو گیا لیکن ڈھول اور نفیریوں کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ اُس وقت ساڑھے چار بجے تھے۔ مقبول دروازے میں کھڑا تھا۔ اس وقت انگوری ہمارے لئے قہوہ لے آئی۔ میں نے کمرے سے باہر آ کر ڈرم سے منہ ہاتھ دھویا اور پھر کمرے میں آ گیا۔ چائے پیتے ہوئے مقبول بتا رہا تھا کہ بستی والے روانگی کی تیاری کر رہے ہیں۔

چند منٹ بعد جب ہم ماسی عائشہ کے گھر سے رخصت ہوئے تو انگوری اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں بے پناہ اُداسی تھی۔

اب میری سمجھ میں آ گیا کہ صبح مقبول نے کس تیاری کی بات کی تھی۔ گاؤں کے چوراہے پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ دو تین آدمی ڈھول اور نفیریاں بجا رہے تھے۔ کچھ ادھیڑ عمر آدمی قلندرانہ رقص کر رہے تھے۔ ایک بوڑھے نے سبز کرتا پہن رکھا تھا اور اُس کے سر پر ٹوپی بھی ہرے رنگ کی تھی۔ چار پانچ آدمیوں نے ہرے رنگ کے جھنڈے اُٹھائے ہوئے تھے۔ ایک جھنڈے پر گوٹے سے کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ باقی جھنڈوں کے کناروں پر گوٹا لگا ہوا تھا۔

بستی سے جو قافلہ روانہ ہوا اُس میں میرے اور مقبول سمیت بیس بائیس افراد تھے جن میں مرد بھی تھے، عورتیں اور بچے بھی۔ یہ قافلہ گلمرگ کے نواح میں پیر بابا کی درگاہ پر جا رہا تھا۔ ہر چاند کی پہلی جمعرات کو پیر بابا کی درگاہ پر میلے کا سا سماں ہوتا تھا۔ اور آج پہلی جمعرات تھی۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ ہمیں گلمرگ مطلوبہ مقام تک پہنچانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ اور ظاہر ہے یہ پلاننگ بہت پہلے اور بہت سوچ سمجھ کر کی گئی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہمارا قافلہ ڈھول تاشے بجاتا گلمرگ شہر سے ایک میل دُور اُس وسیع و عریض قبرستان میں پہنچ گیا جہاں پیر بابا کا مزار تھا۔ وہاں پہلے ہی سے بہت سے لوگ جمع تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہاں پولیس یا فوج کے آدمی بھی ہوں گے مگر دُور دُور تک کوئی وردی والا نظر نہیں آ رہا تھا۔

شام ہوگئی تھی۔ مزار پر بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں تھا۔ جگہ جگہ زمین میں گڑھی ہوئی لکڑیوں پر لالٹینیں لٹکی ہوئی تھیں۔ اچھا خاصا رش تھا۔ قوالی کا پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ لوگ جوق در جوق مزار پر دُعا مانگنے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے۔ پیر بابا کی قبر جس حجرے میں تھی اُس کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ ایک آدمی مجھے دھکیلتا ہوا اُس دروازے کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ مقبول بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ آدمی مجھے دھکیلتا ہوا دروازے کے اندر لے گیا اور پھر دروازہ بند ہو گیا......

میں نے مُڑ کر اُس شخص کی طرف دیکھا اور چونک گیا۔ وہ کمانڈر رشید تھا......

مزار کے اس حجرے کے اندر طاقچوں میں سرسوں کے تیل کے دیئے جل رہے تھے اور اگر دان میں اگر بتیاں بھی سلگ رہی تھیں۔ حجرے میں چراغوں اور اگر بتیوں کا دُھواں بھرا ہوا تھا۔ کمانڈر رشید مجھے قبر کے سنگِ مرمر کے تعویذ کے پاس لے آیا۔ اُس نے نیچے جھک کر دو جگہوں پر قبر میں لگے ہوئے سنگِ مرمر کے ٹکڑوں کو مخصوص انداز میں دبایا اور پھر قبر کے تعویذ کو دونوں ہاتھوں سے ایک طرف دھکیلنے لگا۔ قبر کا تعویذ صندوق کے ڈھکنے کی طرح اُوپر اُٹھتا چلا گیا۔ اُس کے نیچے خلا تھی جس کے اندر سیڑھیاں تھیں۔

کمانڈر رشید نے مجھے اشارہ کیا، میں جھک کر اُس خلا میں اُتر گیا اور ڈھکنا بند ہو گیا۔

نیچے کہیں مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں محتاط انداز میں سیڑھیاں اُترتا چلا گیا اور پھر نیچے پہنچ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ یہ بہت وسیع و عریض تہہ خانہ تھا جس میں اسلحہ کی کئی پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں اور اُن کے قریب ہی کمانڈر محب اللہ، عبدالغنی لون اور تین آدمی کھڑے تھے۔ اُن سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

کمانڈر محب اللہ نے دونوں بانہیں پھیلا دیں اور میں دوڑ کر اُن سے لپٹ گیا۔

○

وہ بہت وسیع و عریض تہہ خانہ تھا اور ایک طرف لکڑی کی بڑی بڑی کم و بیش بیس بائیس پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں جن میں مختلف قسم کا اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ ان پیٹیوں کے پیچھے تین لائٹ مشین گنیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ اُن مشین گنوں کو کندھوں پر لاد کر آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا تھا۔ ان کے قریب ہی چار بزوکا (کندھے پر رکھ کر راکٹ فائر کرنے والے لانچر) بھی پڑے ہوئے تھے۔ یہ لانچر رُوسی ساخت کے تھے۔ اُن کے قریب ہی ایک کھلی ہوئی پیٹی میں ایک درجن راکٹ رکھے ہوئے تھے۔ یہ راکٹ بھی رُوسی ساخت کے تھے اور اسی کلیبر کے تھے جس کلیبر کے لانچر تھے۔ کئی پیٹیوں میں سب مشین گنیں تھیں۔ کم از کم چار پیٹیاں ایمونیشن سے بھری ہوئی تھیں۔ سب مشین گنوں کی گولیاں کھلی بھی تھیں اور بھرے ہوئے میگزین بھی۔ ایک پیٹی میں گولیوں سے بھرے ہوئے لائٹ مشین گنوں کے بیلٹ بھی تھے۔

یہ تمام اسلحہ مجھے کمانڈر محب اللہ نے دکھایا تھا اور میرے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ سب اسلحہ بالکل نیا تھا جسے ابھی تک استعمال نہیں کیا گیا تھا۔

''یہ اسلحہ مختلف چھاپہ مار کارروائیوں کے دوران بھارتی فوجیوں سے چھینا گیا ہے۔''

کمانڈر محب اللہ کی یہ بات سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ میرے دل کی بات کیسے جان لیتا تھا؟

''اور یہ راکٹ......'' اُس نے راکٹوں والی پیٹی کی طرف اشارہ کر کے بات جاری رکھی۔ ''یہ راکٹ بھارتی فوجی کے ایک لیفٹیننٹ سے خریدے گئے ہیں۔''

''خریدے گئے ہیں......؟'' میں اُچھل پڑا۔ ''بھارتی فوجی ہمارے بدترین دشمن ہیں۔ ہماری بستیوں کو تباہ و برباد کر رہے ہیں اور بے گناہوں کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتار رہے ہیں۔ اسلحہ کی تلاش کے لئے وہ ہمارے گھروں پر چھاپے مارتے ہیں۔ ہمیں ہر طرح سے نہتا کر دینا چاہتے ہیں تاکہ ہم اُن کے مقابلہ پر نہ آ سکیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارے ہاتھوں میں کسی بھی قسم کا اسلحہ اُن کی موت کا پیغام بن جائے گا۔ ایسی صورت میں کوئی بھارتی فوجی مجاہدین کے ہاتھ اپنا اسلحہ کیسے فروخت کر سکتا ہے؟

کمانڈر محب اللہ خاموشی سے میری تقریر سنتا رہا۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

''ہم ایک مقصد کے لئے لڑ رہے ہیں اور وہ مقصد ہے آزادی۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے ہمیں اپنی جانوں کی بھی پرواہ نہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''لیکن بھارتی فوجیوں کے پیشِ نظر کوئی مقصد نہیں ہے۔ وہ ایک بے مقصد جنگ لڑ رہے ہیں۔ وہ تو سرکار کے ملازم ہیں جن کے ہاتھوں میں بندوق تھما کر جنگ میں جھونک دیا گیا ہے۔ وہ ہر مہینے ملنے والی پگھار کے لئے بندوق اُٹھانے پر مجبور ہیں۔ اگر وہ انکار کر دیں تو اُنہیں فوج کی نوکری سے نکال دیا جائے گا اور اُن کے بال بچے بھوکے مر جائیں گے۔ وہ اس لئے لڑنے پر مجبور ہیں کہ اُنہیں اپنی جان بچانی ہے اور جان بچانے کے لئے وہ جدید ترین اسلحہ بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن......'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''لیکن جنگ نہ تو اسلحے سے لڑی جاتی ہے اور نہ ہی نفری کسی کو فتح دلا سکتی ہے۔ جنگ تو جذبے سے لڑی جاتی ہے۔ جذبہ جو یہاں ہوتا ہے۔'' اُس نے میرے سینے پر ہاتھ مارا۔ ''کوئی مقصد ہو گا تو جذبہ بھی پیدا ہو گا اور جب کوئی مقصد ہی سامنے نہ ہو تو کیسا جذبہ...... اور نفری یا تعداد سے کیا ہوتا ہے۔ بھارت سرکار نے سات لاکھ فوج کشمیر کی اس جنگ میں جھونک رکھی ہے۔ لیکن اب تک کیا کر لیا ہے اُنہوں نے؟ مظلوموں اور بے گناہوں کو بربریت کا نشانہ بنانے کے لئے اُنہوں نے کیا، کیا ہے؟ نہتے اور پُرسکون لوگوں کی بستیوں پر آگ برسا کر اُنہیں خاکستر کر دینے کے علاوہ کیا تیر مارا ہے ان سات لاکھ سورماؤں نے؟ کیا بے گناہوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دینے سے ہنستی بستی بستیوں کو اُجاڑ دینے اور جلا کر راکھ کر دینے سے آزادی کی یہ تحریک ختم ہو جائے گی؟ غیور کشمیریوں کے جذبہ آزادی کو کچل دیا جائے گا؟ نہیں میرے دوست......!'' اُس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میں نے پہلی مرتبہ اُسے اس طرح بولتے دیکھا تھا۔ ''نہیں میرے

دوست!'' اُس نے ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ ''جذبہ کبھی نہیں مرتا اور آزادی کی تحریک کو کبھی نہیں کچلا جا سکتا۔ اس کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ افغانستان کو دیکھ لو...... غیور افغانیوں نے دنیا کی اُس وقت کی سب سے بڑی طاقت سوویت یونین کو افغانستان سے بوریا بستر گول کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور یہ افغانستان میں عبرتناک شکست کا نتیجہ تھا کہ سوویت یونین کا شیرازہ بکھر گیا۔ ہمیں ویتنام اور الجزائر کو بھی نہیں بھولنا چاہئے۔ اُنہوں نے طویل عرصہ تک اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقتور دشمنوں کے خلاف جنگ لڑی اور بالآخر اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ بوسنیا اور چیچنیا کی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ آزادی کے متوالے بے سروسامانی کی حالت میں طاقتور دشمنوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ نفری اور جدید ترین اسلحہ سے کوئی جنگ نہیں جیتی جا سکتی۔ جنگ جیتنے کے لئے جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے اور بھارتی فوجیوں میں یہ جذبہ مفقود ہے۔ وہ تو تنخواہ کے لئے بندوق اُٹھانے پر مجبور ہیں۔ اور ایک بات اور تمہیں بتا دوں، یہ بنیا قوم جو ہے نا، صرف پیسے کو پوجتی ہے...... پیسہ ہی ان کا دین دھرم ہے۔ بڑی بے ضمیر قوم ہے یہ۔ اور یہ اسلحہ ہم نے ایسے ہی بھارتی فوجیوں سے خریدا ہے جنہیں اپنے قومی مفاد سے زیادہ اپنا ذاتی مفاد عزیز ہے۔''

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا اور چند لمحوں بعد بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''بھارتی سینا میں ایسے بہت سے سورما موجود ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ جب کشمیر میں اپنی ڈیوٹی پوری کر کے واپس جائیں تو اُن کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی ہوں۔ اُن میں معمولی سپاہی سے لے کر بریگیڈیئر تک کے اعلیٰ افسران بھی شامل ہیں۔ اور وہ بیوقوف یہ نہیں سمجھتے کہ پیسے کے لالچ میں جو اسلحہ وہ ہمارے ہاتھ فروخت کرتے ہیں وہی اسلحہ اُن کے خلاف استعمال ہو گا اور وہ خود بھی مارے جائیں گے۔ جس لیفٹیننٹ نے ہمارے آدمی کے ہاتھ یہ راکٹ فروخت کئے تھے تیسرے ہی روز وہ ہندو لیفٹیننٹ پٹن میں مجاہدین کے ساتھ ایک جھڑپ میں مارا گیا تھا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں کمانڈر!'' میں نے جواب دیا۔ ''مقصد اور جذبہ یہی دو چیزیں ہیں جو منزل تک پہنچاتی ہیں اور......'' میں بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا۔ ڈھول اور تاشوں کے شور کی آواز میری سماعت سے ٹکرانے لگی تھی۔

کمانڈر محب اللہ دو تین قدم اُٹھا کر آگے بڑھ گیا۔ میں بھی سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اُوپر سے ڈھول اور نفیریوں کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔ اور پھر وہ آواز دفعتہً بند ہو گئی اور چند سیکنڈ بعد دو آدمی سیڑھیوں والے راستے سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے۔

اس کے پانچ منٹ بعد دو آدمی اور اندر آئے تھے۔ اُس وقت بھی ڈھول وغیرہ کی آواز سنائی دی تھی۔ میں سمجھ گیا جب کسی کے اندر آنے کے لئے حجرے میں واقع قبر کا سنگ مرمر والا تعویذ ڈھکنے کی طرح اُٹھایا جاتا تھا تو باہر کی آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کے اندر اس تہہ خانے میں چودہ آدمی جمع ہو چکے تھے۔ اُن سب کے حلیے بڑے عجیب تھے۔ کئی کئی روز

کے بڑھے ہوئے شیو، سر کے بال بھی بے تحاشہ بڑھے ہوئے۔ کپڑوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کئی روز سے جسم سے جدا نہ ہوئے ہوں۔ ایک آدمی تو ایسا تھا جس کے کرتے پر دو جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔

اُن سب کے حلیے دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ بھکاری ہوں۔ لیکن وہ بھکاری نہیں تھے۔ یہ تو کسی کروڑ پتی سے بھی زیادہ دولت مند تھے۔ ان کے پاس تو جذبے کی بے پناہ دولت تھی۔ ان کے پاس حوصلے کی قوت تھی۔ یہ اس وادی کے امین تھے جس پر غاصبوں نے قبضہ جما رکھا تھا اور یہ اُن غاصبوں کو یہاں سے نکالنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ یہ تو ہیروز تھے۔ کشمیر کے مظلوم عوام کی اُمیدوں کا مرکز تھے۔

مقبول اور حسن، بسال پور سے میرے ساتھ آئے تھے۔ لیکن وہ اس تہہ خانے میں نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے اُن دونوں کو اُوپر ہجوم کے ساتھ قلندرانہ رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ بھی کچھ دیر میں یہاں پہنچنے والے تھے۔

میں تہہ خانے میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ اس تہہ خانے میں انسانی کوششوں کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اور مجھے یہ اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ اس تہہ خانے کے معرض وجود میں آنے میں بھی پانی کا کمال تھا۔ ہو سکتا ہے کسی زمانے میں اُونچے پہاڑوں سے آنے والا پانی اس جگہ کوئی راستہ پا کر زمین کے اندر داخل ہو گیا ہو اور پھر اندر ہی اندر چٹانوں کو اس طرح کاٹتا رہا ہو کہ یہاں زیر زمین غار بن گئے تھے۔ یہ عمل بھی صدیوں بعد پایہ تکمیل کو پہنچا ہو گا۔

دیواریں ناہموار اور کٹی پھٹی تھیں۔ کئی جگہوں پر تنگ سی دراڑیں نظر آ رہی تھیں۔ فرش بھی ناہموار اور اُونچا نیچا تھا۔ قبرستان کے نیچے یہ قدرتی تہہ خانہ جیسا بھی تھا مجاہدین کے لئے ایک بہترین پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔

عبدالغنی لون اُس وقت میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ میں نے اس تہہ خانے کے بارے میں دریافت کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بتانے لگا۔

''میری معلومات کے مطابق ساٹھ سال پہلے یہاں پہلی قبر بنی تھی۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''پرانا قبرستان گلمرگ شہر کے دوسری طرف ہے۔ وہاں جگہ نہ بچی تو یہاں قبرستان بنا لیا گیا۔ ہندوستان کے بٹوارے کے بعد کشمیر کا مسئلہ پیدا ہوا تو اس قبرستان کی آبادی میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ آزادی کی تحریک جیسے جیسے زور پکڑتی گئی یہ قبرستان بھی پھیلتا چلا گیا۔ تقریباً تیس سال پہلے......'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تقریباً تیس سال پہلے یہاں ایک قبر کھودی جا رہی تھی تو زمین کے نیچے کی مٹی بیٹھتی چلی گئی اور قبرستان کے نیچے اس وسیع و عریض غار کا انکشاف ہوا۔ اس غار کو راز میں رکھا گیا اور یہاں ایک حجرہ تعمیر کر کے ایک ضعیف العمر آدمی کو بٹھا دیا گیا۔ وہ بڑا اللہ لوک تھا۔ کچھ لوگ اُس کے پاس اُٹھنے بیٹھنے لگے۔ اس طرح وہ پیر بابا کے نام سے مشہور ہو گیا۔ دس سال پہلے پیر بابا کا انتقال ہوا تو اُس کی

قبر پر بھی ایک حجرہ تعمیر کر دیا گیا۔ اس دوران یہ پختہ قبر بھی تعمیر کر لی گئی۔ تہہ خانے کے راستے چھپانے کا یہی ایک بہتر طریقہ تھا۔ یوں تو بھارتی وحشی فوجی جنازوں پر فائرنگ کرتے ہیں اور کوئی شبہ ہونے پر قبریں تک کھود ڈالتے ہیں لیکن اس مزار پر انہیں آج تک کوئی شبہ نہیں ہو سکا۔ یہ تہہ خانہ مجاہدین کے لئے پچھلے دس پندرہ سال سے ایک چھوٹے سے اسلحہ ڈپو کا کام دے رہا ہے۔ یہاں جمع ہونے والے اسلحے کو روکا نہیں جاتا، وقتاً فوقتاً مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ضرورت کے وقت مجاہدین یہاں پناہ بھی لے لیتے ہیں۔ گلمرگ اور اس کے قرب و جوار میں چھاپہ مار کارروائیوں میں ہمارا پلہ اس لئے بھی بھاری رہتا ہے کہ یہاں سے ہمیں ضرورت کا اسلحہ مل جاتا ہے اور بھارتی فوجی آج تک یہ سراغ نہیں لگا سکے کہ اُن کی ناک کے عین نیچے بہت بڑی چھاؤنی سے محض ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ہمارا یہ اڈہ موجود ہے۔"

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "لیکن جب سے شہر کے جنوب میں بھارتی فوج کا وہ کیمپ اور گولہ بارود کا ڈپو بننا شروع ہوا ہے اس علاقے میں ہماری سرگرمیاں محدود ہو کر رہ گئی ہیں اور آج اس ڈپو کے خلاف کارروائی کا پروگرام ہے۔"

یہ تو مجھے پہلے ہی علم ہو چکا تھا کہ اس بھارتی فوجی کیمپ کے خلاف کارروائی میں جو مجاہد شریک ہوں گے اُن میں میرا نام بھی شامل ہے۔ اور اس لئے مجھے یہاں لایا بھی گیا تھا۔ دوسرے مجاہدین کو بھی اسی طرح خفیہ طور پر یہاں جمع کیا جا رہا تھا۔ لیکن اپنے آپ کو ایک بڑی کارروائی کے اس قدر قریب دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑ رہی تھیں......

اس دوران چار آدمی اور آ چکے تھے۔ اور پھر کمانڈر محبّ اللہ نے مجھے اشارے سے اپنے قریب بلا کر ایک نوجوان مجاہد کے حوالے کر دیا۔

"آج کی کارروائی کے دوران تم لائٹ مشین گن سنبھالو گے۔ اکبر کے ساتھ جاؤ! یہ تمہیں ایل ایم جی چلانا سکھا دے گا۔ زیادہ مشکل نہیں ہے تم چند منٹ میں سیکھ لو گے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آٹو میٹک رائفل اور سب مشین گن کے استعمال میں تو مجھے خاصی مہارت ہو چکی تھی اور اب لائٹ مشین گن۔ میرے بدن میں برقی لہریں سی کوندنے لگیں۔

اکبر نے ایک لائٹ مشین گن اُٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔ اُس کے آگے نال کے ساتھ نیچے کی طرف ایک سٹینڈ لگا ہوا تھا جس سے گن کی نال کچھ اُوپر اُٹھ گئی تھی۔ لیکن اپنی مرضی کے مطابق اسے حرکت دی جا سکتی تھی۔

"یہ گن زیادہ وزنی نہیں ہے۔" اکبر بتا رہا تھا۔ "اسے کندھے پر رکھ کر بڑی آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکتا ہے اور اس کا استعمال بھی زیادہ مشکل نہیں ہے۔" چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر مجھے گن کے پیچھے پوزیشن میں بٹھا دیا اور اُس کے استعمال کے بارے میں بتانے لگا کہ کس طرح بیلٹ لوڈ کیا جاتا ہے، لاک، ٹرائیگر اور گرپ کہاں ہونی چاہئے وغیرہ وغیرہ۔

ایسے اسلحہ کی ٹریننگ کے لئے اگرچہ خاصا وقت درکار ہوتا ہے لیکن مجاہدین کے پاس نہ تو کوئی ٹریننگ کیمپ تھا اور نہ ہی اتنا وقت۔ وہ ہر قسم کے اسلحے کا استعمال چند منٹوں میں سیکھ لیتے تھے اور دشمن کے خلاف چھاپہ مار کارروائیاں ہی اُن کی اصل ٹریننگ تھی۔

میں نے آدھے گھنٹے میں ایل ایم جی کا استعمال سیکھ لیا اور بیلٹ چڑھا کر بھی دکھایا اور دوسرے فنکشنز کے استعمال کا بھی مظاہرہ کیا۔

"گڈ ......!" اکبر مسکرا دیا۔ "تم واقعی ذہین آدمی ہو۔ اس کا بیلٹ عام طور پر پیٹی میں ہوتا ہے اور گنر کے ساتھ اس کا ایک ہیلپر بھی ہوتا ہے جو بیلٹ کے فنکشن کا خیال رکھتا ہے۔ لیکن ہمارے پاس زیادہ آدمی نہیں ہوں گے۔ گولیوں والا بیلٹ بھی تمہیں ہی اُٹھانا پڑے گا۔ اس طرح......" اُس نے پیٹی میں سے گولیوں سے بھرا ہوا بیلٹ نکال کر اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور پھر میں نے بھی اُسے بیلٹ اپنے جسم پر لپیٹ کر دکھایا۔

ہزار گولیوں کا بیلٹ تھا اور خاصا وزنی تھا...... لیکن میرا خیال تھا کہ میں بیلٹ اور ایل ایم جی اُٹھا کر پہاڑیوں میں کئی میل تک بے تکان چل سکتا تھا۔

اکبر میری کارکردگی سے مطمئن ہو گیا اور پھر کچھ دوسری باریکیاں سمجھانے لگا۔ اُس سے باتیں کرتے ہوئے میں وقتاً فوقتاً اِدھر اُدھر بھی دیکھ رہا تھا۔ بعض دوسرے آدمیوں کو بھی ایل ایم جی اور راکٹ چلانے کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔

ایک بڑی کارروائی سے پہلے یہی وہ مختصر لمحات تھے جب ان مجاہدین کو وہ اسلحہ چلانے کی تربیت دی جا رہی تھی جو اُنہوں نے پہلے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ اور یہاں پر موجود کمانڈرز اُن کی اس تربیت سے مطمئن تھے۔

اسی دوران تہہ خانے کے ایک کونے میں جا کر ایک آدمی نے کیراسین آئل کے چولہے پر بغیر دُودھ کی چائے بنائی۔ یہاں اس سے پہلے شاید اس سے بھی زیادہ تعداد میں مجاہدین آتے رہتے تھے اس لئے مگوں اور پیالوں کی کمی نہیں تھی۔ چائے تقسیم کرنے کے ساتھ اُس نے زمین پر چادر بچھا کر ایک بڑی سی پوٹلی کھول دی تھی جس میں نمک ملے آٹے کی روٹیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہر شخص اپنے اپنے حصے کی روٹی لے کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ میں نے بھی ایک روٹی لے لی اور نوالے توڑ توڑ کر قہوہ کے ساتھ کھانے لگا۔

کھانے سے فارغ ہو کر کمانڈر محبّ اللہ، کمانڈر رشید اور عبدالغنی لون اکٹھے بیٹھ گئے۔ ہم لوگ بھی اُن کے گرد جمع ہو گئے۔ کمانڈر محبّ اللہ زمین پر بھارتی فوجی کیمپ کی لوکیشن کا نقشہ بنا کر حملے کے پروگرام کو فائنل ٹچ دینے لگا۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ اس کارروائی میں کمانڈروں سمیت چوبیس مجاہدین حصہ لینے والے تھے۔ اٹھارہ تو اس تہہ خانے میں موجود تھے جبکہ باقی چھ کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ بھارتی فوجی کیمپ کے آس پاس مختلف جگہوں پر پہنچ چکے ہیں جو ہمارے سگنل سن کر اس سے آگے ہماری رہنمائی کریں گے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق کیمپ پر حملہ تین مختلف اطراف سے کیا جانا تھا۔ اس طرح مجاہدین بھی تین پارٹیوں میں تقسیم ہو جاتے۔ ہر پارٹی میں آٹھ مجاہدین ہوتے۔ ایک پارٹی کمانڈر محب اللہ تھا، دوسری پارٹی کی کمان کمانڈر رشید کو سونپی گئی جبکہ تیسری پارٹی کی قیادت عبدالغنی لون کے سپرد کی گئی تھی۔ ہر پارٹی کو کارروائی مکمل کرنے کے بعد مختلف سمتوں میں فرار ہو جانا تھا۔

میں کمانڈر محب اللہ کی پارٹی میں تھا اور ہمیں انتہائی جنوب کی طرف سے کیمپ پر حملہ آور ہونا تھا۔ یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ ہر پارٹی کسی سگنل کا انتظار کئے بغیر ٹھیک چار بجے اپنی کارروائی شروع کر دے گی۔

وہ فوجی کیمپ اُسی قبرستان سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ راستہ پہاڑی اور خاصا دُشوار گزار تھا جسے طے کرنے میں کچھ وقت لگ سکتا تھا۔ کمانڈر محب اللہ کا حکم سنتے ہی ہم تیار ہو گئے۔ میں نے لائٹ مشین گن کی گولیوں والا بیلٹ اس طرح اپنے سینے اور باقی جسم پر لپیٹ لیا کہ ضرورت کے وقت جسم سے الگ کر کے استعمال کیا جا سکے۔ ایل ایم جی میں نے دائیں کندھے پر لاد لی۔ کمر پر بندھے ہوئے پٹکے میں، میں نے ایک پستول اور اُس کے چند میگزین بھی اڑس لئے تھے۔ ہر پارٹی میں ایک ایک راکٹ لانچر بردار بھی شامل تھا اس طرح چار چار راکٹ بھی ان تینوں کے حصے میں آئے تھے۔ انہوں نے راکٹ چادروں میں لپیٹ کر پشت پر لاد لئے تھے۔ ہر پارٹی میں دو دو لائٹ مشین گنیں تھیں۔ پستول یا ریوالور ہر ایک کے پاس تھے۔ ان کے علاوہ کسی کے پاس سب مشین گن تھی اور کسی کے پاس آٹومیٹک رائفل۔ بعض لوگوں کی بیلٹوں میں ہینڈ گرنیڈ بھی اڑسے ہوئے تھے۔

ہم لوگ ٹھیک ایک بجے حجرے میں واقع قبر کے راستے اُس تہہ خانے سے رخصت ہونا شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے کمانڈر رشید کی پارٹی وہاں سے روانہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد عبدالغنی لون پندرہ منٹ کے وقفے سے اپنی پارٹی لے کر رخصت ہو گیا۔ اس کے مزید پندرہ منٹ بعد کمانڈر محب اللہ کی رہنمائی میں ہم بھی ایک ایک کر کے باہر آ گئے۔

حجرے میں ایک بوڑھا درویش بیٹھا ہوا تھا۔ آخری آدمی کے باہر آتے ہی اُس نے قبر بند کر دی اور ہمارے ساتھ ہی حجرے سے باہر آ گیا۔

ہر طرف گہرا سناٹا تھا اور تاریکی تھی۔ یہ چاند کی پہلی جمعرات تھی اور غالباً چار تاریخ تھی لیکن چوتھی کا چاند بہت پہلے آسمان سے رخصت ہو چکا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں آدھی رات کے وقت قبرستان میں آنے کی ہمت بھی نہ کر پاتا۔ لیکن اب صورتحال دوسری تھی۔ اس تاریکی اور سناٹے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں تھا۔

ہم قبرستان کے پچھلی طرف سے نکل کر پہاڑیوں کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ مُڑ کر بائیں طرف دیکھا تقریباً ڈیڑھ میل دُور نشیب میں گلمرگ شہر نیند کی آغوش میں تھا شہر میں کہیں کہیں بتیاں جھلملاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ شہر سے پرے قدرے بائیں جانب بھارتی فوجیوں کی چھاؤنی تھی۔

ہم مسلسل جنوب کی طرف ہٹتے ہوئے پہاڑیوں میں داخل ہو گئے۔ کمانڈر محب اللہ سب سے آگے تھا۔ میں اُس کے پیچھے چوتھے نمبر پر تھا۔ انہی پہاڑیوں میں چلتے ہوئے ہمیں تقریباً پانچ میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ ہم مناسب رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایل ایم جی خاصی وزنی تھی۔ میں اُسے کبھی ایک کندھے پر منتقل کرتا اور کبھی دوسرے کندھے پر۔ شروع میں تو یہ مجھے کچھ وزنی لگی تھی لیکن اب میں اس کا عادی ہو گیا تھا۔

تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک کشادہ ندی میں اُتر گئے۔ ندی اگرچہ گہری تھی لیکن جگہ جگہ بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ ہم اُن پتھروں پر اُچھلتے ہوئے ندی پار کر گئے۔ کچھ دُور تک ہم ندی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے پھر پہاڑیوں میں داخل ہو گئے۔ اس مرتبہ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔

راستہ بڑا کٹھن تھا اور وہ ٹکڑا تو بہت خطرناک تھا جو ایک عمودی چٹان کے ساتھ واقع تھا۔ چٹان کے ساتھ تین چار فٹ چوڑی لگر سی باہر کو نکلی ہوئی تھی جس کے دوسری طرف ڈھائی تین سو فٹ گہرا کھڈ تھا۔ ذرا سی لغزش موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔

میں نے ایک ہاتھ سے بائیں کندھے پر لدی ہوئی ایل ایم جی کو سنبھال رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ چٹان پر جمائے محتاط انداز میں قدم اُٹھاتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ تیز ہوا مجھے بار بار پیچھے دھکیل رہی تھی۔ میں چٹان کے ساتھ لگا آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا اور بالآخر سات منٹ میں پل صراط کی طرح وہ خطرناک راستہ طے کر کے دوسری طرف پہنچ گیا۔

ہم رُکے بغیر مسلسل چلتے رہے۔ میرے جسم پر لپٹا ہوا گولیوں کا بیلٹ بھی خاصا وزنی تھا اور کندھے پر لدی ہوئی ایل ایم جی بھی بھاری تھی۔ اُونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے میرا سانس پھولنے لگا، اور میرا خیال ہے تقریباً ڈھائی گھنٹوں تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد ہم ایک جگہ رُکے تھے۔ یہاں چنار کے چند اُونچے درخت تھے۔ تیز ہوا سے اُن کی شاخیں جھکی جا رہی تھیں اور پتوں کے آپس میں ٹکرانے سے پیدا ہونے والی آوازوں سے یوں لگتا تھا جیسے سینکڑوں پرندے بیک وقت پھڑ پھڑا رہے ہوں۔

میرے تمام ساتھی پتھروں پر بیٹھ گئے تھے۔ میں بھی ایل ایم جی کندھے سے اُتار کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ کمانڈر محب اللہ ہم سے چند گز آگے چلا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک تاریکی میں گھورتا رہا۔

پھر یکدم بھیڑیے کی آواز سن کر میں اُچھل پڑا...... لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ آواز سن کر میں سمجھا تھا کہ کوئی بھیڑیا اچانک ہی کہیں سے اس طرف نکل آیا ہے۔ لیکن پھر اپنی اس حماقت پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ وہ کمانڈر محب اللہ تھا جو منہ سے بھیڑیے کی آواز نکال کر کسی کو مخصوص

سگنل دے رہا تھا۔

کمانڈر محبّ اللہ کے خاموش ہونے پر بھیڑیئے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ یہ آواز کچھ دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ کمانڈر محبّ اللہ نے جواب دیا۔ دوسری طرف سے بھی جواب ملا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ مگر یہ خاموشی زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکی تھی۔ دو منٹ بعد ہی چھوٹے چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ صاف لگ رہا تھا کہ کوئی آدمی محتاط انداز میں چل رہا ہے۔ اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی وہ شخص سامنے آ گیا۔

وہ مقبول تھا۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ مقبول اور حسن خان بابا کی درگاہ پر آنے کے بعد کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اُنہیں غالباً ہراوّل دستے کے طور پر آگے بھیج دیا گیا تھا اور اس مقررہ جگہ پر سگنل پا کر مقبول سامنے آ گیا تھا جبکہ میرے خیال میں حسن بھی قرب و جوار میں کہیں موجود ہو گا۔

مقبول نے سیاہ لمبا چوغہ قسم کا کرتا پہن رکھا تھا۔ سر پر ٹوپی بھی کالی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی اور کمر پر بندھے ہوئے پٹکے میں کئی فاضل میگزین اڑسے ہوئے تھے۔

''کیا صورتحال ہے......؟'' کمانڈر محبّ اللہ نے پوچھا۔ اُس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

''سب ٹھیک ہے......'' مقبول نے جواب دیا۔ ''ہمارا وہ راستہ بالکل محفوظ ہے اور کیمپ میں بھی کوئی غیر معمولی سرگرمی دکھائی نہیں دیتی۔ نگران چوکیوں پر بھاری مشین گنیں نصب ہیں اور ہر چوکی پر دو دو فوجی بیٹھے ہوئے ہیں۔ نگران چوکیوں پر سرچ لائٹس بھی جل رہی ہیں جن سے خاردار باڑ کے ساتھ ساتھ اندر اور باہر چند فٹ تک کا علاقہ روشن ہے۔ اس روشنی کی وجہ سے باڑ تک پہنچنا ممکن نہیں۔''

''ناممکن کا لفظ ہماری لغت میں نہیں ہے۔'' کمانڈر محبّ اللہ نے کہا۔ ''آگے بڑھو! ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

کمانڈر کا اشارہ پا کر ہم سب اپنی جگہوں سے اُٹھ گئے اور مقبول کے پیچھے پیچھے ایک قطار میں چلنے لگے۔

درختوں کے جھنڈ سے نکل کر ایک بڑی چٹان کے دوسری طرف آتے ہی میں چونک گیا۔ بائیں طرف کسی قدر نشیب میں روشنیوں کی قطار نظر آ رہی تھی۔ یہ روشنیاں کہیں زیادہ بلندی پر تھیں اور کہیں کسی قدر نیچے۔ یہ سرچ لائٹس اُن ٹاور نما نگران چوکیوں پر نصب تھیں جو باڑ کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنی ہوئی تھیں۔

تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک دراڑ میں داخل ہو گئے۔ یہ دراڑ اس قدر کشادہ تھی کہ اس میں دو آدمی پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ یہ دراڑ دراصل آبی گزرگاہ تھی۔ برسات کے دنوں میں پہاڑوں کی بلندی سے آنے والا پانی ایک نالے کی صورت میں یہاں سے گزرتا تھا۔

ہم مسلسل نشیب میں اُترتے رہے اور پھر بلندی کی طرف جانے لگے اور بالآخر ایک جگہ رُک گئے۔ یہاں دائیں بائیں بھی کھڈ تھے جن میں آسانی سے چھپا جا سکتا تھا۔

کمانڈر محبّ اللہ نے بڑے محتاط انداز میں سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا، پھر نیچے جھک کر نہایت مدھم آواز میں ہمیں ہدایات دینے لگا۔ سب اپنا اپنا اسلحہ تیار کرنے لگے۔ اس قدر احتیاط سے کام لیا جا رہا تھا کہ معمولی سی آواز بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی معمولی سی آواز بھی ہوا کے دوش پر دشمن کے کانوں تک پہنچ سکتی تھی۔

میں نے ایل ایم جی کندھے سے اُتار لی تھی لیکن بیلٹ ابھی نہیں اُتارا تھا کیونکہ گن کو اس جگہ فٹ نہیں کرنا تھا۔ میں نے بہت محتاط انداز میں سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی میرے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑنے لگیں......

ہم سے تقریباً پچاس گز آگے اُونچی جگہ پر وہ خاردار باڑ تھی جس کے ساتھ واچ ٹاورز بنے ہوئے تھے اور اُس باڑ کے دوسری طرف کسی قدر نشیب میں کئی فوجی بیرکیں نظر آ رہی تھیں۔ کئی خیمے بھی تھے۔ ایک طرف لاتعداد ٹرک بھی کھڑے تھے۔ اس وسیع و عریض علاقے میں جگہ جگہ بتیاں جل رہی تھیں۔ ان کی روشنی ہی کی وجہ سے وہ سب کچھ دیکھنا ممکن ہو سکا تھا۔

ایک واچ ٹاور ہمارے بالکل سامنے تھا۔ اُس کی بلندی تقریباً پندرہ فٹ تھی۔ اُس کی چھت پر بھی ایک بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں ٹاور پر نصب بھاری مشین گن صاف نظر آ رہی تھی۔ دو فوجی تھے جن میں ایک گن کے سامنے مستعد بیٹھا تھا اور دوسرا اُس کے قریب کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اُس کے کندھے پر بھی سب مشین گن لٹکی ہوئی تھی۔

کمانڈر محبّ اللہ نے ہم سب کو سمجھا دیا تھا کہ کس کو کیا کرنا ہے؟ اور پھر اُس نے مقبول کو اشارہ کیا۔ وہ کھڈے میں زمین پر جھکتا ہوا بائیں طرف چلتا چلا گیا۔

میرے دل کی دھڑکن خوفناک حد تک تیز ہو گئی تھی۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب ہم نے سرینگر گلمرگ روڈ پر کسی جگہ بھارتی فوجی قافلے پر حملہ کیا تھا۔ وہ صورتحال کچھ اور تھی۔ ہم نے ٹرکوں کے چلتے قافلے پر گھات لگا کر حملہ کیا تھا۔ بھارتی فوجیوں کو سنبھلنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ یہاں صورتحال مختلف تھی۔ دشمن مستعد بیٹھا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مشین گنیں تیار تھیں۔ یہاں زبردست مقابلے کی توقع تھی۔

کمانڈر محبّ اللہ میرے ساتھ ہی تھا اور بار بار کلائی پر بندھی ہوئی ریڈیم ڈائل والی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ میرے بالکل سامنے ہونے کی وجہ سے اُس کی گھڑی مجھے بھی دکھائی دے رہی تھی۔ چار بجنے میں ایک منٹ باقی تھا......

اور پھر ٹھیک چار بجے خاموش فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اُٹھی...... یہ فائرنگ اُس طرف سے ہوئی تھی جس طرف مقبول گیا تھا۔ حسن پہلے سے وہاں موجود تھا۔ چار بجتے ہی اُنہوں نے

فائر کھول دیا تھا......

اُن دونوں کی طرف سے پہلا برسٹ فائر ہوتے ہی واچ ٹاور سے بھاری مشین گن کا فائر کھول دیا گیا...... گولیوں کی بارش اُس طرف ہو رہی تھی جہاں ہم سے تقریباً تیس گز کے فاصلے پر مقبول اور حسن فائرنگ کر رہے تھے۔ ہم کمانڈر محبّ اللہ کے حکم کے انتظار میں بالکل تیار بیٹھے تھے۔ تقریباً اُسی وقت ہمارے دوسو گز دائیں اور اور اتنے ہی فاصلے پر بائیں طرف بھی زبردست فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ عبدالغنی لون اور کمانڈر رشید کی پارٹیوں نے بھی کارروائی شروع کر دی تھی۔

مشین گن سے زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ اور پھر ایک دم اُس طرف تاریکی چھا گئی۔ مقبول یا حسن کی کسی گولی نے سرچ لائٹس توڑ دی تھیں۔ ٹاور کیبن کی چھت پر بلب جل رہا تھا اور وہ دونوں فوجی صاف نظر آ رہے تھے۔

کمانڈر محبّ اللہ نے بھی آڑ لے کر سب مشین گن سے فائر کھول دیا...... ٹاور پر مشین گن سے فائر کرنے والا اپنی جگہ سے اُچھلا اور ڈھیر ہو گیا۔ مشین گن خاموش ہو گئی۔ دوسرا فوجی اپنی سب مشین گن چھوڑ کر ہیوی مشین گن کی طرف لپکا لیکن اس سے پہلے کہ وہ مشین گن پر ہاتھ رکھتا مقبول یا حسن کی گولی نے اُسے چاٹ لیا اور وہ اُچھل کر چیختا ہوا ٹاور سے نیچے گرا۔

''مقبول! ٹاور پر پہنچو...... ہری اپ!'' کمانڈر محبّ اللہ چیخا پھر اُس نے ہمیں حکم دیا۔ ''باڑ کے قریب پہنچو اور فائر کھول دو......''

اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی اُچک کر گڑھے سے باہر نکل گیا۔ میں نے ایل ایم جی اُوپر رکھ دی اور اُچک کر گڑھے سے باہر نکل آیا اور گن اُٹھا کر خاردار تاروں والی باڑ کی طرف دوڑا۔

اُس کیمپ کے بارے میں ہمارے کمانڈروں کے اندازے کچھ غلط نکلے تھے یا اُنہیں پوری معلومات حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ میرا اندازہ بھی یہی تھا کہ باڑ کے ساتھ والے واچ ٹاورز پر گنوں کے علاوہ مزید حفاظتی انتظامات نہیں ہوں گے۔ لیکن بھارتی فوجی اتنے بیوقوف تو ہرگز نہیں تھے کہ اتنے بڑے اسلحہ ڈپو کو محض نگران چوکیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے۔

باڑ سے تقریباً سو گز اندر کی طرف کئی جگہوں پر مٹی کی بوریاں رکھ کر مورچے بنے ہوئے تھے جن میں بھاری مشین گنیں نصب تھیں۔ دن کے وقت دُھوپ سے بچنے کے لئے اُن مورچوں پر سائبان تنے ہوئے تھے جن کی وجہ سے اُن کی نشاندہی ہو رہی تھی۔

پہاڑیاں ہیوی، لائٹ اور سب مشین گنوں کی فائرنگ سے گونج رہی تھیں...... کمانڈر رشید اور عبدالغنی لون کی پارٹیوں نے بھی بھرپور حملہ کیا تھا اور وہ بھی باڑ کی دو نگران چوکیوں پر قبضہ کر چکے تھے اور اُن کے آدمیوں نے ہیوی مشین گنوں کا رُخ کیمپ کی طرف موڑ دیا تھا۔ مقبول بھی سامنے والے ٹاور پر پہنچ گیا تھا۔ اُس نے سب سے پہلے تو اُوپر لگے ہوئے بلب کو اُڑا دیا اور پھر گن کا رُخ موڑ کر کیمپ پر آگ برسانے لگا۔

میں باڑ سے چند فٹ کے فاصلے پر رُک گیا۔ ایل ایم جی کو اپنے سامنے رکھا اور بڑی پھرتی سے اپنے جسم پر لپیٹا ہوا گولیوں والا بیلٹ اُتار کر زمین پر پھیلا دیا اور بیلٹ کا ایک سرا گن میں فٹ کرنے لگا۔ اس سارے عمل میں مجھے ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ لیکن میں ابھی گن کے سامنے پوزیشن نہیں لے پایا تھا کہ کیمپ کے اندر سے گولیوں کی بارش ہونے لگی...... سرخ دہکتے ہوئے انگارے موسلا دھار بارش کی طرح ہماری طرف لپک رہے تھے...... کئی گولیاں میرے سر کے اُوپر سے گزر گئیں۔

میں بڑی پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا اور گن سنبھال لی اور ٹرائیگر کھینچ لیا...... تڑتڑاہٹ کی خوفناک آواز سے گن انگارے اُگلنے لگی......

دشمن کی چلائی ہوئی گولیاں میرے آس پاس گر رہی تھیں جسے ایک بڑے پتھر کی آڑ حاصل تھی۔ کئی گولیاں اُس پتھر پر لگی تھیں اگر میرے سامنے وہ پتھر نہ ہوتا تو میں چھلنی ہو چکا ہوتا۔

محاذ پوری طرح گرم ہو چکا تھا...... میرے پورے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔ دشمن سے اس طرح باقاعدہ مقابلے کا یہ میرے لئے پہلا موقع تھا اور حیرت کی بات تھی کہ میں اپنے آپ میں سنسنی تو محسوس کر رہا تھا لیکن ذہن پر کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔

''ناصر...... ! راکٹ فائر کرو...... وہ سامنے دائیں طرف والی بیرکوں پر۔'' کمانڈر محبّ اللہ کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں نے بائیں طرف دیکھا ناصر مجھ سے پانچ گز کے فاصلے پر تھا۔ اُس نے لانچر میں راکٹ لوڈ کیا، بزوکا کندھے پر رکھا اور اس طرح پوزیشن لے کر بیٹھ گیا کہ ایک گھٹنا زمین پر ٹکا ہوا تھا اور دوسرا گھٹنا کھڑا تھا۔

وہ نشانہ لینے کے لئے لانچر کو آہستہ آہستہ حرکت دے رہا تھا کہ سامنے سے زبرست فائر آیا اور لاتعداد گولیاں میرے سر کے اُوپر سے گزر گئیں...... ناصر بھی بڑی پھرتی سے نیچے گر گیا تھا۔

''فائر!'' کمانڈر محبّ اللہ چیخا۔ ''ناصر! راکٹ فائر کرو! اور زبیر! تم ٹرکوں کو نشانہ بناؤ۔''

بھارتی کیمپ میں اب بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ فوجیوں نے بدحواس ہو کر اندھا دُھند فائرنگ شروع کر دی تھی۔ وہ اس طرف بھی فائرنگ کر رہے تھے جہاں اُن کے مقابلے پر کوئی نہیں تھا۔

ناصر ایک بار پھر پوزیشن لے کر بیٹھ گیا۔ اس مرتبہ اُس نے راکٹ فائر کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ اُس کی یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی تھی۔ راکٹ ایک بیرک پر لگا۔ ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا اور شعلوں کا ایک مہیب بادل آسمان کی طرف اُٹھتا ہوا نظر آیا جو اُوپر جا کر پھیلتا چلا گیا۔

زبیر نے بھی راکٹ فائر کر دیا تھا۔ اُس کا راکٹ حرکت کرتے ہوئے ایک ٹرک پر لگا۔ ٹرک کے پرخچے اُڑ گئے۔ اُس کے جلتے ہوئے ٹکڑوں نے چند اور ٹرکوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا تھا...... ہماری دوسری پارٹیاں بھی کیمپ پر راکٹ برسا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اس بھارتی

فوجی کیمپ پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو...... راکٹ اپنا کام دکھا رہے تھے۔ کیمپ میں اسلحہ کے ذخیرے تباہ ہو رہے تھے...... لگ رہا تھا جیسے کیمپ میں کئی آتش فشاں بیک وقت پھٹ پڑے ہوں۔ مسلسل دھماکوں سے پہاڑیاں لرز رہی تھیں۔

ہمارے سامنے مورچوں سے اب بھی ہیوی مشین گنوں سے بڑی زبردست فائرنگ ہو رہی تھی جس کی وجہ سے ہمیں آگے بڑھنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

مقبول بھی واچ ٹاور پر نصب مشین گن پر قبضہ کرنے کے بعد سامنے مورچوں پر فائر کر رہا تھا۔ دشمن اپنے سامنے مٹی کی بوریوں کی وجہ سے محفوظ تھے۔ ہماری چلائی ہوئی گولیاں اُن کا کچھ نہیں بگاڑ رہی ھیں۔

اور پھر ایک خوفناک چیخ سن کر میں چونک گیا...... میں نے اُس طرف دیکھا اور پھر میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا...... واچ ٹاور پر مقبول کو کئی گولیاں لگی تھیں اور وہ مشین گن کے ساتھ ڈھیر ہو گیا تھا...... سامنے والے مورچوں سے اب فائرنگ میں شدت آ گئی تھی۔ کمانڈر محبّ اللہ نے بیلٹ میں اڑسا ہوا ہینڈ گرنیڈ نکال کر اُس کی پن کھینچی اور بم کو پوری قوت سے مورچے کی طرف اُچھال دیا......

بم مورچے سے چند گز آگے گرا۔ گرد و غبار کا ایک بادل اُٹھا...... میں نے دو فوجیوں کو مورچے کے پچھلی طرف سے نکل کر ایک طرف بھاگتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اپنی گن کا رُخ اُن کی طرف موڑ دیا۔ وہ دونوں ڈھیر ہو گئے۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اُچھل پڑا۔ اس معرکے میں دشمن کے پہلے دو آدمی میرا شکار بنے تھے۔

کیمپ میں جگہ جگہ دھماکے ہو رہے تھے۔ اسلحہ اور گولہ بارود کے کئی ذخیروں میں آگ لگ گئی تھی۔ آتش فشاں پھٹ رہے تھے۔ فوجی اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

ہمارے عقب میں ایک زوردار دھماکہ ہوا تو میں اُچھل پڑا...... وہ مارٹر گن کا گولہ تھا جو ہم سے تقریباً تیس چالیس گز پیچھے گر کر پھٹا تھا لیکن ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ اپنی مشین گنوں کے ناکام ہونے کے بعد بھارتیوں نے مارٹر گنوں کا استعمال شروع کر دیا تھا...... ہماری طرف سے بھی مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہماری دوسری پارٹیاں بھی اپنے محاذ پر جمی ہوئی تھیں۔

مارٹر گنوں کے گولے ہمارے آس پاس پھٹ رہے تھے...... مارٹر گنوں کے ساتھ بھارتیوں نے اب راکٹ برسانا بھی شروع کر دیے تھے۔ مگر یہ راکٹ ہمیں کوئی نقصان پہنچائے بغیر ہمارے سروں کے اُوپر سے گزرتے رہے۔

ناصر کے پاس چار راکٹ تھے اور وہ چاروں راکٹ فائر کر چکا تھا...... ایک آخری راکٹ اُس نے سامنے والے مورچے پر داغا تھا جہاں سے بھاری مشین گن سے زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ وہ مورچہ تہس نہس ہو گیا...... مشین گن بھی خاموش ہو گئی۔ ناصر نے راکٹ لانچر نیچے رکھ دیا اور سب مشین گن اُٹھا کر دھاڑتا ہوا آگے کی طرف دوڑا۔ لیکن وہ چند گز سے زیادہ آگے

نہیں جا سکا۔ بائیں طرف کے مورچے سے آنے والی گولیوں کی بوچھاڑ نے اُسے چھلنی کر دیا اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

رات بیت رہی تھی۔ اندھیرا رُخصت ہو رہا تھا اور دن کا بہت ہلکا سا اُجالا پھیلنے لگا تھا۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق ایک گھنٹے میں کارروائی مکمل کر کے ٹھیک پانچ بجے تینوں پارٹیوں کو کسی سگنل کا انتظار کئے بغیر وہاں سے نکل جانا تھا۔

کیمپ میں افراتفری اب صاف نظر آ رہی تھی۔ دھماکے اب بھی ہو رہے تھے۔ دُھویں اور شعلوں کے بادل آسمان کی طرف اُٹھتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

کمانڈر محبّ اللہ نے مجاہدوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔ میں اپنی گن اُٹھانا ہی چاہتا تھا کہ کسی طرف سے آنے والی ایک گولی میری گن کی نال کے اگلے حصہ پر لگی۔ میرے ہاتھ کو زوردار جھٹکا لگا۔ گن میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور میں زمین پر لیٹ کر تیزی سے پیچھے کی طرف رینگنے لگا۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے اور دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ موت میرے قریب سے آ کر گزر گئی تھی۔ اگر گن کی نال رکاوٹ نہ بنتی تو وہ گولی میرے سینے میں پیوست ہوتی۔

گولی لگنے سے گن کی نال ٹوٹ گئی تھی اور اس طرح گن بیکار ہو گئی تھی۔ میں نے دوبارہ گن کو اُٹھانے کی کوشش نہیں کی اور پیچھے کی طرف رینگتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

تمام مجاہدین پسپائی اختیار کرتے ہوئے گڑھے میں اُتر رہے تھے۔ ہمارے آس پاس مارٹر گنوں کے گولے اب بھی پھٹ رہے تھے۔ میں نے اس وقت کھڈ میں چھلانگ لگائی تھی کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی کمانڈر محبّ اللہ کی چیخ سنائی دی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا گر گیا۔

مارٹر کے گولے کا ایک ٹکڑا اُس کی ٹانگ میں لگا تھا اور خون بہہ نکلا تھا۔ میں نے اُسے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا...... بم کا ٹکڑا اُس کی بائیں ٹانگ میں گھٹنے سے کچھ اُوپر ران میں لگا تھا۔

''میری فکر مت کرو...... تم لوگ نکل جاؤ!'' کمانڈر محبّ اللہ نے دانت بھینچ کر تکلیف ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''ہم آپ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں کمانڈر؟'' میں نے کہا۔

اُسی وقت اکبر دوڑتا ہوا ہمارے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اکبر اور محبّ اللہ سے اُن کی رائفلیں لے لیں۔ اکبر نے جھک کر محبّ اللہ کو اپنے کندھے پر لادا اور کھائی میں ایک طرف دوڑنے لگا۔

ہمارے اطراف میں اب بھی مارٹر گنوں کے گولے پھٹ رہے تھے اور راکٹ سروں پر سے گزر رہے تھے لیکن ہم کھائی میں ہونے کی وجہ سے محفوظ تھے۔ لیکن ایک راکٹ ہمارے سامنے ایک اُونچی چٹان پر لگ کر پھٹا تو ہم ایک لمحے کو رُک گئے۔ چٹان کے چھوٹے چھوٹے پتھر ٹوٹ

کر ہمارے اُوپر گر رہے تھے......

دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ ہم اُس کھائی کے نشیب میں اُتر رہے تھے۔ اور پھر چٹانوں میں دوسری طرف مُڑ گئے۔ کمانڈر محبّ اللہ کو اب دوسرے مجاہد نے کندھے پر لاد لیا تھا۔ بھارتی فوجی کیمپ میں اب بھی مسلسل دھماکے ہو رہے تھے جن سے آس پاس کی پہاڑیاں لرز رہی تھیں۔

ہم پہاڑیوں میں اُونچے نیچے دُشوار گزار راستوں پر دوڑتے رہے۔ دھماکوں کی آوازیں کچھ مدھم اور کم ہوگئی تھیں۔ ہم وہاں سے بہت دُور نکل آئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ بھارتیوں کا یہ کیمپ اگر پوری طرح تباہ نہیں ہوا تھا تو اُنہیں اچھا خاصا نقصان پہنچایا تھا۔

دُھوپ نکل آئی تھی۔ سورج جیسے جیسے اُوپر آرہا تھا چٹانیں تپنے لگی تھیں۔ ہم ایک جگہ چٹانوں کے سائے میں رُک گئے۔ کمانڈر محبّ اللہ کو زمین پر بٹھا دیا گیا۔ زخم سے خون بہہ رہا تھا اور محبّ اللہ نے تکلیف ضبط کرنے کے لئے دانت بھینچ رکھے تھے۔

اکبر نے اپنی کمر پر بندھا ہوا پٹکا کھول لیا اور اُس کی ایک لمبی سی پٹی پھاڑ کر زخم سے ذرا اُوپر کس کر باندھ دی۔ پہاڑیوں میں فائرنگ کی آوازیں مسلسل گونج رہی تھیں۔ بھارتی فوجی یقیناً ہمارے تعاقب میں ہوں گے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ ان پہاڑوں میں زیادہ اندر آنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

چند منٹ ریسٹ کرنے کے بعد ہم پھر چل پڑے۔ محبّ اللہ کو پھر اکبر نے کندھے پر لاد لیا تھا۔ ہماری منزل فیروز پور نامی قصبے کے قریب پہاڑیوں میں وہ غار تھا جس کے بارے میں پہلے ہی سے طے کر لیا گیا تھا کہ کارروائی مکمل کرنے کے بعد ہماری پارٹی کے مجاہدین وہاں پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

یہاں میں آپ کو ایک بات بتاتا چلوں تاکہ آپ کو صورتحال سمجھنے میں کچھ آسانی ہو سکے۔ فیروز پور نام کا قصبہ سرینگر سے پونچھ کی طرف جانے والی شاہراہ کے سنگم پر واقع ہے جہاں سے یہ گلمرگ سے ہوتی ہوئی بارہ مولا کی طرف چلی گئی ہے۔

پونچھ تو اب آزاد کشمیر کا حصہ ہے۔ کنٹرول لائن کے قریب یہ سڑک بند کر دی گئی ہے۔ اگر آپ سرینگر سے اس شاہراہ پر سفر شروع کریں تو چند میل آگے ماگام کا قصبہ ہے۔ اس سے آگے دو اور چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں جن کے بعد سرینگر سے تقریباً پچیس میل کے فاصلے پر فیروز پور ہے۔ یہیں سے ایک سڑک گلمرگ کی طرف نکلتی ہے۔ اگر سڑک سے سفر کیا جائے تو فیروز پور سے گلمرگ کا فاصلہ تقریباً دس میل بنتا ہے لیکن مجاہدین کے لئے سڑک پر سفر کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس شاہراہ پر بھارتی فوجیوں کے قافلوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے۔

ہم لوگ سڑک سے تقریباً ایک میل دُور ہٹ کر دُشوار گزار پہاڑوں میں سفر کر رہے تھے۔ ہمیں کوئی خطرہ بھی نہیں تھا اور فاصلہ بھی کم سے کم ہو کر چھ میل رہ جاتا۔

کمانڈر محبّ اللہ کو ہم لوگ باری باری کندھوں پر اُٹھا کر سفر کر رہے تھے۔ اس طرح ہماری

رفتار اگرچہ کم ہوگئی تھی لیکن ہم نے بے تکان اپنا سفر جاری رکھا۔

ایک موقع پر ہم پہاڑی پر ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے سڑک نظر آرہی تھی۔ سرینگر کی طرف سے چند فوجی ٹرک بڑی تیز رفتاری سے گلمرگ کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ٹرکوں پر ہیوی مشین گنیں نصب تھیں۔

ہم اُس پہاڑی پر تقریباً دو ہزار فٹ کی بلندی پر تھے اور اس وقت تک چٹانوں کی آڑ میں کھڑے رہے جب تک وہ فوجی ٹرک پہاڑوں میں ایک موڑ گھوم کر ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ ہم چٹانوں میں سفر کرتے ہوئے ایک بار پھر شاہراہ سے دُور ہٹتے چلے گئے اور تقریباً نو بجے کے قریب چٹانوں میں پوشیدہ ایک غار میں پہنچ گئے۔ اس غار میں ڈاکٹر مریم کو دیکھ کر میں اُچھل پڑا۔

○

میرے لئے یہ انکشاف دلچسپی سے خالی نہیں تھا کہ ڈاکٹر مریم گزشتہ شام یہاں پہنچ گئی تھی۔ یہاں اُس کی آمد اتفاقیہ نہیں طے شدہ پروگرام کے مطابق تھی۔ کیونکہ یہ قریب ترین جگہ تھی جہاں زخمی مجاہدین کو طبی امداد فراہم کی جاسکتی تھی۔

ہم سے پہلے عبدالغنی لون کی پارٹی بھی یہاں پہنچ چکی تھی۔ اُس کی پارٹی کے دو مجاہد زخمی ہوئے تھے جن میں سے ایک کے بازو میں گولی لگی تھی اور دوسرے کی پنڈلی میں۔ ڈاکٹر مریم ہمارے آنے سے پہلے اُن کی ڈریسنگ کر چکی تھی۔ اور اب وہ فوری طور پر کمانڈر محبّ اللہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

محبّ اللہ کو لگنے والا بم کا تازہ ٹکڑا گوشت کے اندر بھی رہ گیا تھا جسے نکالنا بہت ضروری تھا۔ اس قسم کے آپریشن کرنے کے لئے مریض کو بے ہوش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہاں انستھیزیا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تاہم ڈاکٹر مریم کے پاس ایک ایسا سپرے تھا جس سے گوشت وقتی طور پر سن ہو جاتا تھا۔

عبدالغنی لون اور میں کمانڈر محبّ اللہ کے قریب موجود تھے۔ ڈاکٹر مریم نے پہلے زخم کا معائنہ کیا پھر اُس کے اطراف میں اسپرے کر دیا۔ چند سیکنڈ بعد اُس نے زخم کے قریب ٹانگ پر چٹکی بھر کر دیکھا۔ محبّ اللہ نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔

ڈاکٹر مریم نے آپریشن شروع کر دیا۔ نشتر اور ایک دوسرے آلہ جراحت کی مدد سے وہ زخم کو اندر سے پھیلاتی چلی گئی۔ میں اُس منظر کو زیادہ دیر تک نہیں دیکھ سکا...... اور نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔

تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ ڈاکٹر مریم زخم کو اندر تک کھولتی چلی گئی۔ اسپرے کا اثر اب زائل ہونے لگا تھا اور محبّ اللہ کے چہرے پر بھی کرب کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔

''حوصلہ رکھو کمانڈر......!'' مریم نے کہا۔ ''بس ایک منٹ۔ میں جانتی ہوں آپ کو اس

وقت بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے لیکن......''

وہ خاموش ہو گئی۔ اُس کی تمام تر توجہ زخم کی طرف تھی۔ وہ ہاتھ میں پکڑی ہوئی چمٹی کو زخم کے اندر حرکت دے رہی تھی۔ اور پھر اُس نے چمٹی کو باہر کھینچ لیا۔ لوہے کا وہ ٹکڑا تقریباً آدھا انچ کے قریب تھا جسے مریم نے ایک طرف ڈال دیا۔ کمانڈر محبّ اللہ اس وقت بری طرح ٹانگ پٹخ رہا تھا۔ میں نے اور عبدالغنی لون نے اُسے مضبوطی سے جکڑ لیا اور ڈاکٹر مریم بڑے انہماک سے اپنے کام میں مصروف رہی۔

چند منٹ اور لگ گئے اور پھر ڈریسنگ کر دی گئی۔ کمانڈر محبّ اللہ کے چہرے پر کرب و اذیت کے تاثرات نمایاں تھے۔ اُس نے تکلیف ضبط کرنے کے لئے جبڑے بھینچ رکھے تھے مگر منہ سے اُف تک نہیں نکلی تھی اور یہ واقعی ہمت کی بات تھی۔ ہوش میں رہتے ہوئے آپریشن برداشت کر لینا بڑے حوصلے کا کام تھا۔

مریم نے اُسے ایک گولی بھی کھلا دی تھی۔ ڈریسنگ کے کچھ دیر بعد محبّ اللہ پُرسکون ہوتا چلا گیا۔ اور پھر شاید یہ اُسے کھلائی جانے والی گولی کا اثر تھا کہ وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

ہم لوگ غار کے دوسرے حصے میں آ گئے۔ مریم ہاتھ دھو کر قہوہ بنا لائی۔ اُس وقت غار میں ہم بارہ آدمی تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ہماری پارٹی کے دو مجاہدین شہید ہوئے تھے۔ حسن لاپتہ ہو گیا تھا اُس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ شہید ہو گیا تھا یا ہم سے بچھڑ کر پہاڑوں میں کسی طرف روپوش ہو گیا تھا۔

عبدالغنی لون کی پارٹی کا ایک مجاہد شہید ہوا تھا اور دو زخمی ہوئے تھے جنہیں یہاں لا کر ٹریٹمنٹ دے دیا گیا تھا۔ کمانڈر رشید یا اُس کی پارٹی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی۔ وہ لوگ کسی اور طرف نکل گئے تھے۔

بھارتیوں کے فوجی کیمپ کے بارے میں بھی کوئی اطلاع نہیں تھی کہ اُن کا کتنا نقصان ہوا تھا؟ لیکن میرا خیال تھا کہ ہم نے اُنہیں اچھا خاصا نقصان پہنچایا تھا۔

یہ غار بھی بارہ مولا والے غار کی طرح کشادہ اور اندر سے کئی حصوں پر مشتمل تھا۔ چائے پینے کے بعد ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر میں ڈاکٹر مریم کے ساتھ غار کے ایک اور حصہ میں آ گیا۔ یہ جگہ بھی ایک بڑے ہال نما کمرے کی طرح بہت کشادہ تھی۔ اُس کے آخر میں تقریباً چار فٹ کی بلندی پر دو فٹ چوڑا ایک پتھر دیوار سے آگے کو نکلا ہوا تھا۔ یہ پتھر اتنا چوڑا تھا کہ دو آدمی آسانی سے اس پر بیٹھ سکتے تھے۔ اُس پتھر سے تین فٹ اُوپر ایک تنگ سرنگ تھی۔ ایک صحت مند آدمی آسانی سے اُس سرنگ میں سے گزر سکتا تھا۔

''آؤ...... تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔'' ڈاکٹر مریم کہتے ہوئے پتھر کی طرح آگے کو نکلے ہوئے کارنس کے قریب پہنچ گئی۔ اُس نے دونوں ہاتھ پتھر پر ٹکا دیئے اور پھر اس طرح اچک کر پتھر پر چڑھ گئی کہ مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی تھی۔ لیکن میرے خیال میں اس میں حیرت کی کوئی

بات نہیں تھی۔ وہ دو سال سے ان پہاڑوں میں رہ رہی تھی اور اس طرح اچک اُچھل کر چٹانوں پر اُترنے چڑھنے کی عادی ہو گئی تھی۔

''آؤ...... اُوپر آ جاؤ......!'' مریم نے مجھے اشارہ کیا۔

میں بھی مریم کی طرح اُچک کر پتھر پر چڑھ گیا۔ اس سے تین فٹ اُوپر تنگ سی سرنگ سے ہوا آ رہی تھی۔ مریم نے دونوں ہاتھ سرنگ کے دہانے کے نچلے کنارے پر جما دیئے اور اپنے جسم کو آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھانے لگی۔ میں اُسے دیکھتا رہا۔ پہلے اُس کے جسم کا بالائی حصہ سرنگ میں غائب ہوا اور پھر اُس کے پیر بھی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

''آؤ...... میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ!'' مریم کی آواز سن کر میں بھی اچک کر اُس سرنگ میں داخل ہو گیا اور سینے کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ سرنگ میں تازہ ہوا کی آمد و رفت تو تھی لیکن تاریکی اس قدر گہری تھی کہ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

چند گز آگے جا کر مریم رُک گئی۔ میرا سر اُس کے پیروں سے ٹکرا گیا۔

'میں اس لئے رُک گئی تھی کہ تم بھی رُک جاؤ۔'' مریم کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''آگے ذرا خیال سے آنا، سرنگ دائیں طرف مُڑ رہی ہے۔ ایسا نہ ہو تمہارا سر سامنے والی دیوار سے ٹکرا جائے۔''

مریم پھر آگے بڑھنے لگی۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے رینگتا رہا تھا۔ اُس کے خبردار کرنے کے بعد میں نے ایک ہاتھ آگے کو نکال لیا تھا۔ میرا ہاتھ سامنے والی دیوار سے ٹکرایا اور میں ٹٹولتا ہوا دائیں طرف مُڑ گیا۔ اس طرف تقریباً پندرہ گز آگے مدھم سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں جگہ بھی قدرے کشادہ تھی۔ وہاں سے سرنگ ایک بار پھر دائیں طرف مُڑ گئی تھی اور روشنی اسی طرف سے آ رہی تھی۔ میں جب اُس طرف مُڑا تو مریم دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ ہم تقریباً دو سو فٹ اُوپر آ گئے تھے۔ سینے کے بل رینگتے ہوئے میری سانس بھی پھول گئی تھی۔ مریم میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

میں نے پہلے اِدھر اُدھر اور پھر سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا تو مجھے سینے میں اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا...... ہم اس وقت ایک تنگ سے کنویں میں کھڑے تھے۔ دیواروں کا درمیانی فاصلہ تین فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ دیواروں میں چھوٹے بڑے پتھر بھی اُبھرے ہوئے تھے۔ اُوپر...... بہت اُوپر روشن آسمان نظر آ رہا تھا۔ میرے خیال میں یہ کنواں تقریباً پچاس فٹ گہرا تھا۔

''اُوپر چلو......'' مریم نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''اُوپر......؟'' میں نے اس طرح اُس کی طرف دیکھا جیسے اُس کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔

OOO

''ہاں ...... اصل نظارہ تو اُوپر ہے۔'' مریم کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

پہلے تو میں سمجھا کہ وہ مذاق کررہی ہے۔ لیکن پھر اُس کا اشارہ پاکر میں اُوپر چڑھنے لگا۔ میں نے باہیں پھیلا کر دونوں ہاتھ دیواروں پر ٹکا دیئے اور اسی طرح پیر بھی پھیلا لئے۔ اس طرح پتھروں پر پیر ٹکا کر اُوپر چڑھتے ہوئے میرا سانس پھول گیا۔

تقریباً نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے نیچے دیکھا۔ مریم بھی میرے پیچھے ہی پیچھے اُوپر آرہی تھی۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ اگر میرا پیر پھسل گیا تو مریم کو بھی اپنے ساتھ لے مرواں گا۔ لہٰذا میں پہلے سے زیادہ محتاط ہوکر اُوپر چڑھنے لگا۔

اُوپر آکر میں نے دونوں ہاتھ اُس کنویں کے کناروں پر جما دیئے اور محتاط انداز میں اچک کر باہر آگیا۔ میرا سانس اگرچہ بری طرح پھولا ہوا تھا مگر میں نے جھک کر مریم کو اُوپر کھینچا اور ایک طرف اوندھا ہوکر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ ڈاکٹر مریم بھی میرے قریب بیٹھی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اور پھر اُس کی آواز سن کر میں سیدھا ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنا سانس سینے میں رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا......

یوں تو کشمیر کی پوری وادی ہی جنت کا ٹکڑا تھی مگر ایسا حسین منظر میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ ہم اس وقت ایک پہاڑی کی چوٹی پر تھے۔ ہمارے پچھلی طرف بیس پچیس فٹ اُونچی ایک چٹان تھی۔ دائیں بائیں دُور تک چنار اور یوکلپٹس کے درخت پھیلے ہوئے تھے اور سامنے تا حدِ نشیب میں جیسے سبز مخمل کا فرش پھیلا ہوا تھا جس میں رنگ برنگے پھول ستاروں کی طرح ٹکے ہوئے تھے۔ نیچے پھیلی ہوئی وادی میں بہت دُور دُور تین مکان تھے۔ ایک مکان کی چمنی سے دُھواں اُٹھ رہا تھا اور سرمئی لکیر کی طرح اُوپر اُٹھ کر آسمان کی وسعتوں میں پھیل کر معدوم ہورہا تھا۔

اس وادی کے دوسری طرف بہت اُوپر برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی چوٹیاں تھیں۔ تیز دُھوپ میں برف پوش چوٹیاں اس طرح چمک رہی تھیں کہ اُن پر نگاہ ٹکانا مشکل ہورہا تھا۔

انہی برف پوش پہاڑوں کے دامن میں غالباً چیڑ کا جنگل تھا جو دائیں بائیں دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ فضا میں بڑی خوشگوار سی مہک تھی۔ میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

''یہ جو وادی میں سبزہ نظر آرہا ہے نا......'' مریم سامنے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''دھان کے کھیت ہیں۔ اور دائیں طرف وہ جو چمکتی ہوئی لکیر سی نظر آرہی ہے وہ وولر جھیل سے نکلنے والا ایک چھوٹا دریا ہے جو سرحد پار کرکے پونچھ کی طرف نکل جاتا ہے۔ اور اُس دریا کے دائیں طرف وہ جہاں درختوں کا جھنڈ نظر آرہا ہے وہاں سے تقریباً نصف میل کے فاصلہ پر فیروز پور قصبہ ہے۔ لیکن ان نیلی پہاڑیوں کی وجہ سے قصبہ یہاں سے نظر نہیں آئے گا۔''

''لگتا ہے تمہیں وادی کے بارے میں بہت سی معلومات ہیں۔'' میں نے کہتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔

''میں دو سال سے مجاہدین کے ساتھ ان پہاڑوں میں ہوں۔ اور وادی کے چپے چپے سے واقف ہوں۔'' مریم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اور یہ کون سی جگہ ہے؟...... میرا مطلب ہے یہ غار۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ غار فیروز پور قصبے سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہے اور ہم اس وقت تقریباً تین ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔'' مریم نے کہا۔ ''اس غار تک آنے کا راستہ تم دیکھ چکے ہو بہت دُشوار گزار مگر محفوظ ہے۔ بھارتی فوجی مجاہدین کا تعاقب کرتے ہوئے بھی کبھی پہاڑیوں میں زیادہ اندر تک نہیں آتے۔ اُنہیں اپنے گھیرے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ وہ غار اگرچہ محفوظ ہے لیکن قدرت بھی ہماری مدد کرتی ہے۔'' وہ خاموش ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اُس نے ہم کا لفظ استعمال کیا تھا اور وہ اپنے آپ کو مجاہدین سے الگ نہیں سمجھتی تھی۔

''اگر کبھی اتفاق سے بھارتی وحشی اس غار تک پہنچ بھی گئے تو قدرت نے ہمیں اپنے بچاؤ کا دوسرا راستہ بھی دکھا رکھا ہے۔ غار کے اندر وہ تنگ سی سرنگ اور یہ کنواں نما راستہ۔'' وہ کنویں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ وہ راستہ ہے جو ہنگامی صورتحال میں ہم اپنے بچاؤ کے لئے استعمال کرسکتے ہیں۔ اس طرف سے بھی یہ راستہ محفوظ ہے۔ اوّل تو کسی بھارتی فوجی کے یہاں تک آنے کا امکان ہی نہیں اور اگر اتفاق سے کوئی یہاں پہنچ بھی جائے تو اس گہرے کنویں کو دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ یہاں سے غار تک راستہ جاتا ہے۔''

''ہاں واقعی......'' میں نے کہا۔ ''قدرت ہم پر مہربان ہے جو ہمارے لئے اس طرح کے وسیلے پیدا کررہی ہے۔''

مریم نے فوری طور پر کچھ نہیں کہا۔ چند لمحے خاموش رہی اور پھر وہ مجھ سے گزشتہ شب کی کارروائی کے بارے میں دریافت کرنے لگی۔ میں اُسے تفصیل سے سب کچھ بتاتا رہا۔ اپنے بعض ساتھیوں کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے میں افسردہ سا ہوگیا تھا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ساتھیوں کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔'' میں آخر میں کہہ رہا تھا۔ ''ہم نے اگرچہ اُس کیمپ کی حد تک بھارتی فوجیوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ہم نے اُنہیں کتنا نقصان پہنچایا ہے۔''

''آج شام تک یا کل دن میں کسی وقت یہ بھی معلوم ہوجائے گا۔'' مریم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور میرا خیال ہے اب چلنا چاہئے۔ کافی دیر ہوگئی۔''

ہم تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے۔ میں نے اُٹھ کر چاروں طرف دیکھا اور پھر مریم سے

پہلے کنویں میں اُترنے لگا۔ اُس وقت احساس ہوا کہ کنویں کی دیواروں پر چڑھنا آسان تھا لیکن نیچے اُترنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ میں بڑی احتیاط سے ہاتھ اور پاؤں جما جما کر نیچے اُترنے لگا۔ اس سے زیادہ مشکل مرحلہ سرنگ میں اُترنا تھا۔ اس مرتبہ بھی مریم میرے آگے تھی اور میں پیچھے۔ ہم سینے کے بل اُلٹا لیٹے نیچے کی طرف پھسل رہے تھے۔ اور بالآخر یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔

جب ہم غار میں پہنچے تو اکبر کے سوا سب لوگ سو رہے تھے۔ اکبر سب مشین گن سنبھالے غار کے دہانے پر بیٹھا ہوا تھا۔ سب لوگ رات بھر کے جاگے ہوئے اور پہاڑوں میں طویل سفر کر کے تھکے ہوئے تھے مگر حیرت کی بات تھی کہ مجھے نہ تو تھکن کا احساس ہو رہا تھا اور نہ ہی نیند آ رہی تھی۔

''اکبر بھائی..... تم بھی رات بھر جاگے ہو اور تھکے ہوئے ہو۔ سو جاؤ! میں یہاں ڈیوٹی دیتا ہوں۔'' میں نے اُس کے قریب پہنچ کر کہا۔ میں نے اکبر سے سب مشین گن لے لی اور اُس کی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اکبر اُٹھ کر چند گز دُور عبدالغنی لون کے قریب فرش پر لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر بعد اُس کے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔

''میں تمہارے لئے قہوہ بنا کر لاتی ہوں۔ تمہیں اس وقت یقیناً طلب ہو رہی ہو گی۔'' مریم نے کہا۔

''ہاں..... طلب تو ہو رہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

مریم غار کے دوسرے حصے کی طرف چلی گئی۔ میں غار سے باہر دیکھنے لگا۔ یہاں سے وہ منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا جو میں نے اُوپر سے دیکھا تھا۔ غار کا دہانہ دوسرے رُخ پر تھا۔ اس کے سامنے قد آدم خودرو جھاڑیاں اور چٹان نما بڑے بڑے پتھر پھیلے ہوئے تھے جن کی وجہ سے زیادہ دُور تک نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد مریم قہوہ بنا کر لے آئی۔ اُس نے ایک مگ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور دوسرا خود لے کر سامنے بیٹھ گئی۔ قہوے کی چسکیوں کے ساتھ ہم سرگوشیوں میں باتیں بھی کرتے رہے۔ انہی باتوں سے مریم کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی میرے سامنے آیا۔ وہ لاہور کے ایک زمیندار گھرانے کی فرد تھی۔ اُن کی زمینیں لاہور کے نواح میں تھیں جبکہ لاہور کے سب سے مہنگے علاقے ماڈل ٹاؤن میں بھی ان کی ایک شاندار کوٹھی تھی۔ وہ میڈیکل کی تعلیم سے جیسے ہی فارغ ہوئی تو والدین کو اُس کی شادی کی فکر ہوئی لیکن اُس نے صاف انکار کر دیا کہ فی الحال اس کا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

اس کی منگنی اگرچہ بچپن ہی میں اپنے عم زاد سے ہو چکی تھی اور وہ بھی انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ مریم نے اپنے منگیتر سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اس کا خیال دل سے نکال دیا جائے۔ مریم کے منگیتر نے بڑی شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے اُس سے دستبرداری کا اعلان کر دیا اور مریم کو یہ پیشکش بھی کی کہ وہ شادمان ٹاؤن میں اپنے دس کنال

پلاٹ پر اُسے ہسپتال کی عمارت تعمیر کر کے دینے کو تیار ہے اور وہ بے لوث ہو کر ہر طرح سے اُس کی معاونت بھی کرتا رہے گا۔ لیکن مریم نے اُس کی اس پیشکش کو بھی ٹال دیا تھا کہ فی الحال اسے تجربے کی ضرورت تھی۔ وہ سرکاری ملازمت کے دوران پونچھ کے ہسپتال میں آ گئی اور مجاہدین کی حالت دیکھ کر اُس نے زندگی کا اہم ترین فیصلہ کر لیا اور پونچھ سے کشمیر آ گئی اور پچھلے دو سال سے وہ مجاہدین کی خدمت کر رہی تھی۔

ہم دیر تک غار کے دہانے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اور پھر مریم اُٹھ کر دوسرے حصے میں چلی گئی۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا باہر تکتا رہا۔

مریم نے روٹیاں پکا لی تھیں۔ دوپہر کے کھانے کے وقت سب کو جگا دیا گیا۔ کھانا کھانے کے بعد مجھ پر تھکن کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اب مجھ پر نیند بھی حملہ آور ہو رہی تھی۔ زبیر نامی نوجوان نے میری جگہ ڈیوٹی سنبھال لی اور میں فرش پر لیٹتے ہی سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو غار کے باہر بھی شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ غار کے دوسرے حصے میں لالٹین جل رہی تھی جس کی مدھم سی روشنی اس طرف پہنچ رہی تھی۔

چند لمحوں تک تو میرے دماغ پر نیند کا خمار طاری رہا اور جب حواس بحال ہوئے تو یہ جان کر حیران رہ گیا کہ میرے قریب حسن بیٹھا ہوا تھا۔ کمانڈر محبّ اللہ دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے نیم دراز تھا اور مریم اُس کے قریب بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ اُن کے علاوہ غار میں اور کوئی نہیں تھا۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد مجھے پتہ چلا کہ تمام مجاہدین شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی اپنے مختلف ٹھکانوں کی طرف جا چکے تھے۔

حسن کے بڑے دلچسپ انکشافات ہوئے تھے۔ وہ ہماری کارروائی مکمل کرنے کے بعد انہی اطراف کے پہاڑوں میں چھپ گیا تھا۔ اُس کے کہنے کے مطابق شہر کی شمالی چھاؤنی سے کئی فوجی ٹرک وہاں پہنچ گئے تھے لیکن وہ کیمپ سے دُور ہی رُک گئے تھے۔ فوجی دیکھتے ہی دیکھتے آس پاس کی پہاڑیوں پر پھیل گئے۔

''وہ کیمپ بالکل تباہ ہو چکا ہے۔'' حسن بتا رہا ہے۔ ''میں پانچ بجے تک اپنی کمین گاہ میں چھپا رہا۔ اُس وقت تک کیمپ میں اِکا دُکا دھماکے ہو رہے تھے اور دُھویں کے بادل اُمڈ رہے تھے۔ مجھے یقین ہے اس کیمپ میں درجنوں فوجی جہنم رسید ہو چکے ہوں گے اور کچھ نہیں بچا ہو گا وہاں۔''

کیمپ کے نقصان کے بارے میں صحیح اطلاع نہیں تھی۔ بہرحال مجھے خوشی تھی کہ ہم نے بھارتی فوج کو اچھا خاصا نقصان پہنچایا تھا۔

اگلے روز ایک اور مجاہد غار میں پہنچ گیا۔ اُس کی اطلاع کے مطابق بھارتی فوجی مجاہدین کی تلاش میں آس پاس کی بستیوں کو تہس نہس کر رہے ہیں۔ ان بستیوں کے کئی گھروں کو جلا کر راکھ کر ڈالا۔ کئی بے گناہ بوڑھوں کو اذیتیں دے کر ہلاک کیا گیا اور عورتوں کو زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔

اُس بھارتی فوجی کیمپ کی تباہی کے بارے میں مختلف اوقات میں مختلف اطلاعات مل رہی تھیں۔ ایک اطلاع یہ تھی کہ وہ کیمپ مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا اور ستاون فوجی جہنم واصل ہوئے تھے جن میں چند اعلیٰ افسران بھی شامل تھے۔ کیمپ کی تباہی اور اپنے آدمیوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے بے گناہوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ شبے میں پکڑے جانے والوں کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

اُسی شام ایک اور خوفناک اطلاع ملی۔ فوجیوں نے گلمرگ کے ایک مکان سے دو نوجوانوں کو پکڑ لیا تھا۔ اُن میں ایک بیمار تھا۔ اُس میں چلنے کی سکت نہیں تھی اور کئی روز سے بستر پر پڑا ہوا تھا۔ دوسرا اُس کا دوست تھا جو اُس کی مزاج پرسی کے لئے آیا ہوا تھا۔ وہ میٹرک کا سٹوڈنٹ تھا اور اُس کی عمر سولہ کے لگ بھگ تھی۔

بھارتی فوجی اُن دونوں کو پکڑ کر شہر کے مرکزی چوراہے پر قائم کیمپ میں لے گئے۔ تقریباً دو گھنٹوں تک مجاہدین کے بارے میں پوچھ گچھ کے لئے اُن پر تشدد کیا جاتا رہا۔ پھر بیمار نوجوان کے جسم پر بم باندھ کر اُسے چوک میں چھوڑ دیا گیا اور جب بم پھٹا تو اُس نوجوان کے چیتھڑے اُڑ گئے۔ جبکہ دوسرے نوجوان کو مزید تفتیش کے لئے چھاؤنی میں بھیج دیا گیا اور پھر اُس کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔

بیمار نوجوان کو بم سے اُڑائے جانے کی خبر آناً فاناً پوری وادی میں پھیل گئی...... نہتے بے بس اور مجبور کشمیری احتجاج کرنے کے لئے سڑکوں پر نکل آئے۔ کئی شہروں میں اُن کے پُر امن احتجاجی جلوسوں پر بھارتی فوجیوں نے گولیاں برسائیں اور چند اور لاشیں گرا دیں۔ بے گناہ کشمیریوں نے مزید احتجاج کے لئے پوری وادی میں ہڑتال کی کال دے دی۔ وادی کشمیر میں بھارتی مظالم کے خلاف ہڑتال روز کا معمول بن چکا تھا لیکن بھارتی حکمرانوں پر ان پُر امن احتجاجات کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اس کے برعکس نقصان کشمیری عوام ہی کا ہوتا تھا۔ تمام کاروبار ٹھپ ہو رہے تھے۔ شہروں میں رہنے والے بھی فاقہ کشی کر رہے تھے۔

ایک ہفتہ بعد ایک اور سنسنی خیز اطلاع ملی...... بھارتی فوج کے ایک دستے نے بسال پور پر بلہ بول دیا تھا۔ اُنہیں اطلاع ملی تھی کہ کیمپ پر مجاہدین کے حملے سے ایک روز پہلے دو مجاہدین اس بستی میں آئے تھے اور پورا دن یہاں گزار کر گئے تھے۔ یہ اطلاع میرے اور مقبول کے بارے میں تھی۔

ہمارے بارے میں پوچھ گچھ کے لئے بستی والوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور جب بستی والوں نے احتجاج کیا تو بھارتی وحشیوں نے کئی گھروں کو نذرِ آتش کر دیا اور اندھا دُھند فائرنگ شروع کر دی۔

بھارتی فوجیوں کو اطلاع یہ ملی تھی کہ مجاہدین نے ماسی عائشہ کے گھر میں پناہ لی تھی۔ ماسی عائشہ کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اُسے تشدد اور ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد اُس کی چھاتیاں

کاٹ دی گئیں اور سنگینوں سے وار کر کے اُس کا پیٹ چاک کر دیا گیا اور اُس کے گھر کو جلا کر راکھ کر دیا گیا......

میں اُس بستی کے بارے میں کچھ اور سننا چاہتا تھا۔ اور پھر یہ سنسنی خیز خبر سن کر میری رُوح کانپ اُٹھی کہ بسال پور کی چار جوان لڑکیاں لاپتہ تھیں اور اُن میں انگوری بھی تھی......

جب میں نے انگوری کو دیکھا تھا تو میرے سینے میں ایک ہلچل سی مچ اُٹھی تھی۔ اُس سے ابھی تک میری کوئی بات چیت بھی نہیں ہوئی تھی لیکن میں اُس کے لئے اپنے اندر عجیب سے جذبات محسوس کرنے لگا تھا۔ اُس کے بارے میں سوچتا تو میرے پورے بدن میں گدگدی سی ہونے لگتی۔ اور اب اس رُوح فرسا خبر نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا...... میری رُوح تک کانپ اُٹھی تھی۔ خبر لانے والے کی اطلاع کے مطابق دو تین لڑکیاں فوجیوں کے قبضے میں تھیں اور دو تین لڑکیوں کو شام کے اندھیرے میں بستی سے بھاگتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

ہوسکتا ہے انگوری بھی اُن لڑکیوں میں شامل ہو جو بھارتی فوجیوں سے بچ کر بستی سے بھاگ گئی تھیں...... ایک موہوم سی اُمید تھی اور میں اس اُمید کے سہارے اُسے تلاش کرنا چاہتا تھا۔

اور جب میں نے ڈاکٹر مریم سے بات کی تو وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''ٹھیک ہے......'' وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''کمانڈر محبّ اللہ سے بات کر لو! وہ تمہیں نہیں روکے گا۔''

کمانڈر محبّ اللہ نے مجھے جانے کی اجازت دے دی اور حسن کو بھی میرے ساتھ کر دیا۔ ہم اُسی شام اُن سے رُخصت ہو کر غار سے روانہ ہو گئے۔ ہم رات بھر پہاڑوں میں چھپ کر سفر کرتے رہے۔ صبح سویرے بسال پور کے نواح میں پہنچ گئے لیکن بستی کا رُخ کرنے کی بجائے جنگل میں چھپے رہے۔ پورا دن ہم نے جنگل میں گزار دیا اور شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد جنگل سے نکل کر بستی میں آ گئے۔

کئی گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا گیا تھا...... یہ بھارتی فوجی چنگیز اور ہلاکو سے زیادہ سنگدل اور ظالم تھے۔ جس بستی میں نکل جاتے اُسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے۔

''اُس روز بھارتی فوجی دو تین لڑکیوں کو اُٹھا کر لے گئے تھے۔'' میرے پوچھنے پر گاؤں کے ایک بوڑھے نے بتایا۔ ''انگوری دو تین لڑکیوں کے ساتھ بستی سے بھاگ گئی تھی۔ کل یہ خبر سننے میں آئی تھی کہ اُسے پٹن کی طرف کسی جگہ پر دیکھا گیا ہے۔ یہ تصدیق نہیں ہو سکی کہ وہ انگوری ہی تھی یا کوئی اور۔''

میرے دل میں اُمید کی کرن کچھ اور روشن ہو گئی۔ میں اور حسن اُسی رات پٹن کی طرف روانہ ہو گئے۔ بارہ مولا سرینگر شاہراہ پر واقع پٹن نام کا قصبہ بسال پور سے تقریباً پچیس میل کے فاصلے پر تھا۔ اگر ہم بارہ مولا کی طرف سے ہو کر جاتے تو یہ فاصلہ کم سے کم بیس میل بڑھ جاتا۔ ہم نے وہ راستہ اختیار کیا جس پر بھارتی فوجیوں کے تصادم کا زیادہ خطرہ بھی نہیں تھا۔

ہمیں بستی سے خچر مل گئے تھے۔ ہم راتوں رات دُشوار گزار پہاڑی راستوں پر سفر کرتے ہوئے صبح چار بجے کے قریب پتن بارہ مولا ہائی وے کے قریب پہنچ گئے۔

سڑک ہمارے سامنے تھی۔ ہم پہاڑیوں سے نکل کر سڑک پر آنا چاہتے تھے کہ گڑگڑ کی آواز سن کر رُک گئے...... وہ بھاری ٹرکوں کی آواز تھی۔ ہم خچروں سے اُتر کر کچھ آگے نکل گئے اور ایک چٹان کی آڑ سے سڑک کی طرف دیکھنے لگے۔ اُس جگہ بڑے بڑے چٹان نما پتھر تھے اور درختوں کی بھی بہتات تھی۔ اس لئے سڑک کی طرف سے ہمیں دیکھ لئے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔

وہ دو فوجی ٹرک تھے جن پر سامنے اور دائیں بائیں مشین گنیں نصب تھیں اور فوجی مستعد کھڑے تھے۔

سڑک ہم سے تقریباً پندرہ فٹ نیچے تھی۔ میں اور حسن پتھروں کی آڑ میں کھڑے اُنہیں اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ میرا خیال تھا کہ ٹرک نکل جائیں تو ہم سڑک پار کر کے دوسری طرف کی پہاڑیوں میں چلے جائیں گے۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پہاڑیاں تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اُٹھیں...... میں اُچھل پڑا۔ ہم سے کچھ آگے شاید کچھ مجاہدین گھات لگائے بیٹھے تھے اور اُنہوں نے ٹرکوں پر فائر کھول دیا تھا۔

میں نے حسن کی طرف دیکھا، اور پھر ہم دونوں بھی ٹرکوں پر فائرنگ کرنے لگے۔ اگلے ٹرک کے دو گنر دوسرے مجاہدین کی فائرنگ سے جہنم واصل ہو چکے تھے۔ اُن کی جگہ دوسرے فوجیوں نے سنبھال لی تھی اور مشین گنوں کا فائر کھول دیا تھا۔

نصف درجن فوجی ٹرکوں سے کود کر سڑک کے کنارے پتھروں کے پیچھے پوزیشن سنبھال چکے تھے اور سب مشین گنوں سے فائرنگ کر رہے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ دوسرے مجاہدین کون تھے لیکن اُن کی ہمت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ سامنے سے مشین گنوں کی شدید فائرنگ کے باوجود اپنی جگہ پر ڈٹے ہوئے تھے۔

اور پھر کان پھاڑ دینے والا ایک دھماکہ ہوا...... مجاہدین میں سے کسی نے اگلے ٹرک پر دستی بم پھینکا تھا۔ ٹرک کے پرخچے اُڑ گئے۔ سڑک کے کنارے پتھروں میں پوزیشن لئے ہوئے بھارتی فوجیوں کی فائرنگ میں شدت آ گئی تھی۔ ہم اپنی جگہ بدل کر فائر کر رہے تھے۔ سامنے سے فائرنگ میں بھی شدت آ گئی تھی۔ میں اور حسن دوڑتے ہوئے وہاں سے دُور نکل گئے۔ اُس طرف سے بھی دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور پھر دو آدمی دوڑتے ہوئے سامنے آ گئے۔ اُنہوں نے ہمیں دیکھتے ہی رائفلیں سیدھی کر لی تھیں...... لیکن دوسرے ہی لمحوں رائفلوں کے رُخ بدل گئے۔

میں دوڑتا ہوا جیسے ہی ایک پتھر کے دوسری طرف مُڑا اُس طرف سے آنے والا ایک مجاہد مجھ سے ٹکرا گیا۔ اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ چیخ سن کر میں بھی چونک گیا تھا۔

اُس مجاہد نے ڈھیلا ڈھالا لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر کالا رُومال بندھا ہوا تھا...... چہرے پر نقاب تھا۔ اکثر مجاہدین بھارتی فوجیوں کے خلاف چھاپہ مار کارروائیاں کرتے ہوئے چہروں پر نقاب باندھ لیتے تھے تاکہ اُنہیں شناخت نہ کیا جا سکے۔

مجھ سے ٹکرا کر وہ مجاہد لڑکھڑا گیا۔ میں نے اُسے سنبھالنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اتفاق سے میرا ہاتھ اُس کے چہرے سے ٹکرایا اور نقاب اُس کے چہرے سے ہٹ گیا...... اور اُس سیاہ پوش مجاہد کا چہرہ دیکھ کر میں اُچھل پڑا۔ وہ انگوری تھی......

"انگوری تم......؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ مجھے یاد آ گیا جب میں نے ایک دن اُن کے گھر میں قیام کیا تھا تو میری طرف دیکھتے ہوئے اُس کے چہرے پر سرخی چھا جاتی تھی اور حیا سے نظریں جھک جاتی تھیں۔ لیکن اس وقت مجھ سے ٹکرانے کے بعد وہ میرے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان صرف چند انچ کا فاصلہ تھا۔ لیکن نہ تو اُس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیلی تھی اور نہ ہی اُس کی نظریں جھکی تھیں۔ اس کے برعکس اُس کی موٹی موٹی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ میں نے اُس کے ہاتھوں کی مخروطی اُنگلیوں کو سوئی کی مدد سے کپڑے پر رنگین دھاگوں سے نازک سے بیل بوٹے بناتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس وقت اُس کے ہاتھوں میں سب مشین گن تھی جو صرف انگارے اُگلنا جانتی تھی۔

"تمہارے ہاتھوں میں رائفل دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔" میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اوہ......!" انگوری کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "عورت کھیتوں میں اناج اُگانے کے لئے ہل چلا کر زمین کا سینہ چیر سکتی ہے۔ سڑکیں بنانے کے لئے پتھر کوٹ سکتی ہے۔ مزدوری کرنے کے لئے سر پر بوجھ اُٹھا سکتی ہے تو ہاتھوں میں رائفل کیوں نہیں اُٹھا سکتی؟ اور میں تو کشمیر کی بیٹی ہوں...... اب وقت آ گیا ہے کہ کشمیر کی ہر عورت اپنی عزت و ناموس کے تحفظ اور وادی کے تقدس کے لئے ہاتھوں میں رائفل اُٹھا لے۔ لیکن......" گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکی۔ بھارتی فوجی فائرنگ کرتے ہوئے پیش قدمی کر رہے تھے۔

"انگوری بھاگو...... اس طرف......!" انگوری کے ایک ساتھی نے چیختے ہوئے کہا۔ یہ بھی نسوانی آواز تھی جس نے مجھے بری طرح چونکا دیا تھا...... میں نے پہلی بار اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ وہی مجاہد تھا جس نے پہلے مجھ پر رائفل تانی تھی۔ گول مٹول سا چہرہ، چمکتی ہوئی موٹی موٹی آنکھیں اور ڈھیلا ڈھالا کرتا۔ اُس کے سر پر بھی کالا رُومال بندھا ہوا تھا اور وہ بھی لڑکی تھی۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا، اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"یہ باتوں کا وقت نہیں ہے...... بعد میں تفصیل سے باتیں ہوں گی۔ تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟" انگوری نے کہا۔

''صرف ایک......'' میں نے جواب دیا اور حسن کی طرف اشارہ کیا جو چند گز دُور ایک بڑے پتھر کی آڑ سے بھارتی فوجیوں کی فائرنگ کا جواب دے رہا تھا۔

''اوہ!'' انگوری کے منہ سے ایک بار پھر نکلا۔ ''اُن وحشیوں کا ایک ٹرک ہم نے تباہ کر دیا ہے۔ زندہ بچ جانے والے فوجی اب صرف اپنے آپ کو بچانے کے لئے فائرنگ کر رہے ہیں۔ ان پہاڑوں میں ہمارے پیچھے نہیں آئیں گے۔ اس طرف نکل چلو اور نوری تم......'' اُس نے اپنی ساتھی کی طرف دیکھا۔ ''عبداللہ کو لے کر اُس طرف سے نکل جاؤ۔ ہم لوگ چشمے پر ملیں گے۔''

وہ لڑکی نوری فوراً ہی اپنے تیسرے ساتھی کی طرف دوڑ گئی۔ مجھے اطمینان ہوا کہ اُن کے ساتھ کم از کم ایک مرد تو تھا۔ میں نے حسن کو اشارہ کیا اور انگوری کے ساتھ ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ حسن بھی رُک رُک کر بھارتی فوجیوں کی فائرنگ کا جواب دیتا ہوا ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ بھارتی فوجیوں کے ٹرکوں پر حملہ کرنے والی مجاہدین کی اس پارٹی میں صرف تین افراد تھے۔ دو عورتیں اور ایک مرد۔ اور اُن کی یہ کارروائی بڑی کامیاب رہی تھی۔ اُنہوں نے ایک ٹرک کو تباہ کر دیا تھا اور میرے اندازے کے مطابق اُس ٹرک کے ساتھ کم از کم آٹھ فوجیوں کے بھی پرخچے اُڑ گئے تھے۔

ہم بلندی کی طرف دوڑتے رہے۔ نوری اور عبداللہ کسی اور طرف نکل گئے تھے۔ اُس طرف سے بھی وقفے وقفے سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں انگوری کو بہت نازک اندام سمجھتا تھا لیکن وہ جس طرح اُونچے نیچے پتھروں پر چھلانگتی ہوئی بلندی کی طرف دوڑ رہی تھی اس پر مجھے شدید حیرت ہو رہی تھی۔ بعض اوقات تو مجھ سے بھی آگے نکل جاتی۔ یہ پہاڑیاں سبزے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ مخملی گھاس اور جھاڑیاں بھی تھیں اور اُونچے درخت بھی۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑی عمودی چٹان تھی۔ اُس طرف دوڑتے ہوئے انگوری کا پیر رپٹ گیا اور وہ کراہتی ہوئی زمین پر گری۔

انگوری کا اس طرح گرنا اُس کی زندگی کا ضامن بن گیا تھا...... کیونکہ ٹھیک اُسی لمحہ لاتعداد تڑتڑاتی ہوئی گولیاں اُس کے سر کے اُوپر سے گزرتی ہوئی سامنے والی چٹان میں لگی تھیں۔ میں نے بھی ایک طرف چھلانگ لگا دی اور زمین پر گرتے ہی پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ دو بھارتی فوجی اُوپر آ گئے تھے اور سب مشین گنوں سے اندھا دُھند فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ انگوری اُن کی گولیوں کی زد میں آتے آتے رہ گئی تھی۔

میں نے ایک پتھر کی آڑ لے کر رائفل کا ٹرائیگر دبا دیا...... رائفل کھٹ کھٹا کر رہ گئی۔ میگزین خالی ہو چکا تھا۔ میں نے خالی میگزین نکال کر پھینک دیا اور کمر پر بندھے ہوئے پٹکے میں اڑسا ہوا دوسرا میگزین نکال کر فٹ کرنے لگا۔ گن میں رائفل فٹ کرتے ہوئے میں نے انگوری کی طرف دیکھا وہ بڑی پھرتی سے لوٹ لگا کر ایک پتھر کی آڑ میں چلی گئی تھی۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے اُس کی رائفل کو شعلے اُگلتے ہوئے دیکھا۔

ایک فوجی چنگھاڑتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے نے اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر ایک طرف چھلانگ لگا دی لیکن وہ بھی اپنے آپ کو نہ بچا سکا۔ حسن کی رائفل کی گولیوں نے اُسے چھلنی کر دیا تھا اور مجھے رائفل استعمال کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

حسن دوڑتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔ میں لپک کر انگوری کے قریب پہنچ گیا اور ایک ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رائفل اُس کے دائیں ہاتھ میں تھی۔

سڑک کی طرف سے زبردست فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بھارتی فوجی ہوا سے ہلتی ہوئی جھاڑیوں پر بھی اندھا دُھند فائرنگ کر رہے تھے۔

ہم تینوں اُس عمودی چٹان کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے اور رُکے بغیر مسلسل دوڑتے رہے۔ ہمارا رُخ بلندی کی طرف تھا۔ انگوری جس طرح دوڑنے میں ہمارا ساتھ دے رہی تھی وہ قابلِ تعریف تھا۔ فائرنگ کی آوازیں اب بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ اور پھر فائرنگ رُک گئی۔ بھارتی فوجیوں کو شاید یہ احساس ہو چکا تھا کہ وہ ہوا میں گولیاں چلا رہے ہیں۔

کچھ اور فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کرنے کے بعد ہم گنجان درختوں میں رُک گئے۔ یہاں بڑے بڑے پتھر بھی پڑے ہوئے تھے۔ انگوری ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اُس نے سب مشین گن زمین پر ڈال دی اور گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے دوہری ہو گئی۔ بلندی کی طرف مسلسل دوڑتے ہوئے اُس کا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ میری اور حسن کی کیفیت بھی اُس سے مختلف نہیں تھی۔ میں نے بھی ایک پتھر سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلا لی تھیں۔ جبکہ حسن گھاس پر لیٹ گیا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ پچھلے کئی روز بھاگ دوڑ ہی میں گزر رہے تھے۔ میں نے دوڑتے ہوئے میلوں کا فاصلہ بھی طے کر لیا تھا لیکن ایسی کیفیت پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس وقت ہم مسلسل بلندی کی طرف دوڑتے رہے تھے۔ اگر راستہ ہموار یا نشیب کی طرف ہوتا تو شاید میری یہ حالت نہ ہوتی۔

دو تین منٹ بعد میں نے آنکھیں کھول کر انگوری کی طرف دیکھا۔ اُس نے بھی دونوں ٹانگیں آگے کو پھیلا رکھی تھیں۔ دونوں بانہیں بھی پہلو میں پھیلی ہوئی تھیں۔ سر کسی قدر پیچھے کو جھکا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ ڈھیلے ڈھالے کرتے میں تناؤ سا تھا جس کے نیچے اُس کا سینہ دھونکنی کی طرح پھول اور پچک رہا تھا۔

انگوری نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اور پھر وہ ٹانگیں سمیٹ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ حسن بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''میں تو تمہیں بہت نازک سی لڑکی سمجھتا تھا لیکن تم تو مردوں سے بھی زیادہ دلیر اور حوصلہ مند ثابت ہوئی ہو......'' میں نے انگوری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نزاکتیں دکھانے کا وقت اب گزر چکا ہے۔'' انگوری نے جواب دیا۔ ''غاصب بھیڑیوں نے وادی کی مظلوم اور بے گناہ عورتوں کو ہمیشہ اپنے لئے ایک کھلونا سمجھا۔ اُنہیں تشدد اور زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا رہا، معصوم عورتوں کی اجتماعی آبروریزی روز کا معمول بن چکا ہے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہو گا۔ کشمیر کی عورت اپنی جان تو دے دے گی لیکن کوئی ہاتھ اپنے جسم تک پہنچنے نہیں دے گی۔ وہ ہاتھ توڑ دیئے جائیں گے۔'' چند لمحوں کو وہ خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''اب عورت گھر میں بیٹھ کر صرف روٹیاں نہیں پکائے گی۔ اب کشمیر کی ہر بیٹی کے ہاتھوں میں رائفل نظر آئے گی۔ کشمیر کی عورت اپنے سہاگ، اپنے بھائیوں اور اپنے بیٹوں کو محاذ پر رُخصت کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے تو اس میں مردوں کے پہلو بہ پہلو لڑنے اور دشمن سے پنجہ آزمائی کرنے کا حوصلہ بھی ہے۔''

میں خاموشی سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر باتوں کا رُخ بدل دیا۔ ہم تقریباً بیس منٹ تک وہاں بیٹھے رہے اور پھر انگوری اپنی سب مشین گن سنبھالتی ہوئی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''اب چلنا چاہئے......'' وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اُن پٹے ہوئے بھارتی سورماؤں میں اتنا حوصلہ نہیں کہ اتنی دُور تک ہمارا پیچھا کر سکیں۔ لیکن فوجی ٹرک اُس شاہراہ پر گشت کرتے رہتے ہیں۔ اگر اُنہیں ٹوہ مل گئی تو ممکن ہے وہ اُوپر آنے کی کوشش کریں اس لئے ہمیں اب یہاں سے چل دینا چاہئے۔''

میں اور حسن بھی اُٹھ گئے۔ میں نے اپنی رائفل کندھے پر لٹکا لی۔ ہم گھنے درختوں سے نکل کر کھلی جگہ پر آ گئے۔ جس وقت یہ معرکہ ہوا تھا اُس وقت رات کا اندھیرا رُخصت ہونا شروع ہوا تھا اور دن کا بہت ہلکا سا اُجالا پھیلنے لگا تھا۔ اور اب سورج طلوع ہو چکا تھا اور دُھوپ پھیل رہی تھی۔ ہم تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اب بھی مسلسل بلندی کی طرف سفر کرتے رہے۔ میں نے انگوری سے یہ نہیں پوچھا کہ کہاں جانا ہے کیونکہ میں نوری سے اُس کی باتیں سن چکا تھا۔ اُس نے نوری سے کہا تھا کہ وہ عبداللہ کے ساتھ چشمے پر پہنچ جائے جس کا مطلب تھا کہ اُن کے پاس کوئی محفوظ ٹھکانہ موجود تھا۔ نوری اور عبداللہ دوسری طرف نکل گئے تھے۔

''تمہارے بارے میں تو سنا تھا کہ تم فیروز پور کے نواح میں کمانڈر محبت اللہ کے ساتھ کسی غار میں ہو۔ اس طرف کیسے آ گئے؟'' انگوری نے میرے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں کمانڈر محبت اللہ کے ساتھ تھا؟'' میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

''میں تمہارے بارے میں معلوم کرتی رہتی تھی۔'' انگوری نے جواب دیا۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

میرے سینے میں ہلچل سی مچ اُٹھی...... میں صرف چند گھنٹے اُن کے گھر پر رہا تھا۔ ہم نے نظر بھر کر ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں تھا، ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کی تھی۔ ان کی بستی سے جانے کے بعد میں نے ایک لمحہ کو بھی انگوری کا خیال ذہن سے نہیں نکالا تھا۔ اور اب میرے لئے یہ انکشاف بڑا ہی سنسنی خیز ثابت ہو رہا تھا کہ انگوری بھی میرے تصور کو دل میں بسائے ہوئے تھی۔

''فوجی کیمپ پر تم لوگوں کی کارروائی بڑی کامیاب رہی۔ کوئی بھی نہیں بچا وہاں۔'' انگوری کہہ رہی تھی۔ ''ہمیں مقبول بھائی کی شہادت کی اطلاع بھی مل گئی تھی اور کمانڈر محبت اللہ کے زخمی ہونے کی بھی۔ اب وہ کیسے ہیں؟''

''اُن کی ٹانگ میں بم کا ٹکڑا لگا تھا۔ اب پہلے سے بہت بہتر ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ہم دونوں بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے اور یہ بے تکلفی اس واقعہ کا نتیجہ تھی جو اتفاقاً پیش آیا تھا۔ اگر بھارتی فوجیوں کے خلاف اُس چھاپہ مار کارروائی میں ہم لوگ نہ ملتے تو شاید ہمارے درمیان تکلف کا پردہ عرصہ تک حائل رہتا اور ہم ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے بھی جھجکتے۔

''تم نے بتایا نہیں یہاں کیسے پہنچ گئے؟'' انگوری نے اپنا سوال دہرایا۔

''کل صبح مجھے اطلاع ملی تھی کہ بھارتی درندوں نے کیمپ کی تباہی کا بدلہ لینے کے لئے آس پاس کی بستیوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بسال پور میں جو کچھ بھی ہوا مجھے اُس کا افسوس ہے۔ ماسی عائشہ کی شہادت رائیگاں نہیں جائے گی۔ ہم شہداء کے خون کے ایک ایک قطرے کا اُن درندوں سے حساب لیں گے۔'' میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''مجھے یہ بھی خبر ملی تھی کہ وہ بھارتی وحشی بستی کی کچھ لڑکیوں کو اُٹھا کر لے گئے ہیں اور تم بھی لاپتہ ہو۔ میں نے کمانڈر محبت اللہ سے اجازت لے لی اور حسن کے ساتھ کل رات بسال پور پہنچ گیا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ تم بستی سے بھاگ گئی تھیں اور تمہیں پتن کی طرف دیکھا گیا ہے۔ ہم رات ہی کو بسال پور سے روانہ ہو گئے اور جب یہاں پہنچے تو ان دو فوجی ٹرکوں کو دیکھ کر رُک گئے کہ وہ گزر جائیں تو ہم سڑک پار کر کے دوسری طرف نکل جائیں۔ مگر اسی وقت تم لوگوں نے ٹرکوں پر حملہ کر دیا اور دوسری طرف سے ہم بھی اس کارروائی میں شریک ہو گئے۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے بات جاری رکھی۔ ''میرا خیال تھا کہ مجاہدین کی کوئی بڑی پارٹی ہو گی جس نے فوجی ٹرکوں پر حملہ کیا تھا میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس پارٹی میں صرف تین افراد ہوں گے۔ ایک مرد اور دو لڑکیاں۔ اور یہ تو میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ ان لڑکیوں میں ایک تم ہو گی۔''

''عورت جب ہتھیار اُٹھا لیتی ہے تو زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے۔'' انگوری نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پھر اُس کے چہرے پر سنجیدگی آ گئی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''گلمرگ والے کیمپ کی تباہی کے بعد بھارتی فوجی بری طرح جھنجلا گئے تھے۔ اُنہوں نے بدلہ لینے کے لئے قرب و جوار کی بستیوں کو تہس نہس کرنا شروع کر دیا۔ اُنہیں ان مجاہدین کی تلاش تھی جنہوں نے کیمپ کی تباہی میں حصہ لیا تھا لیکن وہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ

مجاہدین ان بستیوں میں نہیں ملیں گے۔ وہ تو محض اپنا غصہ اور جھنجھلاہٹ اُتار رہے تھے...... بیگناہوں کو بربریت کا نشانہ بنا رہے تھے، اُن کے گھروں کو جلایا جا رہا تھا، احتجاج کرنے والوں کو سنگینوں سے چھلنی کیا جا رہا تھا اور اُن کی لاشیں راستوں پر گھسیٹی جا رہی تھیں۔ اور وہ درندے چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ جو بھی احتجاج کرے گا اُس کا یہی حشر ہوگا۔ اور پھر اُس روز......'' وہ خاموش ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''اور پھر اُس روز شام ہونے سے ذرا پہلے دو جیپوں اور دو ٹرکوں پر سوار تقریباً تیس پینتیس فوجی ہماری بستی میں گھس آئے۔ اُنہوں نے آتے ہی لوٹ مار شروع کر دی۔ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ اُنہیں نہ جانے کس طرح یہ پتہ چل گیا تھا کہ کیمپ کی تباہی سے ایک روز پہلے دو مجاہدین نے چند گھنٹوں کے لئے اس بستی میں قیام کیا تھا۔ اور اُنہیں یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ مجاہدین عائشہ کے گھر میں ٹھہرے تھے۔ چار فوجی ہمارے گھر آ گئے۔ اماں نے مجھے پچھلے دروازے سے نکال دیا۔ میں گلی کے سرے پر چاچی رشیدہ کے گھر میں چھپ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ فوجی اماں کو مارتے پیٹتے اور بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بستی کے چوک پر لے آئے۔ چاچی رشیدہ کے گھر والوں نے مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ اماں کی چیخیں میرے کانوں سے ٹکراتی رہیں۔ میں باہر نکلنا چاہتی تھی مگر چاچی رشیدہ کے گھر والوں نے مجھے کمرے سے نہیں نکلنے دیا۔ بستی میں شور بڑھتا جا رہا تھا۔ بھارتی فوجیوں نے ہمارے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ بستی کے کچھ اور گھروں کو بھی جلا دیا تھا۔ میں جس کمرے میں بند تھی اُس کی کھڑکی سے شعلے اور دُھویں کے بادل اُٹھتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ فوجی اب گھروں میں گھس کر جوان لڑکیوں کو باہر نکال رہے تھے۔ چاچی رشیدہ کا بھائی مجھے اور اپنی جوان بیٹی طاہرہ کو لے کر چھپتا چھپاتا بستی سے نکل آیا اور کہا کہ ہم جنگل میں جا کر چھپ جائیں۔ اور جب یہ بھیڑیئے واپس چلے جائیں تو ہم بھی واپس آ جائیں۔ میں اور طاہرہ بستی سے نکل کر گلمرگ کی طرف جانے والے راستے کے قریب اُونچی جھاڑیوں میں چھپ گئیں۔ راستے کے قریب چھپنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم ان فوجیوں کو واپس جاتے ہوئے دیکھ سکیں اور جب وہ دُور چلے جائیں تو ہم بستی میں واپس آ جائیں۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ بستی کے کئی مکانوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اور پھر ہمیں دو فوجی ٹرک آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں اور طاہرہ جھاڑیوں میں چھپی اُنہیں دیکھتی رہیں۔ اُس وقت ہم دونوں خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ایک جیپ اور دو ٹرک ہمارے سامنے سے گزر گئے۔ آخر میں آنے والی جیپ ہمارے عین سامنے سڑک پر رُک گئی۔ میں اور طاہرہ خوف کے مارے ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ میرا خیال تھا کہ اُنہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ جیپ خراب ہوکر رُکی تھی۔ ڈرائیور بار بار اِنجن سٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا، پھر نیچے اُتر کر اُس نے اِنجن کا ڈھکنا اُٹھایا اور خرابی تلاش کرنے لگا۔ جیپ بغیر چھت

کی تھی۔ پچھلے حصے میں دو فوجی بیٹھے ہوئے تھے جنہوں نے ایک لڑکی کو دبوچ رکھا تھا۔ اُس لڑکی کے کراہنے کی آوازیں ہمارے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

دوسری جیپ اور ٹرک بہت آگے نکل چکے تھے۔ میں نے اور طاہرہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ہم میں نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ ہم نے ایک نہایت خطرناک فیصلہ کر لیا۔ ہم دونوں بہت محتاط انداز میں جھاڑیوں سے نکلیں اور چیختے دھاڑتے ہوئے جیپ پر حملہ کر دیا۔ ہماری چیخوں سے جیپ پر بیٹھے ہوئے فوجی بدحواس ہو گئے۔ ہم نے اُن کی رائفلوں پر قبضہ کر لیا۔ پہلے لڑکی کو اُن کے شکنجے سے چھڑا کر جیپ سے اُتارا اور پھر ان دونوں فوجیوں کو گولیوں سے بھون دیا۔ ڈرائیور نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن طاہرہ نے اُسے بھی ڈھیر کر دیا۔

جس لڑکی کو ہم نے فوجیوں کے قبضے سے چھڑایا وہ نوری تھی۔ ہم نے تینوں فوجیوں کی رائفلوں پر قبضہ کر لیا اور جیپ میں رکھے ہوئے کئی فالتو میگزین بھی اُٹھا لئے۔ اسی دوران ایک ٹرک واپس آتا ہوا نظر آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم نے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ ہمارا پیچھا کر کے ہمیں گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔ ہم سڑک سے ذرا ہٹ کر جھاڑیوں اور پتھروں میں چھپ گئے۔ اب ہمارے دلوں سے خوف مٹ چکا تھا۔ حوصلے بڑھ گئے تھے۔ مجاہدین ہماری بستی میں آ کر ٹھہرتے رہتے تھے۔ مقبول بھائی تو اکثر ہمارے گھر میں ٹھہرتے تھے۔ میں نے مقبول بھائی سے رائفل چلانا سیکھ لی تھی۔ بستی کی دوسری بہت سی لڑکیاں بھی بستی میں آنے والے مجاہدین سے شوقیہ طور پر رائفل چلانا سیکھ چکی تھیں۔ لیکن اُس روز عملی طور پر ہمیں رائفل اُٹھانے کا موقع پہلی بار ملا......'' وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ مسلسل بلندی پر چڑھتے رہنے سے ہمارے سانس ایک بار پھر پھولنے لگے تھے۔ انگوری بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ٹرک جیپ سے چند گز کے فاصلے پر رُک گیا اور تقریباً نصف درجن فوجی ٹرک سے اُتر کر جیپ کی طرف دوڑے۔ اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر اُن کے چہروں پر ہوائیاں سی اُڑنے لگیں۔ وہ ٹرک کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں تھے اور مکمل طور پر ہماری زد میں تھے۔ اُنہوں نے رائفلیں سنبھال لیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ صورتحال کو پوری طرح سمجھ سکتے ہم نے فائر کھول دیا۔ تین فوجی ڈھیر ہو گئے اور باقی ٹرک کی طرف دوڑے۔ وہ لوگ شاید یہ سمجھے تھے کہ مجاہدین کی کوئی پارٹی یہاں پہنچ گئی ہے۔ ٹرک مُڑ کر تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑنے لگا۔ اُس پر سوار فوجی اندھیرے میں اندھا دُھند فائرنگ بھی کر رہے تھے۔

جیپ پر وہ فوجی نوری کو راستے بھر نوچتے آئے تھے۔ اُس کی قمیض تار تار ہو رہی تھی۔ ہم لوگ بستی میں واپس آ گئے۔ کئی اور گھروں کی طرح میرا گھر بھی شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ میری ماں کی لاش چوک میں پڑی تھی...... بستی کے لوگ خوفزدہ اور سراسیمہ تھے۔ کچھ لوگ میری ماں کی لاش کے قریب بھی جمع تھے۔

نوری کی ماں کا تو عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ جنگل

کاٹنے والے ٹھیکیدار کے یہاں مزدوری کرتا تھا۔ لیکن آج وہ بھی اُن درندوں کی بربریت کا شکار ہو گیا تھا...... بستی میں تین اور لاشیں بھی اِدھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں۔ اُن تمام لاشوں کو صبح ہونے سے پہلے پہلے دفن کر دیا گیا۔ میں نے اُن کی قبروں پر کھڑے ہو کر قسم کھائی تھی کہ اُن کے خون کے ایک ایک قطرے کا بدلہ لوں گی۔

رات تو خیریت سے گزر گئی۔ یہ بھارتی فوجی بڑے بزدل ہیں۔ اُنہیں اپنی جان کا بڑا خوف رہتا ہے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد یہ اپنی چھاؤنیوں یا کیمپوں سے باہر نہیں نکلتے۔ رات کو انہوں نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی تھی۔ اُن کے پانچ ساتھیوں کی لاشیں رات بھر بستی کے باہر سڑک پر پڑی بھیڑیوں کی خوراک بنتی رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ صبح ہوتے ہی فوجی بھاری تعداد میں ایک بار پھر بستی پر حملہ آور ہوں گے اس لئے میں نے دن کی روشنی پھیلنے سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ طاہرہ کو چاچی رشیدہ رات ہی کو چند میل دُور ایک اور بستی میں اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں لے گئی تھی۔ نوری میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔ اور پھر عبداللہ بھی ہمارے ساتھ ہو گیا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے منگیتر ہیں۔

ہم نے ایک محفوظ ٹھکانہ تلاش کر لیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ دن کے وقت فوجی گاڑیاں شاہراہ پر گشت کرتی رہتی ہیں۔ پہلے روز ہم نے ایک اکیلی جیپ کو نشانہ بنایا۔ وہ جیپ پٹن سے بارہ مولا کی طرف جا رہی تھی۔ اُس میں ڈرائیور سمیت چار فوجی تھے۔ ہم گھات لگائے بیٹھے تھے۔ وہ چاروں ہمارے ہاتھوں مارے گئے۔ اس جیپ سے ہمیں بہت سا ایمونیشن اور کئی دستی بم مل گئے۔ پچھلے تین روز سے ہم اُس شاہراہ کے مختلف مقامات پر اسی قسم کی چھاپہ مار کارروائیاں کر کے بھارتی فوجیوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ آج بھی ہم رات کے آخری پہر تین بجے اس جگہ گھات لگا کر بیٹھ گئے تھے۔ اور جیسے ہی ہم نے ٹرکوں پر حملہ کیا دوسری طرف سے فائرنگ کی آواز سن کر میں سمجھی تھی کہ مجاہدین کی کوئی بڑی پارٹی اس طرف آ نکلی ہے۔ ہمارے حوصلے بڑھ گئے لیکن......''

''کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔'' میں نے اُس کی بات پوری کر دی۔ انگوری نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ فضا میں جیسے نقرئی گھنٹیاں سی بج اُٹھیں۔

''لیکن تم دو نے بھی ہمیں بڑا حوصلہ دیا تھا۔'' انگوری نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''دو طرف سے حملہ ہوا تو بھارتی سورما یہی سمجھے تھے کہ مجاہدین کی کسی بڑی پارٹی نے حملہ کیا ہے۔ اور پھر عبداللہ نے بروقت ہینڈ گرنیڈ پھینک کر بڑا کام کر دکھایا۔''

''میں تم لوگوں کی ہمت کی داد دیتا ہوں۔'' میں نے چلتے چلتے انگوری کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا لیکن نہ تو کوئی اعتراض کیا اور نہ ہی ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ ''کیا گولیاں چلاتے اور خون بہتے دیکھ کر تمہیں خوف نہیں آتا؟''

''خوف اور ڈر...... یہ چیزیں اب میرے لئے بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔'' اُس نے جواب

دیا۔ ''میرا ڈر تو اُس روز دُور ہو گیا تھا جب میں نے اور طاہرہ نے نوری کو فوجیوں کے شکنجے میں دیکھ کر جیپ پر حملہ کر دیا تھا۔ اور پھر میں نے اپنوں کا خون بہتے دیکھا ہے۔ اُن بھارتی بھیڑیوں کا خون بہتے دیکھ کر مجھے خوف کیوں محسوس ہونے لگا؟ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جب میں کسی بھارتی فوجی کو گولی کھا کر گرتے اور اُس کے جسم سے خون کے فوارے اُبلتے دیکھتی ہوں تو مجھے عجیب سا سکون ملتا ہے۔''

میں نے انگوری کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ ہم ایک بار پھر رُک گئے۔ حسن ہم سے چند گز پیچھے چل رہا تھا۔ وہ بھی ہمارے قریب آ کر ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ہم پہاڑ کی چوٹی پر تھے، دوسری طرف نشیب میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا جو دُور تک چلا گیا تھا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک بیٹھے رہے اور پھر اُٹھ کر ایک تنگ سے راستے میں داخل ہو گئے۔ یہاں ہوا بہت تیز تھی جو ہمیں مسلسل پیچھے کی طرف دھکیل رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم کھلی جگہ پر پہنچ گئے۔ بڑی حسین جگہ تھی۔ دُور تک درختوں کے جھنڈ پھیلے ہوئے تھے۔ مخملی گھاس میں مسکراتے ہوئے رنگ برنگے جنگلی پھول بہار دکھا رہے تھے۔

ہم ایک بار پھر ایک چھوٹی سی ندی پر رُک گئے۔ شفاف پانی اُچھلتا اور گنگناتا ہوا بہہ رہا تھا۔ میں نے جی بھر کر ٹھنڈا پانی پیا اور منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔

ہم صرف چند منٹ وہاں رُکے اور ندی کے ساتھ ساتھ اُوپر کی طرف چلنے لگے۔ اس مرتبہ ہمیں زیادہ فاصلہ طے نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً سو گز آگے ایک سرسبز چٹان کے ساتھ گھومتے ہی ہم رُک گئے۔ درختوں کے جھنڈ کے نیچے ایک بڑا تالاب تھا۔ وہ ندی اسی تالاب سے نکل کر بہہ رہی تھی۔ یہی وہ چشمہ تھا جس کا پانی تالاب کی صورت میں جمع ہو رہا تھا۔ اس تالاب کے بائیں طرف گھاس پھونس کا ایک جھونپڑا بنا ہوا تھا اور ایک بوڑھا آدمی جھونپڑے کے سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھا رسّی بٹ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اُس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ضرور رہی ہو گی۔ داڑھی اور سر کے بال برف کی طرح سفید تھے۔ ہمیں دیکھ کر رسّی والی چرخی اُس نے نیچے رکھ دی اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''آ گئیں بیٹی......!'' وہ انگوری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ دونوں ہیں تو اپنے ہی شیر مگر ان کے نام بتا دو بیٹی تا کہ انہیں مخاطب کرنے میں آسانی رہے۔'' اُس نے کہتے ہوئے ہماری طرف دیکھا۔

''یہ شمروز ہے اور یہ حسن۔'' انگوری نے ہمارا تعارف کرایا۔ ''آج اتفاق سے یہ بھی اُسی شکار پر جھپٹے تھے جو ہمارا نشانہ تھا۔''

''پھر تو اُس بدبخت شکار کے چیتھڑے اُڑ گئے ہوں گے۔'' بوڑھا مسکرا دیا۔

''ہاں بابا...... یہی سمجھ لو! چیتھڑے ہی اُڑ گئے اُن کے۔'' انگوری بھی مسکرا دی۔

''نوری اور عبداللہ تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔'' بابا نے کہا۔

''وہ بس آتے ہی ہوں گے......'' انگوری نے جواب دیا۔ ''پر ہمیں تو بہت بھوک لگ رہی ہے بابا!''

''تم لوگ بیٹھو میں ابھی چاول اُبال لیتا ہوں۔'' وہ سفید ریش بوڑھا کہتے ہوئے جھونپڑے کے پچھلی طرف چلا گیا۔

حسن تو چٹائی پر لیٹ گیا۔ میں اور انگوری ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔ میں بار بار انگوری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے سر پر بندھا ہوا رُومال کھول دیا تھا۔ اُس روز میں نے اُسے دو چوٹیاں باندھے ہوئے دیکھا تھا۔ سینے پر لہراتی ہوئی وہ دو چوٹیاں بھی مجھے اچھی لگی تھیں اور بکھرے ہوئے سیاہ ریشمی بال بھی بہت اچھے لگ رہے تھے۔ مجھے اپنی طرف اس طرح گہری نظروں سے گھورتے ہوئے دیکھ کر انگوری کے چہرے پر ہلکی سی سرخی پھیل گئی اور نگاہیں جھک گئیں۔ میں بے اختیار مسکرا دیا۔ اس وقت میرے سامنے وہی انگوری بیٹھی تھی جسے میں نے پہلی بار اُس کے گھر میں دیکھا تھا۔ شرمائی، لجائی اور جھجکی ہوئی سی لڑکی......

تھوڑی ہی دیر بعد نوری اور عبداللہ بھی پہنچ گئے۔ وہ کچھ زیادہ تھکے ہوئے تھے۔ نوری نے اپنی سب مشین گن ایک طرف ڈال دی، سر پر بندھا ہوا رُومال کھول دیا اور چٹائی پر لیٹ کر اپنا سر انگوری کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ انگوری پیار سے اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگی۔

فضا میں چاولوں کی خوشگوار سی مہک پھیل گئی۔ جھونپڑے کے پچھلی طرف وہ بابا چاول اُبال رہا تھا۔ اُن کی اشتہا آمیز خوشبو سے میری بھوک چمک اُٹھی تھی۔

''یہ بابا کون ہے اور یہاں اس ویرانے میں کیوں رہ رہا ہے؟ میرا خیال ہے قرب و جوار میں کوئی بستی بھی نہیں ہے۔'' میں نے انگوری سے پوچھا۔

''اس کا نام عبدالفتح ہے۔'' انگوری نے بتایا۔ ''برسوں پہلے اس کا نام بھارتی فوجیوں کے لئے خوف و دہشت کی علامت بنا ہوا تھا۔ یہ اپنے مجاہدین کے ساتھ جس چوکی یا کیمپ پر حملہ کرتا وہاں لاشوں کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہتا۔ بھارتی فوج کے بعض جنرل بھی اس کا نام سن کر تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔ عبدالفتح اپنی زندگی میں کم از کم تین مرتبہ پکڑا گیا لیکن بھارتیوں کی بنائی ہوئی کوئی بھی زنجیر اسے پابند سلاسل نہیں کر سکی۔ یہ ہر مرتبہ بھاگ نکلا۔ اس کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ یہ مافوق الفطرت قوتوں کا مالک ہے۔ بھارتی فوجیوں کو یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ عبدالفتح کو گرفتار کرنے کی بجائے دیکھتے ہی گولی سے اُڑا دیا جائے۔ بابا عبدالفتح کے بدن پر زخموں کے لاتعداد نشان ہیں۔ کم از کم سات مرتبہ گولیوں کا نشانہ بنا۔ بے پناہ تشدد برداشت کیا مگر زندہ رہا...... آزادی کی لگن نے اسے زندہ رکھا۔ عبدالفتح تیس سال تک بھارتیوں کے لئے ہوا بنا رہا۔ پھر اس کے قویٰ جواب دینے لگے۔ یہ چھاپہ مار کارروائیوں میں عملی طور پر حصہ لینے کی بجائے مجاہدین کو تربیت دینے لگا۔ اور پھر گوشہ نشین ہو گیا۔ عبدالفتح نے پچھلے تین سال سے یہاں ڈیرہ جما رکھا ہے۔ اللہ اللہ کرتا ہے اور وطن کی آزادی کی دُعائیں مانگتا رہتا ہے۔ یہ درخت، پودے، گنگناتی ہوئی ندی، چہچہاتے ہوئے پرندے اور قدرتی نظارے اس کے ساتھی ہیں۔ یہاں سے تقریباً پانچ کوس کے فاصلے پر اس پہاڑ کے پیچھے ایک بستی ہے۔ بابا عبدالفتح ہر دو ہفتے بعد اُس بستی میں جا کر اپنی ضرورت کی چیزیں لے آتا ہے۔ بستی کا کوئی بھی دُکاندار اس سے پیسے لینے کو تیار نہیں ہوتا مگر یہ بغیر قیمت کے کوئی چیز نہیں لیتا۔ یہاں بیٹھا رسیاں بٹتا رہتا ہے جنہیں بیچ کر ضرورت کی چیزیں خرید لیتا ہے۔''

غازی عبدالفتح کا نام میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ بچپن میں کئی مرتبہ یہ نام سنا تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا یہ کئی مرتبہ سوپور بھی آ چکا تھا اور مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ آج مجھے اس عظیم مجاہد کے نیاز ہوا جس نے اپنی زندگی وطن کی آزادی کے لئے لڑتے ہوئے گزار دی تھی۔ اور آج بھی بھارتی فوج کے جنرلوں اور کشمیر کے کٹھ پتلی حکمرانوں کو اس کی تلاش تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد بابا عبدالفتح نے چاولوں کی پتیلی اور چند پلیٹیں ہمارے سامنے چٹائی پر رکھ دیں۔ نوری اور حسن بھی اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

''جس نے جتنا کھانا ہو خود ہی نکال لو بیٹا!'' بابا عبدالفتح آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

انگوری نے ایک پلیٹ میں چاول نکال کر وہ پلیٹ بابا کے سامنے رکھ دی اور پھر ہمیں پلیٹوں میں نکال نکال کر دینے لگی۔ گرم گرم چاولوں سے اُٹھنے والی خوشبو میری بھوک بڑھا رہی تھی۔ لیکن مجھے چاولوں کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔ نمک ملے ہوئے یہ چاول بہت اچھے لگ رہے تھے۔ چاول کھاتے ہوئے میں بابا عبدالفتح سے باتیں بھی کر رہا تھا۔

''آپ سوپور بھی تو آ چکے ہیں...... میں اُس وقت بہت چھوٹا تھا لیکن کئی مرتبہ آپ کے بارے میں سنا تھا۔''

''میں کئی مرتبہ سوپور جا چکا ہوں۔ مجھے اب بھی سب کچھ یاد ہے۔'' بابا عبدالفتح نے کہا۔ ''احمد علی عباس، غلام اکبر دُکاندار اور رسول بخش لون اُنہوں نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا۔ اُنہوں نے کبھی بندوق نہیں اُٹھائی لیکن میرے نزدیک اُس کا رُتبہ بھی غازیوں اور مجاہدوں سے کم نہیں۔ تم بھی سوپور کے رہنے والے ہو۔ کس کے بیٹے ہو؟''

''رسول بخش لون کا۔'' میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''اوہ...... مجاہد کا بیٹا مجاہد ہی ہوتا ہے۔'' اُس نے آگے بڑھ کر میرا ماتھا چوم لیا...... ''کیسا ہے تمہارا باپ؟ اب تو وہ......''

''وہ شہید ہو گئے......!'' میں نے کہا۔

''اوہ......'' بابا عبدالفتح کا ہاتھ منہ کی طرف جاتے جاتے رُک گیا۔ اُس نے نوالہ پلیٹ میں ڈال دیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ ''یہ کب کی بات ہے......؟''

○○○

''تقریباً دو مہینے پہلے۔'' میں نے کہا۔ اور پھر سوپور پر بھارتی فوجیوں کے حملے کی تفصیلا
بتانے لگا۔ انگوری نے بھی ہاتھ کا نوالہ چھوڑ دیا تھا اور وہ بھی پوری توجہ سے میری باتیں سن رہ
تھی۔ ''میری زندگی تھی جو میں بچ گیا۔'' میں کہہ رہا تھا۔ ''وہ لوگ مجھے مُردہ سمجھ کر پھینک
تھے۔ اتفاق سے کمانڈر محبّ اللہ اور اُس کے ساتھیوں کا اس طرف سے گزر ہوا اور وہ لوگ مجھ
بے ہوشی کی حالت میں اُٹھا کر لے گئے۔'' میں ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اور چند لمحوں
وقفے کے بعد اپنی بقیہ کہانی سنانے لگا۔

''وہ تمہاری آزمائش تھی۔'' میرے خاموش ہونے پر بابا عبدالفتح نے کہا۔ ''قدرت انسان کا امتحان لیتی ہے۔ اگر وہ آزمائش میں کامیاب ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اُسے منز پر پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ تم بھی اس آزمائش سے سرخرو ہو کر نکلے ہو۔ یہ غاصب بھار حکمران اب تمہارا راستہ نہیں رک سکتے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ''مجھے انگوری بتایا تھا کہ کمانڈر محبّ اللہ کی قیادت میں مجاہدین نے گلمرگ کے دوسری طرف نئے قائم ہو والے اسلحہ ڈپو کو اُڑا دیا ہے۔ مجھے بھی اُس ڈپو کے بارے میں اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ اگر ڈپو قائم رہتا تو اس علاقے میں بھارتی فوج کی گرفت مضبوط ہو جاتی۔ مگر تم لوگوں نے اُن کی تو ڑ دی ہے۔ اب وہ طویل عرصہ تک سنبھل نہیں سکیں گے۔''

''آپ کے خیال میں کشمیر کے سیاسی لیڈروں کو وطن کی آزادی کے لئے کوئی کردار ادا نہیں کرنا چاہئے؟'' میں نے موضوع بدل دیا۔

''سیاسی لیڈر......!'' بابا عبدالفتح کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''کشمیر کے سیا لیڈروں کا آزادی کی اس تحریک میں کوئی کردار نہیں ہے۔ یہ جنگ تم جیسے نوجوانوں کو ہی لڑ پڑے گی۔ ہمارے لیڈر تو ہندو سامراج کے آلہ کار ہیں۔ وہ سرینگر کے عالیشان بنگلوں شاندار ڈرائنگ رُومز میں بیٹھ کر کشمیریوں کی بے بسی اور مظلومیت کا رونا روتے ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ عوام ان کو بھولنے لگی ہے تو بھارتی حکمرانوں یا فوج کے مظالم کے خلاف ایک زوردار بیان جاری کر دیتے ہیں جس پر حکومت اُنہیں گرفتار کر لیتی ہے اور وہ جیل میں بھی عیش کرتے ہیں اور چند روز بعد وہ پھر رہا ہو کر اپنی عیاشیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہمارے سیاسی لیڈر کشمیر کی آزادی کے لئے کیا کریں گے؟ یہ لوگ کشمیری عوام کے ہمدرد نہیں۔ نہ انہیں آزادی سے کوئی دلچسپی ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ لیڈر تحریک آزادی کی راہ میں رُکاو بنے ہوئے ہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر یہ لیڈر نہ ہوتے تو کشمیر بہت عرصہ پہلے آزاد ہو چکا ہوتا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ایک زمانے میں شیر کشمیر کے نام کا بہت چرچا تھا۔ وہ تحریک آزادی کا ہیرو کہلانے لگا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے اور دنیا جانتی ہے کہ کشمیر کاز کو سب سے زیادہ نقصان اسی شیر کشمیر نے پہنچایا تھا۔ کرسی کی خاطر اُس نے کشمیری عوام سے غداری کی، کشمیر کاز سے غداری کی اور پھر یہ روایت بن گئی۔ اقتدار سے محروم ہو کر یہ شیر کشمیر کشمیری عوام پر بھارتی حکمرانوں اور فوج کے مظالم کا رونا روتا اور جب اُسے وزارتِ اعلیٰ کی مسند پر بٹھا دیا جاتا تو اُس کی زبان اُنہی کشمیری عوام کے خلاف زہر اُگلنے لگتی۔ شیر کشمیر مر گیا۔ اُس کی گدی اُس کی اولاد نے سنبھال لی۔ یہ تو غدار ابن غدار ہیں۔ کشمیر کاز کو سب سے زیادہ نقصان اسی خاندان نے پہنچایا ہے۔ دوسرے لیڈر بھی یہی سب کچھ کر رہے ہیں۔ وہ چٹے اُجلے کپڑے اور اُونچی ٹوپیاں پہن کر بیانات جاری کرنے کے لئے تصویریں بنواتے ہیں۔ اُن کی دلچسپی صرف اپنی سیاست چمکانے تک محدود ہے۔ آزادی سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ وادی میں ہر جگہ پولیس اور فوج سے کشمیری عوام کی جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ نہتے عوام پولیس کی لاٹھیاں کھاتے ہیں، فوج کی گولیوں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ ان کے گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے، ان کی عورتوں کو سڑکوں پر گھسیٹا جاتا ہے، ان کی جوان بیٹیوں کو اجتماعی آبروریزی کا نشانہ بنایا جاتا ہے، انہیں ہر طرح سے رُسوا کیا جاتا ہے۔ لیکن کیا کسی لیڈر کے بارے میں ایسا سنا ہے کہ اس کے جسم پر کوئی معمولی سا بھی زخم لگا ہو؟ اُن کے گھروں کو آگ لگائی گئی ہو یا اُن کی عورتوں کو ہاتھ لگایا گیا ہو؟ نہیں میرے دوست! یہ سب کچھ تو ان نہتے اور بے گناہ کشمیری عوام کے ساتھ ہو رہا ہے جو اس حسین وادی کو بھارتی سامراج سے آزاد کروا کر امن و آشتی کا گہوارہ بنانا چاہتے ہیں۔ آزادی کے متوالوں کو جب گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہوتا ہے، اُن کے گھروں سے آگ کے مہیب شعلے اُٹھ رہے ہوتے ہیں اور اُن کی عورتوں کو سڑکوں پر گھسیٹا جا رہا ہوتا ہے اُس وقت ہمارے یہ لیڈر اپنی کوٹھیوں کے عالیشان ڈرائنگ رُومز میں بیٹھ کر سیاست بگھار رہے ہوتے ہیں اور یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ معصوم کشمیریوں کے جسموں سے بہنے والے خون سے وہ ذاتی طور پر زیادہ سے زیادہ کتنا اور کس طرح فائدہ اُٹھا سکتے ہیں؟'' بابا عبدالفتح چند لمحوں کو خاموش ہو گیا۔ اُس کی ان باتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کشمیر کے سیاسی لیڈروں سے کس قدر بد دِل تھا۔

''یہ سب کچھ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ......'' وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں ان لیڈروں سے مایوس ہو چکا ہوں۔ اُنہیں صرف اپنی سیاسی دُکان سے دلچسپی ہے جسے وہ چمکائے رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کشمیر کی آزادی نہیں چاہتے بلکہ اس معاملے کو اُلجھائے رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے کردار بہت گھناؤنے ہیں۔ تم ان کے اندر جھانک کر دیکھو تو تمہیں بھی ان سے نفرت ہو جائے گی۔ میں تمہیں ایک لیڈر کی بات بتاؤں۔'' وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے

لگا پھر بولا۔ ''یہ اپنے آپ کو کشمیری عوام کا بہت بڑا ہمدرد اور بہت بڑا لیڈر سمجھتا ہے۔ اُس کے بیانات سن کر لگتا ہے کہ بھارتی فوجیوں نے مظلوم کشمیریوں پر مظالم بند نہ کئے تو وہ اپنی جان دے دے گا۔ لیکن اُس کے اصل کردار کے بارے میں جان کر تمہیں اُس سے نفرت ہو جائے گی۔'' وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ میں اُس کے چہرے پر تاثرات کے اُتار چڑھاؤ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''چند سال پہلے جب بھارتی فوجیوں کے خلاف میری سرگرمیاں عروج پر تھیں تو اس لیڈر نے کم از کم دو مرتبہ مجھ سے رابطہ کیا تھا اور یہ پیشکش کی تھی کہ میں بھارتی سامراج کے خلاف اپنی سرگرمیاں ختم کر دُوں تو مجھے بہت ساری مراعات دی جا سکتی ہیں۔ ہندوستان کے کسی بھی شہر میں یا پاکستان میں مجھے بہت بڑی کوٹھی دی جائے گی۔ شاندار کار دی جائے گی اور کم از کم پانچ لاکھ روپے ماہانہ اخراجات کے لئے دیئے جائیں گے۔ یہ مراعات مجھے زندگی کی آخری گھڑی تک ملتی رہیں گی۔ لیکن میں نے اُس کی پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ میں یہ جنگ اپنے ذاتی مفاد کے لئے نہیں اُن مظلوم اور بے گناہ بہن بھائیوں کے لئے لڑ رہا ہوں جو پچھلے باون برسوں سے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ تو یہ ہے ہمارے لیڈروں کا کردار۔'' وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ''سب لیڈر ایسے بے ضمیر نہیں ہیں۔ بعض لوگوں کے دل میں واقعی کشمیری عوام سے ہمدردی ہے۔ وہ بھی بھارتی تسلط سے وادی کو آزاد کرانا چاہتے ہیں لیکن اُنہیں آگے نہیں آنے دیا جاتا، اُنہیں اپنی بات کہنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ لیڈروں نے مجھے بڑا مایوس کیا ہے۔ لیکن میں کشمیر کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ کشمیر ضرور آزاد ہو گا اور سیاسی لیڈر نہیں بلکہ تم جیسے سر پھرے نوجوان آزادی دلائیں گے۔ میں سیاست کا طالب علم نہیں ہوں۔ میں نے تو صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ زمانہ تعلیم کے دوران بھی مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن یہ دیکھ دیکھ کر میرا دل کڑھتا تھا کہ غاصب اور ظالم ہندوؤں نے ہماری آزادی سلب کر رکھی ہے۔ وہ طاقت کے بل بوتے پر ہمیں دبائے رکھنا چاہتے ہیں۔''

کمانڈر رشید اور دوسرے مجاہدین ہمارے قصبے میں آتے رہتے تھے۔ میں اُن کی باتیں سنتا تھا۔ ہر رات قصبے کے کچھ لوگ ہمارے گھر آ جاتے تھے اور بیٹھک میں بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ لیڈروں کے بیانات پر تبصرے ہوتے، کٹھ پتلی حکمرانوں کے کردار کا تجزیہ کیا جاتا اور پھر اپنے والدین کی شہادت کے بعد میں نے رائفل اُٹھائی تو مجاہدین کی باتیں سن کر مجھے پتہ چلا کہ سیاست کیا ہوتی ہے۔ مگر اُس وقت بھی میں نے زیادہ گہرائی میں جانے کی کوشش نہیں کی تھی اور آج بابا عبدالفتح کی باتوں نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کشمیر کو بھارتی تسلط سے آزادی سیاسی لیڈر نہیں بلکہ مجاہدین ہی دلائیں گے۔ آزادی کے متوالے یہ وہ لوگ تھے جو اپنا گھر بار چھوڑ کر پہاڑوں میں کٹھن ترین زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہی لوگ اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھ کر بجلی کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑتے تھے اور اُنہیں تہس نہس کر کے پہاڑوں میں روپوش ہو جاتے تھے۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ اب میں بھی ان سرفروشوں میں شامل تھا اور تحریک آزادی میں اپنے حصے کا کردار ادا کر رہا تھا۔

اگرچہ ہم سب کو شدید بھوک لگی ہوئی تھی مگر ان باتوں سے ہماری بھوک مر چکی تھی۔ نوری نے چاولوں کی پتیلی اُٹھا کر جھونپڑی میں رکھ دی اور پلیٹیں دھونے کے لئے ندی پر لے گئی۔ بابا عبدالفتح ایک بار پھر چھوٹی سی چرخی گھما کر رسّی بٹنے لگا تھا۔

''میرے ہاتھوں میں اب رائفل اُٹھانے کی سکت نہیں رہی۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''لیکن اس اُمید پر زندہ ہوں کہ اپنی آنکھوں سے اس وادی کی فضاؤں میں آزادی کا پرچم لہراتے دیکھ سکوں۔''

''انشاءاللہ آپ ضرور دیکھیں گے۔'' میں نے کہا۔

عبداللہ اور حسن بھی اُٹھ کر ہم سے کچھ دُور درختوں کے نیچے گھاس پر جا بیٹھے تھے۔ میں بظاہر باتیں تو بابا عبدالفتح سے کر رہا تھا مگر میرا دھیان انگوری کی طرف تھا جو بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

''ارے بیٹی انگوری! تم جا کر سو جاؤ...... بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔'' بابا عبدالفتح نے انگوری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

انگوری اُٹھ کر جھونپڑے میں چلی گئی۔ میں کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جھونپڑے میں چٹائی پر نمدے بچھے ہوئے تھے اور چند کمبل بھی تہہ کر کے ایک طرف رکھے ہوئے تھے۔ وہ ایک کونے میں لیٹ گئی۔ نوری بھی پلیٹیں وغیرہ دھونے کے بعد عبداللہ اور حسن کے قریب جا بیٹھی تھی۔ میں کچھ دیر بابا عبدالفتح سے باتیں کرتا رہا اور پھر چٹائی پر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔

دن سوتے ہوئے گزرا اور رات کو نیند آنکھوں سے دُور رہی۔ حسن، عبداللہ اور نوری تو جلد ہی سو گئے تھے۔ انگوری میری طرح دن میں اپنی نیند پوری کر چکی تھی۔ وہ بھی میری طرح بابا عبدالفتح کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ بابا عبدالفتح اپنی جوانی کے قصے سنا رہا تھا۔ عبدالفتح کے بارے میں، میں نے بھی بچپن میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور اب اِسی غازی سے اُس کے معرکتہ الآراء کارناموں کی تفصیل سن رہا تھا۔ بابا نے باتیں کرتے کرتے قمیض اُوپر اُٹھا دی۔

''یہ دیکھو......'' وہ سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ زخم نہیں میڈل ہیں جو میری بہادری کا اعتراف کرتے ہوئے بھارتی فوجیوں نے میرے سینے پر سجائے تھے۔ اور یہ دیکھو!'' اُس نے گھوم کر برہنہ پشت میری طرف کر دی۔ ''میری پشت پر تمہیں ایسا کوئی نشان نظر نہیں آئے گا۔ بہادری کے میڈل ہمیشہ سینے پر سجائے جاتے ہیں پشت پر نہیں۔'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گیا پھر قمیض درست کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں یہ سب کچھ اس لئے بتا رہا ہوں کہ تم بھی یہ میڈل سینے پر ہی سجانا تمہاری پشت کبھی دشمن کی طرف نہیں ہونی چاہئے۔''

''ایسا ہی ہو گا بابا......'' میں نے کہا۔

"تم محبت اللہ کے ساتھ رہے ہو" بابا عبدالفتح نے کہا۔ "وہ ایک ذہین اور بہادر مجاہد ہے۔ اُس کی زندگی کا بیشتر حصہ بھی جہاد کرتے ہوئے گزرا ہے۔ اُس کے ساتھ رہ کر تمہیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔"

"مجھے ایک تجربہ ہو چکا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "گلمرگ والے فوجی کیمپ کی تباہی میں، میں اُن کے ساتھ تھا۔ اُن کی رہنمائی اور تجربے سے ہم نے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔"

"وہ تجربہ کار آدمی ہے۔ دشمن پر متعدد بار کاری ضربیں لگا چکا ہے۔ اُس سے مجھے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔" بابا نے کہا۔

"کمانڈر محبت اللہ ہی نہیں وادی کا ہر مجاہد آپ کی توقعات پر پورا اُترے گا اور آپ دیکھیں گے کہ ہم ان غاصبوں کو ایک نہ ایک دن بوریا بستر گول کرنے پر مجبور کر دیں گے۔" میں نے کہا۔

"انشاء اللہ....." انگوری بول اُٹھی۔

باہر جھاڑیوں کی سرسراہٹ کی آواز سن کر میں چونک گیا اور اُس طرف دیکھنے لگا۔ جھونپڑے کے دروازے کے سامنے لالٹین رکھی ہوئی تھی۔ اُس کی روشنی میری آنکھوں میں پڑ رہی تھی اور باہر اندھیرا تھا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ لیکن ایک منٹ بعد آواز دوبارہ سنائی دی۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی بہت محتاط انداز میں جھاڑیوں میں چلنے کی کوشش کر رہا ہو..... میں نے لپک کر اپنی سب مشین گن اُٹھالی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... کوئی جانور ہوگا۔" بابا عبدالفتح نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "جانور پانی پینے کے لئے چشمے پر آتے رہتے ہیں۔"

میں نے رائفل ہاتھ سے نہیں چھوڑی اور آنکھیں پھاڑ کر باہر اندھیرے میں گھورتا رہا۔ اور پھر ایک مانوس آواز سن کر میں بھی مطمئن ہوگیا۔ وہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی پہاڑی بکرا یا ایسا ہی کوئی جانور پانی پی رہا ہو۔ میں نے رائفل رکھ دی۔

"یہ جگہ بہت محفوظ ہے۔" بابا عبدالفتح نے پھر کہا۔ "دونوں طرف سڑک کم سے کم پانچ پانچ کوس کے فاصلے پر ہے اور راستہ اتنا دُشوار گزار ہے کہ بھارتی فوجی سڑک سے ادھر آنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ دو سال پہلے ایک مرتبہ انہوں نے ایسی کوشش کی تھی لیکن مجاہدین کے گھیرے میں آ گئے۔ اُن میں سے کوئی بھی واپس نہیں جا سکا تھا۔ بھیڑیئے کئی روز تک اُن کی لاشوں کی ضیافت اُڑاتے رہے تھے۔"

ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بابا عبدالفتح کے ہاتھ میں رسّی بٹنے کی چرخی مسلسل چل رہی تھی۔ وقت بہت دھیرے دھیرے بیت رہا تھا۔ انگوری بھی اب اونگھنے لگی تھی۔ اس وقت سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ میں نے ایک کمبل اُٹھا کر اپنے اوپر ڈال لیا۔

تھوڑی دیر بعد انگوری، نوری کے قریب لیٹ کر سوگئی۔ بابا عبدالفتح بھی ایک طرف چٹائی پر لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر بعد اُس کے خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں رائفل اُٹھا کر جھونپڑے کے دروازے کے قریب بیٹھ گیا اور تاریکی میں گھورتا رہا۔ وقفے وقفے سے جنگلی جانور بھی پانی پینے کے لئے چشمے یا ندی پر آ رہے تھے۔ جھونپڑے کے پاس اگرچہ لالٹین روشن تھی لیکن وہ تمام جانور بے ضرر تھے کسی نے بھی جھونپڑے کی طرف آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کبھی کبھار دُور کہیں سے کسی بھیڑیئے کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔

سردی سے بچنے کے لئے میں نے کمبل اوڑھ لیا تھا۔ وقت جیسے تھم کر رہ گیا تھا۔ ایک ایک لمحہ صدیوں جیسا طویل لگ رہا تھا۔ اور بالآخر میری ہمت بھی جواب دے گئی اور پہلے تو میں وہیں بیٹھا اونگھتا رہا، پھر دروازے کے اندر ایک طرف ہٹ کر چٹائی پر لیٹ گیا اور دروازے کے سامنے ٹنگا ہوا ٹاٹ کا پردہ نیچے گرا دیا۔

صبح میں دیر تک سویا رہا۔ سب لوگ مجھ سے پہلے ہی جاگ چکے تھے مگر مجھے کسی نے نہیں جگایا تھا۔

وہ دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ ہم کبھی تو اُٹھ کر گھومتے ہوئے کچھ دُور چلے جاتے اور کبھی جھونپڑے کے سامنے چٹائی پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے۔ انگوری اب پھر وہی پہلے والی انگوری تھی جسے میں نے پہلی مرتبہ اُس کے گھر میں دیکھا تھا۔ وہ کبھی کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتی اور کبھی مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر اُس کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔

انگوری کو دیکھ کر میرے اندر عجیب سی ہلچل ہونے لگتی۔ لطیف سی گدگدی کا احساس پورے جسم میں سرایت کر جاتا۔ میں اُس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ بہت سی باتیں..... لیکن وہ میرے قریب رہتے ہوئے بھی مجھ سے دُور تھی۔

میں نے سنا تھا کہ محبت نام کی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ایسی بہت سی داستانیں بھی سنی تھیں۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے؟ کیسے کی جاتی ہے؟ لیکن شاید میری یہ سوچ غلط تھی۔ محبت کی نہیں جاتی محبت تو ہو جاتی ہے۔ اور شاید یہ محبت ہی تھی کہ یہاں سے میلوں دُور مریم اور کمانڈر محبت اللہ کے پاس غار میں جب میں نے یہ سنا کہ انگوری کو بھارتی فوجی اُٹھا کر لے گئے ہیں یا وہ لاپتہ ہو چکی ہے تو میں تڑپ اُٹھا تھا اور پہاڑوں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا بسال پور پہنچ گیا تو جہاں مجھے یہ پتہ چلا کہ انگوری کو پٹن کی طرف کسی جگہ دیکھا گیا تھا۔ اگرچہ اس کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی لیکن میں ایک منٹ صبر نہیں کر سکا تھا اور راتوں رات پہاڑوں پر سفر کرتا ہوا پٹن کے نواح میں پہنچ گیا جہاں بالکل غیر متوقع اور حیرت انگیز طور پر انگوری سے سامنا ہو گیا۔

انگوری ایک نئے رُوپ میں میرے سامنے آئی تھی۔ کشیدہ کاری کرنے والے نازک سے ہاتھوں میں رائفل تھی جس سے میں نے اُسے دشمن پر موت برساتے ہوئے دیکھا تھا۔ دشمن کے خلاف اسی مشترکہ چھاپہ مار کارروائی کے دوران ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ ہمارے درمیان حائل تکلف کے پردے اُٹھ گئے تھے اور میں نے ہمت کر کے چلتے چلتے اُس کا

ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ میری اس حرکت پر اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں غصہ نہیں تھا ایک عجیب سی چمک اُبھر آئی تھی۔ اور اُس نے میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اتنا قریب آنے کے بعد وہ ایک بار پھر مجھ سے دُور ہوگئی تھی۔ کبھی اُسے اپنی طرف متوجہ پا کر مجھے عجیب سی بے چینی ہونے لگتی اور جب وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی تو میرے سینے میں طوفان سا اُچھلنے لگتا۔ کیا اس کیفیت کو محبت کا نام دیا جا سکتا ہے؟ کیا انگوری بھی میرے بارے میں اسی طرح سوچتی ہے؟

مجھے اپنے دل سے ملنے والا جواب ہاں میں تھا۔ میں اُس کے گھر میں صرف چند گھنٹے مہمان رہا تھا۔ اس دوران تو ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہمارے درمیان ایک رسمی جملے کا تبادلہ بھی نہیں ہوا تھا۔ ہم نے تو نظر بھر کر ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ لیکن میرے جانے کے بعد وہ میرے لئے فکر مند تھی۔ کیمپ پر ہماری چھاپہ مار کارروائی کے بعد اُس نے کسی نہ کسی ذریعے سے یہ معلوم کرلیا تھا کہ میں خیریت سے ہوں۔

وہ شام سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ میں چشمے سے ذرا آگے ندی میں پیر لٹکائے بیٹھا یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ چھپاک چھپاک کی آواز سن کر چونک گیا...... میں نے گردن گھما کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ میں اپنی سوچوں میں اس قدر غرق تھا کہ مجھے یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ انگوری کب میرے قریب آ کر بیٹھی تھی؟ وہ پیروں کو پانی میں ڈالے حرکت دے رہی تھی اور چھپاک چھپاک کی آواز سن کر ہی میں چونکا تھا۔

''یہاں اکیلے بیٹھے کیا سوچ رہے ہو؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''کیا...... میرے بارے میں کیا سوچ رہے تھے؟'' اُس نے خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اُس کی بھنویں تن گئی تھیں۔

''اوہ...... کک...... کچھ نہیں۔'' میں گڑبڑا سا گیا۔

''ابھی تم نے اعتراف کیا ہے کہ میرے بارے میں سوچ رہے تھے۔'' اُس نے ایک بار پھر مجھے گھورا۔ ''بتاؤ نا! کیا سوچ رہے تھے تم میرے بارے میں؟'' آخری جملہ کہتے ہوئے اُس کے لہجے نے عجیب انداز اختیار کرلیا تھا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ......'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے رُک رُک کر کہا۔ ''میری طرح تمہارا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ تم اپنی زندگی کس کے سہارے گزارو گی؟''

''میں ایسا نہیں سمجھتی......'' انگوری نے جواب دیا۔ ''میرا مطلب ہے میں اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھتی۔ کیا وادی میں رہنے والے میرے نہیں ہیں؟ کیا تم میرا ساتھ نہیں دو گے؟ ویسے اب میرے ہاتھوں میں رائفل آ گئی ہے۔ یہ رائفل میرا ساتھ دے گی اور تم...... تم میرے ساتھ ہو تو

مجھے کس بات کی پرواہ ہوسکتی ہے؟''

''کک...... کیا؟'' میں ایک بار پھر بدحواس ہوگیا۔ میرے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک پھیل گئی۔ ''کیا واقعی تم ایسا سمجھتی ہو کہ......''

''کیوں نہیں......'' انگوری کی آنکھوں میں شوخی تیر گئی۔ ''کیا ہم دونوں ساتھ نہیں رہ سکتے؟ ہمارے ساتھ نوری اور عبداللہ بھی ہوں گے۔ ہم چاروں بھارتی غاصبوں کے لئے قیامت بن جائیں گے...... اُنہیں یہاں سے نکل جانے پر مجبور کردیں گے۔''

میرے جذبات پر اوس پڑ گئی۔ میں اُس کے بارے میں نجانے کیا سوچ رہا تھا اور اُس کی سوچ کا انداز مجھ سے مختلف تھا۔

دو دن اور گزر گئے۔ اس دوران انگوری سے بار بار میرا آمنا سامنا ہوا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اُس کے قریب رہنا چاہتا تھا، اُسے دیکھتے رہنا چاہتا تھا۔ اور میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بھی عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہتی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ یہاں پڑے پڑے ہماری صلاحیتوں کو زنگ لگ رہا ہے۔'' ایک روز اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہئے...... یہاں کھیتی باڑی شروع کردی جائے؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''میرا خیال ہے کہ صبح سویرے اس طرف والی سڑک پر ایک چھوٹی سی کارروائی کر کے بھارتیوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلا دینا چاہئے۔'' انگوری نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہاں میں آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ پتن سے بارہ مولا کی طرف جانے والی سڑک اُن پہاڑوں کے اُوپر سے گھومتی ہوئی جاتی ہے۔ اس طرح سڑک کا ایک حصہ مشرق کی طرف اور دوسرا دوسری طرف تھا۔ درمیان میں یہ جگہ تھی جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔

مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ نوری، عبداللہ اور حسن کو بھی آگاہ کر دیا گیا۔ اور پھر رات ایک بجے کے قریب ہم بابا عبدالفتح کی دُعاؤں کے سائے میں رُخصت ہوگئے۔ اُس طرف سے وہ سڑک چار کوس کے لگ بھگ تھی۔ مگر راستہ نہایت دُشوار گزار اور خطرناک تھا۔ یہ غنیمت تھی کہ آسمان پر چاند چمک رہا تھا اور مدھم سی چاندنی میں راستہ طے کرنے میں ہمیں کوئی دُشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

ایک جگہ میں رُک گیا۔ ہمارے سامنے تقریباً بیس فٹ چوڑا نالہ بہہ رہا تھا۔ وہ نالہ اگرچہ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ شفاف پانی کی تہہ میں پتھر صاف نظر آ رہے تھے۔ پانی زیادہ سے زیادہ ہماری پنڈلیوں تک آتا تھا لیکن پانی کا بہاؤ اس قدر تیز تھا کہ قدم جمانا مشکل ہو جاتا۔

''اس طرف آؤ...... مجھے راستہ معلوم ہے۔'' انگوری نے ایک طرف اشارہ کیا۔ تقریباً سو گز

آگے پہنچے تو ایسی تیز آواز سنائی دینے لگی جیسے بلندی سے کوئی آبشار گر رہا ہو۔ اور پھر ہم نالے کے ساتھ ایک چٹان کے اُوپر سے گھوم کر پہنچے تو میں رُک گیا۔ اُس جگہ پانی کی چادر تقریباً بیس فٹ کی بلندی سے گر رہی تھی۔ نیچے ایک بہت بڑا تالاب سا بن گیا تھا جس کا پانی اُس نالے میں بہہ رہا تھا۔ بلندی سے گرنے والی پانی کی وہ چادر تقریباً دس فٹ چوڑی تھی اور جس چٹان سے وہ آبشار گر رہا تھا وہ باقی حصے سے بہت آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ اس طرح اُس آگے کو نکلی ہوئی چٹان نے ایک سائبان سا بنا دیا تھا۔ پانی کی گرتی ہوئی چادر کے پیچھے اندر کی طرف آٹھ دس فٹ کی جگہ تھی۔ وہاں کی زمین پانی کے تالاب سے دو ڈھائی فٹ اُونچی تھی۔

لگتا تھا انگوری اور اُس کے ساتھیوں نے ہمارے آنے سے پہلے تین چار روز میں یہ علاقہ اچھی طرح چھان ڈالا تھا۔ انگوری مجھے اشارہ کرتی ہوئی آبشار کے پیچھے اُس سائبان کے نیچے گھس گئی۔ اُس پتھریلی جگہ پر خاصی پھسلن ہو رہی تھی۔ ایک مرتبہ تو میں گرتے گرتے بچا تھا۔ آبشار کا پانی بارش کی پھوار کی طرح اندر بھی آ رہا تھا۔ دوسری طرف پہنچتے پہنچتے میرے کپڑے گیلے ہو چکے تھے۔

ہم ایک بار پھر بلندی طے کرنے لگے، اور پھر اس سے آگے ہم مسلسل ڈھلان پر اُترتے رہے۔ پتھروں، چٹانوں اور گڑھوں نے جگہ جگہ راستہ روک رکھا تھا اور دُشواریاں پیدا کر رکھی تھیں...... بالآخر مزید ایک گھنٹے بعد ہم رُک گئے۔ ہمارے سانس بری طرح پھول گئے تھے۔ چند منٹ اپنی حالت پر قابو پانے میں گزر گئے۔

وہ رات کا آخری پہر تھا اور غالباً ساڑھے تین بجے کا وقت تھا۔ ہمیں یہاں تک پہنچنے میں ڈھائی گھنٹے لگے تھے۔ جس جگہ ہم رُکے تھے وہاں جابجا بڑے بڑے چٹانی پتھر پھیلے ہوئے تھے اور قد آدم جھاڑیاں تھیں۔ اس سے آگے بالکل عمودی ڈھلان تھی۔ اور اس ڈھلان کے اختتام پر تقریباً تیس گز آگے سڑک تھی۔ سڑک کے دوسری طرف ایک ہموار سی میدان نما وادی تھی جو نشیب اختیار کرتی ہوئی دُور تک چلی گئی تھی۔

''میرے خیال میں یہ جگہ مناسب رہے گی۔'' انگوری نے ایک جگہ پتھروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے تنقیدی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا۔ دونوں طرف دُور تک سڑک نظر آ رہی تھی۔ ہم کسی بھی طرف سے آنے والی ہر گاڑی کو دیکھ سکتے تھے۔ لیکن پتھروں اور جھاڑیوں کی وجہ سے ہم کسی کی نگاہوں میں نہیں آ سکتے تھے۔ انگوری نے واقعی بہترین جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ اور پھر یہاں سے میں نے کمان سنبھال لی۔ ظاہر ہے ہم چاروں ایک ہی جگہ پر نہیں رہ سکتے تھے۔ میں نے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مختلف جگہوں کا انتخاب کر کے ہر ایک کو سمجھا دیا کہ کس کو کس جگہ پوزیشن سنبھالنی ہے۔ ہر پوزیشن سے سڑک صاف نظر آ رہی تھی۔

چاند آسمان سے غائب ہو چکا تھا۔ رات کے آخری پہر کے اندھیرے نے فضا کو اپنی لپیٹ

میں لے لیا۔ اس کھلی جگہ پر تیز ہوا میں بڑی کاٹ تھی۔ ہم سب ٹھنڈی ہوا کے براہِ راست ٹکراؤ سے بچنے کے لئے ایک چٹان نما پتھر کی آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں انگوری تھی اُس کے ساتھ نوری جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر عبداللہ اور پھر میں۔ حسن میرے بائیں طرف تھا۔ ہم دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے اور ظاہر ہے اس وقت ہمارا موضوع موسم کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا؟ وقت بہت مدھم رفتار سے گزر رہا تھا۔

بالآخر رات کا اندھیرا رُخصت ہونے لگا۔ اس کی جگہ بہت مدھم سا اُجالا پھیل رہا تھا جو بتدریج واضح ہوتا چلا گیا۔ اب دُور دُور تک کی چیزیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

''اب اپنی اپنی پوزیشن پر پہنچ جاؤ!'' میں نے اپنی سب مشین گن سنبھالتے ہوئے کہا۔

وہ چاروں بھی اُٹھ گئے۔ ہم سب کے پاس سب مشین گنوں کے علاوہ چار چار فاضل میگزین بھی تھے۔ ہینڈ گرنیڈ صرف دو تھے ایک حسن کے پاس اور دوسرا عبداللہ کے پاس۔

ہم تقریباً ڈیڑھ سو گز کے ایریا میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس طرح دشمن کو یہ تاثر ملتا کہ حملہ آور زیادہ تعداد میں ہیں۔ دائیں طرف سب سے آخر میں حسن تھا، اس کے بعد میں، مجھ سے آگے انگوری اور نوری اور بائیں طرف عبداللہ سب سے آخر میں تھا۔

ہم اپنی اپنی جگہ پر پوزیشن لے کر بیٹھے رہے۔ میری نظریں سڑک پر اور کان کوئی آواز سننے کے منتظر تھے۔ وقت گزرتا رہا لیکن سڑک سنسان رہی اور کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

سورج طلوع ہو رہا تھا جب کسی بھاری گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دینے لگی...... ہوا کے دوش پر یہ آواز کبھی بہت قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوتی اور کبھی بہت دُور سے۔ ہم سب اپنی اپنی سب مشین گنیں سنبھال کر ہوشیار ہو گئے۔ اور پھر دو منٹ بعد وہ گاڑی ہماری نظروں کے سامنے آ گئی...... وہ پتن سے بارہ مولا کی طرف جانے والی بس تھی۔ میں نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو خبردار کر دیا کہ بس پر فائرنگ نہ کی جائے۔

وہ بس ہمارے سامنے سے گزر گئی۔ اور پھر اس کے فوراً ہی بعد پتن ہی کی طرف سے آتی ہوئی ایک فوجی جیپ دکھائی دی۔ اُس کے پیچھے دو ٹرک تھے۔

''ہوشیار......!'' میں نے چیخ کر کہا اور خود بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ جیپ اور ٹرکوں کی رفتار خاصی تیز تھی۔ جیپ پر بھی ایک مشین گن نصب تھی اور گنر گن پر ہاتھ رکھے مستعد کھڑا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر ایک آفیسر اور پچھلی سیٹوں پر چار فوجی تھے جن کے ہاتھوں میں سب مشین گنیں تھیں اور اُن سب کا رُخ پہاڑیوں کی طرف تھا۔ پچھلے دو ٹرکوں کی صورتحال بھی ایک ہی تھی۔ اُن پر لگی ہوئی ہیوی مشین گنوں کا رُخ بھی پہاڑیوں ہی کی طرف تھا۔

وہ جیسے ہی زد میں آئے میں چیخ اُٹھا۔

''فائر......!''

اور پھر خاموش اور پُرسکون فضا سب مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اُٹھی۔ میں

نے جیپ کو آگے نکلنے دیا تھا اور درمیان والے ٹرک کو نشانہ بنایا تھا۔

آگے نکل جانے والی جیپ کو نوری اور انگوری نے نشانہ بنایا۔ ان میں سے کسی کی گولی جیپ کے ڈرائیور کو لگی۔ جیپ لڑکھڑاتی ہوئی سڑک سے اُتر کر بڑی تیزی سے نشیب کی طرف لڑھکنے لگی۔ جیپ سے مشین گن کا ایک برسٹ مارا گیا تھا۔ عبداللہ کی گولیاں جیپ کا تعاقب کر رہی تھیں۔ آفیسر نے جیپ سے چھلانگ لگا دی وہ جھاڑیوں میں ایک طرف دوڑ رہا تھا مگر عبداللہ کی گولیوں نے اُسے ڈھیر کر دیا۔ عبداللہ کا نشانہ واقعی بہت اچھا تھا۔

اب ہمارا نشانہ وہ دونوں ٹرک تھے۔ فائرنگ شروع ہوتے ہی آگے والے ٹرک کے ڈرائیور نے بدحواس ہو کر پوری قوت سے بریک دبا دیا تھا۔ ٹرک ٹائروں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ آڑھا ترچھا ہو کر رُک گیا۔ دوسرا ٹرک ڈرائیور سے بے قابو ہو کر ایک زوردار دھماکے سے اگلے ٹرک سے ٹکرا گیا۔ فوجی چیختے ہوئے ٹرکوں میں لڑھک گئے۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہے تھے مگر اس دوران کم سے کم تین فوجی ہماری گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔

ایک فوجی کو مشین گن سنبھالنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے فائر کھول دیا مگر ہماری پوزیشن ایسی تھی کہ مشین گن کی گولیاں ہمارا کچھ بگاڑے بغیر ہمارے سروں کے اُوپر سے گزر گئیں۔

عبداللہ نے ہینڈ گرنیڈ کی پن کھینچ کر اُسے ٹرکوں کی طرف اُچھال دیا۔ مگر وہ دستی بم ٹرکوں سے کچھ فاصلے پر گرا۔ چند اور فوجی سنبھل چکے تھے اور سب مشین گنوں سے اندھا دُھند فائرنگ کر رہے تھے۔

فائرنگ میں مزید شدت آئی تو حسن نے دستی بم اُچھال دیا۔ یہ بم آگے والے ٹرک کے اندر گرا۔ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ بہت سی چیخیں سنائی دیں۔ ٹرک کے ساتھ اُس میں موجود فوجیوں کے بھی پرخچے اُڑ گئے تھے۔ دوسرے ٹرک کے بچے ہوئے فوجی اندھا دُھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ہمارے سامنے چونکہ بالکل عمودی ڈھلان تھی اور سڑک نیچے تھی اس لئے نہ اُن فوجیوں کی گولیاں ہمارا کچھ بگاڑ رہی تھیں اور نہ ہی ہماری گولیاں اُن کا کچھ بگاڑ سکتی تھیں۔

حسن اپنی پوزیشن سے اُٹھ کر دوڑتا ہوا آگے نکل گیا تا کہ ڈھلان کے کنارے پر پہنچ کر نیچے سڑک پر فوجیوں کو نشانہ بنا سکے۔ میں نے چیخ کر اُسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ فائرنگ کرتا ہوا دوڑتا چلا گیا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ سامنے سے چلائی جانے والی کئی گولیاں اُس کے سینے میں لگیں...... وہ چیختا ہوا گرا اور ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کی طرف دوڑا لیکن پھر ایک جھٹکے سے رُک گیا۔ گولیوں سے چھلنی حسن ڈھلان کے کنارے پر پہنچ چکا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ عمودی ڈھلان کے دوسری طرف گر کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

اور پھر پتن ہی کی طرف سے دو اور فوجی ٹرکوں کو دیکھ کر میں اُچھل پڑا...... وہ ٹرک ابھی بہت دُور تھے۔ میں نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو خطرے سے آگاہ کیا اور دوسرے ہی لمحے ہم بھاگ کھڑے ہوئے......

عبداللہ اور نوری ہم سے آگے تھے۔ انگوری میرے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ چھوٹے پتھروں میں بار بار اُس کے پیر رپٹ رہے تھے۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم دوڑتے رہے۔ مجھے یقین تھا کہ تازہ دم فوجی ہمارا تعاقب شروع کر دیں گے اور پہاڑیوں میں ہمیں گھیرنے کی کوشش کریں گے لیکن وہ ٹرک ابھی کافی دُور تھے اور مجھے اطمینان تھا کہ ہم اُن کے آنے سے پہلے کافی دُور نکل جائیں گے۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ہمارے سانس پھول گئے تھے مگر ہم رُک نہیں سکتے تھے۔ ہم اُس جگہ سے اگرچہ کافی دُور نکل آئے تھے مگر وہاں فائرنگ کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔

ہم بہت دُور نکل آئے...... اب فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ انگوری دوڑتے دوڑتے ایک بار پھر گر گئی۔ اُس کے گھٹنے پر پتھروں سے رگڑ لگ گئی تھی اور وہ کافی تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ مگر میں اُس کا ہاتھ پکڑے دوڑتا رہا۔ ابھی ہم خطرے سے باہر نہیں ہوئے تھے۔

نوری اور عبداللہ اب بھی ہم سے آگے تھے۔ اور پھر نوری بھی دوڑتے دوڑتے گر گئی۔ عبداللہ جھک کر اُسے اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم بھی اُن کے قریب رُک گئے۔ انگوری نے رائفل پھینک دی اور دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ اُس کے منہ سے کف جاری تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ نوری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھی۔ عبداللہ بھی نوری کے پاس بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ میں بھی انگوری کے قریب ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں زندگی میں اتنا تیز کبھی نہیں دوڑا تھا۔ لیکن جب موت بھیانک رُوپ میں تعاقب میں لگی ہوئی ہو تو جسم کی تمام تر توانائیاں ٹانگوں میں سمٹ آتی ہیں۔ ہم خطرے سے ابھی زیادہ دُور نہیں ہوئے تھے۔ صرف پانچ چھ منٹ وہاں رُکے اور پھر دوڑنے لگے۔ گھٹنے کی تکلیف سے انگوری کو دوڑنے میں خاصی تکلیف ہو رہی تھی لیکن وہ بڑی باہمت لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ میرے ساتھ قدم ملا کر دوڑتی رہی۔

بالآخر ہم اُس آبشار کے قریب پہنچ گئے۔ اس وقت تک ہم پھر ہانپنے لگے تھے۔ انگوری اور نوری ندی کے کنارے پر گر گئیں۔ میں اور عبداللہ بھی قریب بیٹھ کر ہانپنے لگے۔

جب سانس کی رفتار کسی حد تک نارمل ہوئی تو میں ندی کے کنارے پر سینے کے بل لیٹ کر کسی جانور ہی کی طرح پانی پینے لگا۔ ٹھنڈے اور شیریں پانی کے چند گھونٹ بھرنے کے بعد ہی میرے حواس بحال ہونے لگے تھے۔ ان تینوں نے بھی پانی پیا اور وہیں بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ نوری اور عبداللہ ہم سے کچھ دُور تھے۔ انگوری گھٹنے کے قریب اپنی ٹانگ دبا رہی تھی۔ پھر اُس نے ڈھیلا ڈھالا کرتا اُوپر کھینچ لیا اور شلوار کا پائنچہ آہستہ آہستہ اُوپر کھینچنے لگی۔ اُس کے

گھٹنے پر کھال چھل گئی تھی۔ خون تو نہیں نکلا تھا مگر وہ جگہ سرخ ہوگئی تھی۔ میری نظریں اُس کے زخمی گھٹنے کو نہیں اُس کی سڈول گلابی پنڈلی کو دیکھ رہی تھیں۔ میرا سانس بے قابو ہونے لگا۔

انگوری نے میری نگاہوں کے مرکز اور میری کیفیت کو تاڑ لیا اور جلدی سے پائنچہ نیچے کھینچ لیا۔ اُس کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا تھا۔ اپنا گھٹنا دیکھنے کے لئے اُس نے بے خیالی میں پائنچہ اُوپر کرلیا تھا لیکن اب شرم کے مارے اُس کے چہرے کی رنگت بدلی جارہی تھی۔

''اب چلنا چاہیے۔'' اُس نے میری طرف سے نظریں چرا کر کہا اور رائفل سنبھال کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ہم اگرچہ خطرے کی حد سے نکل آئے ہیں مگر کوئی بھروسہ نہیں کہ وہ بھیڑیئے ہمارا تعاقب کرتے ہوئے کسی طرح یہاں بھی پہنچ جائیں۔''

آبشار کے نیچے سے گزر کر ہم تیزی سے چلتے رہے۔ راستہ اگرچہ یہاں بھی بڑا کٹھن تھا مگر ہماری رفتار میں کمی نہیں آئی۔ ایک چٹان پر سے کودتے ہوئے انگوری بے اختیار کراہ اُٹھی اور گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر دوہری ہوگئی۔

''اگر چلنے میں تکلیف ہورہی ہو تو میں کندھے پر اُٹھالوں؟'' میں نے اُس کے قریب رُک کر سرگوشی کی۔ اُس نے گھور کر میری طرف دیکھا مگر نظروں میں غصہ نہیں تھا۔

انگوری کی وجہ سے ہم نے رفتار کم کردی۔ وہ لنگڑاتی ہوئی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

مزید ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ نوری اور عبداللہ اُس وقت ہم سے کافی پیچھے رہ گئے تھے اور گنجان درختوں اور جھاڑیوں میں وہ نظر بھی نہیں آرہے تھے۔ اس لئے میں نے بے تکلفی سے انگوری کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

بابا عبدالفتح عام طور پر جھونپڑے کے سامنے بیٹھا رہتا تھا مگر اس وقت وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ جھونپڑے کا پردہ بھی گرا ہوا تھا۔

''بابا......!'' انگوری نے پکارا۔ اس وقت ہم جھونپڑے سے دس گز کے فاصلے پر تھے۔ ''ہم آگئے بابا! بڑے زور کی بھوک لگی ہے ہمیں۔''

جھونپڑے کا پردہ ہلا اور دوسرے ہی لمحے میرا دل اُچھل کر حلق میں آگیا...... جھونپڑے سے بابا عبدالفتح نہیں دو بھارتی فوجی برآمد ہوئے تھے......اور اُن کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی سب مشین گنوں نے ہمیں زد پر لے رکھا تھا......

میرے پورے بدن میں سنسنی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ سینے میں سانس رُکنے لگا۔ وہ دونوں فوجی شکلوں ہی سے وحشی اور درندے لگ رہے تھے۔ میں بے حس و حرکت ہوکر رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ حقیقت ہے یا کوئی خواب؟

جھونپڑے کا پردہ ایک بار پھر ہلا۔ دو فوجی اور اندر سے برآمد ہوئے۔ اُنہوں نے اپنے درمیان بابا عبدالفتح کو گرفت میں لے رکھا تھا۔

بابا عبدالفتح کی حالت دیکھ کر میں لرز اُٹھا۔ اُس کا لباس خون آلود تھا۔ داڑھی اور سر کے سفید

بال بھی خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ ناک سے بھی خون بہہ رہا تھا اور پیشانی بھی زخمی تھی جس سے بہنے والا خون چہرے کو تر کرتا ہوا گلے تک چلا گیا تھا۔

وہ دونوں فوجی جنہوں نے بابا عبدالفتح کو دونوں طرف سے بانہوں کی گرفت میں لے رکھا تھا اُن میں ایک لانس نائیک اور دوسرا لیفٹیننٹ تھا۔ لانس نائیک کی رائفل اُس کے دوسرے ہاتھ میں تھی جبکہ لیفٹیننٹ کا ریوالور اُس کے ہولسٹر میں اڑسا ہوا تھا۔ ہولسٹر کا فلیپ کھلا ہوا تھا۔

ان دونوں نے بابا عبدالفتح کو آگے دھکیل دیا۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا اور لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ اُس کی بائیں ٹانگ پنڈلی سے سوج کر کپا ہورہی تھی۔ بابا عبدالفتح کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اُس کی ٹانگ کی ہڈی بھی توڑ دی گئی تھی۔ مگر آفرین ہے اس بوڑھے پر اُس کے منہ سے میں نے ابھی تک ایک ہلکی سی کراہ بھی نہیں سنی تھی۔ اس کے برعکس اُس کا چہرہ پُرعزم اور بوڑھی آنکھوں میں پراسراری چمک تھی۔

میں ابھی تک انگوری کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔ لیکن پھر اُس کا ہاتھ اس طرح میری گرفت سے چھوٹا کہ مجھے احساس تک نہیں ہوسکا...... انگوری چیختی ہوئی بابا عبدالفتح کی طرف لپکی لیکن ایک فوجی کی ٹھوکر کھا کر پیچھے پلٹ گئی۔ اُس کے منہ سے بڑی خوفناک چیخ نکلی تھی۔ فوجی نے اُس کی پسلیوں پر ایک اور ٹھوکر رسید کردی...... وہ ایک بار پھر چیخی۔ فوجی نے تیسری ٹھوکر مارنی چاہی تو لیفٹیننٹ نے اُسے روک دیا۔

''نہیں رتن لال......'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''اگر یہ مرگئی تو ہمارے کسی کام کی نہیں رہے گی۔ ذرا دیکھو تو اسے......لگتا ہے بھگوان نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہو۔ یہ ٹھوکریں مارنے کے لئے نہیں، پیار کرنے کے لئے ہے۔''

اُس نے اپنی بیلٹ میں اڑسا ہوا خنجر نکال لیا اور انگوری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میرے جسم میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہی مگر ایک فوجی نے بڑی تیزی سے آکر رائفل کی نال میرے سینے پر رکھ کر مجھے پیچھے دھکیل دیا۔

لیفٹیننٹ انگوری کے سامنے کھڑا اُس کے چہرے کو گھور رہا تھا۔ انگوری نے اُس کے منہ پر تھوک دیا۔ لیفٹیننٹ غصے سے آگ بگولا ہوگیا......اُس نے خنجر کی نوک انگوری کے سینے پر رکھ کر نیچے کی طرف زور سے جھٹکا دیا۔ انگوری کی چیخ سن کر میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

ایک لمحے بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو میں ایک بار پھر لرز کر رہ گیا...... انگوری کی قمیض اُوپر سے نیچے تک کٹ گئی تھی اور اُس کا سینہ برہنہ ہورہا تھا......

''شاید تم اپنی بہن کو بھی دوسروں کے سامنے اسی طرح ننگا کرچکے ہو۔'' انگوری نے غراتے ہوئے کہا۔ اُس کے لہجے میں خوف نام کو بھی نہیں تھا۔

لیفٹیننٹ نے اُس کے سینے پر زوردار تھپڑ رسید کردیا۔ انگوری چیختی ہوئی نیچے گرگئی۔

''ابھی تو میں نے صرف تمہاری چھاتیوں کو ننگا کیا ہے۔'' لیفٹیننٹ بھیڑیئے کی طرح غراتے

ہوئے کہہ رہا تھا۔ ’’ابھی تھوڑی دیر میں یہ سارا لباس تمہارے جسم سے الگ کر دُوں گا اور اس کے بعد تمہارے ساتھ جو کچھ ہوگا اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ میرے یہ آدمی کئی مہینوں سے اپنے گھروں سے دُور ہیں۔ عورت کو ترس گئے ہیں۔ تم جیسی ناری کو تو یہ لوگ چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے۔ لیکن......‘‘ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ’’پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم لوگوں کے ساتھ اور کتنے آدمی ہیں اور کہاں چھپے ہوئے ہیں؟‘‘

’’ہمارے ساتھ اور کوئی نہیں۔ اگر ہوتے تو اب تک آ چکے ہوتے۔‘‘ انگوری نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ میں اب تک اُسے ایک کمزور سی لڑکی سمجھ رہا تھا۔ رائفل چلانا اور بات تھی اور اس طرح تشدد کا سامنا کرنا دوسری بات۔ اس نے کسی طرح اپنے آپ کو کمزور ثابت نہیں کیا تھا۔

’’تم بتاؤ......تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟‘‘ لیفٹیننٹ میری طرف گھوم گیا۔ ’’اس بڈھے کا انجام دیکھ رہے ہو۔ اس نے بھی کچھ بتانے سے انکار کر دیا تھا۔ صرف ایک ہی بات پر اڑا رہا کہ یہاں اس کے سوا کوئی نہیں رہتا۔ اگر یہ ہمیں سب کچھ بتا دیتا تو اس کا یہ حشر نہ ہوتا۔ مگر بڑا سخت جان بڈھا ہے ابھی تک زندہ ہے۔ میرا خیال ہے تم ایسی مار برداشت نہیں کر سکو گے۔ جب شریر پر چوٹ پڑتی ہے تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اگر تم اس تکلیف سے بچنا چاہتے ہو تو اپنے ساتھیوں کے بارے میں بتا دو! میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اور اس کبوتری کو زیادہ تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی۔‘‘

میں انگوری کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ میں نے لیفٹیننٹ کی طرف دیکھا۔ ’’ہمارے ساتھ کوئی اور نہیں ہے۔ اگر کوئی ہوتا بھی تو تمہیں نہ بتاتا کہ وہ کتنے لوگ ہیں اور کہاں چھپے ہوئے ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح تشدد کا نشانہ بنا کر تم ہمارے حوصلے پست کر سکو گے؟ یاد رکھو آفیسر! اس وادی کا بچہ بچہ اپنی جان تو دے سکتا ہے مگر تحریک سے غداری نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی قربانی اس وادی کو تم جیسے بھیڑیوں سے نجات دلا سکتی ہے۔‘‘

’’بڑا گھمنڈ ہے تمہیں۔‘‘ لیفٹیننٹ غرایا۔ ’’دیکھتا ہوں تم زبان کیسے نہیں کھولتے۔ ابھی فر فر بولنے لگو گے۔‘‘

اُس نے دو فوجیوں کو اشارہ کیا۔ وہ انگوری کو بانہوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ایک طرف لے جانے لگے۔ میں کانپ اُٹھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ میری زبان کھلوانے کے لئے کیا کرنے والے تھے؟ میں متوحش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جب ہم اس طرف آ رہے تھے تو نوری اور عبداللہ ہم سے پیچھے رہ گئے تھے اور میرا خیال تھا کہ اُنہوں نے دُور سے ہی یہ صورتحال دیکھ لی تھی اور کہیں چھپ گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی کارروائی ضرور کریں گے۔ لیکن میں پریشان ہو رہا تھا کہ اُنہیں دیر ہو گئی تو کارروائی کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

دونوں فوجی انگوری کو بانہوں سے پکڑ کر گھسیٹ رہے تھے اور انگوری اپنے آپ کو چھڑانے

کی جدوجہد کر رہی تھی۔ لیفٹیننٹ ایک طرف کھڑا دلچسپ نظروں سے اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انگوری کی قمیض پھٹ گئی تھی جسے ایک فوجی نے کھینچ کر اُس کے بدن سے الگ کر دیا۔

میں نے ایک بار پھر اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہی مگر میرے سامنے کھڑے ہوئے فوجی نے رائفل کی نالی زور سے میرے سینے پر ماری۔ میں لڑکھڑا کر گر گیا۔ اُس فوجی نے ایک پیر میرے سینے پر رکھ دیا اور رائفل کی نالی میری کھوپڑی سے لگا دی۔ اُس کی اُنگلی ٹرائیگر پر تھی۔

میری نظر زمین پر پڑے ہوئے بابا عبدالفتح کی طرف اُٹھ گئی۔ اب تک وہ بے حس و حرکت پڑا تھا لیکن اب اُس کے جسم میں حرکت پیدا ہوتے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔

لیفٹیننٹ بابا عبدالفتح کے قریب ہی اُس کی طرف پشت کئے کھڑا تھا اور بابا عبدالفتح دونوں ہاتھ زمین پر ٹکائے آہستہ آہستہ اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جس فوجی نے مجھے دبا رکھا تھا اُس کی پشت بھی بابا عبدالفتح کی طرف تھی۔ وہ بھی اُسے حرکت کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں کن انکھیوں سے کبھی بابا عبدالفتح کی طرف دیکھتا اور کبھی اُس فوجی کی طرف۔

’’آرام سے پڑا رہ......حرکت کی تو کھوپڑی اُڑا دُوں گا۔‘‘ فوجی مجھے گھورتے ہوئے بھیڑیئے کی طرح غرایا۔

میں نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے بابا عبدالفتح کی طرف دیکھا۔ وہ اس پوزیشن میں آ چکا تھا جیسے چیتا اپنے شکار پر جھپٹنے کو تیار ہو۔ میں نے صرف ایک نظر انگوری کی طرف دیکھا جو اب بھی چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ اُس نے ایک فوجی کو لات مار کر دُور گرا دیا تھا۔

اور اسی لمحے بابا عبدالفتح بھی چیتے ہی کی طرح اپنی جگہ سے اُچھلا......اُس کا ہاتھ لیفٹیننٹ کے ہولسٹر پر پڑا اور جب لیفٹیننٹ اُچھل کر مُڑا تو ریوالور بابا عبدالفتح کے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ خوف و دہشت سے لیفٹیننٹ کا چہرہ دُھواں ہو گیا۔ بابا عبدالفتح ایک بھی لمحہ ضائع کئے بغیر ریوالور کا ٹرائیگر دباتا چلا گیا۔ ریوالور سے نکلنے والی گولیاں یکے بعد دیگرے لیفٹیننٹ کے پیٹ اور سینے میں پیوست ہوتی رہیں۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا مگر اُس نے خنجر بابا عبدالفتح کی طرف اُچھال دیا۔

لیفٹیننٹ کے اُچھلنے اور چیخنے کی آواز سن کر وہ فوجی بھی تیزی سے مُڑا جس نے مجھے دبا رکھا تھا۔ میری طرف سے اُس کی توجہ ایک لمحے کو ہی ہٹی تھی۔ میں نے رائفل پر ہاتھ ڈال کر اُسے ایک جھٹکے سے اپنی پیشانی سے ہٹایا اور پھر دوسرا ہاتھ بھی رائفل پر ڈال کر ایک اور زوردار جھٹکا دیا۔ وہ فوجی لڑکھڑا کر دائیں طرف گرا۔ تیسرے جھٹکے سے رائفل میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں بڑی تیزی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور رائفل کا رُخ اُس فوجی کی طرف کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔ کئی گولیاں اُس کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ اسی وقت درختوں کی طرف سے بھی فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

میں بابا عبدالفتح کی طرف لپکا لیکن میں اُس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ لیفٹیننٹ کا پھینکا ہوا خنجر اُس کے حلق میں پیوست تھا اور وہ بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔

میں نے دوڑ کر ایک درخت کی آڑ میں پوزیشن لے لی۔ پہلے میں سمجھا تھا کہ جو فوجی انگوری کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے فائرنگ اُنہوں نے کی تھی لیکن یہ فائرنگ سامنے درختوں میں چھپے ہوئے نوری اور عبداللہ کر رہے تھے۔

انگوری نے جس فوجی کو لات مار کر دُور گرایا تھا وہ اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ عبداللہ کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ دوسرا فوجی انگوری کو چھوڑ کر دوڑتا ہوا ایک درخت کی آڑ میں پوزیشن لے کر بیٹھ گیا تھا اور نوری کی طرف فائرنگ کر رہا تھا۔

نوری نے حماقت یہ کی کہ فائرنگ کرتے ہوئے چیختی ہوئی آگے کی طرف دوڑ پڑی جہاں انگوری پڑی ہوئی تھی۔ لیکن وہ چند قدم سے زیادہ آگے نہیں آ سکی۔ بھارتی فوجی کی ایک گولی اُس کی پیشانی پر لگی اور وہ چیختی ہوئی گری۔ عبداللہ درخت کی آڑ سے نکل کر اُس کی طرف لپکا تو وہ بھی بھارتی فوجی کی گولیوں کا نشانہ بن گیا......

میرا دماغ گھوم رہا تھا...... آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا اور پھر انگوری کی چیخ سن کر میں ہوش میں آ گیا۔ وہ چیختی ہوئی میری طرف دوڑی آ رہی تھی۔ اور پھر وہ ٹھوکر کھا کر منہ کے بل جھاڑیوں میں گری۔ اس لمحے گولیوں کی ایک بوچھاڑ انگوری کے اُوپر سے گزر گئی تھی۔ اگر وہ ٹھوکر کھا کر نہ گرتی تو بھارتی فوجی کی گولیاں اُسے بھی چھلنی کر دیتیں۔

انگوری پر فائرنگ کرنے کے لئے اُس بھارتی فوجی کو درخت کی آڑ سے نکلنا پڑا تھا۔ اس طرح وہ میرے سامنے آ گیا اور میں نے فائر کھول دیا۔ بھارتی فوجی نے بھی ٹرائیگر دبایا مگر اُس کی رائفل خالی ہو چکی تھی۔ اُس نے رائفل پھینک دی اور اُٹھ کر خوفزدہ انداز میں چیختا ہوا ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ مگر زیادہ دُور نہیں جا سکا۔ میری رائفل سے نکلنے والی لاتعداد گولیاں اُس کی پشت میں پیوست ہو گئیں اور وہ اوندھے منہ ڈھیر ہو گیا۔ میں اُٹھ کر انگوری کی طرف لپکا۔ وہ بھی اُٹھ کر میری طرف دوڑی۔ وہ وحشیانہ انداز میں چیختے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بھی اُسے اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ چند لمحے چیختی رہی اور پھر یکایک خاموش ہو کر میری بانہوں میں جھول گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

میں نے انگوری کو آہستگی سے نیچے لٹا دیا۔ وہ اُوپر کے دھڑ سے برہنہ تھی اور اُس کے سینے پر ایک چھوٹا سا زخم بھی تھا جس سے خون رِس رہا تھا۔ میں کچھ دیر تک متوحش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ انگوری کی پھٹی ہوئی قمیض ایک طرف جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ میں نے وہ قمیض اُٹھا کر جیسے تیسے کر کے اُس کے جسم پر اس طرح ڈال دی کہ برہنگی چھپ گئی۔

میں دوڑتا ہوا عبداللہ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ چند گز پرے نوری کی لاش پڑی تھی۔ اُس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ رہی

ہو کہ معصوم اور بے گناہ کشمیری عوام پر ڈھایا جانے والا یہ ظلم کب ختم ہو گا؟ ظالموں کے ہاتھ کون روکے گا......؟ مظلوموں کی دادرسی کون کرے گا؟

میں نے اُس کی آنکھیں بند کر دیں اور دوبارہ انگوری کے پاس چلا آیا تھا۔ وہ ایک جرأت مند لڑکی تھی میں نے اُس کی بہادری کا مظاہرہ دیکھا تھا۔ میں نے اُسے غاصب دشمن پر موت برساتے ہوئے دیکھا تھا۔ دشمن پر گولیاں برساتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں وہ چمک دیکھی تھی جو عزم و ہمت کا مظہر ہوتی ہے۔ وہ بزدل نہیں تھی لیکن اس وقت وہ خونخوار بھیڑیوں میں اس طرح گھر گئی تھی کہ اُس کے حواس جواب دے گئے تھے۔ اُس نے آخری دم تک اُن بھیڑیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اپنی آبرو بچانے کے لئے وہ ہوش و حواس کی آخری حد تک مزاحمت کرتی رہی تھی اور جب وہ میری طرف دوڑی تو اُس کے حواس جواب دے گئے تھے اور وہ مجھ سے لپٹ کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

میں گھٹنوں کے بل انگوری کے پاس جھک گیا اور اُس کے گال تھپتھپا کر اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا لیکن کامیابی نہ ہوئی تو دوڑ کر ندی پر پہنچ گیا۔ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں پانی بھرا اور انگوری کے قریب پہنچ کر پانی اُس کے منہ میں ٹپکانے لگا۔ کچھ چھینٹے اُس کے چہرے پر بھی ڈالے۔ مجھے دوسری مرتبہ پھر چلو میں پانی لانا پڑا۔

اس مرتبہ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ وہ پہلے تو کسمسائی، پھر آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے متوحش سی نگاہوں سے میرے چہرے کو تکتی رہی۔ پھر اُسے سب کچھ یاد آ گیا اور وہ اُچھل کر چیختی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ جھٹکے سے جب اُٹھی تو قمیض اُس کے جسم پر سے ہٹ گئی تھی لیکن اُسے ابھی اپنی برہنگی کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔

صورتحال نہایت سنگین ہونے کے باوجود میں اس سے چشم پوشی نہ کر سکا۔ اُس روز جب میں نے پہلی مرتبہ انگوری کے گھر میں اُسے دیکھا تھا تو قمیض کے نیچے اُبھاروں کو دیکھ کر میرا دل عجیب طرح سے مچلا تھا اور میں جتنی دیر وہاں رہا تھا کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ پھر میں گلمرگ چلا گیا۔ میں کئی روز اُس سے دُور رہا لیکن اُس کی تصویر ایک لمحے کو بھی میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔ اور جب وہ دوبارہ ملی تو بھی میں اُسے دیکھتا رہتا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی واپس آتے ہوئے وہ ایک مرتبہ پیر رپٹ جانے سے گر گئی تھی اور میں اُسے اُٹھانے کے لئے جھکا تھا تو میری نظریں اُس کے گریبان کے اندر تک رینگ گئی تھیں اور میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی سنسنی محسوس کرنے لگا تھا...... اور اب وہ برہنہ حالت میں مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ اُس کی برہنہ پشت پر تھے لیکن میرے اندر نہ تو کسی جذبے نے سرکشی کی تھی اور نہ ہی خون کی گردش میں تیزی آئی تھی۔ البتہ زندگی کے جس سنسنی خیز اور خوفناک ترین تجربے سے اس وقت ہم گزر رہے تھے اُس سے میرے دماغ میں بھی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔

انگوری میرے ساتھ لپٹی سسکیاں بھر رہی تھی۔ زندگی کے اس خوفناک تجربے نے اُس پر

زیادہ اثر کیا تھا۔ وہ خونخوار بھیڑیوں کی ہوس اور موت کا شکار ہوتے ہوتے بچی تھی۔

''ہوش میں آؤ انگوری......'' میں نے اُس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''سب کچھ ختم ہو گیا۔ اب اپنے آپ کو سنبھالو! ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔''

اُس نے اب بھی مجھے بانہوں کے حلقے میں کس رکھا تھا۔ وہ گرفت ڈھیلی کر کے ذرا سا پیچھے ہٹی تو اُسے اپنی برہنگی کا احساس ہو گیا۔ وہ چیختی ہوئی اُچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ دونوں ہاتھ سینے پر لپیٹ لئے اور متوحش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اُس کی پھٹی ہوئی قمیض قریب ہی پڑی تھی۔ میں نے قمیض اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دی۔

''اسے تم پہن نہیں سکتیں۔ فی الحال ایسے ہی لپیٹ لو!'' میں اُٹھ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ انگوری نے وہ پھٹی ہوئی قمیض کس طرح اپنی برہنگی چھپانے کے لئے جسم پر لپیٹی تھی میں اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ البتہ دو تین منٹ بعد وہ میرے قریب کھڑی تھی۔ میں نے اُس طرف دیکھا تو اُس نے نظریں جھکا لیں اور جسم چھپانے لگی۔ وہ برہنگی پوری طرح نہیں چھپا سکی تھی۔

○○○

آنسو اُس کے رُخساروں کو تر کر رہے تھے۔

''یہ...... یہ کیا ہو گیا شمروز؟'' اُس نے سسکی بھرتے ہوئے اپنا سر میرے سینے پر ٹکا دیا۔

''حوصلہ رکھو انگوری! تم تو بہت باہمت لڑکی ہو۔'' میں نے اُس کا کندھا تھپتھپایا۔ ''پہلے ہمیں ان لاشوں کا بندوبست کرنا ہو گا۔ اس کے بعد کوئی اور بات کریں گے۔'' وہ جیسے ہی پیچھے ہٹی تو کپڑا پھر اُس کے بدن پر سے سرک گیا۔ میں رُخ بدل کر کھڑا ہو گیا اور اپنا کرتہ اُتار کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔ ''فی الحال یہ پہن لو! بعد میں دیکھیں گے کہ بابا کے جھونپڑے سے تن ڈھانپنے کی کوئی چیز مل جائے۔''

اُس نے میرے ہاتھ سے کرتہ لے لیا اور تین منٹ بعد کرتا پہن کر سامنے آ گئی۔ اُس کے سینے پر معمولی سا زخم تھا جس سے خون رِس رہا تھا۔ میرا خیال ہے جب وہ بھارتی فوجیوں سے نبرد آزما تھی تو یہ زخم اُس وقت لگا ہو گا یا جب وہ گری تھی تو کوئی نوک دار پتھر لگ گیا ہو گا۔ اور جب وہ مجھ سے لپٹی تھی تو خون کا معمولی سا دھبہ میرے کرتے پر بھی لگ گیا تھا اور میرا کرتا پہن لینے کے بعد تو وہ سرخ دھبہ کچھ پھیل بھی گیا تھا لیکن انگوری کو ابھی تک شاید چوٹ کی تکلیف کا احساس نہیں ہوا تھا۔

ہم دونوں نوری اور عبداللہ کی لاشیں اُٹھا کر جھونپڑے کے قریب لے آئے اور اُنہیں بھی بابا عبدالفتح کی لاش کے قریب لٹا دیا۔ بھارتی فوجیوں کی لاشیں اُٹھا کر وہاں سے دُور ڈال دیں۔ میں نے تمام رائفلیں بھی ایک جگہ جمع کر لی تھیں۔

اب سب سے بڑا مسئلہ ان لاشوں کی تدفین کا تھا۔ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے قبر کھودی جاتی۔ اگر کوئی چیز ہوتی بھی تو پتھریلی زمین پر قبر کھودنا ممکن نہیں تھا۔

میں کسی مناسب جگہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ چشمے کے دوسری طرف چند گز آگے ایک گڑھا نظر آ گیا۔ میں نے انگوری کو بھی وہیں بلا لیا اور اُس گڑھے کے بارے میں مشورہ کرنے لگا۔ پھر میں گڑھے میں اُتر کر نیچے پتھر صاف کرنے لگا۔

گڑھا کافی بڑا تھا۔ نوری کی لاش کو ایک نمدے میں لپیٹ کر ایک کونے میں ڈال دیا گیا۔ اس کے ساتھ عبداللہ کی لاش کو بھی ایک چادر میں لپیٹ کر لٹا دیا گیا۔ دوسری طرف بابا عبدالفتح کی لاش کو بھی چادر ہی میں لپیٹ کر ڈال دیا گیا۔ درختوں کی موٹی موٹی شاخوں سے گڑھے کو ڈھانپ کر اُوپر پتھر رکھ دیئے تاکہ جنگلی جانور اُنہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔

اور پھر میرے ساتھ انگوری نے بھی دونوں ہاتھ اُٹھا دیئے۔ دُعا مانگتے ہوئے اُس کی ہچکیاں جاری تھیں۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔

اس کے آدھے گھنٹے بعد ہم جھونپڑے کے سامنے چٹائی پر بیٹھے صورتحال کا جائزہ لے رہے تھے۔ شروع میں جب ہمیں گھیرا گیا تھا تو میں سمجھا تھا کہ ان فوجیوں کے اور ساتھی بھی ہوں گے۔ لیکن میرا یہ خدشہ بے بنیاد نکلا۔ صرف وہی چاروں تھے جو مہم سر کرنے نکلے تھے۔

''یہ بھارتی فوجی زیادہ تعداد میں بھی پہاڑوں کے اندر تک نہیں جاتے۔ حیرت ہے صرف یہ چاروں یہاں تک کیسے آ گئے تھے؟'' انگوری نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بابا عبدالفتح بہت عرصہ سے یہاں تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ایک مجاہد کی حیثیت سے اس نے ماضی میں بھارتیوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا...... وہ وادی کشمیر میں بھارتیوں کو سب سے زیادہ مطلوب تھا۔ ہوسکتا ہے کسی نے اُس کی مخبری کر دی ہو۔ بھارتی فوج کی ہائی کمان اور سرینگر کی کٹھ پتلی حکومت نے اُس کے سر کی لاکھوں روپے قیمت مقرر کر رکھی تھی...... ہوسکتا ہے اس لیفٹیننٹ کو اُس کے بارے میں اطلاع ملی ہو اور وہ صرف تین آدمیوں کو لے کر بابا عبدالفتح کو پکڑنے کے لئے یہاں آ گیا تھا تا کہ بہادری کے اس کارنامے پر سرکار سے انعام حاصل کر سکے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' انگوری بولی۔ ''لیکن انہیں کیسے پتہ چلا کہ بابا عبدالفتح کے علاوہ یہاں کوئی اور بھی موجود ہے؟''

''یہاں بہت سی ایسی چیزیں بھی موجود ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں ایک سے زیادہ افراد رہائش پذیر ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ صرف بابا عبدالفتح کو پکڑنے کے لئے آئے ہوں گے لیکن یہاں پہنچ کر انہیں اندازہ ہوا ہوگا کہ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ بابا عبدالفتح نے بے پناہ تشدد برداشت کر لیا لیکن ہمارے بارے میں زبان نہیں کھولی۔ اور پھر اتفاق سے اس وقت ہم بھی پہنچ گئے اور ہماری آوازیں سن کر وہ جھونپڑے میں چھپ گئے اور اس طرح ہم اُن کے گھیرے میں آ گئے۔''

''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بابا عبدالفتح کے بارے میں مخبری کس نے کی ہوگی؟ اس بستی کے تو سب لوگ...... اوہ......'' انگوری کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

''کوئی خاص بات؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''رستم...... مجھے اُس پر شبہ ہے۔'' انگوری نے کہا۔

''رستم کون؟'' میں نے پوچھا۔

''بستی کا ایک دُکاندار ہے۔'' انگوری نے جواب دیا۔ ''بابا عبدالفتح نے ایک روز بتایا تھا کہ رستم تقریباً چار مہینے پہلے بستی میں آیا تھا۔ وہ زخمی تھا اور بہت بری حالت میں تھا۔ اُس کی کہانی اُس کی حالت سے بھی زیادہ دردناک تھی۔'' انگوری چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''بابا عبدالفتح کے کہنے کے مطابق سرینگر میں رستم کے ہاتھوں ایک فوجی مارا گیا تھا۔ سرینگر کے شہری اُس روز سرینگر کی پولیس اور فوج کے مظالم کے خلاف لال چوک پر مظاہرہ کر رہے تھے۔ پولیس نے پُرامن مظاہرین پر لاٹھی چارج کر دیا جس پر مظاہرین بھڑک اٹھے اور پولیس پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ فوج نے پولیس کی حمایت میں مظاہرین پر گولی چلا دی۔ دو بے گناہ کشمیری شہید ہو گئے۔ مظاہرین میں رستم بھی شامل تھا۔ اور اُس کی جیب میں پستول بھی موجود تھا۔ اُس نے گولی چلا دی جو ایک فوجی کی پیشانی میں لگی اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ رستم وہاں سے بھاگ نکلا۔ لیکن اُسی رات فوجیوں نے اُس کے گھر کو گھیرے میں لے لیا۔ رستم نے مکان کی چھت سے فوجیوں پر پستول سے فائرنگ کر دی۔ وہ تو کسی فوجی کا کچھ نہ بگاڑ سکا البتہ فوجیوں نے اُس کے مکان کو آگ لگا دی۔ رستم تو زخمی ہو کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اُس کی بیوی اور دونوں بچے ہلاک ہو گئے اور مکان کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئے۔

رستم کسی نہ کسی طرح اس بستی میں پہنچ گیا۔ بستی والے اُس کی کہانی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ وادی کا ہر دوسرا شخص بھارتیوں کے ایسے ہی ظلم وستم کا شکار ہے۔ وہ سب حسب توفیق ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں۔ بستی والوں نے رستم کی بھی مدد کی۔ اُسے رہنے کے لئے دو کمروں کا ایک مکان دے دیا اور تھوڑے بہت پیسے جمع کر کے اُسے بستی کے چوک پر سبزی کی دُکان کھلوا دی۔

بابا عبدالفتح بھی اُس سے مل چکا تھا اور پتہ نہیں رستم پر بابا کو کیوں شبہ ہونے لگا؟ بابا کے کہنے کے مطابق آخری مرتبہ جب اپنی ضرورت کی چیزیں لینے کے لئے بستی گیا تو رستم کی دُکان بند تھی۔ ایک آدمی سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ سرینگر گیا ہوا ہے۔ بابا عبدالفتح کے کہنے کے مطابق رستم پر اُن کا شبہ کچھ اور بھی قوی ہو گیا کیونکہ اُس آدمی سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اس بستی میں آنے کے بعد رستم تین چار مرتبہ سرینگر جا چکا ہے۔''

انگوری خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ''تم لوگوں کے آنے سے پہلے بابا نے مجھ سے کہا تھا کہ اُسے رستم پر شبہ ہے۔ کیونکہ جس آدمی نے سرینگر میں ایک فوجی کو قتل کیا ہو، خود اُس کے گھر اور بیوی بچوں کو جلا کر راکھ کر ڈالا گیا ہو وہ اس طرح بار بار سرینگر کیسے جا سکتا ہے؟ بابا نے کہا تھا کہ اب وہ بستی جائے گا تو اس بارے میں تحقیقات کرے گا لیکن......'' وہ خاموش ہو کر سسکیاں بھرنے لگی۔

''بابا عبدالفتح کا شبہ غلط نہیں ہو سکتا۔'' میں نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اب ہمیں پہلے اس بستی ہی کا رُخ کرنا چاہئے۔ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ بابا کے بارے مخبری اس نے ہی کی تھی تو میں بستی کے چوک پر اُسے پھندے سے لٹکا دوں گا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اب تم اس بستی میں جاؤ گے؟'' انگوری نے اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''ہاں......'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''غداروں کا پتہ لگنا ضروری ہے۔ بابا عبدالفتح جیسے لوگ ہمارا سرمایہ ہیں۔ اُن کا نقصان ہمارے لئے ناقابل تلافی ہے۔ اگر مخبر کا پتہ نہ لگایا گیا تو وہ اندر ہی اندر ہماری جڑیں کاٹتا رہے گا۔'' میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ''ایک زمانہ تھا جب مسلمان آدھی سے زیادہ دنیا پر حکومت کرتے تھے۔ لیکن پھر اپنوں ہی کی غداریوں کی وجہ سے اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھرتا گیا اور آج مسلمان دنیا بھر میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں اپنوں کا زیادہ ہاتھ ہے۔ اس وقت وادی میں آزادی کی تحریک زوروں پر ہے۔ مجاہدین چھاپہ مار کارروائیوں میں بھارتی فوج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ بھارتی سورما ہمارے مجاہدین کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اب وہ وہی ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ وہ غداروں کے ذریعے ہمارے کاز کو نقصان پہنچانے اور ہمارے حوصلے پست کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان غداروں کو اُن کے انجام تک پہنچانا ضروری ہے۔ اگر انہیں چھوٹ مل گئی تو مجاہدین کو جگہ جگہ بھاری جانی نقصان پہنچے گا اور ہماری تحریک دم توڑ دے گی۔ ہمیں آج ہی بستی پہنچنا ہوگا۔''

''لیکن اگر رستم بے قصور نکلا تو؟'' انگوری بولی۔

''بابا عبدالفتح تجربہ کار مجاہد تھا۔ اُس کی زندگی جہاد کرتے ہوئے گزری ہے۔ اگر اُسے رستم پر غداری کا شبہ تھا تو یہ غلط نہیں ہو سکتا۔ لیکن بالفرض......'' میں نے انگوری کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن بالفرض رستم پر شبہ غلط نکلا اور وہ بے قصور ثابت ہوا تو بھی ہم اُس غدار کو تلاش کریں گے۔ یہ صرف کسی مخبری ہی کا نتیجہ ہے کہ صرف چار فوجی بابا کو پکڑنے کے لئے یہاں آئے تھے۔ اگر اُنہیں یہاں مجاہدین کے کسی ٹھکانے کا شبہ ہوتا تو صرف چار فوجی نہ آتے، پوری پلٹن آتی۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' انگوری بولی۔ ''ابھی چلیں؟''

''ابھی نہیں......'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم یہاں سے اس طرح روانہ ہوں گے کہ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد بستی میں داخل ہوں۔ ویسے وہ کون شخص تھا جس نے بابا کو رستم کے سرینگر آنے جانے کے بارے میں بتایا تھا؟''

''بابا نے اُس کا نام ولی محمد بتایا تھا...... وہ بستی میں بڑھئی کا کام کرتا ہے۔'' انگوری نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم بابا کی ساری چیزیں احتیاط سے سمیٹ کر رکھ دو! ہو سکتا ہے ہمارے بعد مجاہدین کی کوئی پارٹی اس طرف نکل آئے تو یہ سب کچھ اُن کے کام آ جائے۔ ویسے تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟''

''ہاں کہو!'' انگوری سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''بابا عبدالفتح تو اب اس دنیا سے رُخصت ہو گیا۔ اس کی یہ چیزیں میرا مطلب ہے اگر ہم

اں کے دو کرتے لے لیں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

انگوری چند لمحے خاموش رہی، پھر افسردہ سی آواز میں بولی۔ ''میرا خیال ہے یہ چوری نہیں ہوگی۔ ویسے ایک روز مجھے اپنے کپڑے دھونے تھے۔ میں نے پہننے کے لئے بابا سے ایک کرتہ مانگا تو اُنہوں نے کہا کہ سب کچھ تم ہی لوگوں کا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو بلا تکلف استعمال کرلو، پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر ہم بابا کے کپڑے استعمال کرلیں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ ویسے بھی میں اُن کے ٹرنک سے مرہم کی ڈبیہ نکالنا چاہتی ہوں۔ میں جب اس درندے سے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگی تھی تو گرنے سے کوئی نوک دار پتھر چبھ گیا تھا۔ زخم تو معمولی سا ہے مگر اب تکلیف ہو رہی ہے۔''

میں انگوری کی برداشت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اتنی دیر خاموش رہی تھی اور اب اُس نے اپنی تکلیف کا اظہار کر ہی دیا تھا۔

ہم دونوں اُٹھ کر ٹرنک کے قریب گئے جو جھونپڑے کے ایک کونے میں پڑا ہوا تھا۔ انگوری نے لرزتے ہاتھوں سے وہ پرانا سا ٹرنک کھولا۔ اُس میں تین چار جوڑے دُھلے ہوئے رکھے تھے۔ انگوری نے ایک جوڑا مجھے دے دیا۔ نیلے رنگ کی قمیض اور اُس سے ذرا ہلکے رنگ کی شلوار۔ قمیض کندھوں اور پشت پر سے گھسی ہوئی تھی۔

''تم بھی زخم پر مرہم لگا کر کپڑے بدل لو! میں باہر جا رہا ہوں چشمے پر...... پانی میں ایک غوطہ لگا لوں گا تو دماغ کی تپش بھی کم ہوگی۔'' میں نے کہا اور کپڑے لے کر جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔ میں نے ایک سب مشین گن بھی اُٹھا لی اور وہاں سے تقریباً پندرہ گز دُور چشمے پر پہنچ گیا۔ گن کنارے پر رکھی، اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کپڑے اُتارے اور پانی میں کود گیا۔

پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ ایک لمحہ کو تو کپکپی سی چھڑ گئی۔ میں نے پانی میں بیٹھ کر جسم کو ملا، دو تین غوطے لگائے اور باہر آ گیا۔ کپڑے پہن کر جب میں واپس آیا تو انگوری جھونپڑے کے سامنے کھڑی تھی۔

''کیا بات ہے...... تم نے کپڑے نہیں بدلے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بھی نہانا چاہتی ہوں...... اب تم یہاں بیٹھ جاؤ اور میں......''

''تم زخمی ہو۔ پانی پڑنے سے......'' میں نے انگوری کی بات کاٹی تھی اُس نے میری بات کاٹ دی۔

''کچھ نہیں ہوتا۔'' وہ بولی۔ ''ان درندوں کے غلیظ ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے مجھے کراہت ہو رہی ہے۔ اور ہاں۔'' وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''بابا کا خیال تھا کہ ہم دن کی روشنی پھیلتے ہی آ جائیں گے اور ہمیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ اُنہوں نے ہمارے لئے چاول پکا رکھے تھے۔ پتیلی جھونپڑے کے پیچھے چولہے کے قریب رکھی ہوئی ہے۔''

''ٹھیک ہے...... تم آؤ تو کچھ کھا لیں گے۔ بھوک لگ رہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

میں گن سنبھالے جھونپڑے کے سامنے بیٹھا رہا۔ میری نظر بار بار چشمے کی طرف اُٹھ رہی تھی اور میں اپنے آپ کو اس حرکت پر سرزنش بھی کر رہا تھا۔ چشمہ بلندی پر تھا اور اُس کے کنارے پر بیٹھے ہوئے کسی شخص کو بھی یہاں سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا مگر میرے خیال میں اس طرح دیکھنا بھی غیر اخلاقی حرکت تھی اور اس غیر اخلاقی حرکت سے بچنے کے لئے میں رُخ بدل کر بیٹھ گیا۔

انگوری تقریباً آدھے گھنٹے بعد آئی تھی۔ اُس نے بابا عبدالفتح کے ٹرنک سے نکالا ہوا جوڑا پہن رکھا تھا۔ میرون رنگ کی شلوار اور اُسی رنگ کا لمبا سا کرتا جس کا گلا خاصا فراخ تھا۔ انگوری نے اگرچہ بال جوڑے کی طرح باندھ لئے تھے مگر اُن سے نچڑنے والا پانی گردن پر بہتا ہوا کرتے میں جذب ہو رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں مرہم کی وہ ڈبیہ تھی جو اُس نے بابا کے سوٹ کیس میں سے نکالی تھی۔

''یہ مرہم بہت اثر انگیز ہے۔'' وہ ڈبیہ دکھاتے ہوئے بولی۔ ''عبداللہ کی ٹانگ پر چوٹ لگی تھی تو بابا نے یہی مرہم لگایا تھا۔ وہ دو دن میں ٹھیک ہو گیا تھا۔''

اُس نے ڈبیہ کرتے کے پہلو کی جیب میں رکھ لی اور جھونپڑے کے پیچھے جا کر پتیلی اُٹھا لائی۔ پتیلی اُوپر تک چاولوں سے بھری ہوئی تھی اور پانچ چھ آدمی پیٹ بھر کے کھا سکتے تھے۔

اس وقت شاید بارہ بج رہے ہوں گے۔ سورج عین سر پر چمک رہا تھا۔ بھوک سے واقعی بری حالت ہو رہی تھی۔ انگوری نے ایک ہی پلیٹ میں چاول نکالے تھے۔ وہ پلیٹ ہم دونوں کے بیچ میں رکھی ہوئی تھی۔ انگوری اُنگلیوں میں چاول اُٹھاتی، نوالہ منہ میں رکھنے کے لئے ذرا سا آگے کو جھکتی تو میری گستاخ نظریں اُس کے فراخ گریبان کے اندر تک رینگ جاتیں...... اس وقت میں بھول گیا تھا کہ ہم کس قسم کی صورتحال سے دوچار ہیں۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی اور کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔

''کیا بات ہے...... چاول کیوں نہیں کھا رہے؟''

انگوری کی آواز سن کر میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ ''اوہ...... کچھ نہیں......'' میں نے کہا اور اُس کے سامنے سے پلیٹ اُٹھا کر وہاں سے دُور ہٹ گیا۔ ''تم پتیلی میں ہی کھا لو۔ میں تمہارے سامنے بیٹھ کر نہیں کھا سکتا۔'' میری بات کا مطلب سمجھ کر انگوری کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ نظریں جھک گئیں اور پھر اُس نے پتیلی اپنی طرف کھینچ لی۔

کھانا کھانے کے بعد انگوری نے میرے والی پلیٹ دھو کر اور پتیلی ڈھک کر رکھ دی اور اس کے بعد ہم دونوں جھونپڑے میں گھس کر بابا عبدالفتح کی چیزیں سمیٹنے لگے۔ تمام کپڑے تہہ کر کے ٹرنک میں رکھ دیئے۔ ٹرنک میں کچھ رقم بھی موجود تھی جسے ہم نے نہیں چھوا۔ باقی چیزیں بھی ٹرنک کے قریب ہی رکھ دی گئیں۔ میں باہر سے بھارتی فوجیوں کی تمام رائفلیں بھی اُٹھا لایا۔ لیفٹیننٹ والا ریوالور میں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ دو رائفلیں ہم نے اپنے لئے منتخب کر لیں۔ اُن کے میگزین چیک کئے اور ایک ایک فاضل میگزین اپنے لباس میں چھپا لیا۔ یہ آٹو میٹک رائفلیں دراصل سب مشین گنیں تھیں جن سے طوفانی بارش کی طرح گولیوں کی بوچھاڑ کی جا سکتی تھی۔

سارے کاموں سے فارغ ہو کر ہم جھونپڑے کے باہر چٹائی پر بیٹھ گئے۔ مجھے اچانک ہی خیال آیا۔ میں نے قمیض کے نیچے شلوار کے نیفے میں اڑسا ہوا ریوالور نکال کر کھولا اُس میں صرف تین گولیاں تھیں۔ میں اُٹھ کر لیفٹیننٹ کی لاش کے قریب چلا گیا جو جھاڑیوں میں اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے پیر سے اُسے سیدھا کیا اور اُس کے ہولسٹر کے فلیپ پر لگی ہوئی گولیاں نکال کر ریوالور میں بھرنے لگا۔ لاشوں پر لاتعداد مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ میں تحقیر آمیز نظروں سے لاشوں کو دیکھتا ہوا دوبارہ اپنی جگہ پر آ گیا۔

پانچ بجے کے قریب ہم روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔ تینوں شہداء کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی اور بابا عبدالفتح کے جھونپڑے پر الوداعی نظریں ڈالتے ہوئے ایک طرف چل پڑے۔

''اُس بستی کو راستہ اس طرف سے جاتا ہے۔ چٹانوں کے اندر۔'' انگوری نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہم اُس طرف مُڑ گئے۔ وہ بستی تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر تھی۔ راستہ خاصا دُشوار گزار تھا اور میرا خیال تھا کہ ہم شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک تو ہم اُونچی نیچی چٹانوں پر اُترتے چڑھتے رہے۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنا بوڑھا ہونے کے باوجود بابا عبدالفتح یہ خطرناک راستہ کیسے طے کیا کرتا تھا؟

بالآخر ہم چٹانوں سے نکل کر کھلی جگہ پر آ گئے۔ سامنے نشیب میں وسیع و عریض سرسبز وادی پھیلی ہوئی تھی اور مغرب کی طرف جھکتے ہوئے سورج کی دُھوپ میں ایک سرمئی لکیر بھی چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ کوئی چوڑی ندی تھی جس کا پانی دُھوپ میں چمک رہا تھا۔

چنار اور یوکلپٹس کے درخت بکثرت تھے۔ قد آدم جھاڑیاں تھیں۔ ہم سنبھل سنبھل کر ان جھاڑیوں میں نشیب کی طرف اُترتے رہے۔

وادی میں اُترتے ہی دھان کے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں کی بالیاں اگرچہ ابھی سبز تھیں مگر خوشبو سے پوری فضا مہک رہی تھی۔ کاشتکاروں کو فصل پکنے کے لئے ابھی کم از کم دو ہفتے انتظار کرنا تھا۔ میرا تعلق بھی کاشتکار گھرانے سے تھا اور میں جانتا تھا کہ کشمیر کے کاشتکاروں کو زمین کا سینہ چیر کر اناج اُگانے میں کتنی دُشواریاں پیش آتی ہیں۔ اور اس جیسے علاقوں میں تو بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ کوئی میدانی علاقہ نہیں تھا جہاں کھیتوں کا تسلسل ہو۔ ایک آدھ کھیت کی جگہ قابل کاشت ہوتی اس کے بعد پتھریلا میدان۔ پھر تھوڑی سی جگہ جہاں بیج ڈال دیا ہوتا تھا۔ یہ دھان کے کھیت بھی ایسے ہی تھے۔ کوئی اُونچی جگہ پر اور کوئی بہت نشیب میں۔

ہم اُن کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے ایک چٹان کے ساتھ دائیں طرف گھوم گئے۔ سامنے ایک گہری ندی تھی۔ اُس کا پاٹ دو سو فٹ کے قریب ضرور ہوگا اور چٹانوں میں تقریباً پچاس فٹ نیچے ندی کا پانی پرشور آواز کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ندی میں اُترنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

ندی کے دوسری طرف سیبوں کا باغ تھا اور اُس کے پیچھے وہ بستی تھی جو بلندی سے تو ہمیں نظر آ رہی تھی لیکن اب گنجان درختوں کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''ہم دوسری طرف کیسے جائیں گے؟ یہاں تو ندی میں اُترنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔'' انگوری نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی راستہ تو ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس طرف کھیت ہیں اور بستی دوسری طرف۔ کاشتکار یہاں کسی راستے سے تو آتے ہوں گے۔ آؤ اس طرف چلتے ہیں کوئی راستہ ضرور ہوگا۔''

دائیں طرف تقریباً سو گز آگے ندی چٹانوں میں گھوم گئی تھی۔ چند گز آگے ہمیں ایک پگڈنڈی مل گئی اور جب ہم اُس پگڈنڈی پر چلتے ہوئے دوسری طرف پہنچے تو میرا اندازہ درست نکلا۔ یہاں ندی کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا اور آمد و رفت کے لئے ایک راستہ بھی موجود تھا۔ وہ ایک ڈولی سی تھی جس کا پلیٹ فارم لکڑی کا تھا اور اُوپر رسوں سے کٹہرا سا بنا دیا گیا تھا جس میں تین چار آدمی کھڑے ہو سکتے تھے۔

چٹان پر پلیٹ فارم سا بنا ہوا تھا جس پر لکڑی کی دو موٹی موٹی بلیاں ستونوں کی طرح گڑھی ہوئی تھیں۔ ایک بلی ان پر اُفقی رُخ پر ٹکی ہوئی تھی جس میں لوہے کی ایک ریل بھی پھنسی ہوئی تھی اور ایک موٹا رسا اُس ریل پر لپٹا ہوا تھا۔ وہ ڈولی اُس رسے کے نچلے حصے میں لٹکی ہوئی تھی۔

آہنی ریل سے لپٹ کر یہ رسہ دو رسوں کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ ایک اُوپر اور ایک نیچے اور یہ دونوں راستے ندی کے دوسرے کنارے تک چلے گئے تھے جہاں ایک چٹان پر کچھ ایسا ہی انتظام تھا۔

وادی کشمیر میں رہنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ وادی میں ندی نالے اور بعض مقامات پر دریا پار کرنے کے لئے رسوں کے پل بنائے گئے ہیں۔ اس قسم کی ڈولیاں بنائی گئی ہیں۔ ہم دونوں اُس ڈولی میں بیٹھ گئے۔ انگوری کٹہرے کے رسے کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اُوپر والے رسے کو پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا ڈولی حرکت میں آ گئی۔

میں رسے کو کھینچتا رہا، رسہ دونوں طرف آہنی ریلوں پر گھوم رہا تھا اور ڈولی آہستہ آہستہ دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہاں ہوا تیز تھی جس سے ڈولی بری طرح ہلکورے لے رہی تھی۔ بعض اوقات تو یوں لگتا کہ ڈولی اب اُلٹی کہ تب اُلٹی۔ انگوری نے بڑی مضبوطی سے رسوں کو پکڑ رکھا تھا۔

بالآخر ڈولی دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ میں نے پہلے انگوری کو چٹانی پلیٹ فارم پر اُتارا اور پھر خود بھی چھلانگ لگا کر چٹان پر پہنچ گیا۔ ہم سیبوں والے باغ کے اُوپر سے گھومتے ہوئے ایک جگہ رُک گئے۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ ہم قدرے بلندی پر تھے اور بستی نشیب میں۔ ابھی غروب ہوتے ہوئے سورج کی کچھ روشنی باقی تھی اور ہم دن کی روشنی میں بستی میں

داخل نہیں ہونا چاہتے تھے۔

میرے اندازے کے مطابق وہ بستی ڈھائی تین سو گھروں پر مشتمل ہوگی۔ سامنے ہی ایک گلی سی نظر آ رہی تھی اور فاصلہ تقریباً دو سو گز ہونے کے باوجود گلی میں لوگوں کی آمد و رفت دکھائی دے رہی تھی۔

ہم ایک اُونچی جگہ پر پودوں کی آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے اس لئے ہمیں دیکھ لئے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ دراصل میں اندھیرا گہرا ہونے کے بعد بستی میں داخل ہونا چاہتا تھا تاکہ کم سے کم لوگوں سے آمنا سامنا ہو سکے۔

ہم تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے اور پھر بستی میں داخل ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہاں کس قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑے گا؟ رائفلیں ہم دونوں کے کندھوں پر تھیں اور ایک لمحہ کے نوٹس پر رائفلیں کندھوں سے اُتر کر ہمارے ہاتھوں میں آ سکتی تھیں۔

اُونچے نیچے راستے پر اندھیرے میں ٹھوکر لگنے کا اندیشہ تھا اس لئے میں نے انگوری کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور اُس نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ بستی کے پہلے مکان کے قریب پہنچ کر ہم رُک گئے۔ مکان کے آنگن سے بکریوں کے ممیانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ میں نے اب بھی انگوری کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ گلی میں چلتے رہے۔ اتفاق سے اس وقت گلی میں کوئی نہیں تھا۔ لیکن پھر اچانک ہی ایک گھر کا دروازہ کھلا اور تین چار بچے برآمد ہوئے اور شور مچاتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے چلے گئے۔ اُنہوں نے ہماری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ غالباً تاریکی کی وجہ سے وہ نہیں دیکھ سکے تھے کہ ہم اجنبی ہیں۔ اور پھر سامنے سے دو عورتیں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ ایک نے کسی شیر خوار بچے کو گود میں اُٹھا رکھا تھا اور دوسری نے ٹوکری ہاتھ میں لٹکا رکھی تھی۔ وہ ہمارے بالکل قریب سے گزریں۔ ایک لمحے کو وہ ٹھٹکیں اور پھر اپنے راستے پر چلتی رہیں۔

ہم بھی آگے بڑھتے رہے۔ اور پھر چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد رُک گئے۔ وہ غالباً ایک دُکان تھی جس کے دروازے سے روشنی دکھائی دے رہی تھی اور اندر سے دو تین آدمیوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں دروازے کے سامنے آ گئے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ ایک چھوٹی سی دُکان ہی تھی۔ دُکان کا سامان کافی پیچھے تھا۔ آگے کچھ کھلی جگہ تھی جہاں دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک خالی کنستر پر ٹکا ہوا اور دوسرا لکڑی کی اُونچی چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دُکاندار اپنے سامان کے دوسری طرف ایک تپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹین کے کنستر، بوریاں، شیشے کے مرتبان اور ایسی ہی چیزیں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ کسی بھی کنستر یا بوری میں زیادہ سامان نہیں تھا۔ دُکان کی اس اُجڑی ہوئی حالت کو دیکھ کر دُکاندار کی مالی پوزیشن کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ایک اُونچے سٹول پر لالٹین جل رہی تھی۔ یہی لالٹین دُکان میں روشنی کا واحد ذریعہ تھی۔ دُکان کی پچھلی دیوار میں کوئی دروازہ بھی

تھا جس کے سامنے ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ سامنے والے حصے میں بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کے بیچ میں ایک حقہ بھی موجود تھا۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ جب ہم دُکان میں داخل ہوئے تو ایک آدمی پشاوری طرز کے اُس حقے سے جسے چلم کہا جاتا ہے کش لگا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اُس نے حقہ چھوڑ دیا تھا۔ وہ تینوں آدمی ہمیں دیکھ کر کچھ گھبرا سے گئے اور پریشان نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''گھبرائیے نہیں......'' میں نے باری باری اُن تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم آپ کے لئے کسی پریشانی کا باعث نہیں بنیں گے۔ ہم دراصل یہاں بابا عبدالفتح سے ملنے آئے ہیں۔ کیا آپ لوگ بتا سکتے ہیں کہ اُن سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟''

میرے اس استفسار پر انگوری نے عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''بابا عبدالفتح......؟'' دُکاندار چونک گیا۔ ''کون ہو تم لوگ اور کہاں سے آئے ہو؟'' باقی دونوں آدمی بھی مشتبہ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

''ہم پر شک نہ کریں۔'' میں نے باری باری اُن تینوں کی طرف دیکھا اور پھر اپنے اور انگوری کے بارے میں بتانے لگا۔ ہم نے اُنہیں اس امر کی ہوا تک نہیں لگنے دی تھی کہ ہم دس بارہ دن بابا عبدالفتح کے مہمان رہے ہیں اور آج اُسے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتار کر آرہے ہیں۔

''اوہ......تو تم مولوی رسول بخش لون کے بیٹے ہو۔'' کنستر پر بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ ''مگر تم تو کمانڈر محب اللہ کے ساتھ تھے؟''

''ہاں......'' میں نے جواب دیا۔ ''گلمرگ والے کیمپ پر کارروائی کے بعد مجھے پتہ چلا کہ بھارتی فوجیوں نے انگوری کی بستی پر ہلہ بول دیا تھا۔ کئی افراد کو قتل اور تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد کئی گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا گیا تھا۔ میں انگوری کی تلاش میں اس طرف آگیا تھا۔''

''یہ تو روز کا معمول بن چکا ہے۔'' اُس شخص نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بے گناہوں کو تشدد کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا جاتا ہے اور گھروں کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ تم لوگ بابا عبدالفتح سے ملنے آئے ہو مگر وہ تو بستی میں نہیں ہے۔ اُس کا ٹھکانہ تو یہاں سے دُور پہاڑوں میں ہے۔ وہ کبھی کبھی یہاں آتا ہے۔''

''ولی محمد تو بستی میں ہوگا۔ وہ اس بستی کا بڑھئی ہے۔ ہمیں اُس سے ملوا دو۔'' میں نے کہا۔

''ولی محمد میرا ہی نام ہے۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟'' کنستر پر بیٹھے ہوئے شخص نے اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''پہلے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں اس کے بعد آپ دونوں بھی ہماری گفتگو میں شامل ہوسکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم انہیں گھر لے کر چلو ہم آتے ہیں تھوڑی دیر میں۔'' دوسرے آدمی نے ولی محمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ!'' ولی محمد کہتے ہوئے اُٹھ گیا۔

ہم دُکان سے نکل رہے تھے کہ ایک بوڑھا کوئی سودا لینے کے لئے آگیا۔ اُس نے عجیب سی نظروں سے ہماری طرف دیکھا تھا۔

ہم دُکان سے نکل کر ولی محمد کے ساتھ اُس گلی میں آگے چلتے رہے اور پھر ایک اور تنگ سی گلی میں مُڑ گئے۔ اُس گلی میں زیادہ تاریکی تھی مگر ہمیں زیادہ دُور نہیں جانا پڑا۔ ولی محمد نے رُک کر ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ تقریباً دو منٹ بعد دروازہ کھلا۔ ولی محمد اندر داخل ہوگیا۔ چند لمحے سرگوشیوں میں کسی سے باتیں کرتا رہا، پھر ہمیں اندر بلا لیا۔ میں نے ایک سایہ آنگن میں دائیں طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ولی محمد ہمیں ایک کمرے کے سامنے چھوڑ کر خود بھی اُسی طرف چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ ایک جلتی ہوئی لالٹین لے آیا۔ کمرہ کھول کر ہمیں اندر بٹھایا اور لالٹین رکھ کر باہر چلا گیا۔ ولی محمد اگرچہ بڑھئی تھا مگر اُس کے گھر میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ فرش پر بوری اور پرانے سے نمدے بچھے ہوئے تھے۔ ہم نے رائفلیں ایک طرف رکھ دیں اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

ولی محمد تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہمارے لئے کھانا لے آیا۔ ایک پلیٹ میں اُبلے ہوئے چاول اور پیالے میں پانی کی طرح پتلی سی دال تھی۔ چاول کی پلیٹ میں دو چمچے بھی لگے ہوئے تھے۔

''تم لوگ شاید بہت دُور سے آئے ہو۔ پہلے کھانا کھا لو پھر بات ہوگی۔ میں پانی لے کر آتا ہوں تم لوگ شروع کرو۔'' ولی محمد ایک بار پھر باہر چلا گیا۔ اس مرتبہ اُس کی واپسی دو منٹ میں ہی ہوگئی تھی۔ اُس نے پانی سے بھرے ہوئے ایلومینیم کے دو گلاس ہمارے قریب رکھ دیئے اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ کھانے کے دوران ہم وادی کے حالات کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس بستی کے لوگ بھارتی فوجیوں کے خلاف چھاپہ مار کارروائیوں کے حوالے سے میرے نام سے واقف ہوچکے تھے۔

کھانے کے فوراً ہی بعد ولی محمد بکری کے دُودھ کی چائے بھی لے آیا۔ اس کے دوسرے دونوں ساتھی ابھی نہیں آئے تھے اور میں اُن کے آنے سے پہلے پہلے ولی محمد سے بات کر لینا چاہتا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کس طرح شروع کروں؟

''تم کچھ کہنا چاہتے تھے۔'' ولی محمد نے کہا۔

''ہاں ملنا تو میں تم سے ہی چاہتا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ......'' میں نے چائے کا گھونٹ بھر کر پیالہ نیچے رکھ دیا۔ چند لمحے خاموش رہا اور پھر مدھم لہجے میں اُسے سب کچھ بتانے لگا۔

ولی محمد کا چہرہ دُھواں ہو رہا تھا۔ اور پھر اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''میرا خیال ہے کہ رستم پر بابا عبدالفتح کا شبہ درست تھا۔'' میں کہہ رہا تھا۔ ''وہ ایسی جگہ ہے جہاں مخبری کے بغیر کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ بھارتی فوجی تو ویسے بھی پہاڑوں کے اندر تک جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ مگر وہ لیفٹیننٹ اپنے تین آدمیوں کو لے کر پہنچ گیا۔ اُن کے لئے ہماری

موجودگی کا انکشاف تو بعد میں ہوا تھا۔ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ہم نہ تو بابا عبدالفتح کے کسی کام آ سکے اور نہ ہی عبداللہ اور نوری کو بچا سکے۔'' کئی لمحوں تک خاموشی رہی۔ ولی محمد کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس صدمے کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اُسے صبر اور ضبط کی تلقین کرنے لگا۔

''اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' بالآخر ولی محمد نے پوچھا۔

''آج رات...... '' میں نے جواب دیا۔''رستم کے گھر پر چھاپہ مارنا ہے۔اس کے ساتھ اور کون کون ہے؟''

''وہ اکیلا ہی رہتا ہے۔'' ولی محمد نے جواب دیا۔''اُس کا مکان بستی کے دوسری طرف ذرا ہٹ کر ندی کے کنارے پر ہے۔ وہ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی اپنی دُکان بند کر کے چلا جاتا ہے اور پھر گھر سے باہر نہیں نکلتا۔اُس سے کوئی ملنے بھی جاتا ہے تو ٹال دیتا ہے۔'' وہ چند لمحوں تک خاموش ہوا پھر بولا۔''اب تو مجھے بھی اُس پر شبہ ہونے لگا ہے۔اُس کے آنے سے پہلے بھی مجاہدین پناہ لینے کے لئے بستی میں آتے رہتے تھے اور ایک آدھ دن گزار کر چلے جاتے تھے۔مگر پچھلے چار مہینوں کے دوران تین مرتبہ مجاہدین پناہ لینے کے لئے یہاں آئے اور ہر مرتبہ یہی ہوا کہ چند گھنٹوں بعد ہی بھارتی فوجی بستی کو گھیر لیتے۔اس طرح کم از کم سات مجاہدین اس بستی میں بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں اور تین گھروں کو جلا کر راکھ کیا گیا ہے۔''

دروازے پر دستک کی آواز سن کر وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے اُس کو ہدایت کر دی کہ بابا کی شہادت کے بارے میں تو بے شک اپنے ساتھیوں کو بتا دے لیکن رستم کا نام اُس کی زبان پر نہیں آنا چاہئے۔ ولی محمد اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

وہ دونوں اُس کے ساتھی تھے۔ ولی محمد نے اُنہیں بابا کے بارے میں بتانے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ اُن دونوں کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ دونوں واپس چلے گئے اور ولی محمد ہمارے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد مختلف لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔

رات گیارہ بجے کے قریب تین اور آدمی آئے۔ اُن میں ایک قدرے بھاری بھرکم آدمی بھی شامل تھا۔ عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ گول داڑھی جس کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے تھے۔ سر پر سفید کپڑے کی گول ٹوپی، ہاتھ میں تسبیح اور کندھوں پر سرخ چیک دار رومال پھیلا ہوا تھا۔

''یہ بابا رستم ہیں۔'' ولی محمد نے اُس کا تعارف کرایا۔''بہت نیک، پرہیز گار اور شریف آدمی ہیں۔ بھارتی فوجیوں نے ان کے بیوی بچوں کو شہید کر دیا۔ گھر جلا ڈالا۔ یہ پچھلے چند مہینوں سے یہاں رہ رہے ہیں۔''

رستم نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ اُس نے عجیب سی نظروں سے انگوری کی طرف بھی دیکھا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ اُسے کسی طرح بابا عبدالفتح کی شہادت کی خبر مل گئی تھی اور وہ تصدیق کرنے آیا تھا۔ میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ جو چار بھارتی فوجی بابا کو پکڑنے آئے تھے وہ ہمارے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد رستم چلا گیا۔ اُس کے ساتھ آنے والے بھی تھوڑی دیر بعد رُخصت ہو گئے۔

''اب میں اسے موقع نہیں دینا چاہتا۔'' میں نے ولی محمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا پروگرام ہے؟'' اُس نے اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''ابھی چلتے ہیں۔ اگر ہمارا شبہ درست نکلا تو اُسے معاف نہیں کیا جائے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

انگوری بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم ولی محمد کے گھر سے نکل آئے۔ بستی کی گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ کہیں کہیں کتوں نے بھونک کر ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر ولی محمد نے اُنہیں ڈانٹ کر بھگا دیا۔

رستم کا مکان بستی سے تقریباً سو گز دُور ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے پر تھا۔ مکان کے قریب پہنچ کر ہم بہت زیادہ محتاط ہو گئے۔

چار دیواری زیادہ اُونچی نہیں تھی۔ ہم بہت احتیاط سے اندر کود گئے۔ یہ دو کمروں کا مکان تھا۔ ایک کمرے کے دروازے کے ساتھ ہی کھڑکی تھی جس کے پٹ بند تھے لیکن اُس میں بہت معمولی سی درز تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس جھری سے آنکھ لگا دی۔ اور پھر اندر کا منظر دیکھ کر میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا......

سامنے ہی لکڑی کی ایک چوکی رکھی ہوئی تھی۔ چوکی پر ایک طرف لالٹین تھی اور اُس کے ساتھ ہی دس بائی آٹھ انچ کے لکڑی کے فریم میں کالی دیوی کی تصویر رکھی ہوئی تھی اور رستم چوکی کے سامنے زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا سر کسی قدر جھکا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔

صرف ایک منٹ بعد ہی اُس نے تصویر دوسری طرف پڑے ہوئے ٹرنک میں احتیاط سے کپڑوں کے نیچے رکھ دی اور اُس ٹرنک میں سے چار بائی چھ انچ حجم کا ایک ڈبہ نکال کر اپنے سامنے رکھ لیا۔

میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں اور دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ ٹرانسمیٹر تھا۔

میں نے بڑی آہستگی سے اپنی جگہ سے حرکت کر کے ولی محمد کو اشارہ کیا، اُس نے جھک کر کھڑکی کی جھری سے آنکھ لگا دی اور پھر ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ انگوری بھی ہمارے قریب ہی کھڑی تھی اُس نے بھی کھڑکی کی جھری سے آنکھ لگا کر اندر کا منظر دیکھ لیا۔

صورتحال کچھ یوں تھی کہ وہاں سناٹا تھا۔ اگر ہم سرگوشی میں بھی بات کرتے تو آواز اندر تک

پہنچ سکتی تھی۔ ولی محمد نے مجھے اشارے سے بتایا کہ اس کمرے کے پچھلی طرف بھی ایک کھڑکی ہے۔ میں نے انگوری کو اُس طرف بھیج دیا تا کہ اگر رستم اُس کھڑکی کے راستے فرار ہونے کی کوشش کرے تو اُسے روکا جا سکے۔ انگوری کے پاس رائفل تھی اور وہ اس سے کام لینا بھی جانتی تھی۔ دوسری رائفل میرے پاس تھی۔ ولی محمد خالی ہاتھ تھا۔

میں نے ایک بار پھر کھڑکی کی جھری سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ رستم ہاتھ میں پکڑے ہوئے اُس ڈبے کا ڈھکنا کھول چکا تھا۔ اُس نے پہلے ریڈیو انٹینا کی طرح کا ایک اِنچ لمبا راڈ باہر نکالا اور انٹینا ہی کی طرح اُسے کھینچ کر کھولتا چلا گیا۔ وہ پتلا سا انٹینا راڈ تقریباً دو فٹ اُوپر تک چلا گیا۔ اب وہ ڈبے کے اندر دو باریک سی تاروں کو آپس میں جوڑنے لگا۔

میرے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔ دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ ٹرانسمیٹر پر کسی کو بابا عبدالفتح کی موت اور بستی میں ہماری موجودگی کی اطلاع دینا چاہتا تھا۔ اب ایک بھی لمحہ ضائع کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں دروازے کے سامنے آ گیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر کندھے کی ایک بھرپور ٹکر دروازے پر ماری۔ اندر سے لگا ہوا دروازے کا کنڈا زیادہ مضبوط نہیں تھا۔ پہلی ہی ٹکر میں دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔

دروازے کے دھماکے کی آواز سن کر رستم اُچھل پڑا۔ ٹرانسمیٹر اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چارپائی پر گر گیا۔ وہ بری طرح بدحواس ہو گیا تھا لیکن میں دل ہی دل میں اُس کے مضبوط اعصاب کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس اچانک افتاد پر سکتے میں آ جاتا اور کچھ دیر تک اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے قابل نہ رہتا۔ لیکن رستم نے تیس سیکنڈ سے بھی کم وقت میں نہ صرف اپنے حواس پر قابو پا لیا بلکہ اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کرتے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا......

دروازے کو ٹکر مارتے ہوئے میں نے رائفل کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ جھٹکا لگنے سے میں بھی لڑکھڑایا تھا لیکن سنبھل گیا اور اس کے ساتھ ہی رائفل کو بھی گھما دیا۔ رائفل کا بٹ رستم کے ریوالور والے ہاتھ پر لگا۔ اُس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ ریوالور ہوا میں اُڑتا ہوا دروازے کے پٹ سے ٹکرا کر دہلیز کے قریب گرا۔

رستم نے کھڑکی کی طرف چھلانگ لگا دی۔ میں رائفل کو اسی طرح پکڑے کھڑا رہا۔ آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔

''تمہارا راز کھل چکا ہے رستم...... تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ بہتر یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو!'' میں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے کہا۔

''اگر تم نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو اس بستی پر ایسی تباہی نازل ہو گی جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکو گے۔'' اُس نے کھڑکی کی چٹخنی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ اُس کا خیال تھا کہ مجھے باتوں میں لگا کر کھڑکی کے راستے فرار ہو جائے گا۔ میں بھی اطمینان سے اپنی جگہ پر کھڑا

تھا۔ ''تم میرا راستہ نہیں روک سکتے۔ کوئی میرا راستہ نہیں روک سکتا۔ کالی مائی میری رکھشا کر رہی ہے۔ جو بھی میرا راستہ روکے گا جل کر بھسم ہو جائے گا۔''

اُس نے کھڑکی کھول لی۔ میں اس وقت اطمینان سے کھڑا تھا۔ رستم کا خیال تھا کہ میں اُس کی کالی مائی کے نام سے ڈر گیا ہوں اس لئے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہا۔

اُس نے دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹکا دیئے اور دوسری طرف کودنے کے لئے اُچھلا۔ لیکن اُسی لمحہ وہ بھیانک انداز میں چیختا ہوا اندر کی طرف گرا۔ باہر کھڑی ہوئی انگوری نے رائفل کا بٹ پوری قوت سے اُس کے کندھے پر رسید کر دیا تھا اور وہ کتے کی طرح بلبلا اُٹھا تھا۔

''کیوں رستم......'' میں نے رائفل سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری کالی مائی کا جادو اُلٹا کیوں ہو گیا؟''

''تت...... تم لوگ...... تم لوگ بچ نہیں سکو گے۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔ اسی دوران ولی محمد بھی کمرے میں آ گیا اور اُس نے جھک کر رستم والا ریوالور بھی اُٹھا لیا تھا۔ عقبی کھڑکی کے باہر انگوری کھڑی تھی اور اُس نے رائفل کی نال کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹکا کر رستم کو زد پر لے لیا تھا۔

''بابا عبدالفتح کا شبہ تم پر درست تھا۔'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ وادی میں جو کچھ بھی کر رہے ہو، بے گناہ لوگوں کو جس طرح ظلم وستم کا نشانہ بنا رہے ہو اس کا حساب تو تم لوگوں سے لیا ہی جائے گا لیکن اس وقت تو اس بستی والے تم سے حساب لیں گے۔ انہوں نے مظلوم سمجھ کر تمہیں پناہ دی، رہنے کو مکان اور کام دھندے کو پیسے جمع کر کے دیئے۔ یہ نیکی اگر وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کے ساتھ کرتے تو ان کی آئندہ نسلیں بھی ان کی شکر گزار رہتیں۔ مگر تم...... تمہارے دھرم میں وفا نام کی تو کوئی چیز ہی نہیں۔ تم ان کا دیا کھاتے رہے اور انہی کے ساتھ غداری کرتے رہے۔'' میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''بابا عبدالفتح کو تو شبہ تھا لیکن ہمیں اب یقین ہو چکا ہے کہ تم باقاعدہ پلاننگ کے تحت یہاں آئے تھے یا تمہیں بھیجا گیا تھا۔ اس کے لئے ایک کہانی گھڑی گئی۔ کشمیر کے مسلمانوں کے ساتھ تو برسوں سے یہ ظلم ہو رہا ہے۔ کسی معمولی سی بات پر ان کے گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے، ان کے بیوی بچوں کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے اور اس بستی والوں کی سادہ لوحی تو دیکھو...... تم نے یہاں آ کر انہیں ایک دردناک جھوٹی کہانی سنائی اور انہوں نے یقین کر لیا۔ تحقیق کرنے کی ضرورت شاید اس لئے نہیں سمجھی کہ وادی میں ہر جگہ مسلمانوں کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ انہوں نے تمہاری کہانی پر بھی یقین کر لیا۔ اور تم ان کی سادہ لوحی سے فائدہ اُٹھا کر اپنا کام کرتے رہے۔

''تمہارا اصل مشن شاید بابا عبدالفتح کا سراغ لگانا تھا۔ اس کے لئے تم نے پہلے بہت نیک اور شریف انسان اور پکا مسلمان بن کر بستی والوں کا اعتماد حاصل کیا۔ بابا عبدالفتح بستی میں آتا

رہتا تھا۔ تم اُن کا اعتماد بھی حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور بستی کے بعض لوگوں سے مجا ان کے ٹھکانے کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن بستی کے لوگ غدار نہیں ہیں۔ وہ اپنے ہیرو کا ٹھکانہ کیسے بتا دیتے؟ اسی دوران تم نے اپنی دوسری سرگرمیاں جاری رکھیں اور فوقتاً بستی میں پناہ لینے والے مجاہدین کے بارے میں اپنے آقاؤں کو اطلاع دیتے رہے۔

مجھے نہیں معلوم تم نے بابا عبدالفتح کا ٹھکانہ کس طرح معلوم کر لیا تھا؟ ہو سکتا ہے بستی کے کس شخص کے منہ سے غلطی سے کوئی ایسی بات نکل گئی ہو جس سے تمہیں بابا کے ٹھکانے کا پتہ چل اور تم نے اپنے آقاؤں کو اطلاع دے دی۔ بابا عبدالفتح نے مجاہدانہ زندگی گزاری تھی۔ اُس ن ایک مجاہد ہی کی طرح موت کو گلے لگایا۔ وہ تو شہادت کے رُتبے پر فائز ہوا اور ہر مجاہد کی خواہش یہی ہوتی ہے۔ لیکن وہ جو چار بھیڑیئے اُسے گھیرنے کے لئے آئے تھے اُن میں سے کوئی بھ زندہ واپس نہیں جا سکا۔ وہ چاروں جہنم واصل ہو چکے ہیں۔ اُن کی لاشیں بھیڑیوں کی خوراک بن چکی ہوں گی۔'' میں خاموش ہو گیا۔ میری نظریں رستم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ فرش خاموش بیٹھا ابھی تک کندھا سہلا رہا تھا جہاں انگوری کے رائفل کے بٹ کی ضرب لگی تھی۔

''تمہیں شاید کسی طرح ہمارے بستی میں آنے کی اطلاع مل گئی تھی۔'' میں نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''اور شاید تمہیں بابا عبدالفتح کی شہادت کا بھی پتہ چل گیا اور تم تصدیق کرنے کے لئے ولی محمد کے گھر پہنچ گئے۔ لیکن تم زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھے۔ تصدیق ہوتے ہی واپس آ گئے اور ٹرانسمیٹر پر اپنے آقاؤں کو اطلاع دینے جا رہے تھے۔''

''تم نے جو کہنا تھا کہہ چکے۔'' رستم نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا، اس وقت اُس کے چہرے پر اور لہجے میں اطمینان کی جھلک دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''تو گویا تمہارے پاس بھی کہنے کو کچھ ہے۔'' میں نے اُسے گھورا۔

''ہاں.....'' اُس نے جواب دیا۔ ''یہ جو کچھ بھی ہوا کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ اسی وادی کی مٹی سے جنم لیا ہے۔ میں بھی اس زمین کا اتنا ہی وفادار ہوں جتنے تم یا کوئی اور مسلمان ہو سکتا ہے۔ میں اس سرزمین سے غداری کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تمہیں شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم اگر آرام سے بیٹھ کر بات کرو تو میں اپنے مؤقف کو سچ ثابت کر سکتا ہوں کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔''

''تو پھر تم نے بھاگنے کی کوشش کیوں کی تھی؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''ہر کشمیری مسلمان کی طرح میں بھی ڈرا ہوا ہوں۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ خوف کے سائے میں گزر رہا ہے۔ میری کہانی تم سن چکے ہو۔ وہ غلط نہیں ہے۔ میرے ساتھ واقعی ظلم ہوا ہے۔'' چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ''سرینگر میں میرے ساتھ جو ظلم ہوا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ تم سرینگر کے لاہوری محلے میں جا کر تصدیق کر سکتے ہو۔ میرے ہاتھوں ایک بھارتی فوجی مارا گیا تھا۔ میں چھپ کر یہاں زندگی گزار رہا ہوں۔ تم نے جب ٹکر مار کر دروازہ کھولا تو میں یہی سمجھا تھا کہ بھارتی فوجیوں کو میرے بارے میں پتہ چل گیا ہے اور وہ مجھے پکڑنے کے لئے آئے ہیں۔ اسی لئے میں نے بھاگنے کی کوشش کی۔

''اور وہ ٹرانسمیٹر؟'' میں نے زمین پر پڑے ہوئے ٹرانسمیٹر کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ ٹرانسمیٹر نہیں ٹرانسسٹر ہے۔'' رستم نے جواب دیا۔ ''میں خبریں سننے کے لئے ریڈیو آن کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ تم......''

''اس وقت کسی ریڈیو سٹیشن سے خبریں نہیں آتیں۔'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''آل انڈیا ریڈیو سے تقریباً ہر گھنٹے بعد خبروں کا بلیٹن نشر ہوتا ہے جس سے حالات کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں مسلمان ہوں اور......''

''کیسے مسلمان ہو؟'' میں نے ایک بار پھر اُس کی بات کاٹ دی۔ ''مسلمان خدا کے سوا کسی اور سے مدد نہیں مانگتا۔ کسی مشکل کے وقت بھی اُس کے منہ سے خدا ہی کا نام نکلتا ہے۔ اور تم کیسے مسلمان ہو کہ مجھے اپنی کالی دیوی کے عذاب سے ڈرا رہے تھے؟''

''میں سرینگر میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا ہوں......'' رستم نے جواب دیا۔ وہ بلاشبہ آہنی اعصاب کا مالک تھا۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے باوجود اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا تھا اور اس واقعہ کو کوئی اور رنگ دینے کی کوشش کر رہا تھا اور میرے خیال میں اُس کی بات سن لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ''ہمارے محلے میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ میں بچپن ہی سے اُن کے بیچ میں رہا ہوں...... ہندی شبد (الفاظ) بولنے اور ہندو دیوی دیوتاؤں کے نام لینے کی عادت ہو گئی ہے۔''

''ایسے مسلمان کو تو ڈوب مرنا چاہئے جو پتھر کی مورتیوں کو بھی خدا مان کر اُن کا نام زبان پر لاتا ہو۔'' میں نے اُسے گھورا۔ ''تم ہندوؤں کے بیچ پلے بڑھے ہو لیکن کیا آج تک تم نے کسی ہندو کے منہ سے اللہ کا نام نکلتے سنا ہے...... کیا کبھی کسی ہندو کو بسم اللہ یا ماشاءاللہ یا انشاءاللہ کہتے سنا ہے؟ نہیں رستم! تمہاری یہ کہانی ایک دلچسپ لطیفہ تو ہو سکتی ہے مگر اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر تمہارے اس ٹرنک میں تمہاری اُس کالی مائی کی فریم شدہ تصویر تمہارے اس بیان کی نفی کر رہی ہے۔''

''کیسی تصویر؟'' اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔ میری بات سن کر اُس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا لیکن اُس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا تھا۔ میں نے جھک کر چارپائی کے نیچے سے ٹرنک باہر کھینچ لیا، اس کا ڈھکن اُٹھایا اور کپڑے کے نیچے سے وہ فریم نکال لیا۔

''یہ ہے تمہاری کالی مائی کی تصویر جس کی تم ہمارے آنے سے پہلے پوجا کر رہے تھے۔'' میں نے تصویر اُس کے سامنے پھینک دی۔

''یہ...... یہ تصویر......'' وہ پہلی مرتبہ ہکلایا۔ مگر فوراً ہی سنبھل گیا۔ ''تقریباً بیس دن پہلے بھارتی فوجیوں نے مجاہدین کی تلاش میں اس بستی پر ریڈ کیا تھا۔ اُن کے ٹرک اس طرف سے

گزرے تھے۔ واپسی پر یہ فریم شاید کسی ٹرک سے گر گیا تھا۔ تم جانتے ہو ہندو فوجی اپنے دیوتاؤں کی چھوٹی چھوٹی مورتیاں یا اُن کی تصویریں اپنے پاس رکھتے ہیں۔ یہ تصویر بھی شاید ٹرک پر لگی ہوگی جو جھٹکا لگنے سے گر گئی اور میں اسے اُٹھا کر لے آیا تھا۔''

''ٹھیک کہا تم نے۔'' میں نے کہا۔ ''میں آخری حد تک تمہاری بات سننے کو تیار ہوں۔ ایک جھوٹ نبھانے کے لئے کئی جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور ان میں تسلسل قائم نہیں رہتا۔ میں ہر طرح سے ثابت کر سکتا ہوں کہ تم مسلمان نہیں ہندو ہو اور ایک پلاننگ کے تحت مخبری کے لئے یہاں آئے ہوئے تھے۔''

''تمہیں میری بات کا یقین کرنا پڑے گا...... میں مسلمان......''

میں نے ولی محمد کو اشارہ کیا۔ وہ تلے قدم اُٹھاتا ہوا رستم کے پیچھے چلا گیا۔ میں جو کچھ کرنا چاہتا تھا اس کے لئے انگوری کی موجودگی مناسب نہیں تھی۔ میں نے اُسے اشارہ کیا، وہ کھڑکی سے ایک طرف ہٹ گئی۔

ولی محمد نے اچانک ہی رستم کو پیچھے سے بانہوں میں جکڑ لیا۔ رستم بھی شاید سمجھ گیا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ وہ مزاحمت کرنے لگا جس کے نتیجہ میں وہ دونوں فرش پر گر گئے۔ ولی محمد کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر گر گیا تھا مگر اُس نے رستم پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں ہونے دی۔

میں بھی آگے بڑھ آیا۔ رستم بری طرح لاتیں چلا رہا تھا لیکن میں اُس کے پاجامے کا بند کھولنے میں کامیاب ہو گیا اور پھر میں پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اب کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہندو تھا۔

''چھوڑ دو اسے۔'' میں نے ولی محمد کو اشارہ کیا۔

ولی محمد اُس کو چھوڑ کر الگ ہٹا ہی تھا کہ اُس نے اپنی برہنگی کی پرواہ کئے بغیر بڑی تیزی سے پستول کی طرف چھلانگ لگا دی۔ پستول ہاتھ میں آتے ہی اُس نے فائر کر دیا...... گولی میرے سر سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی اور اس سے پہلے کہ رستم کو دوسری گولی چلانے کا موقع ملتا کھڑکی کی طرف سے فائر ہوا اور رستم چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا......

انگوری کی چلائی ہوئی گولی رستم کے ریوالور والے بازو پر کلائی سے ذرا اُوپر لگی تھی اور ہڈی توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ ریوالور اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا جسے ولی محمد نے جھپٹ کر اُٹھا لیا۔ رستم کے بازو سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی اور وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ ولی محمد نے آگے بڑھ کر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

''تم نے ہمارے کئی مجاہدوں کو دھوکے سے مروا دیا۔ ہمارے بابا عبدالفتح کو شہید کروا دیا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بتا کون ہے تو..؟'' ولی محمد اُس پر ٹھوکریں برساتا ہوا چیخ رہا تھا۔

''اسے چھوڑ دو ولی محمد۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اس طرح نہیں بتائے گا۔ اس کے لئے دوسرا طریقہ اختیار کرنا ہوگا اور اسے سزا تو ایسی دی جائے گی کہ آئندہ وہ لوگ اپنا کوئی جاسوس کسی بھی میں بھیجنے کی جرأت نہیں کریں گے۔''

ولی محمد نے اُسے چھوڑ دیا۔ اسی دوران انگوری بھی کمرے میں آ گئی تھی۔ رستم کا نچلا دھڑ برہنہ تھا۔ انگوری رُخ بدل کر کھڑی ہو گئی اور ولی محمد نے رستم کا پاجامہ اُوپر کھینچ کر کمر بند باندھ دیا۔ میں رستم کے سامنے آ گیا۔

''مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ تمہیں کس نے بھیجا تھا یا تمہارا نام کیا ہے۔'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ ''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اب تک تم ایسے کتنے مشن پایہ تکمیل تک پہنچا چکے ہو اور تمہاری وجہ سے ہمارے کتنے مجاہدین تمہارے سورماؤں کے ہاتھوں شہید ہوئے ہیں؟ کتنے گھر جلائے ہیں اور کتنے بے گناہوں کو ظلم کا نشانہ بنایا ہے؟''

رستم زبان کھولنے کو تیار نہیں تھا۔ لیکن میں بھی خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مجھے کمرے کے ایک کونے میں رکھی ہوئی ایک چھڑی مل گئی۔ شہتوت کی یہ چھڑی تقریباً تین فٹ لمبی تھی۔ میں نے وہ چھڑی اُٹھا کر دیکھی، پھر ولی محمد کو اشارہ کیا۔

ہم دونوں نے رستم کو چارپائی پر سیدھا لٹا کر رسّی سے باندھ دیا اور میں چھڑی اُٹھا کر پائنتی کی طرف آ گیا۔ رستم کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔

''ہم بھی تشدد کے کچھ طریقے جانتے ہیں۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ ہم لوگوں نے تشدد کے طریقے تم ہی لوگوں سے سیکھے ہیں۔ تم لوگ ہمارے پکڑے جانے والے مجاہدین اور بے گناہ شہریوں پر تشدد کے جو حربے استعمال کرتے ہو ان میں سے صرف ایک ہی تم پر آزماؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھے کوئی دوسرا طریقہ استعمال کرنے کا موقع نہیں دو گے۔'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

میں چند لمحے اُس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر چھڑی زور سے اُس کے پیروں کے تلوؤں پر ماری۔ وہ چیخ اُٹھا...... مگر میں رُکے بغیر چھڑی سے ضربیں لگاتا رہا۔ اگر اُس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے نہ ہوتے تو وہ یقیناً فرش پر گر کر پانی سے نکالی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگتا۔ مگر رسّی کی بندشوں نے اُسے ایسا موقع نہیں دیا۔

''ٹھ...... ٹھہرو...... میں بتاتا ہوں......'' وہ چیخ اُٹھا۔

○○○

میں نے ہاتھ روک لیا۔ اُس کا بازو پہلے ہی زخمی تھا۔ انگوری کی چلائی ہوئی گولی ہڈی توڑتی ہوئی نکل گئی تھی اور اب پیروں پر لگنے والی ضربوں نے اُسے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اُس کا نام چندر پال تھا۔ وہ سرینگر ہی کا رہنے والا تھا۔ پہلے پولیس کے لئے مخبر کی حیثیت سے کام کرتا رہا تھا۔ اُس کی فراہم کردہ اطلاعات پر پولیس نے کئی بے گناہوں کو پکڑ کر تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور اس تشدد سے دو آدمی شہید بھی ہو گئے تھے۔ شہر میں رہتے ہوئے اُس کا سب سے مکروہ اور سیاہ کارنامہ وہ تھا جب اُس نے اپنے ہی محلے کی ایک خوبصورت مسلمان لڑکی کے خلاف پولیس میں مخبری کی تھی۔ وہ لڑکی پہلگام کی رہنے والی تھی اور مہینے میں ایک دو مرتبہ اپنے ماموں کے گھر آیا کرتی تھی جو اُسے کپڑوں پر کڑھائی کا کام لے کر دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ چندر پال نے اُسے چھیڑ دیا تھا جس پر لڑکی نے اُسے تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ اُس وقت گلی سنسان تھی۔ اگر کوئی مسلمان چندر پال کو لڑکی کو چھیڑتے ہوئے دیکھ لیتا تو چندر پال زندہ نہ بچتا۔

چندر پال نے اپنی توہین کا بدلہ لینے کے لئے پولیس کو اُس کے خلاف یہ جھوٹی اطلاع فراہم کر دی کہ یہ لڑکی دراصل مجاہدین کی مخبر ہے جو سرینگر میں اپنے ماموں سے پولیس اور فوج کی سرگرمیوں کی رپورٹس لے کر مجاہدین کو پہنچاتی ہے۔

پولیس نے اُسی رات عبدالستار نامی اُس شخص کے گھر چھاپہ مار کر عبدالستار اور اُس کی بھانجی زرینہ کو گرفتار کر لیا۔ عبدالستار کو پوچھ گچھ کے دوران اس قدر تشدد کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ زندگی بھر کے لئے مفلوج ہو گیا اور زرینہ نامی اُس لڑکی کو اجتماعی طور پر ہوس کا شکار بنایا گیا۔ جب اُسے چھوڑا گیا تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ دوسرے ہی روز اُس نے زیرو برج سے دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ چندر پال کئی سال تک سرینگر شہر میں پولیس کے لئے مخبری کرتا رہا، پھر فوج تک پہنچ گیا۔ اب وہ فوج کے لئے مخبر کا کام کرنے لگا۔ اُسے ہر مرتبہ نئی کہانی دے کر کسی ایسی بستی میں بھیج دیا جاتا جہاں مجاہدین کی خفیہ سرگرمیوں کا شبہ ہوتا۔

چندر پال مسلمان کے بھیس میں اس بستی میں پہنچ جاتا اور بھارتی فوجیوں کے ظلم کی فرضی کہانی سنا کر بستی والوں کی ہمدردیاں حاصل کر لیتا اور وہاں رہ کر اُنہی کی جڑیں کھوکھلی کرنے لگتا۔

چار پانچ مہینے پہلے فوج کے ڈیفنس انٹیلی جنس کے ایک کرنل نے اُسے ایک نیا مشن سونپا تھا۔ اُس کرنل کو اپنے ذرائع سے اطلاعات ملی تھیں کہ عبدالفتح اس بستی کے آس پاس کہیں روپوش زندگی گزار رہا ہے لیکن کوشش کے باوجود اُس کے ٹھکانے کا پتہ نہیں چل سکا تھا۔

چندر پال کو یہ مشن دے کر یہاں بھیجا گیا۔ بابا عبدالفتح نے ماضی میں بھارتی فوجیوں کو ناقابل تلافی نقصانات پہنچائے تھے۔ اُس کی گرفتاری پر فوج کی طرف سے اور سرینگر کی کٹھ پتلی سرکار کی طرف سے لاکھوں روپے کے انعام مقرر کئے گئے تھے۔ چندر پال سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر اُس کی فراہم کردہ اطلاع پر عبدالفتح گرفتار ہو گیا تو تمام انعامی رقوم اُسے دے دی جائیں گی۔

چندر پال کے کہنے کے مطابق وہ ایک مہینے کے اندر اندر بستی والوں کا اعتماد حاصل کر چکا تھا۔ وہ اُس کی موجودگی میں مجاہدین کی سرگرمیوں کے بارے میں کھل کر بات کرتے لیکن بابا عبدالفتح کے بارے میں اُنہوں نے کبھی زبان نہیں کھولی حالانکہ بابا عبدالفتح خود بھی ہفتے دو ہفتے کے بعد بستی کا چکر لگاتا رہتا تھا۔

چندر پال کو یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ بابا عبدالفتح کا بستی والوں سے تعلق ہے اور وہ یہاں آتا بھی ہے لیکن اُس کا اصل ٹھکانہ کوشش کے باوجود اُسے معلوم نہیں ہو سکا۔ اُس کا بستی میں آنے کا کوئی دن بھی مقرر نہیں تھا ظاہر ہے وہ کرنل کو اُس کے بارے میں کوئی حتمی اطلاع نہیں دے سکتا تھا۔ اور پھر وہ بستی کے ایک شخص سے بابا عبدالفتح کا ٹھکانہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس نے ٹرانسمیٹر پر اپنے کرنل کو اطلاع دے دی۔ چندر پال کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بابا عبدالفتح کے اس خفیہ ٹھکانے پر کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں۔ اُس نے کرنل کو یہی بتایا تھا کہ بابا عبدالفتح اکیلا رہتا ہے۔ اُس کی اطلاع پر کرنل نے صرف چار فوجیوں پر مشتمل ایک ٹیم اُن پہاڑوں میں بھیج دی۔ اُن کے خیال میں ایک آدمی کو گرفتار کرنے کے لئے چار فوجی کافی تھے۔ لیکن اُن چاروں کی موت ہی اُنہیں گھیر کر وہاں لے گئی تھی۔

چندر پال کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بابا عبدالفتح کے خفیہ ٹھکانے پر ریڈ کس دن ہو گا۔ چندر پال عام طور پر بستی کی مسجد میں عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد گھر آ جاتا تھا۔ لیکن آج گھر آنے کے بعد وہ سگریٹ لینے کے لئے بستی واپس چلا گیا تھا۔ اس وقت تک ہم بستی میں پہنچ چکے تھے اور بابا عبدالفتح کی شہادت کی اطلاع بھی بستی کے بیشتر لوگوں تک پہنچ چکی تھی۔ چندر پال جس دُکان پر سگریٹ لینے کے لئے گیا تھا اُسے بھی یہ اطلاع وہیں سے ملی تھی۔ وہ کافی دیر تک وہیں بیٹھا باتیں کرتا رہا اور پھر دو تین آدمیوں کے ساتھ ولی محمد کے مکان پر آ گیا۔ وہ اپنے آقاؤں کو اطلاع دینے سے پہلے خود تصدیق کر لینا چاہتا تھا لیکن ہمارے ہتھے چڑھ گیا۔ اگر ہمیں یہاں پہنچنے میں چند منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو وہ ٹرانسمیٹر پر اپنے آقاؤں کو اطلاع دے چکا ہوتا۔

''ٹھیک ہے......'' میں نے چندر پال کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''یوں تو تم نے پوری وادی کے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ بابا عبدالفتح بھی پوری وادی کے لوگوں کا ہیرو تھا لیکن اُسے اس بستی سے خاص لگاؤ تھا۔ اس بستی کو بھی تم ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکے ہو۔ یہاں وقتاً فوقتاً پناہ لینے والے مجموعی طور پر آٹھ مجاہدین کے علاوہ بستی کے دو بے گناہ نوجوان بھی قتل کئے جا چکے ہیں اس لئے تمہاری تقدیر کا فیصلہ بھی بستی والے کریں گے۔''

چندر پال کا چہرہ دُھواں ہو گیا۔

اسی دوران باہر سے شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لگتا تھا جیسے بہت سے لوگ جمع ہوں۔ اور پھر باہر والا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی رستم کا نام لے کر پکار رہا تھا۔

میں نے ولی محمد کی طرف دیکھا۔ وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اُس کی واپسی چند منٹ بعد ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ بستی کے تین چار آدمی بھی تھے۔ کسی کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، کسی کے ہاتھ میں کلہاڑی، ایک کے ہاتھ میں رائفل بھی تھی۔

اور پھر اُن کی بات سن کر اُن لوگوں کے یہاں جمع ہونے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ بستی والوں نے دو گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی۔ پہلے وہ سمجھے کہ بھارتی فوجیوں کے کسی دستے نے بستی پر حملہ کر دیا ہے لیکن اس کے بعد فائرنگ کی آواز سنائی نہیں دی۔ البتہ چندر پال کی چیخوں کی آواز اُن تک پہنچ گئی تھی۔ بستی والے یہ سمجھے تھے کہ شاید کوئی چور وغیرہ رستم کے گھر میں گھس گئے ہیں۔ فوجیوں کے بارے میں اُن کا شبہ ختم ہو گیا تھا کیونکہ بستی میں یا باہر بھی فوج کی کوئی گاڑی وغیرہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''یہ ہے تمہارا رستم......'' میں نے ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کا اصل رُوپ یہ ہے۔'' میں نے زمین پر پڑی ہوئی کالی دیوی کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ مسلمان کے بھیس میں ہماری بستیوں میں جا کر مخبری کرتا رہا۔ کئی مجاہدین اس کی وجہ سے شہید ہوئے۔ کئی معصوم عورتوں کی عزت لوٹی گئی۔ کئی گھر جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ آج ہمارا بابا عبدالفتح بھی اس کی وجہ سے شہید ہوا۔ نوری اور عبداللہ کی زندگیوں کے چراغ بھی اسی کی وجہ سے گل ہوئے۔ یوں تو یہ وادی کے تمام مسلمانوں کا مجرم ہے لیکن اسے سزا دینے کا حق تم لوگوں کو ہے۔ اس بستی کے لوگ ہی اس کے لئے سزا تجویز کریں گے۔''

ایک دو آدمی چندر پال کو مارنے کے لئے لپکے تھے لیکن میں نے اُنہیں روک دیا۔ اور بھی کئی لوگ اندر آ گئے تھے۔ اُنہوں نے کالی کی تصویر بھی دیکھ لی تھی اور ٹرانسمیٹر بھی۔ اس کے علاوہ ٹرنک سے ایک دو مزید ایسی چیزیں برآمد ہوئی تھیں جنہیں چندر پال کے خلاف ثبوت کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔

وہ تمام چیزیں میں نے اپنے قبضے میں لے لیں اور چندر پال کو بستی میں لے آئے۔ اُس کے مکان کو تالا لگا دیا گیا تھا۔ اگرچہ آدھی رات بیت چکی تھی۔ گاؤں، دیہاتوں اور ایسی بستیوں میں شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد ہی سناٹا چھا جاتا تھا مگر رستم کے پکڑے جانے کی خبر رات کو بھی جنگل کی آگ کی طرح پوری بستی میں پھیل گئی تھی اور بہت سے لوگ بستی کے مرکزی چوراہے پر جمع ہو گئے تھے۔ وہ سب لوگ چندر پال کے خلاف غصے کا اظہار کر رہے تھے اور کئی لوگ اُسے مارنے کو لپک رہے تھے۔

چندر پال کو باندھ کر ولی محمد کے گھر کے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ صبح فجر کی نماز کے فوراً ہی بعد بستی کے لوگ ایک بار پھر مرکزی چوراہے پر جمع ہو گئے اور چندر پال کو بھی وہاں پہنچا دیا گیا۔ بستی والوں نے چندر پال کے خلاف اپنا فیصلہ سنا دیا۔

چوراہے پر اخروٹ کے درخت کی اُونچی شاخ پر رسا باندھ کر چندر پال کو پھندے پر لٹکا دیا گیا اور اُس کی لاش دوپہر تک درخت پر جھولتی رہی اور پھر گاؤں کے چند لڑکوں نے وہ لاش پھندے سے اُتار کر بستی سے بہت دُور کھیتوں میں لے جا کر پھینک دی۔

بستی والے میرے اور انگوری کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ ہم تو اُسی روز جانا چاہتے تھے مگر اُنہوں نے ہمیں روک لیا۔ دو آدمی بابا عبدالفتح کے پہاڑی ٹھکانے پر چلے گئے تھے۔ اُن کی واپسی تقریباً چار گھنٹوں بعد ہوئی تھی اور وہ لوگ بھارتی فوجیوں کی تمام رائفلیں اُٹھا لائے تھے۔

ہمارا خیال تھا کہ بابا عبدالفتح کے خفیہ ٹھکانے پر ریڈ کرنے والے فوجیوں کے واپس نہ پہنچنے اور چندر پال کی طرف سے بھی کوئی اطلاع نہ ملنے پر کوئی نہ کوئی فوجی دستہ اس بستی پر ہلہ بول دے گا۔ مگر وہ رات خیریت سے گزر گئی۔ اگلے روز بھی کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ اُس روز بھی ہم نہیں جا سکے۔ اس سے اگلی رات شبہ تھا کہ بھارتی فوجیوں کی طرف سے کوئی نہ کوئی کارروائی ضرور ہو گی۔ بستی والوں کے پاس اب چار پانچ سب مشین گنیں آ چکی تھیں۔ پہلے بھی اُن کے پاس دو چار تھری ناٹ تھری کی رائفلیں موجود تھیں جنہیں ہمیشہ چھپا کر رکھا جاتا تھا۔ اور اب وہ رائفلیں بھی باہر نکل آئی تھیں۔ چند لوگوں نے رات کے وقت بستی کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اُن میں انگوری بھی شامل تھی اور میں بھی۔ ہمارا پروگرام یہ تھا کہ اگر رات کو بھارتی فوجیوں کی کوئی گاڑی بستی میں داخل ہو تو اُن پر چاروں طرف سے فائر کھول دیا جائے اور اُن فوجیوں کو جہنم رسید کر کے اُن کے اسلحہ پر قبضہ کر لیا جائے لیکن...... اُس رات بھی کچھ نہیں ہوا۔

رات کے آخری پہر مجھے اور انگوری کو کچھ دیر سونے کا موقع مل گیا تھا اس لئے صبح ہم کسی قدر تازہ دم تھے۔ ناشتہ ہم نے ولی محمد کے گھر پر ہی کیا تھا۔ اور بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔

میں گلمرگ کی طرف جانا چاہتا تھا تاکہ کمانڈر محبّ اللہ یا کمانڈر رشید سے کسی طرح رابطہ کیا جا سکے۔ وہ اُس طرف بھارتی فوجیوں کے خلاف چھاپہ مار سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ لیکن انگوری ہندواڑہ جانا چاہتی تھی جہاں اُس کی خالہ رہائش پذیر تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ دو چار روز ہندواڑہ میں رہنے کے بعد ہم بارہ مولا کی طرف آ جائیں گے اور وہاں سے گلمرگ کی طرف نکل جائیں گے۔

ہمیں بستی سے دو خچر مل گئے۔ ہم بستی والوں سے رخصت ہو کر پہاڑوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ بستی والوں نے ہمیں کچھ کھانا بھی دے دیا تھا جو کم از کم دو وقت ہمارے کام آ سکتا تھا۔ بستی کے دو آدمی تقریباً تین میل تک ہمارے ساتھ آئے تھے پھر اُنہوں نے ہمیں آگے جانے کا راستہ سمجھا دیا۔ ہمیں واپس جانے کے لئے بھی وہ دریا پار کرنا تھا جس پر رسے کا پل پار کر

کے ہم اس طرف آئے تھے لیکن ہمیں جو راستہ بتایا گیا تھا اور جہاں سے دریا پار کرنے کو کہا گیا تھا وہاں سے دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا اور ہم خچروں سے اُترے بغیر دریا پار کر سکتے تھے۔

ہم بتائے ہوئے راستے پر دھان کے کھیتوں میں چلتے رہے۔ بالآخر کھیتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ہم پہاڑوں میں داخل ہو گئے۔ دوپہر تک ہمارا سفر جاری رہا۔ اب ہم دریا کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے دریا کا پاٹ بتدریج چوڑا ہوتا جا رہا تھا۔

مسلسل کئی گھنٹوں تک خچر کی پشت پر بیٹھے بیٹھے میری کمر اکڑ گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ انگوری بھی خچر پر بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے بار بار سینہ بھی سہلا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح اکڑ کر مسلسل کئی گھنٹوں تک بیٹھے رہنے اور جھٹکوں کی وجہ سے اُس کے سینے کے زخم میں تکلیف شروع ہو گئی تھی۔

اب ہم دریا میں اُتر چکے تھے۔ یہاں دریا کا پاٹ تقریباً ہزار گز چوڑا تھا۔ اس طرح پانی بھی پھیلا ہوا تھا۔ وسط میں ممکن ہے اس کی گہرائی دو ڈھائی فٹ کے قریب ہو مگر کنارے کے ساتھ ساتھ پانی ٹخنوں سے زیادہ گہرا نہیں تھا۔

میری نظر سامنے بہت دُور درختوں کے ایک جھنڈ پر مرکوز تھی۔ وہ جھنڈ دریا کے کنارے کے بالکل ساتھ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ وہاں پہنچ کر کچھ دیر آرام کر لیا جائے گا۔

ہم تقریباً بیس منٹ میں وہاں پہنچ سکتے تھے۔ وہ خوبانی کے درخت تھے۔ پھول جھڑ رہے تھے اور پھل ابھی آنا شروع ہوا تھا۔ میں اپنا خچر روک کر نیچے اُتر آیا اور انگوری کو بھی سہارا دے کر نیچے اُتار لیا۔ انگوری خچر سے اُترتے ہی چھوٹے چھوٹے پتھروں میں اُگی ہوئی مخملی گھاس پر لیٹ گئی۔ وہ ایک ہاتھ سے مسلسل سینے کو سہلا رہی تھی۔

''زیادہ تکلیف ہو رہی ہے؟'' میں نے اُس کے قریب بیٹھ کر پوچھا۔

''ہاں......'' اُس نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''اکڑ کر بیٹھے رہنے اور جھٹکے لگنے سے درد ہو رہا ہے۔''

''مرہم والی وہ ڈبیہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جیب میں رکھی ہے۔ ابھی ذرا سانس درست ہو جائے تو میں نکالتی ہوں۔'' انگوری نے جواب دیا۔

''لاؤ...... نکالو ڈبیہ میں لگا دوں مرہم۔'' میں نے روانی میں کہہ دیا۔ اس میں میری بدنیتی کو کوئی دخل نہیں تھا اور میرے ذہن میں ایسا کوئی خیال بھی نہیں تھا۔

''کیا......؟'' انگوری نے مجھے گھورا۔ ''کیا تم......؟''

''سوری انگوری!'' میں گڑبڑا گیا۔ ''میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔'' مجھے اپنی بات پر شرمندگی ہو رہی تھی۔ میں اُٹھ کر چند گز دُور چلا گیا جہاں ٹخنوں تک گہرا پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے پہلے جی بھر کے پانی پیا پھر جوتے اُتار کر پیر پانی میں ڈال دیئے اور مڑ کر انگوری کی طرف دیکھنے لگا۔

اُس کا ایک ہاتھ کرتے کے اندر تھا۔ شاید وہ زخم پر مرہم لگا رہی تھی۔ میں پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

چند منٹ بعد انگوری بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر میرے قریب آ گئی۔

''ناراض ہو گئے؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کیوں...... میں تم سے ناراض کیوں ہونے لگا؟'' میں نے کہا۔

''میں نے تمہیں ڈانٹ دیا تھا نا......'' وہ میرے قریب ہی پتھر پر بیٹھ گئی اور جھک کر ہاتھ دھونے لگی۔

''میں نے تمہاری ڈانٹ کا برا نہیں مانا۔ غلطی میری ہی تھی۔ مجھے ایسی بات کہنی ہی نہیں چاہئے تھی۔ میں تو......''

''میں جانتی ہوں۔'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''مجھے تمہاری نیت پر کوئی شبہ نہیں۔ اچھا بس، اب اس بات کو ختم کرو...... مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

بھوک تو مجھے بھی لگ رہی تھی۔ ہم جس جگہ بیٹھے ہوئے تھے درختوں کا سایہ وہاں تک پہنچ رہا تھا۔ میں وہ پوٹلی اُٹھا لایا جس میں ولی محمد کی بیوی نے کھانا باندھ دیا تھا۔ چاول کے آٹے کی موٹی موٹی روٹیاں تھیں۔ ایک اور پوٹلی میں بھنے ہوئے چاول بھی تھے جن میں گڑ ملا ہوا تھا۔ روٹیوں پر مرچوں کا اچار رکھا ہوا تھا۔ میں نے کپڑے کو وہیں دسترخوان کی طرح بچھا دیا اور ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر اچار کے ساتھ روٹی کھانے لگے۔

''اگر تمہیں دو تین دن آرام مل جائے تو تمہارا زخم ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اور اگر اسی طرح بھاگ دوڑ کرتی رہی تو زخم کے پھیل جانے کا اندیشہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہندواڑہ میں خالہ کے ہاں شاید آرام کا موقع مل جائے۔'' انگوری نے منہ میں نوالہ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن میں نے طے کر رکھا ہے کہ اب زندگی بھر آرام سے نہیں بیٹھوں گی۔ ان خونخوار بھیڑیوں کے خلاف لڑتی رہوں گی جو ہماری سرزمین پر قابض ہیں اور ہمارے بہن بھائیوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں۔''

''میرا بھی یہی مشن ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بابا عبدالفتح کی شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ یوں تو ہر کشمیری مسلمان کا مشن یہی ہے کہ ان غاصب اور متعصب ہندوؤں کو اس وادی سے نکال دیا جائے، اس وادی کی فضاؤں میں آزادی کا پرچم لہرائے۔ اب تک ساٹھ ہزار سے زیادہ کشمیری مسلمان اسی کاز کے لئے اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔ بابا عبدالفتح زندگی بھر بھارتی سامراج کے خلاف برسرپیکار رہا۔ اُس نے بھی اپنی جان دے دی۔ اُس کے مشن کو میں آگے بڑھاؤں گا اور وطن کی آزادی کے لئے لڑتے ہوئے جان دے دوں گا۔''

انگوری خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اور پھر ہم دیر تک بابا عبدالفتح ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

تقریباً ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ہم روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔ ہمارے خچر گھاس چرتے ہوئے کچھ دُور چلے گئے تھے۔ میں اُنہیں پکڑ لایا۔ انگوری کو سہارا دے کر اُس کے خچر پر بٹھایا اور خود بھی اپنے خچر پر سوار ہو گیا۔

ولی محمد نے ہمیں بتایا تھا کہ یہ راستہ اگرچہ بہت طویل پڑے گا مگر اس لحاظ سے محفوظ ہے کہ اس طرف بھارتی فوج کی کسی گشتی پارٹی سے آمنا سامنا ہونے کی توقع نہیں۔ اور ہم دوپہر کے بعد سنگرام پہنچ جائیں گے۔

سنگرام ایک بڑا قصبہ تھا اور میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہ قصبہ ان شاہراہوں کے سنگم پر واقع تھا جہاں سے ایک سڑک بارہ مولا کی طرف، دوسری سرینگر اور تیسری سڑک سوپور سے ہوتی ہوئی ہندواڑہ کی طرف چلی گئی تھی۔

سوپور...... میرا گھر...... میری جائے پیدائش...... میرا وہ قصبہ جسے بھارتی غاصبوں نے جلا کر راکھ کر دیا تھا، میرے ماں باپ کو شہید کر دیا تھا، میری ایک بہن گولیوں سے چھلنی ہو گئی تھی اور دوسری بہن لاپتہ ہو گئی تھی...... سوپور میں میرے خاندان کے کئی لوگ تھے۔ ہم کسی کے ہاں بھی ٹھہر سکتے تھے۔

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ ہم اس وقت خطرناک پہاڑی راستوں پر سفر کر رہے تھے۔ خچر بڑے نستعلیق قسم کے تھے اور بڑے آرام سے چل رہے تھے۔ اُن کی سست رفتاری کی وجہ سے بھی ہمارا سفر طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔

اور پھر ایک جگہ ہمیں رُک جانا پڑا۔ ہمارے سفر کا خطرناک ترین مرحلہ ہمارے سامنے تھا اور ولی محمد نے اُس کے بارے میں ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا۔ وہ راستہ بہت ہی خطرناک تھا۔ ایک طرف بالکل عمودی چٹان تھی۔ اُس کے ساتھ تقریباً چار فٹ چوڑی ایک پٹی سی تھی جس کے دوسری طرف سینکڑوں فٹ گہرے کھڈ تھے اور نیچے بہت دُور دریا کا پانی دھوپ میں چمک رہا تھا۔

یہ خطرناک راستہ تقریباً پچاس گز طویل تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ایک کارنس سی عمودی چٹان سے باہر کو نکلی ہوئی ہو۔ ہم دونوں اپنے اپنے خچروں سے اُتر آئے۔ وہاں ہوا بھی تیز تھی۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا، اُس کے چہرے پر خوف کے تاثرات اُبھرے ہوئے تھے۔

''یہ تو بڑی خطرناک جگہ ہے۔ کوئی اور راستہ نہیں؟'' انگوری نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میلوں دُور تک تو ہم تنگ سے درّے میں سفر کرتے آئے ہیں کوئی اور راستہ تو نظر نہیں آیا۔'' میں نے جواب دیا۔ اور اس خطرناک راستے کو دیکھنے لگا۔

''میرا خیال ہے کہ راستہ پار کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ بس ذرا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''خچروں پر سوار ہو کر تو ہم اس راستے پر نہیں جا سکتے۔ تم خچر کی لگام پکڑ کر چٹان کے ساتھ ساتھ چلتی رہنا۔ میں آگے چلتا ہوں اور تم میرے پیچھے رہنا۔''

انگوری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ متوحش سی نظروں سے اس راستے کو دیکھ رہی تھی۔ ایک انجانا سا خوف میرے ذہن میں بھی تھا۔ اُس پل صراط سے گزرتے ہوئے کوئی معمولی سی لغزش ہمیں تحت الثریٰ میں پہنچا سکتی تھی۔

ہم دونوں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لیا۔ پہلے میں آگے بڑھا۔ میں نے خچر کی لگام اپنے ہاتھ میں پکڑ لی اور چٹان کے ساتھ رگڑ کھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میں نے لگام ایک طرف سے دبا رکھی تھی تاکہ خچر بھی چٹان کے قریب ہی رہے۔

''ڈرو مت انگوری......'' میں نے انگوری کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ''بس اسی طرح چٹان کے ساتھ ساتھ آ جاؤ!''

انگوری بڑی ہچکچاہٹ کے بعد خچر کی لگام پکڑے چٹان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ میں اُس سے تقریباً دس گز آگے تھا۔ تیز ہوا ہمیں پیچھے دھکیل رہی تھی۔ نیچے سینکڑوں فٹ گہرائی تھی اور اس طرف دیکھتے ہوئے بھی خوف آتا تھا۔ میں اُس طرف دیکھنے سے بھی کترا رہا تھا اور چیخ چیخ کر انگوری کو بھی ہدایات دیتا جا رہا تھا۔

ہم نے تقریباً چالیس گز کا فاصلہ طے کر لیا۔ آگے صرف دس گز فاصلہ رہ گیا تھا۔ لیکن آگے چند فٹ تک وہ راستہ مزید تنگ ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے وہاں سے اُس راستے کی چوڑائی تین فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ ہمارے اس سفر کا کٹھن ترین مرحلہ تھا۔

میں نے انگوری کو پیچھے ہی رُکنے کو کہہ دیا اور خود بہت محتاط انداز میں دیوار کے ساتھ چپک کر آگے سرکنے لگا۔ خچر کو بھی میں نے چٹان کی طرف رکھا تھا۔ آٹھ دس فٹ کا یہ فاصلہ بہت قیامت خیز ثابت ہوا۔ باقی راستہ طے کرنے میں مجھے زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی۔ خچر کو کھلی جگہ پر آگے ہانک کر میں واپس آ گیا۔ ابھی میں اُس تنگ راستے سے چند فٹ دُور ہی تھا کہ انگوری کے خچر کے ہنہنانے کی آواز سن کر چونک گیا۔ پتہ نہیں کس وجہ سے خچر مچل گیا تھا اور سر کو جھٹکے دے کر انگوری سے لگام چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ انگوری نے لگام کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا اور خچر کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''انگوری! لگام چھوڑ دو۔''

خچر کے ہنہنانے کے شور میں میری آواز انگوری کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اُس نے لگام چھوڑ دی۔ لگام چھوٹتے ہی خچر مزید پیچھے ہٹا۔ اُس کا ایک پیر کھڈ کے کنارے سے اُتر گیا اور پھر دوسرا پیر بھی......

انگوری بھی لگام چھوڑتے ہی لڑکھڑا گئی تھی۔ میں نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی اور انگوری کو ساتھ لیتا ہوا عمودی چٹان کے قریب گرا۔ انگوری میرے نیچے تھی اور میں نے اُسے بانہوں میں دبوچ رکھا تھا۔

خچر کے آگے والے دونوں پیر ایک لمحہ کو اُوپر اُٹھتے ہوئے نظر آئے اور پھر وہ کھڈ کی عمیق

گہرائیوں میں غائب ہو گیا......

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ انگوری کو جب میں ساتھ لے کر گرا تھا تو اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی اور میرے نیچے دبی وہ اب بھی ہولے ہولے چیخ رہی تھی لیکن میں نے اُسے دبوچ رکھا۔

بالآخر جب میں نے محسوس کیا انگوری پُرسکون ہو گئی ہے تو میں اُس کے اُوپر سے ہٹ گیا لیکن اُس کا ایک ہاتھ تھامے رکھا۔ انگوری کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ چکا تھا۔ آنکھوں میں بے پناہ وحشت تھی۔ اُس نے ایک نظر کھڈ کی طرف دیکھا، پھر اُس کی نظریں میری طرف اُٹھ گئیں اور دوسرے ہی لمحے وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی...... وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ میں نے اُسے اپنی بانہوں میں سمو لیا۔

○

کئی منٹ گزر گئے...... میں انگوری سے الگ ہو گیا اور اُسے سہارا دے کر اُٹھا دیا۔ اُس نے نیچے جھانک کر دیکھا اور میرے ساتھ جڑ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اب بھی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ میں نے بھی نیچے جھک کر دیکھا سینکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں خچر کا کہیں نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں انگوری کا ہاتھ تھامے چٹان کے ساتھ ساتھ سرکتا رہا۔ تیز ہوا ہمیں پیچھے دھکیل رہی تھی۔ انگوری نے نیچے کی طرف دیکھا اور پھر ایک ہاتھ سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔

"نیچے مت دیکھو...... چکر آ جائے گا۔" میں نے کہا اور اُس کا ہاتھ تھامے کھڑا رہا۔

انگوری کی وجہ سے وہ پل صراط عبور کرنے میں کئی منٹ لگ گئے۔ اس خوفناک ترین راستے کے اختتام پر کھلی جگہ تھی۔ چند گز آگے دو تین درخت تھے۔ میرا خچر اُس طرف گھاس چر رہا تھا۔ میں انگوری کو لے کر ان درختوں کے نیچے آ گیا۔ انگوری ایک پتھر پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ میں اُس کے قریب کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ کچھ دُور کہیں بلندی سے پانی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں خچر کو پکڑ کر لے آیا۔ انگوری کو سہارا دے کر خچر پر بٹھایا اور خود لگام پکڑ کر پیدل چلنے لگا۔ ہمیں زیادہ دُور نہیں جانا پڑا۔ بیس پچیس گز آگے ایک موڑ گھومتے ہی ہم رُک گئے۔ سامنے دس بارہ فٹ کی بلندی سے پانی کی ایک چار پانچ فٹ چوڑی چادر سی گر رہی تھی۔ نیچے جمع ہونے والا پانی ایک ندی کی صورت میں مخالف سمت میں بہہ رہا تھا۔ اس آبشار کے آس پاس رنگ برنگے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

انگوری خچر سے اُتر آئی۔ جی بھر کر پانی پینے کے بعد ہم چند منٹ وہاں رُکے اور پھر آگے چل پڑے۔ انگوری میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اُس نے خچر پر بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔

"تم اُس وقت دوڑے کیوں تھے...... اگر تمہارا پیر پھسل جاتا تو......؟" انگوری نے چلتے چلتے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہوتا......؟" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "خچر سے پہلے میں اُس کھڈ میں پہنچ جاتا۔"

"آئندہ ایسی کوئی بات منہ سے مت نکالنا۔" انگوری نے مجھے گھورا۔

"اگر میں دوڑ نہ لگاتا تو خچر کے ساتھ تم بھی پاتال میں پہنچ چکی ہوتیں۔ تم تو خچر کی لگام چھوڑنے کو تیار ہی نہیں تھیں۔" میں نے کہا۔

"تو تم نے میری خاطر اپنی زندگی بھی خطرے میں ڈال دی تھی۔" انگوری نے کہتے ہوئے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر دل کی بات زبان پر لانے کی ہمت نہ کر سکا۔

"تم نے جواب نہیں دیا میری بات کا؟" انگوری بولی۔

"خاموشی ہی بعض باتوں کا بہترین جواب ہوتی ہے۔" میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "تم تھک جاؤ گی۔ خچر پر بیٹھ جاؤ!"

"اور تم......؟" اُس نے عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "لگام پکڑے پیدل چلتے رہو گے؟"

"ہاں...... میں پیدل چلنے کا عادی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

پھر یہ طے ہوا کہ ہم دونوں خچر پر بیٹھ جائیں۔ میں نے ایک بڑے پتھر کے قریب خچر روک لیا۔ پہلے خود سوار ہوا اور پھر انگوری بھی پتھر پر چڑھ کر میرے پیچھے بیٹھ گئی۔ خچر کی کاٹھی کافی مضبوط تھی۔ وہ ہمارا بوجھ اُٹھائے آرام سے چلتا رہا۔

نیلے پتھروں کی سنگلاخ چٹانیں دُھوپ میں تپ رہی تھیں لیکن سبزے کی کثرت اور ہوا کی وجہ سے گرمی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ہم چٹانوں کے بیچ بل کھاتے ہوئے تنگ راستے پر سفر کرتے رہے۔ کئی جگہوں پر ہمیں خچر سے اُتر کر پیدل چلنا پڑا تھا۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ ولی محمد نے کہا تھا کہ دوپہر کے تھوڑی دیر بعد ہم گرام پہنچ جائیں گے۔ لیکن ہم مسلسل اُونچے پہاڑوں میں سفر کر رہے تھے اور آبادی کا کہیں نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا...... میرے دل میں اب طرح طرح کے خدشے سر اُبھارنے لگے تھے۔ کہیں ہم راستہ تو نہیں بھٹک گئے......؟

تھوڑی ہی دیر بعد انگوری نے بھی اس خدشے کا اظہار کیا۔

"اگر ہم راستہ بھول گئے تو ان پہاڑوں میں بھٹکتے رہیں گے اور ہمیں رات بھی یہیں گزارنی پڑے گی۔" انگوری نے کہا۔

"پہاڑوں میں رات گزارنے سے ڈرتی ہو؟" میں بولا۔

"ڈر اور خوف......" انگوری نے جواب دیا۔ "یہ دونوں چیزیں تو میں نے اُسی روز ذہن

سے نکال دی تھیں جب ہاتھوں میں رائفل اُٹھائی تھی۔'' انگوری نے جواب دیا۔

''اس وقت ہم دونوں خچر پر سوار تھے۔ انگوری میرے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک جگہ چھوٹا گڑھا تھا۔ خچر نے گڑھا پار کرنے کے لئے ہلکی سی چھلانگ لگائی تو انگوری اپنی جگہ پر اُچھلی ا پھر وہ آگے کو جھک کر میرے ساتھ جڑ گئی۔ اُس نے دونوں ہاتھ میری بغلوں کے نیچے سے نکا کر میرے سینے پر لپیٹ لئے تھے۔

اپنی پشت پر انگوری کے بدن کا گداز لمس محسوس کر کے میں اپنے آپ میں عجیب سی کشش محسوس کرنے لگا۔ میرا خیال تھا انگوری پہلے کی طرح سنبھل کر بیٹھ جائے گی لیکن اُس نے تو ا سر بھی میرے شانے پر ٹکا دیا تھا۔

میں نے خچر روک لیا۔ انگوری سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہم واقعی راستہ بھول گئے ہیں۔'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''اب کیا ہوگا؟'' انگوری کے لہجے میں وحشت سی تھی۔

''راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بصورت دیگر اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے ہمیں کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنی پڑے گی۔'' میں نے کہا۔

ہم ایک بار پھر چل پڑے۔ خچر بھی تھک گیا تھا۔ اُس کے چلنے کی رفتار بھی بہت کم ہوگئی تھی۔ ایک جگہ ہم دونوں خچر سے اُتر آئے۔ میں نے خچر کی لگام پکڑ لی...... ہم پیدل چلتے رہے۔ ہم اپنا یہ سفر مزید ایک گھنٹے سے زیادہ جاری نہیں رکھ سکے۔

شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ پانی کے ایک جھرنے کے قریب ہمیں ایک مناسب جگہ بھی مل گئی جہاں رات گزاری جا سکتی تھی۔ وہ ایک کھوہ سی تھی جو چٹان میں پانچ چھ فٹ اندر کی طرف چلی گئی تھی۔ اُس کھوہ میں ہم ہوا سے بھی محفوظ رہ سکتے تھے۔

ہم نے وہیں رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اندھیرے میں ان چٹانوں میں سفر جاری رکھنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ کھانے والی پوٹلی میرے والے خچر کی زین کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ اگر وہ پوٹلی دوسرے خچر کے ساتھ ہوتی تو ہمیں بھوکے رہنا پڑتا۔ میں نے وہ پوٹلی اُتار لی اور خچر کو کھلا چھوڑ دیا۔

ہم نے جھرنے کے قریب بیٹھ کر کھانا کھایا، پھر میں نے اس کھوہ کا جائزہ لیا۔ اندر کافی کشادہ جگہ تھی۔ ایک طرف کونے میں جلی ہوئی لکڑیاں اور کوئلے بھی نظر آئے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کسی وقت یہاں کوئی ٹھہرا ہوگا۔

خچر کی لگام میں نے درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ کے ساتھ باندھ دی اور ہم دیر تک اُس کھوہ کے سامنے پتھروں پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ تیز ہوا کی وجہ سے سردی میں بھی اضافہ ہوگیا۔ ہم اُٹھ کر کھوہ

کے اندر آ گئے۔ میں دہانے کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ٹانگیں آگے کو پھیلا لیں۔ انگوری بھی میرے ساتھ ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

گہری تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دے رہا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے وحشت سی ہو رہی تھی۔ غار کے اندر اگرچہ تیز ہوا سے بچ گئے تھے مگر سردی بہرحال تھی۔ انگوری میرے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ اور پھر اُس نے اپنا سر میرے کندھے پر ٹکا دیا۔

انگوری سے میری ملاقات کوئی روز ہو چکے تھے اور اس وقت سے ہم ساتھ ہی رہ رہے تھے۔ شروع میں تو ہمارے درمیان باتوں میں بھی کچھ تکلف رہا تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ ہم غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں۔ جس طرح ہم دونوں نے ایک ہی خچر پر سفر کیا تھا اور جس طرح اب وہ میرے کندھے سے سر ٹکائے بیٹھی تھی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ انگوری بھی غیر محسوس انداز میں میرے اور اپنے بیچ فاصلہ کم کر رہی تھی۔

سردی بڑھ گئی تھی۔ ہوا سے بچنے کے لئے ہم غار کے آخری سرے پر چلے گئے۔ انگوری میرے ساتھ جڑی بیٹھی تھی۔ باتیں کرتے کرتے وہ سوگئی۔ اُس کا سر بار بار میرے کندھے سے ٹکرا رہا تھا۔ میں نے سہارا دے کر اُس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

دن بھر خچر کی سواری اور پیدل چلنے سے میں بھی بری طرح تھک گیا تھا۔ میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور میرا سر بھی بار بار سینے پر جھک رہا تھا۔ میں جاگتے رہنے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہ ہو سکا اور بالآخر میں بھی نیند کی وادی میں اُتر گیا۔

میری آنکھ کھلی تو میں گڑبڑا سا گیا۔ باہر دُھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اندر بھی روشنی ہو رہی تھی۔ انگوری اب بھی میری گود میں سر رکھے سو رہی تھی۔ اُس نے ٹانگیں اس طرح سمیٹ رکھی تھیں کہ گھٹنے پیٹ سے لگے ہوئے تھے۔ میرا ایک ہاتھ اُس کے سینے پر تھا اور انگوری کا ہاتھ میرے سر پر...... میں اس صورتحال پر گڑبڑا سا گیا۔ میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ ہٹانا چاہا تو انگوری نے اپنے ہاتھ سے میرا ہاتھ دبا لیا۔ وہ نیند میں تھی۔

''انگوری......'' میں نے ہولے سے اُسے پکارا۔ ''دن چڑھ آیا ہے۔ اب اُٹھ جاؤ!''

''اونہوں...... سونے دو نا! نیند آ رہی ہے۔'' وہ نیند ہی میں بڑبڑائی۔

''دن چڑھ آیا ہے...... اب اُٹھ جاؤ!'' میں نے کہا۔ ''ہم سارا دن اس ویرانے میں نہیں بیٹھ سکتے۔''

انگوری نے آنکھیں کھول دیں۔ اُس نے میرا ہاتھ اب بھی اپنے سینے پر دبا رکھا تھا۔ آنکھیں کھولنے کے بعد بھی دیر تک اُس کے دماغ پر نیند کا خمار طاری رہا۔ وہ خمار آلود سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ لیکن پھر حقیقت کا ادراک ہوتے ہی اُس نے میرا ہاتھ ہٹایا اور ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اوہ...... میں شاید گہری نیند سوگئی تھی۔'' وہ نظریں جھکائے ہوئے بولی۔ اُس کے چہرے

پر سرخی سی پھیل گئی تھی۔

میں چند لمحے اُس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر غار سے باہر آ گیا۔ دُھوپ خاصی تیز تھی۔ چند منٹ بعد انگوری بھی باہر آ گئی۔

''ارے...... خچر کہاں گیا؟'' وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔

میں اُچھل پڑا...... میں نے خچر کی عدم موجودگی کا خیال ہی نہیں کیا تھا۔ میں درخت کی اُس شاخ کی طرف دیکھنے لگا جس سے خچر کی لگام باندھی تھی۔ وہاں سے کچھ پتے ٹوٹے ہوئے تھے جس سے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ رات کو یا صبح کسی وقت خچر نے وہاں سے دُور ہٹنے کی کوشش کی ہوگی جس سے لگام اس شاخ سے نکل گئی ہو۔

میں خچر کو اِدھر اُدھر تلاش کرتا رہا مگر اُس کا کہیں نام و نشان نظر نہیں آیا۔ میرا خیال تھا وہ چٹانوں میں کہیں دُور نکل گیا تھا اور اب اُسے تلاش کرنا بیکار تھا۔ میں جھرنے کے قریب واپس آ گیا۔ انگوری اس وقت کچھ قد آدم جھاڑیوں سے باہر آ رہی تھی۔

ہم نے جھرنے کے قریب بیٹھ کر بچی ہوئی روٹی کھائی۔ جی بھر کے پانی پیا اور اپنی رائفلیں سنبھال کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ نہایت دُشوار راستہ تھا۔ چٹانوں پر اُترنے چڑھنے سے انگوری بری طرح ہانپ گئی تھی۔ اُس کی وجہ سے بار بار رُکنا پڑ رہا تھا۔

ایک موقع پر میں نے انگوری کا ہاتھ پکڑا تو چونک گیا...... اُس کا ہاتھ گرم ہو رہا تھا۔ میں نے اُس کی پیشانی کو چھو کر دیکھا۔

''تمہیں گرمی کی وجہ سے ایسا محسوس ہو رہا ہے...... میں ٹھیک ہوں۔'' انگوری نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

لیکن اُس کی یہ حرارت موسم کی گرمی کی وجہ سے نہیں تھی۔ رات کی سردی، اُس کے سینے کے زخم اور تھکن کی وجہ سے اُسے حرارت ہو گئی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ سورج سر پر چمک رہا تھا۔ انگوری نڈھال ہو رہی تھی۔ اب اُس کے لئے چلنا بھی دوبھر ہو رہا تھا......

ایک چھوٹی سی ندی کے قریب ہم رُک گئے۔ انگوری پانی کے چند گھونٹ پی کر ندی کے کنارے ہی گھاس پر لیٹ گئی اور میں اِدھر اُدھر پھر کر کوئی راستہ تلاش کرنے لگا مگر کوئی راستہ نہیں ملا۔

میں انگوری کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ بخار تیز ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری پریشانی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ انگوری ایک ہاتھ سے بار بار سینہ سہلا رہی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اُسے بخار بھی سینے کے اس زخم کی وجہ سے چڑھا تھا۔

''ایک بات کہوں انگوری...... برا تو نہیں مانو گی؟'' میں نے مدھم لہجے میں کہا۔

''کہو......!'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تمہیں بخار سینے کے زخم کی وجہ سے چڑھا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ انفیکشن نہ ہو گیا ہو۔ اگر تم

اجازت دو تو......'' میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی، پھر آنکھیں بند کر لیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر سینے پر رکھ لیا۔

میں نے بڑی آہستگی سے انگوری کی قمیض اُوپر اُٹھا دی۔ مجھ پر اس وقت عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی اور رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگی......

انگوری کے سینے پر دائیں طرف زخم تھا۔ زخم زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اس کے آس پاس کی جلد سرخ ہو رہی تھی۔ میں نے انگوری کی جیب سے مرہم کی ڈبیہ نکالی اور اُنگلی پر مرہم نکال کر اُس کے زخم پر لگانے لگا۔ میرا ہاتھ واضح طور پر کانپ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

انگوری نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہٹا دیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے فوراً ہی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے اُس کی قمیض نیچے کر دی اور اُس کے چہرے کو تکنے لگا۔

''تمہیں مناسب آرام اور علاج کی ضرورت ہے......'' میں نے کہا۔ ''دُعا کرو ہمیں ان پہاڑوں سے نکلنے کا راستہ مل جائے۔ کسی بستی میں پہنچ جائیں تو سب سے پہلے......''

''میرا علاج کراؤ گے۔'' انگوری نے میری بات مکمل کر دی۔

''ہاں......'' میں نے جواب دیا۔

ہم تقریباً آدھے گھنٹے تک وہاں رُکے اور ایک بار پھر آگے چلنے لگے۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ انگوری سے اب بالکل نہیں چلا جا رہا تھا۔ وہ بار بار لڑکھڑا رہی تھی۔ اب اُسے آگے لے جانے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ میں نے دونوں رائفلیں اپنے ایک کندھے پر لٹکا لیں اور انگوری کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔

''میری پشت پر بیٹھ جاؤ...... اب تم سے چلا نہیں جا رہا۔''

انگوری کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ انکار کرتی رہی مگر میں نے اُسے زبردستی اپنی پشت پر لاد لیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ میرے سینے پر لپیٹ لئے اور میں نے دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر اُسے سہارا دیئے رکھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم اُن چٹانوں سے نکل آئے۔ نیچے نشیب میں پھیلی ہوئی وادی میں ایک جگہ سے دُھویں کی لکیر اُٹھتی دیکھ کر میری آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ میں نے انگوری کو پشت سے نیچے اُتار دیا۔

''وہ دیکھو انگوری......'' میں نے اِشارہ کیا۔ ''وہ...... وہاں کوئی مکان ہے۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ بس چند منٹ رُک جاؤ...... پھر چلتے ہیں۔''

انگوری کے چہرے پر بھی رونق سی آ گئی تھی...... وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس

لینے لگی۔ میں بھی اُس کے قریب بیٹھ کر اپنے بے ضبط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

پندرہ بیس منٹ گزر گئے اور پھر اپنے عقب میں ایک غراتی ہوئی آواز سن کر ہم دونوں اُچھل پڑے......

"اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا...... ورنہ گولیوں سے بھون دیئے جاؤ گے۔"

مجھے سینے میں اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا...... میں نے کن انکھیوں سے انگوری کی طرف دیکھا اُس کا چہرہ سرسوں کے پھول کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اور پھر رائفل کی نال میری پشت کو چھونے لگی...... میں نے اپنی جگہ سے حرکت کئے بغیر دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا دیئے اور آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگا......

○○○

میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں......

اُس غراتی ہوئی آواز نے جس طرح مجھے ہینڈز اَپ کروایا تھا اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ بھارتی فوجی تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ ہم کسی بستی کے قرب و جوار میں تھے اور وہاں کوئی فوجی چوکی یا نیا کیمپ بھی تھا۔ اور یہ فوجی گشت کرتے ہوئے اس طرف آ گئے تھے۔

چند منٹ پہلے انگوری کو بٹھانے کے بعد میں نے اپنے کندھے پر لٹکی ہوئی دونوں رائفلیں بھی زمین پر رکھ دی تھیں اور رائفل تک ہاتھ بڑھانے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میرے لئے تو کوئی معمولی سی حرکت کرنا بھی خطرناک ہو سکتا تھا۔

رائفل کی نال گردن سے ہٹ کر اب میری پشت پر ٹک گئی تھی۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ میں اب بھی موت کے بھیانک جبڑوں میں تھا۔

دفعتہً ویرانہ فائر کی آواز سے گونج اُٹھا...... اور رائفل کی یہ گولی ہمارے پیچھے کئی گز کے فاصلے پر چلائی گئی تھی۔ پہاڑیوں میں دیر تک فائر کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ اس کے فوراً ہی بعد ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"میں نے فائر کرنے کو منع کیا تھا...... یہ گولی کس نے چلائی ہے؟"

لہجہ اور الفاظ سو فیصد کشمیری تھے۔ کوئی بھارتی فوجی اس طرح خالص کشمیری لہجے میں بات نہیں کر سکتا تھا۔

"غلطی سے ٹرائیگر دب گیا تھا......" جواب میں ایک اور آواز سنائی دی۔ یہ لہجہ بھی خالص کشمیری تھا۔

اب میں سمجھ گیا کہ یہ بھارتی فوجی نہیں تھے۔ جس نے فائر ہونے پر جواب طلبی کی تھی اُس شخص نے رائفل میری پشت سے لگا رکھی تھی۔ ایک لمحے کے لئے رائفل میری پشت سے ہٹ گئی اور اس طرح مجھے گردن گھما کر پیچھے دیکھنے کا موقع مل گیا۔

وہ درمیانے قد کا دُبلا پتلا سا آدمی تھا۔ سر کے بال بکھرے ہوئے اور شیو بڑھا ہوا تھا۔ آنکھوں میں سرخی تھی۔ اُس نے پرانی سی جینز اور میلی سی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کمر پر رائفل کی گولیوں سے بھرا ہوا بیلٹ تھا جس میں دو میگزین بھی اڑسے ہوئے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی جس کا رُخ میری طرف تھا۔

جس شخص نے انگوری کو رائفل کی زد پر لے رکھا تھا وہ قدرے دراز قامت اور بھاری بھرکم

آدمی تھا۔ اُس کی عمر بھی تیس سے زیادہ نہیں تھی۔

''تم لوگ کون ہو اور ہمیں اس طرح ......''

''پہلے تو ہم تم سے پوچھیں گے کہ تم لوگ کون ہو؟'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''اور ان پہاڑوں میں کس طرح پہنچے؟'' اُس نے میری طرف دیکھا اور پھر انگوری کی طرف دیکھنے لگا۔

انگوری کو میں نے پتھر سے ٹیک لگا کر بٹھایا تھا اور وہ پھسلتی ہوئی ذرا نیچے ہوگئی تھی۔ اُس نے مردانہ کپڑے پہن رکھے تھے اُس کا چہرہ بھی دوسری طرف تھا اس لئے وہ لوگ ابھی تک اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکے گی۔

''میرا نام شمروز ہے...... اور یہ میری ساتھی انگوری ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم کروڑ سے سنگرام کی طرف جا رہے تھے۔ وہاں سے سوپور سے ہوتے ہوئے ہندواڑہ کی طرف جانے کا ارادہ تھا۔ لیکن پہاڑوں میں راستہ بھٹک گئے۔''

''شمروز......'' اُس شخص کی آنکھوں میں اُلجھن سی تیر گئی۔ وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ''تم لوگ کروڑ میں ولی محمد کے پاس تو نہیں ٹھہرے ہوئے تھے کیا؟''

''ہاں ہاں......'' میں نے جلدی سے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''ہم ولی محمد کے پاس ہی تھے اور وہاں ہم نے ایک بھارتی ایجنٹ کو بھی ٹھکانے لگایا تھا جو......''

''جو بابا عبدالفتح کی شہادت کا ذمہ دار تھا۔'' وہ شخص بولا۔

''ہاں...... وہ مسلمان کے بھیس میں کئی مہینوں سے اُس گاؤں میں رہ کر مجاہدین کے خلاف جاسوسی کر رہا تھا اور بالآخر اپنے انجام کو پہنچ گیا۔'' میں نے جواب دیا۔

اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی۔ اُس نے اپنی رائفل ایک پتھر کے سہارے کھڑی کر دی اور دونوں بانہیں پھیلا دیں۔

''معاف کرنا دوست......'' وہ آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ''تمہارا نام تو پوری وادی میں گونج رہا ہے۔ تمہیں اگرچہ بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے لیکن سب نے تم سے بڑی اُمیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ چند روز پہلے کمانڈر محب اللہ سے تمہارے بارے میں سنا تھا۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج تم سے ملاقات ہوگئی۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اپنے اس رویئے پر معذرت کرتے ہوئے بولا۔

''بھارتی فوجی اور اُن کے ایجنٹ کشمیری مجاہدین کا بھیس بدل کر مجاہدین کے ٹھکانوں کا سراغ لگانے کے لئے پہاڑوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ ہم اُن لوگوں سے کچھ نقصان بھی اُٹھا چکے ہیں۔ اس لئے ہمیں محتاط رہنا پڑتا ہے۔''

اُس کا نام گل فراز تھا۔ وہ لوگ کل شام ہی کو کروڑ نامی اُس بستی سے ہو کر آئے تھے جہاں ہم نے رستم نامی مسلمان کے بھیس میں ہندو ایجنٹ کو ٹھکانے لگایا تھا۔ کروڑ میں ابھی تک سکون تھا۔ بھارتی فوجیوں کو ابھی تک اپنے ایجنٹ کے مارے جانے کی خبر نہیں پہنچی تھی۔

''میری ساتھی انگوری کو بہت تیز بخار ہے۔'' میں نے گل فراز کو بتایا۔ ''اس کے سینے پر معمولی سا زخم ہے جس کی وجہ سے بخار ہوگیا ہے۔ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اب اتفاق سے تم لوگوں سے ملاقات ہوگئی ہے۔ شاید تم لوگ ہماری کچھ مدد کر سکو۔''

''کیوں نہیں......'' گل فراز نے جواب دیا اور آگے بڑھ کر انگوری کی پیشانی چھو کر دیکھنے لگا۔ اور دوسرے ہی لمحے ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ ''بخار تو بہت تیز ہے...... میرے پاس اسپرین کی گولی ہے۔ فوری طور پر تو یہی دی جا سکتی ہے۔ اسے فوری طور پر بستی میں پہنچانا ہوگا۔''

''ہم نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا۔'' میں نے کہا۔ ''خالی پیٹ کوئی بھی دوا انگوری کے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔''

گل فراز نے ایک پوٹلی کھول کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ اُس میں تین چار موٹی موٹی روٹیاں تھیں۔

''انگوری بہن! تھوڑی سی روٹی کھا لو...... پھر یہ گولی کھا لینا۔'' اُس نے کہتے ہوئے قمیض کی جیب سے پیراسیٹامول کی گولیوں کا پتا نکال کر اُس میں سے ایک گولی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔

گل فراز کے ساتھی بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ وہ تعداد میں چار تھے اور ہماری طرح ان پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے ہندواڑہ کی طرف ہی جا رہے تھے۔ ایک آدمی نے پانی کی چھاگل بھی کندھے سے اُتار کر ہمارے قریب رکھ دی۔

انگوری دو تین نوالوں سے زیادہ نہیں کھا سکی تھی۔ میں نے اُسے گولی بھی کھلا دی اور روٹی کے دو چار نوالے خود بھی کھائے۔

گل فراز بتا رہا تھا کہ ہم سنگرام سے بہت دُور نکل چکے ہیں۔ اُس طرف جانا اب بیکار ہے۔ البتہ پازنل وہاں سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں انگوری کو طبی امداد بھی مل جائے گی اور ہم دو چار روز وہاں آرام بھی کر سکیں گے۔

انگوری سے اپنے پیروں پر کھڑے بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اُسے پھر پشت پر لاد لیا اور اس طرح ہمارا سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔ گل فراز اور اُس کا ایک ساتھی آگے تھا۔ اُن کے پیچھے میں اور دو آدمی ہمارے پیچھے تھے۔ ہماری رائفلیں بھی گل فراز ہی کے ایک آدمی نے اُٹھا رکھی تھیں۔ راستہ خاصا خطرناک اور آڑھا ترچھا تھا۔ ہم مسلسل نشیب کی طرف جا رہے تھے۔ کوئی معمولی سی غلطی ہمیں کسی حادثے سے دوچار کر سکتی تھی۔

ایک جگہ میں نے انگوری کو ایک پتھر پر بٹھا دیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ گل فراز نے پیشکش کی تھی کہ کچھ دُور تک وہ انگوری کو اپنے کندھے پر اُٹھا لیتا ہے لیکن انگوری نے نفی میں سر ہلا دیا۔

پندرہ منٹ بعد ہم ایک بار پھر چل پڑے۔ اس مرتبہ کچھ زیادہ فاصلہ طے کر لیا لیکن بالآخر

درختوں کے ایک جھنڈ میں رُک گئے۔ چند منٹ آرام کرنے کے بعد گل فراز اور اُس کے ساتھی درختوں سے موٹی اور باریک شاخیں توڑنے لگے۔ اُن درختوں کی پتلی شاخیں بہت لچک دار اور گھنے پتوں والی تھیں۔

گل فراز نے دو موٹی شاخیں تقریباً دو فٹ کے فاصلے پر ایک دوسرے کے متوازی زمین پر رکھ دیں اور پتلی اور لچکدار شاخوں سے باندھنے لگے۔ میں توجہ سے اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد آرام دہ سٹریچر تیار ہو چکا تھا۔ انگوری کو اُس سٹریچر پر لٹا دیا گیا۔ گل فراز کے دو ساتھیوں نے سٹریچر کو آگے پیچھے سے اُٹھایا اور ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

ہم مسلسل نشیب میں اُترتے ہوئے بالآخر ایک وادی میں پہنچ گئے جہاں بہت دُور ایک بستی دکھائی دے رہی تھی۔ بعض گھروں کی چمنیوں سے دُھواں بھی اُٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

گل فراز رُک گیا۔ سٹریچر بھی آہستگی سے نیچے رکھ دیا گیا۔ میں سٹریچر کے قریب بیٹھ گیا۔ انگوری کی پیشانی کو چھو کر دیکھا مجھے کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ پیشانی بدستور تپ رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں بھی بخار کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ میں انگوری سے باتیں کرتے ہوئے اُسے تسلیاں دیتا رہا۔ انگوری کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''تم میرے لئے بہت پریشان ہو؟'' اُس کے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے مدھم سی آواز نکلی۔

''فطری بات ہے...... مجھے تمہارے لئے پریشان ہونا ہی چاہئے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیوں......؟'' اُس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''اس لئے کہ تم کشمیر کی بیٹی ہو۔ اور تم نے اس دھرتی کی آن کے لئے اپنی جان و آبرو داؤ پر لگا رکھی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ......'' اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''صرف اس لئے کہ......''

''تمہارے لئے پریشان ہونے کی اور بھی بہت سی وجوہات ہیں۔'' میں نے کہتے ہوئے اُس کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر ہولے سے دبایا۔ ''پہلی بار جب میں نے تمہیں دیکھا تھا تو میرے سینے میں پہلی مرتبہ ایک عجیب سا احساس جاگ اُٹھا تھا۔ اور جب میں تمہاری بستی سے رُخصت ہوا تھا تو کچھ عجیب سی کیفیت طاری تھی مجھ پر...... اور اس کے بعد ہماری ملاقات عجیب حالات میں ہوئی تھی۔ تمہارے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ اب کوئی غاصب کشمیر کی کسی بیٹی کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکے گا۔'' میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اُس کے چہرے پر نظر جمائے ہوئے بات جاری رکھی۔

''جب میں تمہاری بستی سے رُخصت ہوا تو میرے ذہن میں صرف ایک بات تھی کہ شاید دوبارہ تمہیں نہ دیکھ سکوں۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم دوبارہ اس طرح ملیں گے کہ ہمیں موت ہی ایک دوسرے سے جدا کر سکے گی۔ اب تم سمجھ گئی ہو کہ میں تمہارے لئے پریشان

کیوں ہوں۔''

انگوری کی سرخ آنکھیں چمک اُٹھیں۔ چہرے پر رونق سی آ گئی۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اُس نے میرا ایک ہاتھ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور کچھ کہے بغیر میرے چہرے کو تکتی رہی۔

چند منٹ اور گزر گئے۔ گل فراز اور اُس کے ساتھ روانگی کی تیاری کرنے لگے۔ اس مرتبہ سٹریچر کو پچھلی طرف سے میں نے اُٹھا لیا۔ انگوری سٹریچر پر اس طرح لیٹی ہوئی تھی کہ اُس کا چہرہ میری طرف تھا اور میں اُس سے باتیں بھی کر رہا تھا۔

بستی سے دو فرلانگ دُور ہم گنجان درختوں میں رُک گئے۔ گل فراز کا ایک ساتھی درختوں میں چھپتا ہوا بستی کی طرف چلا گیا اور ہم سب اپنی اپنی رائفلیں اُٹھا کر مختلف جگہوں پر پوزیشن لے کر بیٹھ گئے۔

ہمارے سامنے پازل نام کی وہ بستی تھی جو میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ یہ بستی سوپور سے اٹھارہ بیس میل کے فاصلے پر تھی اور میں بچپن میں اپنے والد کے ساتھ کئی مرتبہ یہاں آ چکا تھا۔ نیلے پہاڑوں میں گھری ہوئی اس بستی کے چاروں طرف کی زمین بڑی زرخیز تھی۔ یہاں سیب اور خوبانی کے باغات تھے اور یہاں دنیا کا بہترین زعفران بھی پیدا ہوتا تھا۔ تھوڑی بہت گیہوں کی کاشت بھی ہوتی تھی البتہ چاول یہاں کی مرکزی فصل تھی اور یہ فصل سال میں دو مرتبہ حاصل کی جاتی تھی۔

پازل نام کی یہ بستی سوپور سے بارہ مولا کی طرف جانے والی شاہراہ سے تین چار میل ہٹ کر تھی۔ یوں تو کشمیر کی کوئی بھی بستی بھارتی فوجیوں کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہیں تھی لیکن پازل کے بارے میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ شاہراہ سے ہٹ کر ہونے کی وجہ سے بھارتی فوجیوں کی آمد کی خبر ہو جاتی تھی اور یہاں پناہ گزین مجاہدین کو بھارتی فوجیوں کے پہنچنے سے پہلے ہی بستی سے نکال کر پہاڑوں میں کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دیا جاتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا ایک مرتبہ چند مجاہدین نے اس بستی میں پناہ لے رکھی تھی۔ بستی سے تین میل دُور سڑک کی نگرانی کے لئے دو آدمی بٹھا دیئے گئے تھے۔ اُن کے پاس موٹر سائیکل تھی۔ وہ جس جگہ بیٹھے تھے وہاں سے دوسری طرف دُور تک سڑک کو دیکھ سکتے تھے۔ اس طرف سے کوئی فوجی گاڑی آتے دیکھ کر وہ موٹر سائیکل پر بستی میں پہنچ کر اطلاع دے دیتے۔ لیکن نجانے کیا ہوا کہ وہ دونوں پکڑے گئے تھے اور فوج کے دستے نے بستی پر ہلہ بول دیا تھا......

فوج کے اس طرح اچانک سر پر پہنچ جانے سے بستی والے اور بستی میں چھپے ہوئے مجاہدین گھبرا گئے تھے۔ اُنہوں نے بستی سے نکل جانے کی کوشش کی مگر وہ فوجی دستے کے گھیرے میں آ چکے تھے۔

خون کے پیاسے بھارتی فوجیوں نے نہ صرف اُن مجاہدین کو گھیرے میں لے کر گولیوں سے

بھون ڈالا بلکہ بستی کو بھی جلا کر راکھ کر دیا۔ بستی کے سات آدمی شہید ہوئے تھے اور درجنوں زخمی۔

اس وقت نظر آنے والی بستی اگرچہ پرسکون تھی۔ کسی گڑبڑ کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر گل فراز احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور اُس نے اپنے ایک ساتھی کو صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے بستی کی طرف بھیج دیا۔

اُس کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ اُنہوں نے بڑی گرمجوشی سے ہم سب سے ہاتھ ملایا۔ اُن کی اطلاع کے مطابق کئی روز سے سکون تھا اور کسی بھارتی فوجی نے ادھر کا رُخ نہیں کیا تھا۔ اُنہی دونوں آدمیوں نے انگوری کا سٹریچر اُٹھا لیا اور ہم لوگ درختوں کے جھنڈ سے نکل کر بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔

بستی کے کئی مکان اب بھی خاکستر ملبے کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ یہ اُن غریب کاشتکاروں کے مکان تھے جو انہیں دوبارہ تعمیر کرانے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ وادی کی معیشت تباہ ہو چکی تھی۔ شہروں میں ہر قسم کا کاروبار ٹھپ ہو گیا تھا۔ کھیتی باڑی بھی تباہ ہو چکی تھی۔ بعض علاقوں میں بھارتی فوجی کھڑی فصلیں تباہ کر جاتے تھے۔ کسان بھی بدحالی کا شکار تھے۔ اُن کے پاس پیٹ بھر کر کھانے کو اناج تک نہیں تھا نئے مکان کیسے تعمیر کرتے؟ وہ لوگ یا تو جھونپڑوں میں وقت گزار رہے تھے یا دوسروں کے گھروں میں پڑے ہوئے تھے۔

ہمیں غلام دین نامی ایک شخص کے گھر میں پہنچا دیا گیا۔ ہماری آمد کی خبر آناً فاناً پوری بستی میں پھیل گئی۔ یہاں چند دلچسپ انکشافات بھی ہوئے۔ بستی کے لوگوں کو یہ پتہ چل گیا کہ میں سوپور کے مولوی رسول بخش لون کا بیٹا ہوں۔ اور دوسرا دلچسپ انکشاف یہ ہوا کہ بستی کے لوگ میرے اور انگوری کے کارناموں سے بھی واقف تھے۔ اس حوالے سے بھی وہ ہمیں دیکھنے کے لئے آ رہے تھے۔

غلام دین اُس بستی کا سب سے معتبر آدمی تھا۔ میرے والد کی طرح وہ بھی مجاہدین کی مالی اور اخلاقی امداد کرتا رہتا تھا۔ یوں تو بستی کے سب ہی لوگ مجاہدین کے ہمدرد تھے مگر مجاہدین کی کوئی پارٹی جب بھی اس طرف آتی، اُن کا قیام خواہ بستی کے کسی بھی گھر میں ہوتا وہ مہمان غلام دین ہی کے ہوتے تھے۔

انگوری کی حالت دیکھ کر غلام دین نے فوراً ہی ایک آدمی کو ڈاکٹر کو بلانے کے لئے بھیج دیا۔

سیف اللہ کئی سال پہلے سرینگر کے ایک سرکاری ہسپتال میں کمپاؤنڈر تھا۔ اُس نے نوکری چھوڑ دی اور گاؤں واپس آ گیا۔ یہاں اُس کی تھوڑی بہت آبائی زمین تھی جو اُس نے غلام دین کو دے رکھی تھی۔ غلام دین اُسے تھوڑا بہت حصہ دے دیتا تھا۔

سیف اللہ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اُس نے گاؤں میں اپنے مکان کے ایک حصے میں چھوٹا سا کلینک کھول لیا تھا۔ وہ بہت جلد ڈاکٹر کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اُس کی وجہ سے گاؤں کے لوگوں کو علاج معالجے کے سلسلے میں بڑی سہولتیں حاصل ہو گئی تھیں۔ سیف اللہ نے کئی سال تک

ہسپتال میں کام کیا تھا۔ ڈاکٹر نہ ہونے کے باوجود اُسے ڈاکٹروں سے زیادہ تجربہ تھا۔

سیف اللہ کو اطلاع مل چکی تھی کہ بستی میں آنے والے مجاہدین کے ساتھ ایک زخمی بھی ہے۔ اطلاع ملتے ہی وہ اپنا تھیلا اُٹھا کر یہاں آنے کے لئے چل پڑا تھا۔ غلام دین کے بھیجے ہوئے آدمی سے اُس کی ملاقات راستے ہی میں ہو گئی تھی۔

اُس نے تمام لوگوں کو کمرے سے نکال دیا اور انگوری کا معائنہ کرنے لگا۔ میں اُس کے ساتھ کمرے ہی میں موجود تھا۔ انگوری کا ٹمپریچر دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں تشویش اُبھر آئی تھی۔ تھیلے میں سے انجکشن نکال کر تیار کرنے لگا۔ انگوری بے چین سی ہو گئی۔

''بالکل تکلیف نہیں ہو گی۔'' سیف اللہ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''انجکشن لگانا ضروری ہے۔ اگر بخار دماغ کو چڑھ گیا تو معاملہ سنگین ہو جائے گا۔''

انگوری نے آنکھیں بند کر لیں۔ بازو میں سوئی چبھی تو اُس کے منہ سے سسکاری سی نکل گئی۔

''اس کے سینے پر ایک زخم ہے۔'' میں نے انجکشن لگنے کے بعد سیف اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''زخم اگرچہ معمولی سا ہے لیکن میرا خیال ہے انفیکشن ہو گیا ہے اور بخار اسی وجہ سے چڑھا ہے۔''

سیف اللہ زخم دیکھنا چاہتا تھا اور انگوری ہچکچا رہی تھی۔

''ایک کہاوت ہے کہ ڈاکٹر اور وکیل سے کچھ چھپانا اپنے لئے ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔'' سیف اللہ نے کہا۔

اُس نے بڑے سلیقے سے اپنی بات کی وضاحت کر دی تھی۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے خود ہی اپنی قمیض اُوپر اُٹھا دی۔

ڈاکٹر سیف اللہ نے جھک کر زخم کا معائنہ کیا اور پھر تھیلے میں سے ایک ٹیوب نکال کر زخم اسپرٹ سے صاف کرنے کے بعد کریم لگا کر بینڈیج لگا دی۔ سپرٹ لگنے سے شدید قسم کی جلن ہوئی تھی اور انگوری نے سختی سے دانت بھینچ لئے تھے۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے......'' ڈاکٹر نے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔

''دو چار دن آرام کرے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ کریم دن میں دو مرتبہ لگانی ہے۔ اور یہ گولیاں......'' اُس نے تھیلے میں سے ایک پلسٹر اسٹرپ نکال لیا۔ ''شاید اس کے لئے بچی رہ گئی تھی۔ چند ہفتے پہلے کسی کے پاس پاکستان سے کچھ دوائیں آئی تھیں۔ جن میں سے کچھ مجھے مل گئی تھیں۔ اور یہ گولیاں اتفاق سے بچی رہ گئی تھیں۔ ان میں ایک گولی اور بخار کے لئے میں رات بھیج دوں گا۔ ویسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج رات ہی کو بخار اُتر جائے گا۔''

میں نے ٹیوب اور گولیوں کا پتا لے لیا۔ اُس میں Stresstabs نام کی چھ سو ایم جی کی چھ گولیاں تھیں۔ چار اس سے پہلے استعمال ہو چکی تھیں۔ یہ گولیاں عام بیماری سے پیدا ہونے والی کمزوری، انفیکشن اور سرجری کے علاج کے دوران استعمال کے لئے بہترین تھیں۔

ڈاکٹر سیف اللہ کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد انگوری سو گئی۔ یہ شاید انجکشن کا اثر تھا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ بستی کے لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ لوگ مجھے اور انگوری کو دیکھنے کے لئے آ رہے تھے۔ انگوری کے پاس کسی کو نہیں جانے دیا گیا البتہ میں بستی کے لوگوں سے ملاقاتیں کرتا رہا۔

گل فراز اور اُس کے ساتھی اگلے روز سہ پہر کے قریب بستی سے چلے گئے۔ مجھے اور انگوری کو اس وقت تک یہاں رہنا تھا جب تک وہ مکمل طور پر صحت یاب نہ ہو جاتی۔ اور ڈاکٹر سیف اللہ نے بتایا تھا کہ ہمیں کم از کم پندرہ دن یہاں رُکنا پڑے گا۔ گل فراز نے بستی سے روانہ ہونے سے پہلے مجھے کہہ دیا تھا کہ میں جب بھی ہندواڑہ پہنچوں وہاں شرافت حسین نامی ایک دُکاندار سے ضرور مل لوں۔

پہلے تین چار دن تو انگوری کی حالت تشویش ناک رہی۔ بخار کبھی ہلکا ہو جاتا اور کبھی تیز۔ ڈاکٹر سیف اللہ دن میں دو تین بار اُسے دیکھنے کے لئے ضرور آتا۔ شروع کی تین راتیں تو اُس نے بھی میرے ساتھ انگوری کے پاس بیٹھ کر گزاری تھیں۔ اُسے بھی خاصی تشویش تھی۔ وہ اپنے وسائل کے مطابق انگوری کا علاج کر رہا تھا۔ اُس نے دو مرتبہ دوا بدلی تھی۔ اور بالآخر پانچویں روز انگوری کی طبیعت سنبھلنا شروع ہوئی۔ اب تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ انگوری کا چارج اب گھر کی عورتوں نے سنبھال لیا تھا جس سے میری پریشانی بھی کچھ کم ہو گئی تھی۔

اور پھر اُس روز بستی کے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ دو فوجی ٹرک بستی کی طرف آ رہے ہیں..... بستی والوں کے پاس اتنا اسلحہ نہیں تھا کہ بھارتی فوجیوں کا مقابلہ کر سکتے۔ چند لوگوں کے پاس تھری ناٹ تھری کی فرسودہ سی رائفلیں تھیں لیکن ظاہر ہے کہ ان چند دقیانوسی رائفلوں سے جدید ترین سب مشین گنوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بھارتی فوجی یا تو مجاہدین کی موجودگی کی اطلاع پر کسی بستی پر ہلہ بولتے تھے یا اسلحہ کی تلاش کے بہانے گھروں کا قیمتی سامان لوٹ لے جاتے اور عورتوں کے ساتھ بدتمیزی کرتے۔ موقع ملتا تو کسی جوان لڑکی کو بھی اُٹھا لے جانے کی کوشش کرتے جس سے بستی والوں کی طرف سے مزاحمت ہوتی اور اس طرح یہ بھارتی سورما نہتے لوگوں پر فائر کھول دیتے اور بستی کے گھروں کو آگ لگا دیتے۔

ٹرکوں کے بارے میں اطلاع ملتے ہی بستی والے سرگرم عمل ہو گئے۔ مجھے اور بستی کے پانچ چھ نوعمر اور جوان لڑکوں کو بستی سے تقریباً پانچ سو گز دُور چٹانوں میں ایک محفوظ جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ کسی بستی میں رہنے والے نوعمر اور جوان لڑکے بھی بھارتی فوجیوں کی آنکھوں میں کھٹکتے تھے۔ اُنہیں اُگروادی (باغی) کہہ کر پکڑ لیا جاتا اور کیمپوں میں لے جا کر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔

میری اور انگوری کی رائفل بھی میرے حوالے کر دی گئی تھی۔ بستی والوں نے اپنی دقیانوسی تھری ناٹ تھری کی رائفلیں بھی اپنے لڑکوں کے حوالے کر دی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ بستی والے

اب کوئی ہنگامہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میرے ساتھ اُنہوں نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ بھارتی فوجیوں نے اگر صرف تلاشی لینے پر ہی اکتفا کیا تو وہ مزاحمت نہیں کریں گے۔ اور اگر بات اس سے آگے بڑھی تو وہ فائر کر کے ہمیں سگنل دے دیں گے۔ اور اس کے بعد جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

ہم جہاں چھپے ہوئے تھے وہاں سے بستی صاف نظر آ رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد دو فوجی ٹرک بستی کی طرف آتے ہوئے نظر آئے..... ایک ٹرک بستی کے باہر ہی رُک گیا۔ اُس ٹرک کے فوجیوں نے نیچے اُتر کر پوزیشن سنبھال لی تھی۔ اُن کی سب مشین گنوں کا رُخ بستی کی طرف تھا۔ ٹرک پر دو لائٹ مشین گنیں بھی نصب تھیں اور دونوں گنرز الرٹ نظر آ رہے تھے۔ دوسرا ٹرک بستی میں جا کر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میں رائفل سنبھالے چٹان سے ٹیک لگائے بیٹھا بستی کی طرف دیکھتا رہا۔

میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ تین دن پہلے یہ اطلاع ملی تھی کہ بھارتی فوجیوں کو کروٹر نامی بستی میں اپنے ایجنٹ چندر پال عرف رستم اور بستی سے پانچ میل دُور پہاڑوں میں بابا عبدالفتح کے خفیہ ٹھکانے پر چار فوجیوں کے مارے جانے کی اطلاع مل چکی تھی۔ فوج کا ایک دستہ اُس بستی میں پہنچ گیا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر اُنہوں نے بستی والوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ لیکن اس سے اگلے روز اُنہیں کسی طرح سے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ بستی میں چندر پال اور پہاڑوں میں چار فوجیوں کے قتل کا ذمہ دار شمروز (یعنی میں) ہے۔ فوجی اگلے روز بستی کے ایک نوجوان کو پکڑ کر لے گئے تھے جہاں کیمپ میں تشدد کر کے اُس سے یہ اُگلوا لیا تھا کہ شمروز اور انگوری ہندواڑہ کی طرف گئے ہیں۔ بعد میں اُس نوجوان کو چھوڑ دیا گیا تھا جو شدید زخمی حالت میں کسی نہ کسی طرح بستی تک تو پہنچ گیا لیکن زخموں سے جانبر نہ ہو سکا اور اُسی شام اُس کا انتقال ہو گیا......

میں سوچ رہا تھا کہ فوجیوں کو شاید یہ اطلاع ملی ہو گی کہ میں اور انگوری یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ انگوری بستی میں تھی اور مجھے اس کی فکر تھی۔ دو گھنٹے گزر گئے بستی کی کسی گلی میں جو ہمیں نظر آ رہی تھی، فوجیوں کی سرگرمیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے علاوہ کوئی غیر معمولی بات اور افراتفری نظر نہیں آئی۔

ایک گھنٹہ اور گزر گیا اور پھر بستی والا ٹرک بھی واپس آتا ہوا دکھائی دیا۔ باہر کھڑے ہوئے فوجی بھی اپنے ٹرک میں سوار ہو گئے اور وہ دونوں ٹرک تیز رفتاری سے ہائی وے کی طرف چلے گئے۔ ٹرکوں کے جانے کے بعد بھی ہم اپنی کمین گاہ میں دبکے رہے۔ اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد بستی کے ایک آدمی نے وہاں آ کر خطرہ ٹل جانے کی اطلاع دی اور ہم چٹانوں سے نکل کر بستی میں آ گئے۔

اُن بھارتی فوجیوں کو اسلحے کی تلاش تھی۔ بعض گھروں کی تلاشی لیتے ہوئے اُنہوں نے توڑ پھوڑ بھی کی تھی۔ مظلوم کشمیری مسلمانوں کو وہ اپنا زرخرید غلام سمجھتے تھے۔ اُن کے ساتھ بدتمیزی

اور حقارت سے پیش آنا معمول کی بات تھی اور بیچارے کشمیری اچھے دنوں کی اُمید پر یہ سب کچھ برداشت کر رہے تھے۔ آج بھی اس بستی کے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا گیا تھا اور وہ برداشت کر گئے تھے۔

میں غلام دین کے گھر میں داخل ہو کر انگوری والے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہاں دو تین عورتیں اور بھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر دو عورتیں باہر چلی گئیں جبکہ ایک عورت چارپائی کی پٹی پر بیٹھی رہی۔ میں لکڑی کے تختوں والی ایک سالخوردہ سی کرسی گھسیٹ کر چارپائی کے سامنے بیٹھ گیا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے انگوری کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

''کوئی پرابلم؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے انگوری کی طرف دیکھا۔

''نہیں..... '' اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''دو فوجی اس کمرے میں بھی آئے تھے۔ الماریوں کا سامان پھیلا کر چلے گئے۔'' اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں نے پہلی مرتبہ بائیں طرف دیکھا وہاں دیوار میں دو ہضمی الماریاں بنی ہوئی تھیں جن میں کپڑے وغیرہ تھے جو اب سنبھال لئے گئے تھے۔

''اس کے علاوہ..... '' انگوری نے بات جاری رکھی۔ ''اُنہوں نے مجھے بھی چارپائی سے اُٹھا دیا تھا اور بستر کا گدا وغیرہ اُٹھا کر دیکھا تھا کہ یہاں میں نے کوئی مشین گن وغیرہ تو نہیں چھپا رکھی؟''

ہم باتیں کر رہے تھے کہ غلام دین بھی آ گیا اور ہم بھارتی فوجیوں کی اس کارروائی پر تبصرہ کرنے لگے۔

پندرہ دن گزر گئے..... ڈاکٹر سیف اللہ کی توجہ سے انگوری کے سینے کا زخم ٹھیک ہو چکا تھا۔ اب بخار بھی بالکل نہیں تھا۔ لیکن کمزوری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ انگوری سہارے کے بغیر چند قدم سے زیادہ نہیں چل سکتی تھی۔ ہمیں ایک ہفتہ مزید پانزل ہی میں گزارنا پڑا۔ اس دوران اِدھر اُدھر کی کچھ اطلاعات ملتی رہی تھیں۔ ایک اہم اطلاع یہ تھی کہ کمانڈر محب اللہ اور کمانڈر رشید نے مشترکہ طور پر کارروائی کرتے ہوئے سرینگر کے قریب بڈگام کے ایک بڑے فوجی کیمپ پر حملہ کر کے اُسے تباہ کر دیا تھا۔ اس کارروائی میں چھ مجاہدین شہید ہوئے تھے جبکہ ایک کرنل اور ایک میجر سمیت بیس بھارتی فوجی جہنم کا ایندھن بنے تھے۔

ہمیں پانزل میں آئے ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہونے والا تھا۔ میں بیکار پڑے پڑے اُکتا گیا تھا۔ انگوری بھی اب بالکل ٹھیک تھی اور اب ہم وہاں سے جانا چاہتے تھے۔

ہم نے غلام دین اور بستی کے دوسرے لوگوں کی مہمان نوازی اور محبتوں کا شکریہ ادا کیا اور اگلے روز صبح سویرے بستی سے رخصت ہو گئے۔ اُس وقت دن کا اُجالا بھی نہیں پھیلا تھا۔ سرمئی دھندلکا تھا۔ بستی سے نکل کر خوبانیوں والے باغ سے ہوتے ہوئے ہم پہاڑیوں کی طرف جا رہے تھے جہاں سے ایک راستہ سوپور کی طرف نکلتا تھا۔

یہ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا، ٹریک سا تھا۔ اُس راستے پر صرف خچر ہی چل سکتے تھے یا جن لوگوں کے پاس موٹر سائیکل ہوتی وہ شارٹ کٹ کے خیال سے یہ راستہ اختیار کرتے۔

لڑکپن میں کئی مرتبہ پانزل اور سوپور کے درمیان سفر کر چکا تھا۔ ان پہاڑیوں کے راستوں سے تو میں اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح واقف تھا اس لئے یہاں بھول جانے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا اور اسی لئے میں اصل راستہ چھوڑ کر پہاڑیوں میں تنگ سی پگڈنڈیوں پر چل رہا تھا۔ انگوری بھی میرے ساتھ چل رہی تھی۔ کسی وقت وہ پیچھے رہ جاتی تو مجھے تھوڑی دیر کے لئے رُک جانا پڑتا۔

دن کی روشنی پھیل رہی تھی اور پھر دُھوپ بھی نکل آئی۔ دُھوپ کی وجہ سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی کیونکہ ان پہاڑیوں پر چنار، چیڑ اور دوسرے درختوں کی بہتات تھی۔ سوپور کا فاصلہ اٹھارہ میل سے زیادہ نہیں تھا اور میرا خیال تھا کہ ہم دوپہر تک وہاں پہنچ جائیں گے۔

ہم نے دُھوپ تیز ہونے تک خاصا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ انگوری تھک کر ایک چھوٹی سی ندی کے قریب بیٹھ گئی۔ اُس نے چند گھونٹ پانی پیا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے بڑے زور کی۔''

''کیا.....؟'' میں نے اُسے گھورا۔ روانہ ہونے سے پہلے تم نے دو روٹیاں کھائی تھیں۔

''وہ ہضم ہو گئیں۔'' انگوری مسکرائی۔ ''پوٹلی کھولو..... کچھ کھائے بغیر میں آگے نہیں جا سکتی۔''

میں اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ انگوری کے لئے تھوڑی دیر آرام کر لینا بھی ضروری تھا۔ وہ طویل بیماری سے اُٹھی تھی اور پہاڑیوں میں مسلسل چلتے رہنے سے اُس کی طبیعت دوبارہ خراب ہو سکتی تھی۔

میں نے پوٹلی کھول لی۔ چار موٹی موٹی روٹیاں اور اُن کے ساتھ بھیڑ کے گوشت کے تلے ہوئے قتلے تھے۔ ہم نے ایک ایک روٹی کھائی، کچھ گوشت بھی بچا لیا۔ میں نے پوٹلی باندھ کر رائفل کی نال پر لٹکا لی اور اس طرح تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم دوبارہ چل پڑے۔

ٹھہر ٹھہر کر چلتے ہوئے دو بجے کے قریب ہمیں ایک بار پھر رُک جانا پڑا۔ یہاں پر ایک چشمے کے قریب بیٹھ کر ہم نے بچی ہوئی روٹی کھائی۔ جس جگہ ہم بیٹھے تھے وہاں سے دو فرلانگ آگے بارہ مولا کو ہندواڑہ سے ملانے والی ہائی وے تھی اور اُس ہائی وے کے دوسری طرف کچھ ہی فاصلے پر میرا قصبہ سوپور تھا۔

اُس ہائی وے پر اُن دونوں شہروں کے درمیان بسوں اور جیپوں کا ٹریفک جاری رہتا تھا اور فوجی گاڑیاں بھی گشت کرتی رہتی تھیں۔ ہم تازہ دم ہو کر چٹانوں میں چلتے ہوئے ہائی وے کے قریب آ گئے۔ اس طرح ایک فوجی ٹرک اور جیپ تیز رفتاری سے گزرتے ہوئے نظر آئے۔ میرا دل تو چاہا کہ فائر کھول دُوں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ ہم محض دو رائفلوں سے اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے البتہ یہ ضرور ہوتا کہ ہم اُن درندوں کے گھیرے میں آ جاتے اور وہ ہمیں گولیوں سے چھلنی کر دیتے۔

جیپ اور ٹرک کافی دُور نکل جانے کے بعد میں نے ایک بار پھر محتاط نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا اور چٹانوں سے نکل کر تیزی سے دوڑتے ہوئے سڑک پار کر کے دوسری طرف کی چٹانوں میں پہنچ گئے اور تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے چلنے لگے۔

اس طرف چھوٹی پہاڑیاں تھیں جو سبزے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ میں نے انگوری کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ پہاڑیوں پر چنار کے درختوں کے نیچے پہنچ کر ہم رُک گئے اور دوسری طرف دیکھتے ہی میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا......

نشیب میں تقریباً دو میل کے فاصلے پر میرا گاؤں تھا...... سوپور کے قصبے میں جگہ جگہ سے سیاہ دُھویں کے بادل اُٹھ رہے تھے......

سوپور جل رہا تھا...... میرا گاؤں جل رہا تھا...... میرا کشمیر جل رہا تھا......!

○

میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے لڑکھڑا گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے اِردگرد پہاڑیاں اور چنار و چیڑ کے درخت بڑی تیزی سے گردش کر رہے ہوں۔ انگوری نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک پتھر پر بٹھا دیا۔ میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ انگوری میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

کئی منٹ بعد میرے حواس بحال ہو سکے تھے۔ اور پھر فضا میں گرر گرر کی آواز سن کر میں چونک گیا اور سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ انگوری بھی متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''وہ...... وہ دیکھو......'' اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا جس جگہ سے ہم نے سڑک پار کی تھی۔ وہاں سے تقریباً دو میل آگے ایک ذیلی سڑک ہمارے قصبے کی طرف مُڑتی تھی اور اُس سڑک پر چار فوجی ٹرک اور دو جیپیں نظر آ رہی تھیں۔ اُن کا رُخ قصبے سے ہائی وے کی طرف تھا جس کا مطلب تھا کہ وحشی درندے سوپور میں اپنی کارروائی مکمل کرنے کے بعد واپس جا رہے تھے۔ چند منٹ بعد جیپیں اور ٹرک چٹانوں کے پیچھے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے مگر فضا میں گرر گرر کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔

''وحشی بھیڑیے......'' میرے منہ سے غراہٹ سی نکلی۔ میری مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔

انگوری نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیئے اور پھر اُس کے ہاتھ پھسلتے ہوئے میری بانہوں میں آ گئے۔ میں نے جھکا ہوا سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں نم آلود تھیں۔

''حوصلہ رکھو شمروز!'' وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ''آج پوری وادی میں ہمارے بہن بھائی، بزرگ اور بچے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ لیکن وہ دن ضرور آئے گا جب ہم ان غاصبوں کو وادی سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اور مجھے یقین ہے وہ دن بہت جلد آئے گا۔''

''انشاء اللہ......'' میں کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور قصبے کی طرف دیکھنے لگا۔ کئی جگہوں سے سیاہ دُھواں اُٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اُن شیطانوں نے جی بھر کے تباہی مچائی تھی۔ پچھلے چند مہینوں کے دوران سوپور دوسری مرتبہ اہنسا کے پجاریوں کے ہاتھوں تباہی و بربادی کا نشانہ بنا تھا...... میں نے فوجی ٹرکوں کو واپس جاتے ہوئے دیکھا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ ان وحشیوں نے صبح سویرے قصبے پر ہلہ بولا ہوگا اور اب اپنی کارروائی مکمل کرنے کے بعد واپس جا رہے تھے۔

میں انگوری کا ہاتھ پکڑ کر نشیب میں اُترنے لگا۔ میرا خیال ہے ہم نے ڈھائی تین سو گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا۔ اس وقت ہم چند بڑے بڑے پتھروں کی آڑ میں تھے۔ ان کے اوپر سے گھوم کر جیسے ہی دوسری طرف پہنچے ایک طرف سے چھوٹے چھوٹے پتھر لڑھکنے کی آواز سنائی دی...... میں نے اس طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اُچھل پڑا۔ ایک آدمی دوڑتا ہوا چٹانوں کے پیچھے غائب ہو گیا تھا...... میں نے اُس کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔

میں نے انگوری کو وہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور اُس طرف دوڑ لگا دی۔ چٹان کے دوسری طرف وہ آدمی نظر آ گیا جو قد آدم پودوں میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''رُک جاؤ...... ورنہ گولی مار دُوں گا۔'' میں اُس کے پیچھے دوڑتا ہوا چیخا۔ اُس شخص کے بارے میں میرا پہلا خیال یہ تھا کہ شاید وہ بھارتی فوج کا کوئی مخبر ہوگا جس نے قصبے میں مجاہدین کی موجودگی کی اطلاع دی ہوگی اور اب یہاں چھپا اپنی فراہم کردہ اطلاع کا نتیجہ دیکھ رہا تھا۔

میں ایک بار پھر چیخا تو وہ شخص رُک گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ گردن پر رکھ لئے۔ میں رائفل تانے اُس کے پیچھے پہنچ گیا۔

''کون ہو تم؟'' میں نے غراتے ہوئے کہا۔ میری طرف گھوم جاؤ! اور اگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو بھون کے رکھ دُوں گا۔''

وہ شخص آہستہ آہستہ میری طرف گھوم گیا...... اُس کا چہرہ دیکھتے ہی میں اُچھل پڑا...... وہ ہمارے قصبے کا ادھیڑ عمر موچی برکت علی تھا۔ یوں تو قصبے میں تین چار موچی تھے مگر برکت علی ہمارے محلے کا تھا اس لئے میں اُسے پہچان گیا۔

''چاچا تم......؟'' میرے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''اوہ......!'' برکت علی کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ میں تو سمجھا تھا کہ وہ خونخوار بھیڑیئے اس طرف بھی آ گئے ہیں۔ آؤ...... میرے ساتھ آؤ!''

برکت علی کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں تھا۔ میں نے رائفل نیچے کر لی۔ دو منٹ بعد انگوری بھی اس طرف آ گئی۔ وہ بھی اُلجھی ہوئی نظروں سے چاچا برکت علی کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہے چاچا...... اور تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے برکت علی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو کہ سب کیا ہو رہا ہے...... اور یہ سلسلہ تو اُس وقت تک چلتا رہے گا جب تک وادی کو ان غاصب ہندوؤں کے ناپاک وجود سے صاف نہ کر دیا جائے۔'' چاچا برکت علی کہہ رہا تھا۔ ''آج صبح فجر کی اذان کے فوراً ہی بعد تین چار ٹرک دندناتے ہوئے قصبے میں آ گئے اور لاتعداد فوجیوں نے فائرنگ کرتے ہوئے گھروں پر ہلہ بول دیا۔ قیامت صغریٰ کا ساماں تھا...... گھروں کو آگ لگائی جا رہی تھی۔ عورتیں اور بچے چیختے چلاتے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ میں نے کچھ عورتوں اور بچوں کو عمر دین کے گھر میں جمع کر لیا اور تھوڑی ہی دیر بعد کچھ اور لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے۔ قصبے کا وہ حصہ ابھی کسی حد تک محفوظ تھا۔ ہم عورتوں، بچوں اور چند بوڑھوں کو لے کر قصبے سے نکل آئے اور باغ میں سے ہوتے ہوئے ان پہاڑیوں میں آ گئے اور اس طرف ایک غار میں پناہ لی۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''میں ابھی یہی دیکھنے کے لئے غار سے نکلا تھا کہ وہ شیطان واپس چلے گئے یا نہیں؟ اِس طرف تم لوگوں کی باتیں سن کر میں سمجھا تھا کہ شاید وہ درندے ہماری تلاش میں اس طرف آ گئے ہیں۔ میں اپنے ساتھیوں کو اطلاع دینے کے لئے بھاگا تھا۔''

''کہاں ہیں وہ لوگ؟'' میں نے پوچھا۔

''اُس طرف ایک غار میں۔'' اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''میرے ساتھ آؤ......''

ہم اُس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے اور بالآخر ایک غار میں داخل ہو گئے۔ وہاں بیس بائیس ادھیڑ عمر اور جوان عورتیں تھیں۔ دس بارہ بچے اور پانچ چھ ادھیڑ عمر آدمی تھے۔ وہ سب مجھے پہچانتے تھے۔ کئی عورتیں مجھ سے لپٹ لپٹ کر رونے لگیں۔ میں بھی آنسو ضبط نہ کر سکا۔ انگوری بھی رو رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم اُن عورتوں اور بچوں کو لے کر غار سے روانہ ہو گئے اور قصبے تک پہنچنے میں بھی ہمیں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ قصبے کی حالت دیکھ کر میں کانپ اُٹھا...... آدھے سے زیادہ مکانات تباہ کر دیئے گئے تھے۔ کئی مکانوں سے اب بھی دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ ہر طرف تباہی و بربادی کے آثار بکھرے ہوئے تھے۔ بھارتی درندہ صفت فوجیوں کی وحشیانہ فائرنگ سے بارہ افراد شہید ہوئے تھے۔ اُن میں دو بچے اور تین عورتیں بھی شامل تھیں جبکہ تیس کے قریب افراد زخمی ہوئے تھے۔

قصبے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لوگ اپنی اس تباہی و بربادی پر ایک دوسرے سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ میں اور انگوری دوسروں کے ساتھ امدادی کارروائیوں میں مصروف رہے۔ شہید ہونے والوں کو شام سے پہلے دفن کر دیا گیا۔ زخمیوں کو ہر ممکنہ حد تک طبّی امداد دی جا رہی تھی۔ لوگ مکانوں کے ملبوں کے ڈھیر میں اپنا سامان تلاش کر رہے تھے لیکن کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ سب جل کر راکھ ہو گیا تھا۔

سوپور میں اس تباہی کی خبر پوری وادی میں پھیل گئی تھی۔ وادی کے کونے کونے میں غم و غ

ی لہر دوڑ گئی۔ ہڑتال کی کال دے دی گئی اور شدید ردِعمل کے طور پر بھارتی غاصبوں کے خلاف مجاہدین کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔

بھارتی فوجی بھی اگرچہ محتاط ہو گئے تھے۔ کیمپوں پر حفاظتی انتظامات سخت کر دیئے گئے تھے۔ لیکن اُسی رات مجاہدین کے ایک گروپ نے سرینگر کے قریب ایک فوجی کیمپ پر حملہ کر کے اُسے مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ اس حملے میں بھارتی فوج کا ایک بریگیڈیئر بھی مارا گیا تھا۔

وہ رات ہم نے برکت علی کے گھر میں گزاری تھی۔ دوسرے دن بھی میں اور انگوری قصبے والوں کے ساتھ امدادی کارروائیوں میں مصروف رہے۔ جن کے گھر کے افراد شہید ہو چکے تھے وہ عورتیں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ بھارتی فوجی پانچ لڑکوں کو بھی پکڑ کر لے گئے تھے۔ اُن کے گھر کی عورتوں کو تو قابو میں کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ کسی طرح سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھیں۔

میرا خیال تھا کہ یہاں کچھ مجاہدین نے پناہ لی ہو گی جس کی اطلاع پر فوجیوں نے یہاں ہلہ بولا تھا۔ لیکن یہ جان کر مجھے زیادہ حیرت بھی نہیں ہوئی کہ پچھلے کئی روز سے مجاہدین کی کسی پارٹی نے اس طرف کا رُخ نہیں کیا تھا۔ فوجیوں نے محض شبے کی بناء پر یہاں ہلہ بول دیا تھا اور تباہی و بربادی پھیلا کر چلے گئے تھے۔

ہم تقریباً ایک ہفتہ سوپور میں رہے۔ اس دوران ہم دونوں قصبے والوں کے ساتھ امدادی سرگرمیوں میں مصروف رہے تھے۔ آس پاس کی بستیوں سے کچھ اور لوگ بھی آ گئے تھے جو ہر ممکن حد تک قصبے والوں سے ہمدردی کا اظہار اور امدادی کاموں میں اُن کا ہاتھ بٹاتے رہے۔

اور بالآخر ایک روز صبح سویرے ہم ہندواڑہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ ہمارے ساتھ قصبے کا ایک آدمی اور بھی تھا۔ ہم تینوں خچروں پر سوار تھے اور اس مرتبہ ہم نے اُونچے پہاڑوں کا رُخ کرنے کی بجائے دریا کے ساتھ ساتھ سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ راستہ اگرچہ طویل تھا لیکن کسی حد تک محفوظ بھی تھا۔

ہم صبح سویرے روانہ ہوئے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے لانگیات نامی گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ یہ گاؤں ہندواڑہ سے چند میل پہلے ہائی وے کے قریب دریا کے کنارے پر واقع تھا۔ ہم گاؤں میں داخل ہونے کی بجائے نصف میل پہلے ایک فارم ہاؤس پر رُک گئے۔

یہاں ایک بوڑھے مرد اور ایک بوڑھی عورت نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم نے وہ رات وہیں گزارنے کا فیصلہ کیا جبکہ ساتھ آنے والا تیسرا آدمی تھوڑی دیر رُکنے کے بعد گاڑی کی طرف چلا گیا۔ اُسے دراصل جانا بھی اُسی گاڑی میں تھا۔

جمال نامی وہ بوڑھا آدمی اپنے دو جوان بیٹوں کو وطن کی آن پر قربان کر چکا تھا۔ وہ خود اگرچہ بوڑھا ہو چکا تھا مگر پس منظر میں رہ کر مجاہدین کی مدد کرتا رہتا تھا۔

وہ میرے اور انگوری کے نام سے واقف تھا۔ ان دونوں میاں بیوی نے ہمارے آنے پر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔

اُس رات ہم میں دیر تک آزادی کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ اُس کا یہ اندازہ غلط نہیں تھا کہ تحریک آزادی کی اس لہر میں کچھ تیزی آ گئی تھی۔ مجاہدین کی کئی تنظیمیں بھارتی سامراج کے خلاف سرگرم عمل تھیں۔ بھارتی فوجی کیمپوں اور فوجی قافلوں کو جگہ جگہ نشانہ بنایا جا رہا تھا اور اُنہیں شدید نقصان پہنچایا جا رہا تھا۔

کشمیری مجاہدین آزادی کی یہ جنگ بے سروسامانی کی حالت میں لڑ رہے تھے۔ وہ کئی کئی وقت فاقے کرتے۔ اسلحہ اور ایمونیشن کے حصول میں بھی اُنہیں شدید دُشواریوں کا سامنا تھا۔ بھارتی فوجیوں سے چھینا اور کیمپوں سے لوٹا ہوا اسلحہ ہی استعمال ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس وادی میں پھیلی ہوئی سات لاکھ بھارتی فوج جدید ترین اسلحے سے لیس تھی۔ اُن کے پاس ہر قسم کے وسائل تھے اور وہ تمام وسائل کو بروئے کار لا رہے تھے۔ اس کے باوجود اُنہیں مجاہدین کے ہاتھوں شدید زک اُٹھانی پڑ رہی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کشمیری مجاہدین کے پاس اتنے وسائل اور اتنا گولہ بارود ہوتا تو وہ عملاً پہلے بھارتی غاصبوں کو نہ صرف کشمیر سے نکال چکے ہوتے بلکہ ہندوستان کے کچھ اور حصے پر بھی ان کا قبضہ ہو چکا ہوتا۔

میرا خیال تھا کہ ہم صبح سویرے ہی ہندواڑہ کی طرف روانہ ہو جائیں گے مگر جمال نے ہمیں روک لیا۔

''شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں......'' اُس نے کہا۔ ''سوپور والے واقعہ کے بعد پوری وادی میں ہنگامے بڑھ گئے ہیں۔ سرینگر سرکار اور فوج کے خلاف جگہ جگہ مظاہرے ہو رہے ہیں۔ لوگ تو پُرامن احتجاج کرنا چاہتے ہیں مگر فوج اور پولیس خود وادی کا امن و امان خراب کر رہی ہے۔ مظاہرین کو دیکھتے ہی گولی چلا دی جاتی ہے۔ بے گناہ نوجوانوں کو پکڑ کر ان پر اس قدر تشدد کیا جاتا ہے کہ وہ زندگی بھر کے لئے مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اجنبیوں کو کسی شہر میں زیادہ مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ تم لوگ دو تین دن یہیں رہو! حالات پُرسکون ہو جائیں تو چلے جانا۔''

''ہندواڑہ میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس وادی کا کوئی بھی گوشہ میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔ ویسے ہندواڑہ میں انگوری کی خالہ ہیں۔ ہم اُنہی کے ہاں جائیں گے۔''

''پھر بھی...... میرا مشورہ ہے کہ تم لوگ دو تین دن یہیں رُک جاؤ۔'' جمال دین نے اصرار کیا۔ ''تم جیسے نوجوان ہمارا سرمایہ ہیں۔ تم لوگوں سے تو کشمیری عوام نے بہت سی اُمیدیں باندھ رکھی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ان ہنگاموں میں تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ اس لئے......''

''ٹھیک ہے......'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''آپ کہتے ہیں تو ہم رُک جاتے ہیں۔''

میں نے انگوری کی طرف دیکھا۔ اُس نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

صبح گاڑی سے دو ادھیڑ عمر آدمی اور تین عورتیں اور بھی آ گئیں۔ دو عورتیں تو ادھیڑ عمر تھیں، تیسری کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ یہ لوگ آتے ہی کھیتوں میں کام میں مصروف ہو گئے۔ انگوری بھی سکینہ نامی اُس جوان عورت کے ساتھ کھیتوں کی طرف چلی گئی تھی۔ میں جمال کے ساتھ ساتھ گھومتا اُس کے کام میں ہاتھ بھی بٹاتا رہا اور باتیں بھی ہوتی رہیں۔

اگلے تین دنوں میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ البتہ ہندواڑہ سے ملنے والی خبروں سے پتہ چلتا تھا کہ وہاں اب پہلے جیسے ہنگامے نہیں رہے تھے تاہم کشیدگی پائی جاتی تھی۔

ایک دن مزید فارم ہاؤس میں رُکنے کے بعد ہم صبح سویرے گاؤں کے لئے روانہ ہو گئے۔ خچر اور رائفلیں ہم نے جمال کے پاس ہی چھوڑ دی تھیں۔ خچر تو وہیں رہتے البتہ رائفلیں ہمیں ہندواڑہ پہنچا دی جاتیں۔

جمال کے ہاں رہتے ہوئے ہم نے کپڑے بھی بدل لئے تھے۔ میں نے جمال کا ایک جوڑا پہن لیا تھا اور اُس کی بیوی نے انگوری کو اپنا ایک جوڑا دے دیا تھا جو اُس کے جسم پر خاصا ڈھیلا تھا۔

لانگیات کے لاری اڈے پر ہمیں تقریباً ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ ہماری طرح کچھ اور لوگ بھی بس کے انتظار میں کھڑے تھے۔

بارہ مولا کی طرف سے آنے والی بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ مگر کچھ مسافروں کے اُتر جانے سے ہمیں بس میں سوار ہونے کا موقع مل گیا۔ انگوری کو تو ایک آدمی نے اپنی سیٹ دے دی لیکن مجھے کھڑے ہی رہنا پڑا۔ مسافروں کے رش کی وجہ سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔

یہ مختصر سا سفر پینتالیس منٹ میں طے ہوا۔ بس جیسے ہی ہندواڑہ کے لاری اڈے پر رُکی درجن بھر فوجیوں نے اُسے گھیر لیا۔ مسافر ایک ایک کر کے اُترتے رہے۔ فوجی بڑی گہری نظروں سے بس سے اُترنے والے مسافروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ میرا خیال ہے اُنہیں کسی خاص آدمی کی تلاش تھی۔

میں نے بس میں ہی صورتحال کا جائزہ لگا لیا تھا اور انگوری کے قریب جھک کر اُس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ہمیں یہاں سے کس طرح نکلنا ہے۔

بس کے آدھے مسافر اُتر چکے تھے۔ میں نے انگوری کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے سہارا دے کر نیچے اُتارا۔ وہ اس طرح جھکی جا رہی تھی جیسے بہت بیمار ہو اور اپنے پیروں پر کھڑے نہ ہوا جا رہا ہو۔ ایک فوجی جو شاید سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا گہری نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اور پھر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی......!

''اے...... تم رُک جاؤ!'' سیکنڈ لیفٹیننٹ نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور ہمارا راستہ روک کر کھڑا

ہو گیا۔

وہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اُس کی نظریں انگوری کی طرف اُٹھ گئیں۔ انگوری نے چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ اُس کا پورا جسم ڈھکا ہوا تھا اور چہرہ بھی چھپا ہوا تھا۔ لیفٹیننٹ نے اُس کے چہرے پر سے چادر ہٹا دی میں آگے بڑھا تو اُس نے ریوالور تان لیا......

''اپنی جگہ پر کھڑے رہو...... حرکت مت کرنا۔'' اُس کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ دو اور فوجی میرے قریب آ گئے تھے۔ اُن دونوں نے مجھے اپنی سب مشین گنوں کی زد میں لے لیا۔ لیفٹیننٹ انگوری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

انگوری کا چہرہ ایک دم پیلا ہو گیا تھا اور وہ واقعی برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھی۔

''کون ہو تم...... کہاں سے آئے ہو اور یہاں کہاں جانا ہے؟'' لیفٹیننٹ نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''لنگیات سے آئے ہیں جی......'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ میری خالہ زاد ہے۔ بیمار ہے اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں۔ دوائی لے کر ہم واپس چلے جائیں گے۔''

لیفٹیننٹ نے ایک فوجی کو اشارہ کیا وہ آگے بڑھ کر میری تلاشی لینے لگا اور پھر سیدھا ہو کر نفی میں سر ہلا دیا۔

''اور تم نے اپنے لباس میں کیا چھپا رکھا ہے؟'' لیفٹیننٹ نے انگوری کو گھورا۔

لیفٹیننٹ شاید خود اُس کی تلاشی لینا چاہتا تھا لیکن میں کسی قسم کی پرواہ کئے بغیر تیزی سے سامنے آ گیا۔

''اس کی تلاشی لینی ہے تو کسی لیڈی سرچر کو بلاؤ!'' میں نے بے خوفی سے کہا۔ ''تم اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اس سے دُور رہو!''

لیفٹیننٹ کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی اقدام کرتا آس پاس کھڑے ہوئے لوگ قریب آنے لگے۔ لوگوں کے تیور دیکھ کر لیفٹیننٹ کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اُس نے ایک فوجی کو اشارہ کیا وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

چند منٹ بعد ہی اُس فوجی کے ساتھ تین پولیس اہلکار وہاں پہنچ گئے۔ اُن میں سے ایک عورت تھی۔ لیفٹیننٹ کا اشارہ پا کر لیڈی کانسٹیبل آگے بڑھ کر انگوری کی تلاشی لینے لگی اور پھر سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

''کچھ نہیں سر!'' اُس نے لیفٹیننٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے......'' لیفٹیننٹ نے گہرا سانس لیتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ''تم لوگ جا سکتے ہو...... لیکن میں تمہارا چہرہ یاد رکھوں گا۔''

میں انگوری کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چل پڑا۔ مجھے اُس لیفٹیننٹ کی نظریں اپنی پشت پر چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ تقریباً بیس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک بازار میں مُڑ گئے۔

انگوری ایک دم سیدھی ہو گئی۔ اب نہ تو اُس کے چہرے پر پیلاہٹ نظر آ رہی تھی اور نہ ہی کسی طرح کمزور لگ رہی تھی۔ اس کے برعکس اُس کے چہرے پر نہ صرف سرخی تھی بلکہ ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔

''تم تو بہت بڑی اداکارہ ہو۔'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہاں تو یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی بے ہوش ہو کر گر پڑو گی۔''

''اگر اداکاری نہ کرتی تو ہم وہاں سے آسانی سے نہ نکل سکتے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ویسے حیرت ہے جب وہ میری تلاشی لینے کے لئے آگے بڑھا تھا تو تمہارے اکڑ جانے پر وہ خاموش ہو گیا تھا۔''

''اگر وہ تمہیں ہاتھ بھی لگاتا تو میں نتائج کی پرواہ کئے بغیر اُس کا ہاتھ توڑ دیتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے وہ خاموش اس لئے ہو گیا تھا کہ شہر کے لوگ پہلے ہی بپھرے ہوئے ہیں شاید یہ بات اُس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اس کی غلطی سے کوئی نیا ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہو گا۔''

شہر کی فضا میں کشیدگی نمایاں تھی۔ جگہ جگہ فوجی ٹرک کھڑے تھے جن پر مشین گنیں نصب تھیں۔ پولیس کی مسلح پارٹیاں بھی گشت کر رہی تھیں۔

ہم بازار سے نکل کر ایک گلی میں داخل ہو گئے اور پھر گلیوں ہی گلیوں میں چلتے رہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد انگوری ایک جگہ رُک گئی۔ ہمارے سامنے تین گلیاں تھیں جو ہاتھ کی اُنگلیوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ انگوری متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا...... راستہ بھول گئیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کئی سال پہلے یہاں آئی تھی۔'' انگوری نے جواب دیا۔ ''اس طرف آؤ...... میرا خیال ہے وہ گھر اسی گلی میں ہے۔''

ہم دائیں طرف والی گلی میں مُڑ گئے۔ انگوری مکانوں کے دروازوں کو دیکھتی ہوئی چل رہی تھی۔ اور پھر وہ ایک مکان کے سامنے رُک گئی۔ اُس نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر دروازے کی زنجیر کھٹکھٹانے لگی۔

ایک منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ بارہ تیرہ سال کی عمر کا ایک لڑکا تھا جس نے لمبا سا کرتا پہن رکھا تھا۔ سر گنجا تھا۔ وہ اُلجھی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھتا رہا۔

''ارے...... تم گڈو ہو نا؟'' انگوری نے کہا تو لڑکے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''خالہ کہاں ہیں...... جاؤ! اُنہیں بتاؤ انگوری آئی ہے۔''

لڑکا اندر دوڑ گیا۔ انگوری نے مجھے اشارہ کیا، میں بھی اُس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ انگوری نے دروازہ بند کر دیا اور خالہ خالہ کہتی ہوئی صحن میں آگے چلنے لگی۔ میں دروازے کے قریب اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

چند سیکنڈ بعد ہی کمرے سے ایک ادھیڑ عمر بھاری بھرکم عورت برآمد ہوئی اور ایک جھٹکے سے

رُک گئی جیسے زمین نے اُس کے پیر پکڑ لئے ہوں...... وہ پلک جھپکے بغیر بے حس و حرکت کھڑی انگوری کی طرف دیکھتی رہی۔ لگتا تھا جیسے اُس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو...... اور پھر ''میری بیٹی'' کہتے ہوئے وہ دوڑ کر انگوری سے لپٹ گئی۔

وہ دونوں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ اس دوران گھر کے دوسرے افراد بھی کمروں سے نکل آئے تھے۔ اُن میں ایک جوان لڑکی اور ایک بہت بوڑھی عورت تھی۔ جھریوں نے اُس کے چہرے پر مکڑی کا جالا سا بن رکھا تھا۔ وہ بھی باری باری انگوری سے لپٹ کر رونے لگیں۔ وہ نوجوان گنجا لڑکا قریب کھڑا حیرت سے اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بڑا رقت آمیز منظر تھا۔ میرا بھی دل بھر آیا۔ آنکھیں بھیگ گئی، مگر میں نے آنسو ضبط کر لئے۔ ماں کے انتقال کے بعد انگوری کی اپنے کسی قریبی رشتے دار سے پہلی ملاقات تھی۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

خالہ نے مجھے دروازے کے قریب کھڑے دیکھا تو چونک سی گئی۔ انگوری نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے میرے بارے میں بتایا۔ خالہ میرے قریب آ گئی، سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور مجھے ایک کمرے میں لے گئی جو بیٹھک کے طور پر سجا ہوا تھا۔ فرش پر گہرے رنگ کا نمدہ سجا ہوا تھا۔ تین کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار کے قریب نمدے پر چوڑے کشن رکھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر طغرے بھی لگے ہوئے تھے۔

خالہ مجھے کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ گنجا لڑکا گڈو میرے پاس ایک کرسی پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ اُس کی یہ بات سن کر میں چونک گیا کہ تین دن پہلے بھارتی فوجی گلی کے ایک مکان سے ایک لڑکے کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ اُس کے بارے میں ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ وہ اُسے کہاں لے گئے ہیں۔

''شمروز کے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔'' خالو مشتاق نے کہا۔ ''اس کا نام ہی اس کا تفصیلی تعارف ہے۔ اور وادی میں اس کے نام کے ساتھ تمہارے نام کی بازگشت بھی گونج رہی ہے۔ ہم سب کی دُعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ قوم نے تم جیسے نوجوانوں سے بڑی اُمیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔''

میں خاموش رہا۔ میرے بارے میں بہت کچھ کہا جا رہا تھا لیکن مجھے اس کا احساس نہیں تھا کہ میرا نام کیا اہمیت اختیار کر گیا ہے؟ میں تو اپنے آپ کو ایک مجاہد ہی سمجھتا تھا۔ میں تو اپنی قوم اور اپنے وطن کی آزادی کے لئے لڑ رہا تھا۔ میری طرح اور بھی ہزاروں کشمیری نوجوان آزادی کی یہ جنگ لڑ رہے تھے۔ سب نے اپنی زندگیاں داؤ پر لگا رکھی تھیں۔ سب ہی سرفروش تھے۔ میری نظروں میں کسی کا رتبہ کم نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد انگوری کی کزن عائشہ چائے بنا کر لے آئی۔ سب لوگ اُس کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ چہرے پر مکڑی کے جال والی وہ بوڑھی عورت مشتاق کی والدہ تھیں۔

مشتاق منڈی میں اناج کا بیوپاری تھا مگر کاروبار کی حالت بہت ہی دگرگوں تھی۔ آئے دن ہنگاموں اور ہڑتالوں نے ہر قسم کا کاروبار تباہ کر رکھا تھا۔

انگوری کی خالہ ان لوگوں کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں اور مشتاق بیٹھک میں اکیلے رہ گئے اور ہم کافی دیر تک تازہ ترین صورتحال پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔

دو دن ہم گھر میں ہی بند رہے۔ تیسرے دن میں شرافت حسین سے ملاقات کے لئے چلا گیا۔ یہ وہی دُکاندار تھا جس سے ملنے کا مشورہ مجھے گل فراز نے دیا تھا۔ اُس کی دُکان تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔ شرافت حسین نے بتایا کہ ہماری رائفلیں اُس کے پاس پہنچ چکی ہیں۔ اُس نے دو دن بعد مجھے رابطہ قائم کرنے کو کہا تھا۔

میں واپس آ رہا تھا کہ شہر میں اچانک ہی ہنگامے شروع ہو گئے...... ایک آدمی سے پتہ چلا کہ چند روز پہلے فوجی مشتاق کے پڑوسی سے جس نوجوان کو اُٹھا کر لے گئے تھے اُسے تشدد کر کے شہید کر دیا گیا تھا۔ اُس کی لاش ایک سڑک پر پڑی ہوئی ملی تھی۔

میں جانتا تھا کہ لوگ اب اس گلی میں جمع ہوں گے جہاں اُس نوجوان کا مکان تھا یعنی مشتاق والی گلی۔ میں تیز تیز چل رہا تھا تا کہ وقت سے پہلے وہاں پہنچ سکوں۔

ایک سڑک پر مُڑتے ہی سڑک کے کنارے پر بیٹھی ایک عورت کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا...... میلا کچیلا پھٹا ہوا لباس جس سے اُس کا جسم جھلک رہا تھا۔ اُلجھے ہوئے گرد آلود بال، پچکے ہوئے گال اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں...... اُس کی حرکات دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ اُس کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔

میں اُس کے قریب رُک گیا۔ اُس کے چہرے کے نقوش جانے پہچانے سے لگتے تھے اور میں اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

میں نے اُسے پہچان لیا تھا......

وہ میری بہن زینب تھی...... جسے کئی مہینے پہلے سوپور پر حملے کے دوران بھارتی فوجی اُٹھا کر لے گئے تھے......!

○○○

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن حقیقت کو جھٹلانا میرے اختیار میں نہیں تھا...... زینب ہی تھی۔

مجھ پر سکتہ کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب ہو چکی تھیں...... میرے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور ٹانگوں میں بھی جیسے کھڑے رہنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

میں کئی لمحوں تک پلک جھپکے بغیر اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ جبکہ اُس نے ایک مرتبہ بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ اُسے شاید احساس ہی نہیں تھا کہ کوئی اس کے قریب آ کر کھڑا ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے شہادت والی اُنگلی سے آڑھی ترچھی لکیریں کھینچنے کے بعد وہ ہتھیلی پھیر کر ساری لکیریں مٹا دیتی اور لکیریں کھینچنے کا عمل دوبارہ شروع کر دیتی۔ ساتھ ہی وہ بار بار ہنس بھی رہی تھی۔

''زینب......!'' میرے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی اور میں ایک گھٹنا ٹیک کر اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''زینب...... اِدھر دیکھ! میری طرف...... میں ہوں...... تمہارا شمروز۔'' میں نے کہتے ہوئے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اے ہٹ......'' اُس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور اس طرح ہاتھ اُٹھایا جیسے تھپڑ مارنا چاہتی ہو۔ لیکن اُس کا ہاتھ رُک گیا اور وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

میں کانپ اُٹھا...... اُس کی ویران آنکھوں میں مکمل اجنبیت تھی۔ وہ چند لمحے مجھے گھورتی رہی پھر قہقہے لگانے لگی۔ اور پھر اچانک ہی مٹھی بھر مٹی اُٹھا کر اپنے سر پر ڈال لی۔

''یہ کیا کر رہی ہو......؟'' میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''مجھے پہچانو زینب! میں تمہارا بھائی ہوں شمروز...... ہوش میں آؤ زینب!''

وہ قہقہے لگاتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی رہی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مکمل ذہنی طور پر مفلوج ہو چکی تھی۔ وہ تو شاید اب اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتی تھی۔

آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی ہمارے قریب رُک گیا۔

''کیوں پریشان کر رہے ہو بیچاری کو؟ اسے چھوڑ دو اس کے حال پر۔'' اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے لہجے میں سرزنش تھی۔

''مم...... میں اسے پریشان نہیں کر رہا۔ یہ...... یہ میری بہن ہے زینب۔'' میں نے سر اُٹھا

کر اُس شخص کی طرف دیکھا۔

''کیا......؟'' وہ اُچھل پڑا۔ ''تمہاری بہن؟'' اُس کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔ ''یہ تو پچھلے تین مہینوں سے اس شہر میں ہے۔ کبھی ایک سڑک پر نظر آتی ہے اور کبھی دوسری سڑک پر۔ لوگ ترس کھا کر اسے کچھ نہ کچھ کھانے کو دے دیتے ہیں۔ تم کہہ رہے ہو کہ تمہاری بہن ہے۔ پہلے کہاں تھے تم؟'' وہ شخص مجھے اس طرح گھور رہا تھا جیسے میری بات کا یقین نہ آ رہا ہو۔

''میرا نام شمروز ہے...... میں ایک مجاہد ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''چند مہینے پہلے بھارتی فوجیوں نے ہمارے گاؤں سوپور پر حملہ کر دیا تھا...... میرے ماں باپ اور ایک بہن شہید ہو گئے تھے اور اسے وہ درندے اُٹھا کر لے گئے تھے۔ میں اسے تلاش کرتا رہا مگر اس کا سراغ نہیں ملا۔ میں دو دن پہلے یہاں آیا ہوں اور اتفاق سے یہ مجھے نظر آ گئی۔''

''سوپور......'' وہ شخص میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''کیا نام بتایا تم نے؟''

''شمروز......'' میں نے جواب دیا۔

''تم مولوی رسول بخش کے بیٹے تو نہیں جو بعد میں کمانڈر محبّ اللہ کی پارٹی میں شامل ہو گیا تھا؟'' اُس شخص نے کہا۔ اُس کی نظریں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''ہاں......'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اُس شخص نے بے اختیار آگے بڑھ کر میری پیشانی چوم لی۔ اور پھر ایک جھٹکے سے الگ ہو گیا۔ شہر کے شمالی علاقے سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

''اسے اُٹھا کر میرے ساتھ آؤ...... جلدی کرو! پورا شہر ہنگاموں کی لپیٹ میں آ رہا ہے۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہئے۔''

''میں لوہاری محلے میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہاں تک کیسے......''

''اُس طرف جانے کا موقع نہیں ہے۔ میرے ساتھ آؤ...... جلدی۔'' وہ شخص بولا۔ میں نے پھرتی سے جھک کر زینب کو کندھے پر لاد لیا اور ہم ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ زینب نے پہلے تو مزاحمت کی تھی لیکن پھر پُرسکون ہو گئی۔

ہم ایک اور گلی میں مُڑ گئے اور اسی لمحے تڑتڑاہٹ کی آواز سنائی دی...... پولیس یا فوج کی کوئی گاڑی فائرنگ کرتی ہوئی تیز رفتاری سے سڑک پر سے گزر گئی۔

لوہاری محلہ مین روڈ کے دوسری طرف شہر کے شمالی علاقے میں تھا اور فائرنگ کی آوازیں سب سے پہلے اُسی طرف سے سنائی دی تھیں۔ ایسے حالات میں انگوری کی خالہ کے گھر تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

ہم مختلف گلیوں میں گھومتے ہوئے وہاں سے کافی دُور نکل آئے۔ ہر جگہ افراتفری نظر آتی تھی۔ بعض نوجوانوں کو منہ پر ڈھاٹے باندھے مین روڈ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اُن میں کسی کے ہاتھوں میں رائفل بھی نظر نہیں آئی تھی۔

وہ شخص ایک تنگ سی گلی میں ایک مکان کے سامنے رُک گیا۔ گلی کچی تھی اور کیچڑ پھیلا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ میرا پیر پھسلا اور میں گرتے گرتے بچا تھا۔

اُس شخص نے دروازے کی زنجیر کھٹکھٹائی۔ چند سیکنڈ بعد ہی ایک جوان عورت نے دروازہ کھول دیا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے چھ سات ماہ کے ایک بچے کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ وہ شخص اندر داخل ہو گیا اور میرے لئے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی اُس شخص نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور مجھے اشارہ کرتا ہوا آنگن کے دوسری طرف ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''اسے یہاں اس چارپائی پر ڈال دو۔'' اُس شخص نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے آہستگی سے زینب کو چارپائی پر لٹا دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہنگامہ کرے گی۔ مگر وہ آرام سے لیٹی ہنستی رہی۔ کبھی وہ میری طرف دیکھتی اور کبھی اُس شخص کی طرف۔

اور پھر اُس نے ایک ایسی حرکت کی کہ میں تھرا اُٹھا...... اُس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیض اُوپر اُٹھا دی اور کمر بند کھولنے لگی۔ میں نے جلدی سے جھک کر اُس کے ہاتھ پکڑ لئے اور قمیض نیچے کھینچ دی۔

''یہ کیا کر رہی ہو...... پاگل ہو گئی ہو کیا؟'' میں چیخا۔

''ہاں...... یہ پاگل ہی ہو چکی ہے۔'' میرے قریب کھڑے ہوئے شخص نے کہا۔ ''میں بعد میں کسی وقت بتاؤں گا۔ اس وقت تم اسے سنبھالو۔''

میرا خیال ہے اُسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ زینب کی اس حرکت ہی سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کن حالات سے گزری تھی۔

زینب نے دوبارہ وہ حرکت نہیں کی تھی لیکن میری طرف دیکھ کر ہنستی رہی۔ دروازے میں وہ عورت بھی بچے کو اُٹھائے کھڑی تھی۔ وہ شخص بھی میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ زینب اب بڑی حد تک پُرسکون ہو چکی تھی۔ وہ چارپائی پر لیٹی ویران سی نظروں سے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''میرا نام ظہور احمد ہے۔'' میرے قریب کھڑے ہوئے شخص نے اپنا تعارف کرایا۔ ''اور یہ میری بہن سلمیٰ ہے۔ بیوہ ہے اس کا شوہر اپنے بچے کی پیدائش سے دو مہینے پہلے باندی پورہ میں ایک جھڑپ کے دوران بھارتی فوجیوں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا...... بڑا دلیر آدمی تھا۔ ایک سچے مجاہد کی طرح اُس نے ساری گولیاں سینے پر کھائی تھیں۔''

میں نے سلمیٰ کی طرف دیکھا۔ شوہر کے ذکر پر اُس کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔ اُس نے شاید غیر ارادی طور پر بچے کو سینے سے بھینچ لیا تھا۔ صرف سلمیٰ ہی ایک ایسی عورت نہیں تھی جس کا جوانی میں سہاگ اُجڑا تھا۔ وادی کے ہر دوسرے گھر کا کوئی نہ کوئی فرد وطن کی آزادی کی خاطر جان لٹا چکا تھا۔ کسی بہن کے سر سے دوپٹہ چھن گیا تھا، کسی کا سہاگ اُجڑ گیا تھا اور کسی ماں کی گود

اجاڑ دی گئی تھی۔

''اور سلمیٰ!'' ظہور احمد کہہ رہا تھا۔ ''ہم کل ہی شمروز اور انگوری کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ عظیم مجاہد آج ہمارے گھر میں موجود ہے۔''

سلمیٰ چونک سی گئی اور میری طرف دیکھنے لگی۔

''تم سلطان کو مجھے دے دو اور پہلے چائے بنا دو۔ اس کے بعد کھانے کا بندوبست کرنا۔''

ظہور احمد نے آگے بڑھ کر بچے کو اُس سے لے لیا۔

''میں ابھی چائے بناتی ہوں۔ مگر تم اس پگلی کو کیوں لے آئے ہو بھائی؟'' سلمیٰ نے زینب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ پگلی......'' ظہور احمد کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ''یہ شمروز کی بہن ہے جسے چند مہینے پہلے سوپور پر حملے کے دوران بھارتی فوجی اُٹھا کر لے گئے تھے۔ اسے تین مہینے پہلے یہاں بازار میں دیکھا گیا تھا۔ پتہ نہیں کن حالات سے گزری ہے؟ بہر حال تم چائے بنا کر لاؤ!''

سلمیٰ کا چہرہ ایک لمحہ کو دُھواں سا ہو گیا۔ اُسے شاید اپنے بھائی کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ وہ چند لمحے پھٹی پھٹی سی نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی زینب کو دیکھتی رہی اور پھر کمرے سے نکل گئی۔ میں چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا اور زینب کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ میں یہ تو سمجھ گیا تھا کہ اُس پر کیا بیتی تھی اور اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی وجہ سے اُس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

ظہور احمد ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اُس کی گود میں بچہ قلقاریاں بھر رہا تھا۔

''اس بے چاری کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر کہہ رہا تھا۔ ''تین مہینے پہلے، پہلی مرتبہ اسے لاری اڈے کے قریب دیکھا گیا تھا۔ پھر یہ شہر کے مختلف علاقوں میں نظر آنے لگی۔ کبھی یہاں کبھی وہاں...... لوگ اسے لاوارث اور پاگل سمجھ کر کچھ نہ کچھ کھانے کو دے دیتے۔ نجانے ہماری قوم کی کتنی بیٹیاں اس طرح اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہیں؟ لیکن لاوارث سمجھ کر اس کے ساتھ کچھ اور زیادتیاں بھی ہوتی رہیں۔ شہر کے بعض اوباش لڑکے......''

''بس بس...... آگے کچھ مت کہو۔'' میں نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا؟ اور یہ تو زینب کی حالت ہی بتا رہی تھی کہ اُس پر کیا بیتی تھی۔

کچھ دیر بعد سلمیٰ چائے لے آئی۔ اُس نے ٹرے ایک میز پر رکھ دی اور ایک پیالی اُٹھا کر چارپائی کے قریب آ گئی۔ میں سمجھ گیا اور اُٹھ کر ظہور احمد کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ سلمیٰ چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گئی۔

زینب خود ہی اُٹھ کر بیٹھ گئی اور سلمیٰ کے ہاتھ سے پیالی لے لی۔ اُس نے پیالی کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا اور ندیدوں کی طرح چائے پینے لگی۔ چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے

اُس کے منہ سے سڑ سڑ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

اور پھر چائے ختم ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد سلمٰی نے زینب کا ہاتھ پکڑ کر اُسے چارپائی سے اُٹھایا اور باہر لے گئی۔ زینب نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔

میں اور ظہور کمرے میں بیٹھے شہر کی تازہ ترین صورتحال پر بحث کرنے لگے۔ باہر سے کبھی کبھی فائرنگ کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔

''وہ لڑکا عبدالحمید......'' ظہور احمد کہہ رہا تھا۔ ''چند روز پہلے کام سے واپس آ رہا تھا کہ چوک پر چند نوجوانوں کی پولیس کی ایک پارٹی سے جھڑپ ہو گئی۔ اسی دوران فوجیوں کی ایک پارٹی بھی وہاں پہنچ گئی اور فائر کھول دیا۔ فائرنگ سے کوئی ہلاک یا زخمی تو نہیں ہوا لیکن بھگدڑ مچ گئی۔ وہ لڑکے اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔ عبدالحمید اگرچہ اُن سے الگ تھلگ تھا لیکن وہ فوجیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔

تین دن تک کچھ پتہ نہیں چلا کہ عبدالحمید کو کہاں رکھا گیا ہے۔ آج اُس کی زخموں سے چور لاش ملی ہے۔ لوگ بپھر گئے ہیں۔ پورا شہر ہنگاموں کی لپیٹ میں آ گیا ہے اور مجھے لگتا ہے آج بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔''

''مزاحمت ہونی چاہئے۔ ہر سطح پر......'' میں نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''شہروں میں، گاؤں دیہاتوں میں، وادی کے کونے کونے میں مزاحمت ہونی چاہئے تاکہ ان غاصبوں کو یہ پتہ چل جائے کہ کشمیری اب بے بس نہیں رہے۔ ان کی آنکھیں کھل چکی ہیں۔ وہ مزید ظلم برداشت نہیں کر سکتے اور غلامی کی زنجیریں توڑ پھینکیں گے۔''

عبدالحمید وہی لڑکا تھا جسے فوجیوں نے مشتاق والی گلی سے اُٹھایا تھا اور اب اُس کی لاش ملی تھی جس پر ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔

میں اور ظہور احمد باتیں کرتے رہے۔ ہمیں وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں رہا۔ اور غالباً ایک گھنٹے بعد سلمٰی زینب کو لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو میں چونک گیا۔ اُس ایک گھنٹے میں سلمٰی نے زینب کو نہلا دھلا کر اُس کے کپڑے تبدیل کر دیئے تھے اور بالوں کی بھی چٹیا بنا دی تھی۔ زینب چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ وہ بار بار اپنے کپڑوں کو چھو کر دیکھ رہی تھی۔ کبھی ہنسنے لگتی اور کبھی گم سم سی ہو جاتی۔

ایک گھنٹہ اور گزر گیا اور پھر سلمٰی نے آ کر بتایا کہ کھانا تیار ہو چکا ہے۔ ہم دوسرے کمرے میں آ گئے۔ میں نے زینب کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

کمرے میں بچھی ہوئی دری پر دستر خوان بچھا ہوا تھا۔ دال چاول تھے۔ زینب ہم سے پہلے ہی دستر خوان پر بیٹھ گئی اور ندیدوں کی طرح چاول کھانے لگی جیسے عرصہ سے کچھ نہ کھایا ہو۔ میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے زینب کی طرف دیکھا۔ ہمارے گھر کیا کچھ نہیں تھا...... ہر چیز کی فراوانی تھی۔ کبھی کسی چیز کی تنگی نہیں ہوئی تھی۔ جو چیز چاہتے کھاتے

تھے۔ اور اب زینب کو دیکھ کر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے تھے۔

کھانے کے بعد سلمٰی زینب کو اپنے کمرے میں لے گئی اور میں ظہور احمد کے ساتھ اُسی کمرے میں آ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ ظہور احمد اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ اُس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔

''صورتحال بڑی سنگین ہے......'' اُس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''پولیس اور فوج سے جھڑپوں میں شہر کے مختلف علاقوں میں اب تک تین نوجوان شہید ہو چکے ہیں۔ ہنگامے اب مزید بڑھیں گے۔''

میں اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ نہتے کشمیری نوجوان وحشی درندوں سے برسرِ پیکار تھے۔ سڑکوں پر اُن کا خون بہہ رہا تھا اور میں یہاں بیٹھا ہوا تھا۔

شام ہونے کو تھی۔ اور پھر یہ اطلاع ملی کہ شہر میں کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ کرفیو کی خلاف ورزی کرنے والوں کو دیکھتے ہی گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔

اب میری پریشانی بڑھ رہی تھی۔ میں صبح نو بجے کے قریب گھر سے نکلا تھا اور انگوری سے کہہ کر آیا تھا کہ دو ڈھائی گھنٹوں میں واپس آ جاؤں گا۔ مگر اب شام ہو رہی تھی۔ انگوری اور اُس کے خالو وغیرہ یقیناً پریشان ہو رہے ہوں گے۔

میں نے ظہور احمد سے اس پریشانی کا ذکر کیا تو وہ بولا۔ ''کوئی بات نہیں۔ میں مشتاق حسین کے گھر اطلاع بھجوا دیتا ہوں کہ تم خیریت سے ہو۔''

''کرفیو لگ چکا ہے...... باہر نکلنا خطرناک ہو گا۔'' میں نے کہا۔

''اس کی تم پرواہ مت کرو......'' ظہور احمد مسکرا دیا۔ ''ہمارے نوجوان ایسے راستوں سے واقف ہیں کہ وہ کرفیو میں بھی شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ سکتے ہیں۔''

وہ اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ اُس کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ ''میں نے دو لڑکوں کو بھیج دیا ہے۔'' اُس نے میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں وہ مشتاق کے گھر پر اطلاع پہنچا دیں گے۔''

باہر شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ سلمٰی نے ہمیں چائے لا کر دے دی اور رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ زینب سو گئی تھی میں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے زینب ہی کے بارے میں سوچتا رہا کہ کیا اب یہ کبھی ٹھیک ہو سکے گی؟

تقریباً دو گھنٹوں بعد دروازے پر دستک کی آواز اُبھری۔ میں بھی ظہور احمد کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں تو برآمدے میں رُک گیا اور ظہور احمد نے آگے بڑھ کر باہر کا دروازہ کھول دیا۔ ایک نوجوان لڑکے کے ساتھ انگوری کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر میں اُچھل پڑا۔

''ارے تم......؟'' میں تیزی سے آگے بڑھا۔ ''تم کیوں آ گئیں...... کیا تمہیں معلوم نہیں کہ شہر میں کرفیو لگا ہوا ہے اور......''

''ان باتوں کی پرواہ کون کرتا ہے؟'' انگوری نے میری بات کاٹ دی۔ ''تم صبح سے غائب تھے۔ مجھے پریشانی ہو رہی تھی۔ اور پھر جب یہ لوگ اطلاع لے کر آئے تو میں بھی ان کے ساتھ آ گئی۔''

آوازیں سن کر سلمٰی بھی باورچی خانے سے نکل آئی تھی۔ اور میں نے جب بتایا کہ یہ انگوری ہے تو وہ دوڑ کر اُس سے لپٹ گئی۔

میں نے انگوری سے سلمٰی اور ظہور احمد کا بھی تعارف کروا دیا۔ اور اُسے زینب کے بارے میں بتایا جس کی وجہ سے میں گھر واپس نہیں جا سکا تھا۔

''اوہ...... کہاں ہے وہ؟'' انگوری کی آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔

''اُس کمرے میں وہ سو رہی ہے۔'' میں نے بتایا۔

انگوری نے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ ہم لوگ اس وقت تک باہر ہی کھڑے تھے۔ پھر سلمٰی انگوری کو لے کر کچن میں چلی گئی۔ میں اور ظہور اپنے کمرے میں آ گئے۔

کھانے کے وقت تک زینب بھی جاگ چکی تھی۔ انگوری زینب کے بازیاب ہونے کی اطلاع پر جس طرح خوش ہوئی تھی اُسے دیکھ کر اس سے کہیں زیادہ افسردہ اور ملول ہو گئی۔

وہ رات ہم نے ظہور احمد کے گھر پر ہی گزاری۔

اگلے روز جمعہ تھا۔ گزشتہ روز کے ہنگاموں میں تین نوجوان شہید ہوئے تھے۔ چوتھا عبدالحمید تھا جو فوجیوں کی حراست میں تشدد سے جاں بحق ہوا تھا۔ نمازِ جمعہ کے لئے کرفیو میں وقفہ دینے کا اعلان نہیں کیا گیا تھا لیکن اندر ہی اندر یہ اطلاع پورے شہر میں گشت کر رہی تھی کہ اُن چاروں شہداء کی نمازِ جنازہ مرکزی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کے بعد ادا کی جائے گی۔ شہر کے معززین کی طرف سے کرفیو کی خلاف ورزی کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔ ساڑھے بارہ بجے میں اور ظہور بھی گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اور بھی بہت سے لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل رہے تھے۔ سب ساتھ ملتے گئے اس طرح جب ہم گلیوں سے نکل کر مین روڈ پر پہنچے تو ہمارے گروپ میں ساٹھ ستر آدمی شامل ہو چکے تھے۔ مین روڈ پر ہر گلی کے موڑ پر پولیس اور فوج کے مسلح سپاہی موجود تھے۔ یوں بھی لاتعداد فوجی اور پولیس والے پورے شہر میں پھیلے ہوئے تھے لیکن کسی نے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ فوج کی ہائی کمان نے نمازِ جمعہ کے لئے کرفیو میں دو گھنٹے کا وقفہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن اس کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ کرفیو میں وقفے کے ساتھ یہ فیصلہ بھی کیا گیا تھا کہ اگر شہریوں کی طرف سے ہنگامہ کرنے کی کوشش کی جائے تو اُن پر بلا جھجک فائر کھول دیا جائے۔

جامع مسجد شہر کے مرکزی چوراہے کے قریب ہی تھی۔ مرکزی چوراہے پر ہزاروں لوگ جمع تھے۔ پولیس اور فوج نے علاقے کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

چاروں شہداء کے جنازے بھی ایک طرف سائے میں رکھے ہوئے تھے۔ ہر چہرہ افسردہ

تھا۔ ہر روز شہر کے چار چھ نوجوان بھارتی درندوں کے ہاتھوں شہید ہو رہے تھے۔

بھارتی سامراج کے خلاف مولوی صاحب کا وعظ بڑا پُر اثر تھا۔ ایک موقع پر اُنہوں نے مُکا لہراتے ہوئے کہا تھا۔

''آج ہمیں ان غاصبوں سے نمٹنے کے لئے کمانڈر محب اللہ، کمانڈر رشید، کمانڈر عبدالحق، کمانڈر سیف الرحمٰن، شمروز جیسے جری و دلیر نوجوانوں اور انگوری جیسی نڈر اور حوصلہ مند بیٹیوں کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ یہ سر پھرے نوجوان ہی بھارتی غاصبوں کو اس سرزمین سے نکال سکتے ہیں۔ خدا ان سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔''

مولوی صاحب کے وعظ میں اپنا اور انگوری کا نام سن کر مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ظہور احمد نے میری طرف دیکھا۔ اُس نے اپنی جگہ سے اُٹھنا چاہا مگر میں نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر بٹھائے رکھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ میری موجودگی کا اعلان کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے مناسب نہیں سمجھا۔ نماز کے بعد شہداء کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ اور پھر نوجوانوں نے جنازے کندھوں پر اُٹھا لئے اور بھارتی سامراج کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے شہر کی سڑکوں پر گشت کرنے لگے۔

جنازے میں ہزاروں لوگ شریک تھے۔ جنازے کے جلوس کو چاروں طرف سے پولیس اور فوج کی بھاری نفری نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ جوشیلے نوجوان بھارتی سامراج کے خلاف نعروں کے ساتھ مجاہدین کے کمانڈر کے نام لے لے کر زندہ باد کے نعرے بھی لگا رہے تھے۔ اُن میں میرا اور انگوری کا نام بھی بار بار آ رہا تھا۔

ایک جگہ پولیس نے جنازے کو روک لیا۔ اس طرف چند سو گز آگے فوج کے مقامی کمانڈنٹ کی رہائش گاہ تھی۔ اور جنازے کے جلوس کے شرکاء اُس کے سامنے مظاہرہ کر کے اُسے یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ فوج کی وحشیانہ کارروائیوں سے کس طرح گھر اُجڑ رہے ہیں...... مگر فوج اور پولیس نے جلوس کو آگے جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔

بات بڑھ رہی تھی۔ نوجوان جنازوں کو اُس راستے سے لے جانا چاہتے تھے۔ وہ اس بات پر بضد تھے کہ اُن کا راستہ چھوڑ دیا جائے۔

پولیس نے پہلے لاٹھی چارج کیا اور پھر فوج نے گولی چلا دی...... پہلے جلوس کو منتشر کرنے کے لئے ہوائی فائرنگ کی گئی۔ پھر لوگوں کو نشانہ بنایا جانے لگا۔ کئی لوگ زخمی ہو کر گرے...... بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ کچھ نوجوانوں نے پولیس اور فوج پر پتھراؤ شروع کر دیا لیکن جدید ترین رائفلوں کے سامنے پتھراؤ کیا حیثیت رکھتا تھا؟ کئی نوجوان زخمی ہو کر گرے۔ فوج نے مصلحتاً اُن کے جسموں کے نچلے حصوں پر گولیاں ماری تھیں۔ یہ ہنگامہ تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ پھر ایک فوجی آفیسر نے میگا فون پر اعلان کیا کہ وہ لوگ جنازے اُٹھا کر لے جائیں اور متبادل راستہ اختیار کریں۔ اگر اس حکم کی خلاف ورزی کی کوشش کی گئی تو ان پر براہِ

راست فائر کھول دیا جائے گا۔

سب سے پہلے میں اور ظہور احمد اُس طرف بڑھے تھے جہاں سڑک پر چاروں جنازے رکھے ہوئے تھے۔ ہماری دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی جمع ہونا شروع ہو گئے۔ بعض جوشیلے نوجوان اب بھی جنازے کے جلوس کو کمانڈنٹ کی رہائش گاہ کی طرف ہی لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن میرے خیال میں یہ ضد بیکار تھی۔ اس سے نہتے شہریوں کو مزید نقصان پہنچ سکتا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر مختصر سی تقریر کی۔

''کیا تم لوگ اس شخص کو اپنے اُوپر ہونے والے ظلم کا احساس دلانا چاہتے ہو جس کے حکم پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے؟ کیا تم ایک خونخوار بھیڑیئے سے یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ چیر پھاڑ نہ کرے؟ نہیں میرے دوستو! یہ انسان نہیں بھیڑیئے ہیں...... ان کے اندر رحم کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا نہ ہی انہیں کوئی احساس دلایا جا سکتا ہے۔ اس لئے اس وقت کوئی ضد کرنا بیکار ہے۔ ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ میتوں کی بے حرمتی نہ ہو۔ ویسے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان درندوں سے ہم شہداء کے خون کے ایک ایک قطرے کا بدلہ لیں گے۔ اب شہداء کو ان کی منزل تک پہنچانے میں دیر نہ کرو دوستو!''

میں کوئی مقرر یا موعظ نہیں ہوں۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ میرے ان الفاظ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور نوجوانوں نے جنازے اُٹھا کر راستہ بدل لیا۔

شاید ظہور احمد نے اپنے قریب کھڑے ہوئے کسی شخص کو بتا دیا تھا کہ میں کون ہوں...... اور پھر یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح ہزاروں لوگوں کے جلوس میں پھیل گئی کہ شمروز بھی جنازے کے اس جلوس میں شریک ہے اور تقریر اُسی نے کی تھی۔

میرے نام کے زندہ باد کے نعرے لگنا شروع ہو گئے...... قبرستان میں بھی میرے نام کے نعرے لگتے رہے۔ جن لوگوں نے مجھے تقریر کرتے ہوئے دیکھا تھا وہ میرے گرد جمع ہو گئے۔ اور پھر یہ دیکھ کر سب ہی لوگ چونک گئے کہ فوج نے قبرستان کو گھیرے میں لے لیا تھا...... جنازے کے اس جلوس میں میری موجودگی کی اطلاع فوج تک بھی پہنچ گئی تھی۔ کچھ عرصے سے میں بھی فوج کی مطلوبہ لسٹ پر تھا۔ کروڑ نامی بستی میں چندر پال عرف رستم اور بابا عبدالفتح کے ڈیرے پر چار فوجیوں کی ہلاکت کے بعد تو میں فوج کے لئے زیادہ اہم ہو گیا تھا۔ اور اس وقت اُنہیں موقع مل گیا تھا۔ اُنہوں نے قبرستان کو گھیرے میں لے لیا تھا......

ظہور احمد کو شاید اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر ندامت کے تاثرات نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔

''گھبراؤ نہیں ظہور بھائی!'' میں نے کہا۔ ''ہم بڑے آرام سے نکل جائیں گے اور یہ فوجی یہاں تاپتے رہ جائیں گے۔''

قبرستان میں ہزاروں لوگ تھے۔ جن لوگوں نے مجھے تقریر کرتے ہوئے دیکھا تھا وہ اب

مجھے پہچان گئے تھے۔ اُنہوں نے مجھے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اور پھر وہ لوگ مجھے اسی طرح گھیرے میں لئے ہوئے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھ گئے۔ درختوں کے نیچے بھی قبریں تھیں۔ اور وہ لوگ اس طرح رُک رُک کر چل رہے تھے جیسے قبریں دیکھ رہے ہوں۔

درختوں کے جھنڈ کے آس پاس بھی چند فوجی موجود تھے۔ اُنہوں نے لوگوں کو روکنے کی کوشش کی اور ایک فوجی نے چیختے ہوئے کہا کہ لوگ واپسی کے لئے وہی راستہ استعمال کریں جس طرف سے آئے تھے۔ لیکن تین نوجوان مجھے اپنے ساتھ لے کر درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو چکے تھے۔

درخت بہت گنجان تھے۔ اُن کی شاخیں نیچے کو جھکی ہوئی تھیں۔ ہم اُن کے اندر ہی اندر چلتے ہوئے قبرستان سے دُور آ گئے اور بالآخر درختوں سے نکل کر تیز تیز چلتے ہوئے گنجان آبادی میں پہنچ گئے۔ اس طرح آدھے گھنٹے میں ہم ظہور احمد کے مکان پر پہنچ گئے۔ وہ تینوں نوجوان مجھے دروازے کے سامنے چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ظہور احمد بھی آ گیا۔ اُس کی اطلاع کے مطابق قبرستان کے داخلی راستے پر بھی فوجیوں کی ایک مسلح پارٹی کھڑی تھی۔ اُن کے ساتھ سول لباس میں دو ایسے آدمی بھی موجود تھے جن کے چہروں پر نقاب تھے۔ صرف آنکھوں کی جگہ پر سوراخ تھے۔ وہ اپنے سامنے سے گزرنے والے ہر شخص کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ظہور احمد کے خیال کے مطابق وہ دونوں نقاب پوش وہ بے ضمیر اور غدار تھے جنہوں نے مجھے جنازے کے جلوس میں دیکھ کر فوج کو خبر دی تھی اور میری شناخت کے لئے وہ فوجیوں کے ساتھ موجود تھے۔ مگر اُنہیں بڑی مایوسی ہوئی تھی کیونکہ میں تو وہاں سے نکل آیا تھا۔

اگلے دو دنوں میں شہر میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوا لیکن کشیدگی برقرار تھی۔ اس دوران میں ایک مرتبہ بھی گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ انگوری بھی میرے ساتھ تھی اور ہماری تمام تر توجہ زینب پر مرکوز تھی۔ اُس کی حالت دیکھ کر مجھے دُکھ ہو رہا تھا۔ وہ کبھی قہقہہ لگانے لگتی، کبھی رونا شروع کر دیتی اور کبھی خاموش بیٹھی رہتی۔ اُن دو دنوں میں اُس نے ہر مرتبہ اپنے کپڑے بھی پھاڑ ڈالے تھے۔

تیسرے دن ہم نے فیصلہ کیا کہ اسے انگوری کی خالہ کے ہاں منتقل کر دیا جائے۔ وہاں اُس کی دیکھ بھال کرنے والے موجود تھے یہاں سلمیٰ اکیلی تھی۔ اُس کا شیر خوار بچہ بھی تھا اُس کے لئے زینب کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

اور پھر اگلے روز ناشتے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم ظہور احمد کے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ظہور احمد بھی ہمارے ساتھ تھا۔ زینب کو ایک طرف سے میں نے اور دوسری طرف سے انگوری نے سہارا دے رکھا تھا۔ ہمیں اُسے ساتھ لے جانے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی۔ وہ بڑے آرام سے ہمارے ساتھ چل رہی تھی۔ ہم گلیوں سے نکل کر جیسے ہی مین روڈ پر پہنچے تو زینب نے اچانک ہی جھٹکا دے کر اپنے آپ کو ہم سے چھڑا لیا اور قہقہے لگاتی ہوئی سڑک کی طرف دوڑی۔

دائیں طرف سے فوج کی ایک تیز رفتار جیپ آ رہی تھی۔ زینب سڑک کے وسط میں پہنچ چکی تھی۔ میں اُسے پکڑنے کے لئے اُس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اور پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا...... وہ فوجی جیپ زینب سے ٹکرائی اور اُسے اپنے ساتھ گھسیٹتی ہوئی لے گئی...... میں ایک جھٹکے سے رُک گیا۔ میرا دماغ سن ہو رہا تھا اور میں پھٹی پھٹی نظروں سے جیپ کے نیچے زینب کی کچلی ہوئی لاش کو دیکھ رہا تھا......!

○

جیپ تقریباً دس گز آگے جا کر رُکی تھی اور وہ زینب کو بھی ساتھ گھسیٹتی ہوئی لے گئی تھی۔

جیپ پر چار فوجی تھے۔ ایک ڈرائیور اور تین پیچھے۔ اُن تینوں میں سے ایک جیپ کے سامنے نصب لائٹ مشین گن کے ساتھ کھڑا تھا اور دو سب مشین گنیں سنبھالے آمنے سامنے والی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ جیپ کے زوردار جھٹکے لگنے سے وہ اپنی سیٹوں پر لڑھک گئے تھے لیکن فوراً ہی سنبھل بھی گئے تھے۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور دوسرے ہی لمحے میں نے جیپ کی طرف دوڑ لگا دی...... میں خون میں لت پت زینب کو جیپ کے نیچے سے نکالنا چاہتا تھا۔ لیکن جیپ کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے فوجی غالباً یہ سمجھے تھے کہ میں اُن پر حملہ آور ہو رہا ہوں۔ اُن میں سے ایک فوجی نے فائر کھول دیا......

صورتحال نے ان فوجیوں کو بھی خاصا بدحواس کر دیا تھا۔ وہ فوجی تو کچھ زیادہ ہی بدحواس تھا۔ اُس نے ٹائیگر دبایا تو رائفل کا رُخ قدرے اُوپر کی طرف تھا۔ گولیاں میرے سر کے کئی فٹ اُوپر سے ہوتی ہوئی میرے پیچھے ایک دُکان کے اُوپر لگے ہوئے سائن بورڈ کو چھلنی کر گئی تھیں۔

میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کر لیا۔ پہلے تو میں زینب کو جیپ کے نیچے سے نکالنے کے لئے لپکا تھا۔ فائرنگ کی آواز سن کر میں نے ارادہ بدل دیا اور جیپ پر چھلانگ لگا دی...... بغیر ہڈ کے جیپ تھی۔ میں ہوا میں اُڑتا ہوا جیپ میں اُس فوجی کے اُوپر گرا جس نے فائرنگ کی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر ٹرائیگر دبا دیا لیکن اس مرتبہ رائفل کا رُخ بدل گیا تھا۔ رائفل کی نال سے نکلنے والی گولیوں نے اُس فوجی کو چھلنی کر دیا جو لائٹ مشین گن کے سامنے اپنی سیٹ پر کھڑا سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چھلنی ہو کر ڈرائیور کے اُوپر گرا۔

میں نے اپنے نیچے دبے ہوئے فوجی کی رائفل پر ہاتھ ڈال دیا اور عین اسی وقت کچھ اور لوگ جیپ کی طرف دوڑ پڑے۔ ظہور احمد اور انگوری اُن میں سب سے آگے تھے۔ ظہور احمد نے آتے ہی دوسرے فوجی کی رائفل چھین لی۔ انگوری ڈرائیور کی طرف لپکی جو سیٹ سے اُترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اُسی وقت دو اور آدمی اس طرف پہنچ گئے اور اُنہوں نے ڈرائیور کو گرفت میں لے لیا اور لاتوں اور گھونسوں سے اُس کی تواضع کرنے لگے۔

ظہور احمد نے رائفل کے بٹ مار مار کر دوسرے فوجی کی کھوپڑی پاش پاش کر دی تھی۔ اُس

کا خون پوری جیپ میں بکھر رہا تھا۔ میں نے اپنے حریف فوجی سے اُس کی رائفل چھین لی تھی اور اُس فوجی کو دھکا دیتا ہوا جیپ سے نیچے اُتر آیا۔ اس دوران انگوری نے سیٹ پر کھڑے ہو کر لائٹ مشین گن سنبھال لی۔

اتفاق سے اُسی وقت ایک اور فوجی جیپ سامنے والی کشادہ گلی سے اس طرف نکل آئی۔ اُس پر بھی لائٹ مشین گن نصب تھی۔ گنر نے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے ہوائی برسٹ مار دیا۔ اُس جیپ کے فوجی صورتحال کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکے تھے۔ گنر نے لوگوں کو خوفزدہ کرنے اور منتشر کرنے کے لئے ہوائی برسٹ مارا تھا لیکن انگوری نے بڑی پھرتی سے اپنی لائٹ مشین گن کا رُخ موڑ کر فائر کھول دیا۔ دوسری جیپ کا گنر چھلنی ہو کر ڈھیر ہو گیا۔

اُس جیپ میں ایک میجر، ایک کرنل اور دو فوجی اور تھے۔ ایک فوجی نے کھڑے ہو کر اپنی سب مشین گن سے فائر کرنا چاہا مگر اُس کے رائفل سیدھی کرنے سے پہلے ہی میں نے فائرنگ کر کے اُسے ڈھیر کر دیا۔ اس کے ساتھ اور دوسرے فوجی نے اپنی رائفل پھینک دی اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھا دیئے تھے۔

''انگوری...... رُک جاؤ! فائر مت کرنا'' میں چیخ اُٹھا۔

سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ لیکن سب دُور دُور تھے۔ البتہ ہمارے والی جیپ کے گرد مجمع لگ گیا تھا۔ چند آدمی زینب کی لاش اُٹھا کر گلی میں دوڑ گئے تھے۔ ظہور احمد بھی ایک فوجی سے چھینی ہوئی سب مشین گن سنبھالے جیپ کے پیچھے آڑ لئے کھڑا تھا۔ میں اپنی سب مشین گن سنبھالے دوسری جیپ کے قریب آ گیا اور جیپ کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے ایک میجر اور کرنل کو دیکھ کر میری آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی......

وہ موت کے فرشتے تھے۔ اُنہوں نے بے دردی سے بے گناہ، مظلوم اور نہتے لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ معصوم اور بے گناہ لوگوں پر گولیاں برساتے ہوئے اُنہوں نے کبھی جھجک محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن اب اپنی موت کو سامنے دیکھ کر اُن کے چہرے دُھواں ہو گئے تھے اور وہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔

''نیچے آؤ!'' میں اُنہیں گن کی زد پر لیتے ہوئے دھاڑا۔ وہ فوجی اور دونوں آفیسر ہاتھ اُٹھا کر نیچے اُتر آئے۔ اتنے میں تین نوجوان دوڑتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئے۔ یہ تینوں وہی تھے جو اُس روز مجھے قبرستان میں فوج کے گھیرے سے نکال کر لائے تھے۔ اُن میں سے دو نے اُن آفیسرز کے ریوالور نکال لئے، تیسرے نے ایک سب مشین گن کندھے پر لٹکا لی، دوسری سب مشین گن سے اُن سب کو زد پر لے لیا۔ اُن میں اب جیپ کا ڈرائیور بھی شامل ہو گیا تھا۔

ایک اور نوجوان دوڑتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔ اُس نے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنا اور انجن سٹارٹ کر کے جیپ کو دوڑاتا ہوا دوسری جیپ کے قریب لے جا کر روک دیا اور انجن بند کر کے دوسری سیٹ پر کھڑے ہو کر لائٹ مشین گن سنبھال لی۔ دونوں جیپوں کا رُخ مخالف

سمتوں میں تھا اور اس طرح وہ سڑک دونوں طرف سے لائٹ مشین گنوں کی زد پر تھی۔ ایک مشین گن پر وہ نوجوان کھڑا تھا اور دوسری انگوری نے سنبھال رکھی تھی۔

میں اُن تینوں نوجوانوں کے ساتھ دونوں بھارتی افسروں اور اُن کے دونوں ماتحتوں کو ہانکتا ہوا پہلی جیپ کے پاس لے آیا۔ بازار بند ہو چکا تھا۔ سڑک پر سناٹا چھا گیا تھا۔ لوگ آس پاس کی گلیوں میں گھس گئے تھے۔ یہ سب کچھ اچانک اور اتفاقیہ طور پر ہی ہوا تھا۔ دو بڑے فوجی افسروں کا ہمارے قبضے میں آنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن میں ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے کہ انگوری کی آواز سن کر چونک گیا......

''شمروز ہوشیار......فوجی ٹرک آرہا ہے۔''

وہ دونوں آفیسر میرا نام سن کر چونک گئے۔ انگوری کی آواز نے بھی اُنہیں اُچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُنہوں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا کہ اُن کی مقبوضہ جیپ پر ایک جوان اور حسین لڑکی مشین گن سنبھالے کھڑی ہے۔ میں اُن آفیسروں کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور مُڑ کر اُس ٹرک کی طرف دیکھنے لگا جو سامنے ایک سڑک سے مُڑ کر اس طرف آرہا تھا۔

میں نے اپنے ساتھیوں کو کچھ ہدایات دیں اور اُن دونوں افسروں اور دوسرے فوجیوں کو اپنے آگے کھڑا کر کے اُنہیں رائفلوں کی زد پر لے لیا۔ میری رائفل کی نال کرنل کے پہلو سے لگی ہوئی تھی اور دوسرے نوجوان نے میجر کو بے بس کر رکھا تھا۔ اُن سب کے ہاتھ گردنوں پر تھے۔

میں نے بہت بڑا رسک لیا تھا لیکن اس وقت اچانک جو صورتحال پیدا ہوئی تھی اس کے پیش نظر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ آنے والے ٹرک کے فوجیوں نے شاید صورتحال کا اندازہ لگا لیا تھا۔ ٹرک ہم سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر رُک گیا اور فوجیوں نے نیچے اُتر کر رائفلیں تان لیں۔ اس پارٹی کا انچارج ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔

''ان سے کہو آگے بڑھنے کی کوشش نہ کریں۔'' میں نے کرنل کے پہلو میں رائفل کی نال سے کچوکا دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر ایک گولی بھی چلی تو تم لوگوں کو چھلنی کر دیا جائے گا۔''

کرنل نے میرے حکم کی تعمیل میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ اُس نے چیخ کر حکم دیا اور تمام فوجی وہیں رُک گئے۔

''کیا چاہتے ہو تم لوگ؟'' کرنل نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس جیپ نے میری بہن کو کچل دیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اس کی تدفین کے لئے پُرسکون فضا اور ان بے گناہ لڑکوں کی رہائی جنہیں پچھلے چند روز کے دوران پکڑا گیا ہے۔''

''اس کے لئے ہائی کمان سے بات کرنی پڑے گی۔'' کرنل نے جواب دیا۔

''اپنے لیفٹیننٹ سے کہو کہ وہ وائرلیس پر مقامی کمانڈنٹ سے بات کرے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ دے سکتا ہوں۔ تیسویں منٹ کے بعد فیصلہ ہمارے حق میں نہ ہوا تو تم لوگوں کو چھلنی کر دیا جائے گا۔''

کرنل نے سیکنڈ لیفٹیننٹ کو قریب بلا کر میرا حکم اُس تک پہنچا دیا۔ اس دوران کچھ نوجوان چہروں پر ڈھاٹے باندھے گلیوں سے نکل آئے تھے۔ اُن میں سے کسی کے پاس رائفل تھی، کسی کے پاس پستول اور کسی نے پتھر اُٹھا رکھے تھے۔ میں نے چیخ کر اُنہیں حکم دیا کہ میری اجازت کے بغیر وہ لوگ کوئی غلط حرکت نہ کریں۔

لیفٹیننٹ ٹرک پر سوار ہو گیا اور وائرلیس پر کمانڈنٹ سے بات کرنے لگا۔ میں ایک مرتبہ پھر کہوں گا کہ میں نے بہت بڑا رِسک لیا تھا۔ لیکن مجھے توقع تھی کہ بھارتی فوج کی ہائی کمان اپنے دو افسروں کو اس طرح مروانا پسند نہیں کرے گی۔

اس دوران تین اور ٹرک وہاں آ گئے تھے اور فوجیوں نے علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ لیفٹیننٹ ٹرک سے اُتر کر بار بار ہمارے پاس آرہا تھا اور میں کرنل کے ذریعے اپنی بات اُس تک پہنچا رہا تھا۔

اور پھر ٹھیک تیسویں منٹ پر میرا مطالبہ مان لیا گیا۔ میں نے ایک اور مطالبہ پیش کر دیا کہ فوج اس وقت تک شہر سے نکل جائے جب تک زینب کی تدفین اور ان لڑکوں کی رہائی عمل میں نہیں آ جاتی۔ اور اگر اس دوران شہر میں کہیں ایک گولی بھی چلی تو ان افسروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔ یہ مطالبہ بھی مان لیا گیا اور چند منٹ کے اندر اندر تمام ٹرک واپس چلے گئے۔

لوگ گلیوں اور کونوں کھدروں سے نکل کر سڑک پر جمع ہو گئے اور میرے اور انگوری کے نام کے نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔

دونوں آفیسروں اور فوجیوں کی آنکھوں پر پٹیاں اور اُن کے ہاتھ پشت پر باندھ کر وہی تینوں نوجوان اُنہیں اپنی نگرانی میں کسی نامعلوم مقام پر لے گئے۔ کچھ اور لوگ بھی اُن کے ساتھ گئے تھے۔

جیپوں پر سے اسلحہ قبضے میں لے کر دونوں جیپوں کو سڑک پر آگ لگا دی گئی تھی۔ لوگوں نے مجھے اور انگوری کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور اُن کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔

ہم دونوں کو کمانڈر کا خطاب مل گیا تھا اور انگوری کو تو دخترِ کشمیر، دخترِ وطن، کشمیر کی شیرنی اور نجانے کن کن خطابات سے نوازا جا رہا تھا۔ انگوری کی دلیری اور حوصلہ مندی وہ دیکھ چکے تھے۔ اُس نے جس طرح لائٹ مشین گن استعمال کر کے دوسری جیپ پر آنے والے فوجی افسروں کو سرنڈر ہونے پر مجبور کیا تھا وہ اُس کا قابلِ تعریف کارنامہ تھا۔

ہمیں تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں روکے رکھا گیا۔ اس دوران بازار کی ساری دُکانیں بھی کھل گئی تھیں۔

پھر ہم مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے ظہور احمد کے گھر آ گئے۔ زینب کی زخموں سے چور چور لاش اُٹھا کر یہیں لائی گئی تھی۔ لوگوں کو پتہ چل گیا تھا کہ شہر کی مختلف سڑکوں پر دکھائی دینے والی وہ پگلی میری بہن تھی۔ لوگ جوق در جوق ظہور احمد کے گھر کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔ گلیوں

میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ ہم بڑی مشکل سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

ظہور احمد کے آس پاس کے کئی مکان خالی کر دیئے گئے تھے۔ وہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے جو مجھ سے ہمدردی کے لئے آئے تھے۔ ظہور احمد کے مکان میں لاتعداد عورتیں بھری ہوئی تھیں۔ مجھے سامنے والے ایک مکان میں پہنچا دیا گیا۔ لاتعداد لوگ صحن کے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے لئے بھی جگہ بنا دی گئی۔ انگوری ظہور احمد کے مکان میں چلی گئی تھی۔

چار بجے کے قریب میت تیار ہو گئی جسے جلوس کی صورت میں شہر کے مرکزی چوک کی جامع مسجد لے جایا گیا اور عصر کی نماز کے بعد جنازے کا جلوس قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔

شہر کی سڑکوں پر پولیس کی تو بھر مار تھی مگر کسی فوجی کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ شاید پہلا موقع تھا کہ اس شہر میں کوئی فوجی دکھائی نہیں دے رہا تھا اور پولیس والے بھی لوگوں سے دُور دُور ہی تھے۔ اگر وہ فوجی آفیسرز ہمارے قبضے میں نہ آئے ہوتے تو صورتحال مختلف ہوتی۔

ہم تدفین کے بعد واپس آ رہے تھے کہ ایک آدمی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا وہ شرافت حسین تھا۔ اُس روز میں اُسی سے ملنے گیا تھا اور واپسی پر ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ شرافت حسین نے دو دن بعد ملاقات کے لئے کہا تھا مگر ہنگامے طول کھینچ گئے تھے اور میں زینب کی وجہ سے بھی ظہور احمد کے گھر میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔

شرافت حسین میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اُس نے مناسب الفاظ میں تعزیت کی اور پھر سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

''پرسوں شام تمہاری باندی پورہ میں افضل عباس نامی ایک شخص سے ملاقات کرانی ہے۔ تم آج ہی رات یہاں سے روانہ ہو جاؤ! وہ تینوں تمہارے ساتھ جائیں گے جو اُس روز تمہیں قبرستان سے نکال کر لے گئے تھے اور آج صبح بھی تمہارے ساتھ تھے۔''

میں چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ شرافت حسین کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''جب تم پہلی بار مجھ سے ملاقات کر کے میری دُکان سے نکلے تو تمہاری حفاظت کے لئے اُن تینوں کو اُسی وقت تمہارے پیچھے لگا دیا تھا۔'' اُس نے سرگوشیانہ لہجے میں بتایا۔ ''وہ تینوں تم سے دُور رہ کر تمہاری نگرانی کرتے رہے ہیں۔ اس لئے آج صبح حادثہ رونما ہوتے ہی وہ تینوں تمہارے قریب پہنچ گئے تھے۔''

''پروگرام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''باندی پورہ پہنچ کر ہی پتہ چلے گا۔'' شرافت حسین نے جواب دیا۔ ''ویسے تمہارے اس کارنامے کی اطلاع بھی اُوپر تک پہنچ چکی ہے۔ تم نے اگرچہ بہت بڑا رسک لیا تھا۔ فوج پورے شہر کو جلا کر راکھ کر سکتی تھی لیکن فوج کے مقامی کمانڈنٹ پر اُوپر سے بہت دباؤ پڑ گیا تھا۔ یہاں بھی اسی رینک کے آفیسرز کمانڈنٹ پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ ان دونوں افسروں کو بچایا جائے۔ اگر کمانڈنٹ اُن کی بات ماننے سے انکار کر کے کسی کارروائی کا حکم دے دیتا تو بھارتی فوج میں

پھوٹ پڑ جاتی۔ کمانڈنٹ کو اس دباؤ میں آ کر تمہارا مطالبہ ماننا پڑا۔ تم نے پہلی مرتبہ فوجی کمانڈنٹ کو اپنے قدموں پر جھکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ تمہاری بہت بڑی کامیابی ہے۔ اُوپر والے تم سے بہت خوش ہیں۔''

شرافت حسین نے دو مرتبہ اُوپر والوں کا ذکر کیا تھا۔ اور میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ اُوپر والے کون ہیں؟ میں نے جب جہاد کے لئے ہاتھ میں رائفل اُٹھائی تھی تو کچھ عرصہ تک کمانڈر محبّ اللہ کے ساتھ رہا تھا۔ اس کے بعد میں اور انگوری آزادانہ طور پر بھارتی فوجیوں کے خلاف کارروائیاں کرتے رہے تھے۔ یوں تو وادی میں مجاہدین کی کئی تنظیمیں بھارتی سامراج کے خلاف برسرِ پیکار تھیں۔ ہم باقاعدہ طور پر کسی ایک تنظیم سے وابستہ نہیں تھے۔ پانزل میں گل فراز نامی مجاہد نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ ہندواڑہ پہنچ کر میں شرافت حسین سے رابطہ کر لوں اور اب شرافت حسین اُوپر والوں کی بات کر رہا تھا اور یہ اُوپر والے میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے کہ کون تھے؟ میں شرافت حسین سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ دو آدمی ہمارے قریب آ گئے اور ہماری گفتگو کا رُخ بدل گیا۔

گھر پہنچے تو شام تک لوگوں کا ہجوم رہا۔ وہ تینوں نوجوان بھی میرے آس پاس منڈلاتے پھر رہے تھے۔ اُن میں سے سعید نامی نوجوان میرے قریب آ گیا۔ وہ دُبلا پتلا سا لڑکا تھا عمر تئیس چوبیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔

''ہم عشا کی نماز کے بعد یہاں سے نکلیں گے کمانڈر......!'' اُس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''فوج کی حراست میں اپنے نوجوانوں اور فوجیوں کے تبادلے کا کیا ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس سلسلے میں ہمارے کچھ آدمی فوجی اور پولیس حکام سے گفت و شنید کر رہے ہیں۔'' سعید نے جواب دیا۔ ''تبادلے کے لئے کل دن میں کوئی وقت مقرر کیا جائے گا۔ ہندوؤں کی ذہنیت سے سب ہی لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ اپنے آفیسروں کی رہائی کے بعد وہ تمہیں اور انگوری کو گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ اُن کا بعض گھروں پر چھاپے مارنے کا پروگرام بھی ہے۔ اس لئے ہم آج ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔''

مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ اپنے افسروں کی رہائی کے بعد بھارتی فوجی بے گناہ نہتے شہریوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں گے۔ میں نے سعید کے سامنے بھی اپنے اس خدشے کا اظہار کر دیا۔

''وہ فی الحال ایسا نہیں کریں گے۔'' سعید نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم نے اُنہیں ایسی چوٹ لگائی ہے جسے وہ کئی روز تک سہلاتے رہیں گے اور اب وہ اپنی حکمت عملی بھی تبدیل کریں گے۔ فوجی افسروں کی گرفتاری کا ذمہ دار مقامی کمانڈنٹ کو ٹھہرایا جا رہا ہے۔ فوج میں بہت اُوپر تک ہلچل مچ گئی ہے اور ممکن ہے اس کمانڈنٹ کو ایک دو روز میں یہاں سے تبدیل کر

کے ہیڈکوارٹر یا کسی اور جگہ بھیج دیا جائے۔''

مجھے سعید کی اس بات سے ذرا بھی اختلاف نہیں تھا۔ ہمارے ہاتھوں فوج کے دو بڑے افسروں کی گرفتاری کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ فوج میں یقیناً اُوپر تک کھلبلی سی مچ گئی ہوگی۔

''تمہارے لئے بھی خطرات بڑھ گئے ہیں۔'' سعید کہہ رہا تھا۔ ''بھارتی فوج کو مطلوب افراد کی فہرست میں تو تم پہلے ہی سے تھے لیکن اب تمہارا نام اس فہرست میں سب سے اُوپر آ گیا ہے۔ اس لئے اُوپر سے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ تمہیں اور انگوری کو آج ہی رات یہاں سے نکال دیا جائے۔''

''یہ اُوپر والے کون ہیں؟'' میں نے وہ سوال کر ڈالا جو شرافت حسین سے پوچھنا چاہتا تھا مگر اس کا موقع نہیں ملا تھا۔

''کمانڈر محبّ اللہ......'' سعید نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کمانڈر محبّ اللہ......؟'' میرے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں......'' سعید کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ''وہ کسی بھی وقت تمہاری طرف سے غافل نہیں رہا۔ تمہاری سرگرمیوں کی رپورٹیں بھی مختلف ذرائع سے اُس تک پہنچتی رہی ہیں۔ پانزل میں گل فراز نے تمہیں ہندواڑہ میں شرافت حسین سے ملاقات کا مشورہ دیا تھا۔ یہ دراصل کمانڈر محبّ اللہ ہی کا حکم تھا جس کی گل فراز نے تعمیل کی تھی۔ گل فراز کی بجائے کسی اور جگہ کوئی اور مجاہد بھی تم سے ملتا تو یہ پیغام تم تک پہنچا دیتا۔''

''لیکن شرافت حسین نے کوئی خاص بات تو نہیں کی۔'' میں نے کہا۔

''یہاں کے حالات کی وجہ سے پروگرام بدل دیا گیا ہے۔ اس لئے اب باندی پورہ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اگر وہاں بھی گڑبڑ ہوئی تو کسی دوسری جگہ کا انتخاب کیا جائے گا جس کی اطلاع ہمیں مل جائے گی۔''

وہاں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے لیکن ہم دونوں اس طرح باتیں کر رہے تھے کہ کسی کو ہم پر شبہ نہیں ہو سکا کہ ہم کسی اہم موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں۔ ویسے میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اُتر گیا تھا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ کمانڈر محبّ اللہ میری طرف سے غافل نہیں تھا۔

عشاء کی نماز ہم نے مرکزی چوک کی جامع مسجد ہی میں پڑھی تھی۔ نماز کے بعد ظہور احمد کے گھر آ کر ہم نے کھانا کھایا۔ اُس وقت بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ جب میں ظہور کے گھر میں داخل ہوا تو انگوری کی خالہ اور اُن کی بیٹی عائشہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ خالہ تو مجھے سینے سے لپٹا کر رو پڑی تھی۔ میں نے انگوری کو الگ لے جا کر بتا دیا کہ آدھے گھنٹے بعد ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔

اور پھر ٹھیک ساڑھے نو بجے میں سعید کے ساتھ اُس مکان سے نکل آیا۔ اُس کے دونوں ساتھی پہلے ہی جا چکے تھے۔ انگوری بھی سیاہ چادر اوڑھے ظہور احمد کے گھر سے نکل آئی۔ اُس

نے اپنی خالہ تک کو نہیں بتایا تھا کہ ہم یہاں سے جا رہے ہیں بلکہ وہ تو کسی کو بتائے بغیر ہی گھر سے نکلی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے تک ہم تنگ اور پُرپیچ گلیوں میں گھومنے کے بعد گنجان آبادی سے باہر نکل آئے۔ آگے آبادی چھدری تھی۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے آبادی مزید کم ہوتی گئی۔ اب پہاڑیوں پر کہیں کہیں اِکا دُکا مکان نظر آ رہے تھے۔

ہم گہری تاریکی میں چلتے ہوئے قبرستان کی طرف نکل آئے لیکن قبرستان میں داخل ہونے کی بجائے اُس کے دائیں طرف سے ہوتے ہوئے گنجان درختوں میں داخل ہو گئے۔ یہ صنوبر کے درختوں کا وہی مختصر سا جنگل تھا جو ایک طرف قبرستان سے ملا ہوا تھا اور دوسری طرف پہاڑی کے دامن تک چلا گیا تھا۔ اُس جنگل میں چنار اور چیڑ کے درخت بھی بکثرت موجود تھے۔

جنگل سے نکل کر ہم پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ سعید چند قدم آگے تھا۔ میں نے انگوری کا ایک ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ ہم دونوں کے کندھوں پر رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ انگوری کی رائفل چادر میں چھپی ہوئی تھی جبکہ ہم سے آگے چلنے والے سعید نے اپنی رائفل ہاتھ میں اُٹھا رکھی تھی۔

ایک جگہ ہم رُک گئے۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا شہر بہت دُور رہ گیا تھا۔ امن اور سکون ہوتا تو یہ چھوٹا سا شہر روشنیوں سے جگمگا رہا ہوتا مگر ہندو غاصبوں نے پوری وادی کا امن وسکون برباد کر رکھا تھا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد بازار بھی بند ہو جاتے تھے اور لوگ بھی اپنے گھروں میں بند ہو کر رہ جاتے تھے۔ تاہم اس وقت شہر میں کہیں کہیں روشنیاں چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

ہم جہاں کھڑے تھے وہ جگہ خاصی بلندی پر تھی اور وہاں سے شہر کے بائیں طرف والی پہاڑی کے دامن میں اُونچی جگہ پر واقع بھارتی فوجی کیمپ کی روشنیاں جگمگاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

سعید وہاں رُک کر کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، پھر ہمیں اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ہم بھی اُس کے پیچھے چل پڑے۔ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سعید پھر رُک گیا۔ وہاں اطراف میں بڑے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے اور جھاڑیوں اور قدِ آدم پودوں کی بہتات تھی۔ سعید ایک طرف رُخ کر کے منہ سے پہاڑی بکرے کی آواز نکالنے لگا۔ جواب میں فوراً ہی دوسرے پہاڑی بکرے کی آواز سنائی دی۔ ہم پودوں میں دبک کر بیٹھ گئے اور رائفلیں بھی ہم نے کندھوں سے اُتار کر ہاتھوں میں لے لی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد ہی تاریکی میں چھوٹے چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے اور قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ دو آدمی تھے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ دو آدمی ہی تھے جو پتھروں کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گئے۔ اُن میں ایک نے سعید کا نام لے کر پکارا اور ہم پودوں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ تاریکی میں اُن دونوں کے چہرے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن آوازوں سے میں نے اُنہیں پہچان

لیا۔ وہ انور اور اشرف نام کے وہی دونو جوان تھے جو سعید کے ساتھ میرے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے اور ہم سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ظہور احمد کے گھر سے رخصت ہو گئے تھے۔

ہم اُن کے ساتھ چلتے ہوئے چٹانوں کے دوسری طرف آ گئے جہاں کھلی جگہ پر بغیر ہڈ کی ایک جیپ کھڑی تھی۔ انور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اشرف نے اُس کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی اور ہم تینوں آمنے سامنے کی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ انگوری میرے ساتھ تھی اور سعید ہمارے سامنے بیٹھا تھا۔

جیپ سٹارٹ ہوئی تو سناٹے میں آواز چٹانوں میں بازگشت سی پیدا کرنے لگی۔ انور نے مڑ کر سعید سے کچھ کہا جسے میں نہیں سن سکا۔ جیپ ایک جھٹکے سے حرکت میں آ گئی۔

جیپ کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ غیر ہموار راستے پر وہ مینڈک کی طرح اُچھلتی ہوئی چل رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد چٹانوں میں گھومنے کے بعد ایک کشادہ راستے پر آ گئی۔ یہ کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی۔ غیر ہموار پتھریلا راستہ تھا۔

ہندواڑہ سے پختہ سڑک کے راستے باندی پورہ جانا ہو تو پہلے بارہ مولا ہائی وے پر سفر کرنا پڑتا ہے۔ سوپور سے کئی میل آگے ایک اور پختہ سڑک وولر جھیل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی باندی پورہ اور پھر جھیل کے اُوپر سے گھومتی ہوئی سمبال سے ہو کر سرینگر تک چلی گئی تھی۔

پختہ سڑک والا راستہ اختیار کرنا ہمارے لئے اس لئے بھی ممکن نہیں تھا کہ ایک تو وہ بہت طویل تھا اور پھر راستے میں فوج کی کسی گشتی پارٹی سے تصادم ہونے کا خطرہ تھا۔ لیکن یہ راستہ جو ہم نے اختیار کیا تھا نا ہموار ضرور تھا مگر ایک تو فاصلہ کم تھا اور دوسرے یہ علاقہ سطح زمین سے تقریباً تین ہزار میٹر کی بلندی پر واقع تھا۔ ان دُشوار گزار پہاڑوں میں بھارتی فوجی دن کے وقت بھی آنے سے کتراتے تھے اور رات کے وقت تو ان سے آمنا سامنا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

کئی گھنٹوں تک ان اُونچے پہاڑوں میں نا ہموار اور نہایت دُشوار راستے پر سفر کرتے ہوئے ہم بالآخر رات کے آخری پہر تین بجے کے قریب مقام نامی گاؤں میں پہنچ گئے۔ باندی پورہ وہاں سے چند میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔

مقام نامی اس گاؤں میں ہم صرف چند منٹ کے لئے رُکے تھے۔ سعید نے بستی کے باہر ہی جیپ رُکوا کر ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا جس سے اندازہ ہوا کہ صاحب مکان جاگ رہا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر شخص سعید کے ساتھ ہی جیپ کے قریب آ گیا۔

''ابھی کل ہی فوج کے ایک دستے نے باندی پورہ پر ریڈ کیا تھا۔'' وہ شخص کہہ رہا تھا۔ ''اور تم جانتے ہو کہ جب کسی بستی سے فوج کو کچھ نہ ملے تو وہ دوسرے تیسرے دن پھر حملہ بول دیتے ہیں۔ بہتر ہے کہ آج کا دن تم لوگ ادھر کا رُخ ہی مت کرو۔ یا تو یہیں رُک جاؤ یا......''

''ہم یہاں نہیں رُک سکتے۔'' سعید نے اُس کی بات کاٹ دی پھر مجھ سے مشورہ کرنے لگا

کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

''یہ تو میرا بھی تجربہ ہے کہ خونی بھیڑیئے کسی بستی پر دوسری مرتبہ ضرور حملہ آور ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں ان کی بات مان لینی چاہیئے۔ اور اگر آج کا دن ہم یہیں رُک جائیں تو شاید اس میں ہماری بھلائی ہو۔''

سعید اور اُس کے ساتھی مجھ سے اختلاف نہیں کر سکے۔ ہم جیپ سے اُتر کر مکان میں داخل ہو گئے۔ انور اسٹیئرنگ کے سامنے ہی بیٹھا رہا۔ وہ شخص ہمیں مکان کے اندر چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد جیپ کے روانہ ہونے کی آواز سنائی دی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ دونوں بھی واپس آ گئے۔ ہم جس کمرے میں بیٹھے تھے وہ خاصا کشادہ تھا۔ فرش پر دری ہی بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں لکڑی کی ایک سالخوردہ چھوٹی میز پر لالٹین رکھی ہوئی تھی۔ وہ شخص کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا معذرت کرنے لگا کہ اس وقت اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں مل سکتی۔ لیکن جب انگوری کو دیکھ کر اُسے کچھ احساس ہوا تو وہ بولا۔

''معاف کرنا بیٹی......آؤ! میں تمہیں دوسرے گھر میں خواتین کے پاس چھوڑ دوں۔''

''میں یہیں ٹھیک ہوں۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔'' انگوری نے جواب دیا۔

''دراصل بات یہ ہے کہ میں یہاں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ میرے گھر والے دوسرے مکان میں ہیں۔'' وہ بولا۔ ''کچھ کھاؤ گے تم لوگ یا قہوہ بنا لیں؟''

''اس وقت تو صرف قہوہ ہی چلے گا۔'' سعید نے جواب دیا۔

اُس شخص کا نام حنیف تھا اور وہ مجاہدین کے لئے مخبر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا تھا۔ اُسے اطلاع تھی کہ ہم آج رات کسی وقت یہاں پہنچیں گے اس لئے وہ ہمارے انتظار میں جاگ رہا تھا۔

حنیف کمرے سے باہر چلا گیا۔ ہم دیواروں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ٹانگیں سامنے کو پھیلا رکھی تھیں۔ جیپ کے اس سفر نے ہمارے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے تھے۔ اگر پیدل چلتے تو شاید اتنی تھکن نہ ہوتی۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی۔

تقریباً بیس منٹ بعد حنیف قہوہ لے کر آ گیا۔ انگوری بھی جاگ گئی۔

گرم گرم قہوہ پینے کے بعد ہمارے حواس کچھ بحال ہوئے لیکن ہم زیادہ دیر تک اسی طرح نہیں بیٹھے رہ سکے۔ تھکن بری طرح سوار تھی اور نیند غلبہ پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ سب سے پہلے انگوری چادر اوڑھ کر آڑھی ترچھی فرش پر لیٹ گئی اور اس کے بعد دوسرے بھی لڑھکتے گئے۔

اگلا دن ہم نے مقام نامی اس بستی میں گزارا، شام سے ذرا پہلے باندی پورہ سے آنے والے ایک آدمی سے ''سب ٹھیک ہے'' کا پیغام مل گیا اور شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد ہم باندی پورہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایک گھنٹے میں ہم باندی پورہ پہنچ گئے۔ افضل عباسی ہمارا منتظر تھا۔ اُس نے جیپ اپنے ایک

آدمی کے حوالے کر دی اور ہمیں لے کر ایک مکان میں پہنچ گیا۔ ایک گھنٹے بعد دو اور آدمی وہاں گئے اور ہمیں بتایا گیا کہ اگلے روز شام سے پہلے ہمیں گندربل پہنچنا ہے جہاں کمانڈر محب اللہ ہمارا منتظر ہو گا۔

میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی بڑا منصوبہ ہے جس کے لئے مجھے اتنی راز داری سے گندربل بلایا جا رہا ہے اور کمانڈر محب اللہ خود بھی وہاں پہنچ رہا ہے۔

ہم رات دو بجے تک باتیں کرتے رہے پھر افضل عباسی اور اُس کے ساتھی چلے گئے اور ہم بھی سونے کی تیاری کرنے لگے۔ میں گہری نیند میں تھا کہ سعید نے ہمیں جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اُس وقت دن کا مدھم سا اُجالا پھیل رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے خمار آلود لہجے میں پوچھا۔

''اُٹھو...... جلدی کرو......!'' سعید چیخا۔ ''فوج نے گاؤں کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے......''

میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا...... میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی......!

○○○

میرے دماغ میں سنسناہٹ بڑھتی جا رہی تھی...... سعید کے علاوہ اشرف اور انور بھی جاگ چکے تھے اور اپنی اپنی رائفلیں چیک کر رہے تھے۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ سعید نے مجھے تو جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا لیکن انگوری کو اُس نے محض آوازیں دینے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ میں نے انگوری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے جھنجھوڑ دیا۔

''انگوری...... اُٹھو جلدی کرو!'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''فوج نے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا ہے...... جلدی سے اُٹھ جاؤ!''

انگوری نے بھی اُٹھنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ اُس نے فوراً ہی اپنی رائفل سنبھال لی۔ اسی وقت افضل عباسی دوڑتا ہوا مکان میں داخل ہوا۔

''تم لوگ میرے ساتھ آؤ...... جلدی کرو!'' افضل عباسی نے تیز لہجے میں کہا۔ ہم اُس کے ساتھ مقان کے عقبی دروازے سے نکل آئے۔ اس طرف ایک تنگ سی گلی تھی۔ افضل عباسی آگے تھا اور ہم اُس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ تین چار تنگ سی گلیاں گھوم کر ہم ایک کشادہ گلی میں نکل آئے۔ ٹھیک اُسی وقت گاؤں کی مشرقی مسجد سے اللہ اکبر کی آواز سنائی دی۔ یہ مسجد گاؤں کے آخری سرے پر تھی اور اُسی طرف وہ سڑک تھی جو گرور، حاجن اور سمبل ہوتی ہوئی سرینگر تک چلی گئی تھی۔ باندی پورہ سے اُوپر شمال کی طرف ترقبال جانے والی سڑک پر ایک بہت بڑا فوجی کیمپ تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ باندی پورہ کو گھیرے میں لینے والی فوج اُسی طرف سے آئی تھی۔

اذان ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اُٹھی۔ اس کے ساتھ ہی مؤذن کی آواز خاموش ہو گئی...... مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بھارتی فوجیوں نے مسجد میں گھس کر مؤذن کو شہید کر دیا تھا۔

میں رُک گیا۔ اب گاؤں کی مرکزی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ میرے پیچھے انگوری اور انور تھے۔ وہ بھی رُک گئے۔ افضل عباسی نے مُڑ کر ہماری طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اُس کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

''رُکو مت کمانڈر...... آگے چلتے رہو!''

''انہوں نے مؤذن کو شہید کر دیا ہے۔'' میں نے بھی چیخ کر جواب دیا۔

''اس وقت ہم کچھ نہیں کر سکتے کمانڈر! میرے ساتھ آؤ۔'' افضل عباسی نے کہا۔ ہم سامنے ایک اور گلی میں داخل ہو گئے اور پھر ایک مکان میں گھس گئے۔ اُس مکان میں عورتیں بھی

تھیں اور بچے بھی۔ دو ادھیڑ عمر آدمی تھے اور ایک جوان لڑکا تھا۔ تینوں مردوں کے ہاتھوں میں آٹو میٹک رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔ صرف ایک منٹ بعد ایک اور نوعمر لڑکا دوڑتا ہوا مکان میں داخل ہوا۔

''ہاں...... کتنے لوگ ہیں اور کہاں کہاں پوزیشن لی ہے اُنہوں نے؟'' افضل عباسی نے اُس لڑکے سے پوچھا۔

''دو ٹرکوں پر تقریباً تیس فوجی ہیں۔ ایک جیپ ہے جس پر دو لیفٹیننٹ اور ایک میجر ہے۔'' لڑکا بتا رہا تھا۔ ''ایک ٹرک گاؤں کے مرکزی چوراہے پر کھڑا ہے۔ فوجیوں نے چاروں طرف رائفلیں تان رکھی ہیں۔ ایک ٹرک اڈے کے پاس ہے۔ اُنہوں نے اڈے کے ساتھ والی مسجد کے پیش امام کو گولیاں مار کر شہید کر دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے...... تم جاؤ اور فقیر حسین سے کہو اپنے آدمیوں کے ساتھ اپنے ٹھکانے پر ہی میرا انتظار کرے۔'' افضل عباسی نے کہا اور لڑکا دوڑتا ہوا مکان سے باہر نکل گیا۔

مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ گاؤں والے مقابلے کے موڈ میں ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اُن کے پاس ایمونیشن بھی کافی مقدار میں موجود ہوگا۔ میں نے فعال کردار ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا......

''یہاں تمہارے پاس کتنے آدمی ہیں، اور ایمونیشن کی صورتحال کیا ہے؟'' میں نے افضل عباسی سے پوچھا۔

''کم از کم بیس آدمی ہیں جو مرتے دم تک مقابلہ کر سکتے ہیں۔'' افضل عباسی نے جواب دیا۔ ''ہمارے پاس گولہ بارود بھی کافی مقدار میں موجود ہے۔ چند روز پہلے ایک جھڑپ میں بھارتی فوجی اسلحہ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے جس پر ہم نے قبضہ کر لیا تھا۔''

''ٹھیک ہے...... ہم اُن کا مقابلہ کریں گے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا ہم کسی ایسی جگہ پر جا سکتے ہیں جہاں سے مرکزی چوک کا جائزہ لیا جا سکے؟''

''ہاں...... میرے ساتھ آؤ!'' افضل نے کہا۔

ایک دو گلیوں اور پھر مکانوں کی چھتوں پر سے ہوتے ہوئے ہم ایک دو منزلہ مکان کی چھت پر پہنچ گئے۔ اُس مکان کی چھت پر خشک لکڑیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ غالباً بہت پہلے درختوں کی لکڑیاں کاٹ کر یہاں ڈال دی گئی تھیں جو اب خشک ہو چکی تھیں۔ اُن میں چند بڑے تنے بھی تھے۔

میں نے انگوری اور سعید وغیرہ کو سیڑھیوں کے قریب ہی رُکنے کا اشارہ کیا اور افضل کے ساتھ لکڑیوں کی آڑ میں سینے کے بل رینگتا ہوا منڈیر کے قریب پہنچ گیا۔

منڈیر تقریباً دو فٹ اُونچی تھی۔ اس کے ساتھ بھی لکڑیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ میں منڈیر کے اُوپر لکڑیوں کی آڑ سے سامنے دیکھنے لگا۔

چوک وہاں سے تقریباً پچاس گز دُور تھا۔ اخروٹ کے ایک بہت بڑے درخت کے نیچے ایک بڑا ٹرک اور اُس کے ساتھ ہی ایک جیپ کھڑی تھی۔ دونوں پر لائٹ مشین گنیں نصب تھیں اور گنر اُن لائٹ مشین گنوں کے سامنے مستعد کھڑے تھے۔

وہ تقریباً اٹھارہ فوجی تھے جو مختلف سمتوں میں رُخ کر کے پوزیشن لئے بیٹھے تھے۔ ایک میجر جیپ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے قریب ہی ایک لیفٹیننٹ کھڑا تھا جبکہ دوسرا لیفٹیننٹ اُن سے دو تین گز دُور ایک میگا فون لئے کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد دو فوجی تین چار مقامی آدمیوں کے ساتھ چوک کے دوسری طرف والی گلی سے نمودار ہوئے۔ گاؤں کے وہ چاروں آدمی بوڑھے تھے اور فوجیوں نے اُنہیں رائفلوں کی زد پر لے رکھا تھا۔ وہ لوگ جیپ کے قریب آ کر رُک گئے۔ میجر اُن سے باتیں کر رہا تھا اور وہ چاروں مسلسل انکار میں سر ہلا رہے تھے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد دوسرا لیفٹیننٹ بھی اُن کے قریب آ گیا۔ وہ بھی اُن سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا پھر میگا فون پر اعلان کرنے لگا۔

''گاؤں والو......'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ کمانڈر شمروز، کمانڈر انگوری اور اُن کے چند ساتھی گزشتہ رات ہندواڑہ سے یہاں پہنچ گئے ہیں اور اُنہوں نے گاؤں کے کسی گھر میں پناہ لے رکھی ہے۔'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گیا۔ میں اپنا اور انگوری کا نام سن کر اُچھل پڑا...... اُنہیں ہمارے ہندواڑہ سے نکلنے اور یہاں پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا......

''ہم اس گاؤں کے باسیوں کو پندرہ منٹ دیتے ہیں ان اُگر وادیوں کو ہمارے حوالے کر دیں۔ پندرہ منٹ بعد ہم گھروں کی تلاشی لیں گے اور پھر ہم کسی کو معاف نہیں کریں گے۔ اور اگر کسی نے مداخلت کی تو اس گاؤں کو جلا کر بھسم کر دیا جائے گا۔''

یہ اعلان کئی مرتبہ دوہرایا گیا۔ بستی کے اُن چاروں آدمیوں کو جنہیں غالباً پوچھ تاچھ کے لئے فوجی پکڑ کر لائے تھے ایک طرف بٹھا دیا گیا تھا۔ میں لکڑیوں کی آڑ سے سامنے دیکھتا رہا۔ وہ تینوں فوجی آفیسر آپس میں کسی قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔

''تم نے کچھ دیر پہلے اُس لڑکے کو فقیر حسین کے پاس بھیجا تھا۔ اُس کے پاس کتنے آدمی ہیں اور وہ کہاں ہیں؟'' میں نے مُڑ کر افضل عباسی سے پوچھا۔

''وہ سامنے کی ایک گلی میں ہے۔ اُس کے ساتھ پانچ آدمی اور ہیں۔'' افضل عباسی نے جواب دیا۔

''اُسے پیغام بھیج دو کہ دو آدمی سامنے سرخ چھت والے مکان پر چلے جائیں اور تین آدمی گلی کو بلاک کر لیں۔'' میں نے چوک کے دوسری طرف ایک مکان کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور تین چار آدمی اُس طرف والی گلی کو بلاک کرنے کے لئے بھیج دو! بھارتی فوجی کھلی جگہ پر ہیں اور ہم ان سے بہتر پوزیشن میں ہیں۔ انشاء اللہ کوئی بھی بھارتی بھیڑیا بچ کر نہیں جا سکے گا۔ اور سعید!'' میں نے مُڑ کر سعید کو مخاطب کیا جو اس دوران جھکتا ہوا ہمارے قریب آ گیا تھا۔ ''تم

اپنے لڑکوں کو لے کر اُس طرف جا کر راستہ بلاک کر دو۔ اگر دوسرا ٹرک اس طرف آنے کی کوشش کرے تو اُڑا دینا۔''

''اور تم لوگ؟'' افضل عباسی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''میں اور انگوری یہیں رہیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ممکن ہو تو ہمیں تھوڑا سا ایمونیشن بھیج دو! ہم یہاں سے بہتر طور پر صورتحال پر نگاہ رکھ سکیں گے۔ جاؤ! اب دیر مت کرو۔ اُنہوں نے پندرہ منٹ کا وقت دیا ہے۔ ہمیں اس مہلت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا چاہئے۔''

افضل اور سعید وغیرہ فوراً ہی وہاں سے رُخصت ہو گئے۔ انگوری میرے قریب آ گئی تھی۔

اُسی وقت میں نے دو آدمیوں کو ایک گلی سے نکل کر بائیں طرف واقع مسجد کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ ذرا آگے بڑھے تو دو فوجیوں نے اُنہیں روک لیا۔ پہلے اُن سے کچھ پوچھتے رہے، پھر ایک فوجی اُن کی تلاشی لینے لگا۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ ہم اپنے ہی گھروں میں محفوظ نہیں تھے۔ ہر شہر، قصبے اور دیہات میں لوگوں کی تلاشی لے کر اُنہیں ذلیل کیا جاتا تھا۔ اگر کسی کی جیب سے ناخن تراش بھی نکل آتا تو ''اسلحہ'' رکھنے کے جرم میں اُس پر بے پناہ تشدد کیا جاتا اور اُسے زندگی بھر کے لئے معذور کر کے پھینک دیا جاتا۔

تلاشی لینے کے باوجود اُن دونوں بوڑھوں کو نماز پڑھنے کے لئے مسجد کی طرف نہیں جانے دیا اور اُنہیں دھکے دے کر واپس جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اسی طرح کئی اور نمازیوں کو بھی مسجد تک نہیں پہنچنے دیا گیا۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ میں نے منڈیر کے قریب لکڑیوں کی آڑ سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ گاؤں میں کوئی نقل و حرکت دکھائی نہیں دی تھی۔ جو چند آدمی نماز پڑھنے کے لئے گھروں سے نکلے تھے اُنہیں واپس بھیج دیا گیا تھا۔ گھروں کے دروازے بند تھے۔ مجھے اپنے آدمی بھی کہیں دکھائی نہیں دیئے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ اپنے اپنے مورچوں پر پہنچ چکے ہوں گے۔

میں ابھی اطراف کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ فضا میں ایک تھرتھراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ یہ چوک والی مسجد کے پیش امام کی آواز تھی۔ لاؤڈ اسپیکر پر اُس کی آواز چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''آج مسجد ویران ہے...... کوئی نمازی اِدھر نہیں آیا...... یاد کرو! تمہارے اسلاف نے تو میدانِ جنگ میں بھی کبھی نماز قضا نہیں کی۔ اسلام کے شیدائیوں نے تو سنگینوں کے سائے میں بھی اپنے رب کے سامنے سجدہ کیا ہے۔ وہ کفر کی طاقت سے کبھی خائف نہیں ہوئے تھے۔ تم آج بت پرستوں کی طاقت......'' میں اُس لیفٹیننٹ اور دو فوجیوں کی طرف دیکھنے لگا جو رائفلیں سنبھالے ایک دم مسجد کی طرف دوڑ پڑے تھے۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی...... مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اب پیش امام کا حشر کیا ہو

گا۔ چند منٹ بعد ہی مولوی صاحب کی آواز سناٹے میں ڈوب گئی...... اور اس کے ایک منٹ بعد اُس ہندو لیفٹیننٹ کی آواز مسجد کے اسپیکر پر سنائی دی۔

''گاؤں والو......'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''پندرہ منٹ کی مہلت ختم ہو گئی ہے...... تمہیں پانچ منٹ اور دیئے جاتے ہیں۔ اگر تم لوگوں نے اُگروادیوں کو ہمارے حوالے نہ کیا تو اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔''

اسپیکر بند ہو گیا اور اس کے دو منٹ بعد وہ منظر دیکھ کر میں کانپ اُٹھا۔ وہ دونوں فوجی مولوی صاحب کو گھسیٹتے ہوئے لا رہے تھے۔ مولوی صاحب کے سر اور چہرے سے خون بہہ رہا تھا۔ اُن کی سفید داڑھی اور کرتہ بھی خون سے تر تھا۔ اُن کے پیچھے آتا ہوا لیفٹیننٹ مولوی صاحب پر ٹھوکریں برسا رہا تھا۔ خون میں تر ہونے کے باوجود مولوی صاحب کی زبان سے اُف تک نہیں نکلا تھا۔ لیکن پھر دفعتہً اُنہوں نے اپنے آپ کو فوجیوں سے چھڑا لیا اور اُن کے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے اور پھر پھیپھڑوں کی پوری قوت سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔

قریب کھڑے ہوئے لیفٹیننٹ نے بڑی پھرتی سے ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور اُس کی نال مولوی صاحب کے منہ میں ٹھونس کر ٹریگر دبا دیا...... مولوی صاحب کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے...... میں تھرا کر رہ گیا۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''اب مزید انتظار کرنا ممکن نہیں انگوری!'' میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''تم جیپ والے گنر کو نشانہ بناؤ! میں اُس لیفٹیننٹ سے نمٹتا ہوں۔ تمہارا نشانہ چوکنا نہیں چاہئے۔''

انگوری نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ منڈیر کے ساتھ پوزیشن لے کر بیٹھ گئی۔ اُس نے رائفل کی نال منڈیر پر ٹکا کر لیفٹیننٹ کا نشانہ لیا اور پھر ہم دونوں کی رائفلیں بیک وقت شعلے اُگلنے لگیں...... مولوی صاحب کو بیدردی سے ہلاک کرنے والے لیفٹیننٹ کو چیخنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ میری پہلی ہی گولی نے اُس کی کھوپڑی اُڑا دی تھی۔ چند گولیاں جسم کے دوسرے حصوں پر بھی لگی تھیں۔ اُس کے ساتھ ایک سپاہی بھی ڈھیر ہو گیا تھا...... دوسرے فوجی کی ٹانگ پر گولی لگی تو وہ چیختا اور لنگڑاتا ہوا جیپ کی طرف دوڑا لیکن میں نے اُسے دو تین گز سے زیادہ آگے جانے کا موقع نہیں دیا اور وہ بھی ڈھیر ہو گیا۔

میں دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ انگوری کی پہلی گولی جیپ پر لائٹ مشین گن کے سامنے کھڑے ہوئے گنر کی گردن میں لگی اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح لہراتا ہوا نیچے گر گیا......

جیپ پر بیٹھے ہوئے میجر نے بدحواس ہو کر ایک طرف چھلانگ لگا دی مگر وہ سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ انگوری کی رائفل کی گولیوں نے اُس کے جسم میں لاتعداد سرخ رنگ کے سوراخ بنا دیئے۔ دوسرے لیفٹیننٹ نے جیپ کی آڑ میں پناہ لے لی اور چیخ چیخ کر اپنے فوجیوں کو آرڈر جاری کرنے لگا......

اور پھر یوں لگا جیسے جہنم کا دہانہ کھل گیا ہو...... تقریباً ڈیڑھ درجن سب مشین گنوں کا رُخ

ہماری طرف تھا۔ گولیوں کی موسلا دھار بارش تھی جس کا رُخ ہماری طرف تھا...... ہم جھک کر منڈیر کی آڑ میں بیٹھ گئے۔ لاتعداد گولیاں دیوار سے ٹکرا رہی تھیں اور لاتعداد گولیاں ہمارے سروں کے اُوپر سے گزر رہی تھیں۔ اور پھر دفعتہً گاؤں کی فضا میں چاروں طرف گولیوں کی آوازیں گونجنے لگیں...... ہمارے آدمیوں نے بھارتی فوجیوں پر چاروں طرف سے فائر کھول دیئے تھے...... ہم پر بھارتی فوجیوں کی فائرنگ کا دباؤ کم ہو گیا۔ میں نے احتیاط سے سر اُٹھا کر دیکھا، فوجی فائرنگ کرتے ہوئے پناہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ اُن میں زیادہ تر ٹرک کی آڑ میں پناہ لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

''مجھے ذرا اس طرف آنے دو!'' انگوری نے مجھے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ میں نیچے دبک کر پیچھے ہٹ گیا۔ انگوری میرے اور منڈیر کی دیوار کے درمیان رگڑ کھاتی ہوئی ذرا آگے نکل گئی اور منڈیر پر رائفل کی نال سیٹ کرنے لگی۔ اس وقت عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر میں نے تیزی سے پیچھے مُڑ کر دیکھا...... وہ افضل عباسی تھا جس نے ایک ہاتھ میں سب مشین گن اور دوسرے ہاتھ میں ایک تھیلا اُٹھا رکھا تھا جس میں سب مشین گنوں کے میگزین بھرے ہوئے تھے۔ انگوری ٹرک کا نشانہ لے رہی تھی۔ پھر اُس نے ٹرائیگر دبا دیا مگر اُس کی رائفل کھٹاکھٹا کر رہ گئی...... اُس نے جلدی سے پیچھے مُڑ کر دیکھا، افضل عباسی اُس سے چھ سات فٹ کے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا اُس نے تھیلے میں سے ایک نیا میگزین نکال کر انگوری کی طرف اُچھال دیا۔ انگوری نے رائفل میں سے خالی میگزین نکال کر نیا میگزین فٹ کیا اور رائفل کی نال دوبارہ دیوار پر ٹکا دی۔ میں نے گردن گھما کر انگوری کی طرف دیکھا، اُس کے پرلی طرف افضل عباسی بھی پوزیشن لے رہا تھا۔

انگوری کی رائفل کا رُخ اگرچہ فوجی ٹرک کی طرف تھا لیکن مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کسی خاص چیز کا نشانہ لے رہی تھی۔ میں نے رائفل کی نال اور ٹرک کی طرف دیکھا اور پھر بات میری سمجھ میں آ گئی۔ ٹرک کا فیول ٹینک اُس طرف سے صاف نظر آ رہا تھا۔

''میری دُعائیں تمہارے ساتھ ہیں انگوری...... فائر!'' میں نے مدھم لہجے میں کہا، انگوری نے ٹرائیگر دبا دیا۔ اس کے فوراً ہی بعد ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا...... دھماکہ اس قدر زوردار تھا کہ مکان کی چھت بھی لرز اُٹھی تھی۔

انگوری کی رائفل سے نکلنے والی گولیاں ٹھیک نشانے پر لگی تھیں۔ ٹرک کا فیول ٹینک پھٹتے ہی کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا اور ٹرک کے پرخچے اُڑ گئے...... ٹرک کے جلتے ہوئے ٹکڑے اخروٹ کے پھیلے ہوئے اور بلند و بالا درخت کی شاخوں میں پھنس گئے۔ کئی جلتے ہوئے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ سیاہ دُھویں کا ایک مہیب بادل تھا جو اخروٹ کے درخت کو لپیٹ میں لے کر فضا میں پھیل رہا تھا۔

میں بڑی تیزی سے اپنی جگہ سے سرکتا ہوا انگوری کے قریب پہنچ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں

بڑی عجیب سی چمک تھی۔ افضل عباسی بھی ہمارے قریب آ گیا اور وہ بھی حیرت سے انگوری کی طرف دیکھ رہا تھا۔

انگوری چمکتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ یکایک اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور وہ رائفل چھوڑ کر بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اُس کا کندھا تھپتھپاتا رہا اور پھر اُسے اپنے سے الگ کر کے چوک کی طرف دیکھنے لگا۔ دُھویں کا بادل اب درخت سے اُوپر فضا میں پھیل رہا تھا۔ ٹرک کے کچھ جلتے ہوئے ٹکڑے اب بھی درخت کی شاخوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ اخروٹ کا درخت دُھویں سے بالکل سیاہ ہو گیا تھا...... درخت کی شاخوں میں ٹرک کے جلتے ہوئے ٹکڑوں کے ساتھ انسانی اعضاء بھی اٹکے ہوئے تھے...... یہ اُن بھارتی فوجیوں کے اعضاء تھے جنہوں نے ٹرک کے پیچھے یا اُس کے اندر پناہ لینے کی کوشش کی تھی۔ ٹرک کے ساتھ اُن کے بھی پرخچے اُڑ گئے تھے اور اُن کے جسموں کے اعضاء درخت کی شاخوں میں اٹک گئے تھے اور کچھ چوک میں اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔

اس دھماکے کے بعد فضا میں اچانک ہی سناٹا چھا گیا تھا...... ہم تینوں اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد دو آدمی دوڑتے ہوئے سامنے والی گلی سے نکل کر سامنے آ گئے۔ اُن دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ افضل عباسی نے اُن میں سے ایک کا نام لے کر پکارا۔

''سب کو جمع کرو! ہم نیچے آ رہے ہیں۔''

اور پھر دوسرے ہی لمحے ہم تینوں سیڑھیوں کی طرف دوڑے۔ جب ہم گلی میں مکان کے دروازے سے نکل کر چوک کی طرف آئے تو وہاں کئی لوگ جمع ہو چکے تھے۔

''یہ کارنامہ کمانڈر انگوری کا ہے۔'' افضل عباسی نے چیخ کر کہا۔ ''اگر یہ ٹرک کو نہ اُڑاتی تو بھارتی درندے بستی کے لوگوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتے تھے۔''

فضا کمانڈر انگوری زندہ باد کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ بستی کے چند خاص لوگوں کے علاوہ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم بستی میں موجود ہیں۔ لیکن اب سب کو پتہ چل گیا تھا۔ لوگ بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مولوی صاحب کی نعش اُٹھا کر مسجد میں پہنچا دی گئی تھی۔ مجھے اور انگوری کو افضل عباسی نے جیپ پر کھڑا کر دیا تا کہ لوگ ہمیں آسانی سے دیکھ سکیں۔ اسی دوران اڈے کی طرف سے دو چار گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد دو آدمی اُس طرف سے دوڑتے ہوئے آ گئے۔ اُن سے ملنے والی اطلاع بڑی دلچسپ تھی۔

جو ٹرک گاؤں کے باہر لاری اڈے پر رُکا تھا اُس پر بارہ فوجی تھے۔ افضل عباسی کے آدمیوں نے اُن میں سے تین کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا، پانچ اپنی جانیں بچا کر پہاڑیوں کی طرف بھاگ نکلے تھے جبکہ چار کو زندہ پکڑ لیا گیا تھا۔

''اُن چاروں کو ہم نے باندھ کر ٹرک میں ڈال دیا ہے۔ کیا کرنا ہے اُن کا؟'' اطلاع لانے والوں میں سے ایک نے پوچھا۔

''اُن کے ساتھیوں کی لاشیں بھی ٹرک میں ڈال دو اور ٹرک یہاں لے آؤ!'' افضل عباسی نے کہا اور دونوں نوجوان واپس دوڑ گئے۔

اُس وقت باندی پورہ کے لوگوں میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر بھارتی فوج کی پوری بٹالین بھی اس گاؤں پر حملہ کر دیتی تو گاؤں کے لوگ اُسے تہس نہس کر دیتے۔ چند منٹ بعد ہی وہ ٹرک وہاں پہنچ گیا۔ اُس پر لگی ہوئی ایک لائٹ مشین گن کے علاوہ ایمونیشن کی چار پیٹیاں، کئی رائفلیں اور دستی بموں کی ایک پیٹی بھی موجود تھی۔ بھارتی فوجی جب کسی بستی کو تاراج کرنے کے لئے نکلتے تو اپنے ساتھ اتنا گولہ بارود لے کر چلتے تھے جیسے طویل عرصہ کے لئے کسی محاذ پر جا رہے ہوں۔

افضل عباسی نے تمام اسلحہ ٹرک سے اُتروا کر کسی مکان میں بھجوا دیا۔ لاری اڈے کے قریب چار مجاہدین شہید ہوئے تھے۔ اُس مسجد کے مؤذن کو اُس وقت شہید کر دیا گیا تھا جب وہ فجر کی اذان دے رہا تھا۔ اُن کی نعشیں بھی چوک والی مسجد میں پہنچا دی گئی تھیں۔

افضل عباسی کا خیال تھا کہ ہمیں اب فوری طور پر گندربل کے لئے روانہ ہو جانا چاہئے۔

''لیکن یہ سب کچھ......؟'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''اس کی تم فکر مت کرو کمانڈر!'' اُس نے کہا۔ ''ایک گھنٹے کے اندر اندر یہاں سب کچھ صاف ہو جائے گا۔''

''یہاں بیس بائیس بھارتی فوجی مارے گئے ہیں جن میں تین آفیسر بھی شامل ہیں۔ ہائی کمان خاموش تو نہیں بیٹھے گی۔ ہوسکتا ہے وہ آج ہی شام سے پہلے پہلے کوئی بڑا حملہ کریں۔'' میں نے کہا۔

''وہ انتقامی کارروائی ضرور کریں گے۔ لیکن ایک دو دن اس کی توقع نہیں۔'' افضل عباسی نے جواب دیا۔ ''وہ یقیناً یہی سمجھیں گے کہ یہاں مجاہدین کا کوئی بڑا گروپ موجود ہے۔ اتنا نقصان اُٹھانے کے بعد وہ فوری طور پر حملہ کرنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ ہوسکتا ہے ایک دو دن تک خاموش رہیں۔ اس دوران بارہ مولا کی طرف سے ایک پارٹی ہمارے پاس پہنچ جائے گی۔ یہاں کے معاملات ہم سنبھال لیں گے۔ تم لوگ گندربل پہنچ جاؤ۔ وہاں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر ایک لڑکے کو اشارہ کیا کہ ہمیں اُس کے گھر پہنچا دیا جائے۔ ہم اُس لڑکے کے ساتھ چلتے ہوئے ایک کشادہ گلی میں داخل ہو گئے۔ اب عورتیں بھی گھروں سے نکل آئی تھیں۔ بچے بھی شور مچاتے ہوئے گھروں سے نکل کر چوک کی طرف جا رہے تھے۔

ہم اُس لڑکے کے ساتھ ایک مکان میں داخل ہو گئے۔ کچھ دیر بعد سعید اور اشرف وغیرہ بھی پہنچ گئے اور پھر باتوں باتوں ہی میں یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ فاضل عباسی، سعید کا حقیقی ماموں ہے اور اس لئے سعید گھر کے زنانہ حصے میں بھی آزادی سے آجا رہا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہمارے سامنے دستر خوان بچھا کر ناشتہ لگا دیا گیا۔ اسی وقت افضل عباسی بھی پہنچ گیا۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ہم تیار ہو کر مکان سے باہر آ گئے۔ سعید تو ایک تنگ سی گلی میں مڑ گیا اور ہم لوگ چوک پر آ گئے۔ گاؤں کے کئی آدمی لکڑیوں کے جلے ہوئے حصے اور انسانی اعضاء کے ٹکڑے اُٹھا کر دوسرے ٹرک میں ڈال رہے تھے۔ چاروں قیدی فوجی درخت کے نیچے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

چند منٹ بعد ہی سعید وہ جیپ لے کر آ گیا جس پر گزشتہ رات ہم نے ہندواڑہ سے یہاں تک سفر کیا تھا۔ ہم نے افضل عباسی اور دوسرے لوگوں کو الوداع کہا اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ جیپ فوراً ہی حرکت میں آ گئی۔

گاؤں سے نکلتے ہی جیپ گرور کی طرف جانے والی سڑک پر آ گئی۔ ہم اُس وقت سمندر سے تین ہزار دو سو میٹر کی بلندی پر تھے۔ ہمارے ایک طرف نیلے پتھروں والے فلک بوس پہاڑ تھے اور دوسری طرف تا حد نگاہ خوبصورت وادی پھیلی ہوئی تھی اور اُس حسین وادی کے پرلی طرف وولر جھیل تھی۔

یہ پختہ سڑک بلند پہاڑوں کے دامن کے ساتھ ساتھ سرینگر تک چلی گئی تھی۔ کشمیر کو ایشیا کا سوئٹزرلینڈ کہا جاتا ہے۔ میں نے سوئٹزرلینڈ نہیں دیکھا لیکن دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ وادی سوئٹزرلینڈ سے بھی زیادہ حسین ہے۔ قدرت نے جی بھر کے اس وادی کو فطری حسن سے نوازا ہے۔ ٹھنڈے اور شفاف پانی کے چشمے، قدم قدم پر گنگناتی ہوئی ندیاں اور جھرنے، برف سے ڈھکی ہوئی فلک بوس پہاڑی چوٹیاں اور اُن پہاڑوں کے دامن میں بہتی ہوئی خوبصورت آبشاریں، پُرسکون جھیلیں، لہلہاتے کھیت، تا حد نگاہ پھیلے ہوئے سبزہ زار، درختوں پر چہچہاتے ہوئے خوش رنگ پرندے اور یہاں پر بسنے والے سادہ لوح باشندے زندگی کے فطری حسن کا دلکش مرقع ہیں۔ وادی میں ہزاروں اقسام کے خوش رنگ پھولوں کے علاوہ اخروٹ، خوبانی، انگور، سیب اور ناشپاتی وغیرہ کے درخت بکثرت ہیں۔ اپنے قدرتی حسن کی بدولت اس وادی کو جنت کا ٹکڑا کہا جاتا ہے۔ لیکن گزشتہ نصف صدی سے مسلط ہندو سامراج نے وادی کی فضا میں زہر گھول رکھا ہے۔ یہاں پھولوں کی خوشبو کی بجائے فضا میں بارود کی بو پھیلی ہوئی ہے...... ہندو غاصب طاقت کے بل بوتے پر وادی کے سادہ لوح اور معصوم لوگوں کو غلام بنانا چاہتے ہیں لیکن کشمیری عوام میں اب اتنا شعور پیدا ہو چکا ہے کہ وہ زیادہ عرصہ تک یہ ظلم وستم برداشت نہیں کر سکتے۔ زنجیریں اب ٹوٹنے ہی والی ہیں......

میں اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی دنیا کی حسین ترین وادی کو دیکھتے ہوئے یہ سب کچھ سوچتا رہا اور جیپ تیز رفتاری سے پہاڑوں میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر دوڑتی رہی۔

دھوپ اگرچہ تیز ہو گئی تھی مگر چاروں طرف پھیلے ہوئے سبزے اور خوشگوار ہوا سے گرمی کا

احساس بالکل نہیں ہو رہا تھا۔

اسٹیئرنگ کے سامنے سعید تھا۔ اُس کے ساتھ والی سیٹ پر انور بیٹھا ہوا تھا۔ میں، انگوری اور اشرف پچھلی سیٹوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ بغیر ہڈ کی جیپ پر ہم چاروں طرف کے نظارے با آسانی دیکھ سکتے تھے۔

اُس سڑک پر سرینگر اور باندی پورہ کے درمیان فوجی گاڑیوں کا گشت جاری رہتا تھا۔ یہ اندیشہ بھی تھا کہ کسی فوجی پارٹی سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ بھارتی فوجی ہیڈ کوارٹر میں شاید ابھی تک باندی پورہ پر حملہ کرنے والی فوجی پارٹی کے انجام کی اطلاع تک نہیں پہنچی تھی۔ اگر اطلاع پہنچ گئی ہوتی تو اب تک کچھ نہ کچھ ہو چکا ہوتا اور سڑکوں پر فوجی گاڑیاں ضرور دندناتی ہوئی نظر آتیں۔ یوں تو پہلے بھی ایسے کئی واقعات رونما ہو چکے تھے جن میں بھارتی فوجیوں کو مجاہدین کے ہاتھوں بھاری نقصان اُٹھانا پڑا تھا لیکن شاید یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ایک جگہ پر بھارتی فوجیوں کا اتنا بھاری نقصان ہوا ہو۔

جیپ ایک چھوٹی سی بستی میں رُک گئی۔ یہاں سے سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک سڑک سنبھل سے ہوتی ہوئی سرینگر کی طرف چلی گئی تھی اور دوسری گندربل کی طرف...... پھر گندربل سے ایک سڑک سرینگر کی طرف جاتی تھی اور دوسری کنگن، سونا مارگ، بتیال، پانچ ہزار دو سو میٹر کی بلندی پر واقع درّہ زوجی لا اور دراس سے ہوتی ہوئی کارگل کی طرف چلی گئی تھی۔

اُس چھوٹی سی بستی میں پہنچ کر پتہ چلا کہ آج صبح سویرے چند میل دُور سرینگر روڈ پر مجاہدین نے کارروائی کر کے ایک فوجی ٹرک تباہ کر دیا تھا جس میں تین بھارتی فوجی مارے گئے تھے۔ اور مجھے حیرت تھی کہ اس کارروائی کے بعد بھی اس شاہراہ پر کسی قسم کی فوجی سرگرمیاں دکھائی نہیں دی تھیں۔

بستی کے ایک ڈھابے پر ہم نے چائے پی اور آگے روانہ ہو گئے۔ اس مرتبہ اسٹیئرنگ انور نے سنبھالا تھا اور میں اُس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ ہمارا رُخ گندربل کی طرف تھا۔ اُس سڑک پر بھی کسی قسم کی فوجی سرگرمی دکھائی نہیں دی جس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ بھارتی درندے تو انتقامی کارروائی میں ذرا بھی دیر نہیں کرتے مگر یہ خاموشی نا قابلِ فہم تھی۔ یہ سکوت اور سناٹا کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ لگ رہا تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ گندربل اب زیادہ دُور نہیں رہ گیا تھا۔ اس وقت ہم نہایت ہی خطرناک راستے پر سفر کر رہے تھے۔ ایک طرف عمودی چٹانیں تھیں اور دوسری طرف سینکڑوں فٹ گہرے کھڈ۔ نشیب میں تا حدِ نگاہ خوبصورت وادی پھیلی ہوئی تھی۔

میں پیچھے کی طرف مُڑ کر انگوری سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور جیپ لڑکھڑا گئی...... میں ایک طرف اُچھل پڑا......

جیپ لہراتی ہوئی تیزی سے سڑک کے کھڈ والے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ انور نے

بڑی پھرتی سے اسٹیئرنگ گھما دیا۔ جیپ کا اگلا پہیہ سڑک کے کنارے سے صرف ایک فٹ کے فاصلے سے مُڑ گیا اور جیپ لہراتی ہوئی دوسری طرف چٹان سے ٹکرا کر رُک گئی۔

ہم سب فوراً ہی چھلانگ لگا کر جیپ سے اُتر گئے اور اِدھر اُدھر دوڑ کر مختلف جگہوں پر پوزیشن سنبھال لی۔

میں چاروں طرف پہاڑیوں میں دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید بھارتی فوجیوں کی کوئی پارٹی ان پہاڑیوں میں گھات لگائے بیٹھی تھی اور اُنہوں نے ہی ہماری جیپ پر فائر کیا تھا۔

کئی منٹ گزر گئے...... کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ کسی طرف سے فائر نہیں ہوا اور نہ ہی آس پاس کی پہاڑیوں پر کوئی نقل و حرکت دکھائی دی۔ میں اُٹھ کر کھلی جگہ پر آ گیا۔ چند سیکنڈ بعد انور اور سعید وغیرہ بھی سامنے آ گئے۔ وہ سب اپنی اپنی رائفلیں سنبھالے محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے لیکن ہر طرف خاموشی تھی۔

سعید جیپ کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کا آگے بائیں طرف والا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ اور تب اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ جیپ کا یہ پہلو عمودی چٹان کی طرف تھا اور ظاہر ہے اس طرف سے کسی حملے کی توقع نہیں تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ ٹائر کسی اور وجہ سے برسٹ ہوا ہے۔ شاید کوئی نوکیلا پتھر اس کا باعث بنا ہو۔

ہمارے پاس کوئی فاضل ٹائر نہیں تھا اس لئے جیپ کو یہیں چھوڑ کر پیدل آگے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ہم نے اپنی اپنی رائفلیں کندھوں پر لٹکا لیں اور چٹان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

تقریباً پانچ سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم رُک گئے گڑگڑ کرتی ہوئی وہ آواز چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی...... آواز سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ یا تو کوئی مسافر بس ہے یا بھارتی فوجی ٹرک جو گندربل کی طرف سے آ رہا تھا۔

ہم سعید کی رہنمائی میں سڑک چھوڑ کر ایک تنگ سے راستے پر پہاڑوں میں داخل ہو گئے اور دُشوار گزار راستوں پر چلتے رہے۔ تقریباً دو سو گز آگے جا کر ہم ایک اُونچی چٹان پر پہنچ گئے۔ یہاں سے سڑک صاف نظر آ رہی تھی۔ اور پھر میرے منہ سے ایک گہرا سانس نکل گیا۔

وہ دو بھارتی فوجی ٹرک تھے جو گندربل کی طرف سے آ رہے تھے...... دونوں ٹرکوں پر ہیوی مشین گنیں نصب تھیں۔ دونوں ٹرکوں کی لمبی سیٹوں پر فوجی سب مشین گنیں سنبھالے مستعد بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے سعید کی طرف دیکھا۔ سعید نے اثبات میں سر ہلا دیا...... دوسرے ساتھیوں کو بھی ہمارے پروگرام سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ ہم نے فوراً ہی مختلف جگہوں پر پوزیشن سنبھال لی۔

وہ دونوں ٹرک جیسے ہی سامنے پہنچے میں نے چیخ کر آرڈر دیا اور ہماری رائفلیں بیک وقت شعلے اُگلنے لگیں...... انگوری میرے ساتھ تھی اور میری طرح وہ بھی ٹرک کے اگلے ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی اور ہمیں ناکامی نہیں ہوئی۔

اچانک فائرنگ سے ٹرکوں کے ڈرائیور ویسے بھی بدحواس ہو گئے تھے۔ پچھلے ٹرک کے ہمارے طرف والے ٹائر دھماکوں سے پھٹ گئے۔ ٹرک لہراتا ہوا سڑک کے کھڈ والے کنارے کی طرف بڑھا۔ میں نے اُس کے اگلے پہیئے سڑک سے اُترتے ہوئے دیکھے تھے اور پھر ہم اُس ٹرک اور اُس میں سوار فوجیوں کا انجام دیکھنے کے لئے وہاں نہیں رُکے تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو چیخ کر حکم دیا اور سب اُٹھ کر پہاڑوں میں اندر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

سڑک کی دوسری طرف سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دوسرے ٹرک کے فوجیوں نے بدحواسی میں اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اور پھر ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ سنائی دیا...... سڑک سے کھائی میں لڑھکنے والا ٹرک اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا......

اُونچے نیچے راستوں پر دوڑتے ہوئے ہمارے سانس پھول گئے اور پھر ہم ایک جگہ درختوں کے سائے میں رُک گئے۔ قریب ہی ایک گنگناتا ہوا جھرنا بہہ رہا تھا۔ تین چار فٹ کی بلندی سے گرنے والے پانی کی آواز مدھر موسیقی کی طرح گنگناتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''کچھ دیر کو یہاں رُک جاؤ......'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ لوگ ہمارے پیچھے نہیں آئیں گے۔ ہم تھوڑی دیر یہاں آرام کر سکتے ہیں۔''

انگوری سعید کے قریب ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ انور اور اشرف بھی درختوں سے ٹیک لگائے کھڑے ہانپ رہے تھے۔ میرا سانس بھی بری طرح پھولا ہوا تھا۔ دو تین منٹ گزر گئے۔ اب میں اپنی کیفیت پر بڑی حد تک قابو پا چکا تھا۔ انگوری اپنی رائفل ایک طرف رکھ کر جھرنے کے قریب پہنچ گئی۔ جس جگہ جھرنے کا پانی گر رہا تھا وہاں ایک چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ وہ تالاب کے کنارے پر بیٹھ کر منہ پر پانی کے چھینٹے دینے لگی۔ اشرف بھی اُس کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر پانی پینے لگا...... ہم تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں رُکے رہے۔ روانگی سے پہلے بھی ہم نے جی بھر کے ٹھنڈا پانی پیا تھا۔

اس مرتبہ سعید ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ راستہ خاصا خطرناک تھا۔ ہم بہت محتاط ہو کر چل رہے تھے جس سے ہماری رفتار بھی خاصی سست تھی۔

سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے ہم ایک ایسی پہاڑی پر پہنچ گئے جس کے دوسری طرف نشیب میں وسیع وعریض وادی پھیلی ہوئی تھی اور اُس وادی میں گندربل کا وہ گاؤں تھا جو ہماری منزل تھی۔

گندربل خاصا بڑا گاؤں تھا۔ رُخصت ہوتی ہوئی دُھوپ میں آبادی سے کچھ فاصلے پر بہنے والے دریا کا پانی چمک رہا تھا اور دوسری طرف ایک بل کھاتی ہوئی سرمئی لکیر سی چمک رہی تھی۔ یہ وہ پختہ سڑک تھی جو سری نگر سے گندربل ہوتی ہوئی لداخ اور کارگل کی طرف چلی گئی تھی۔

آبادی ہم سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر تھی اور سعید کا خیال تھا کہ ہمیں دوسروں کی نظروں سے بچنے کے لئے رات کے اندھیرے میں بستی میں داخل ہونا چاہئے۔ چنانچہ ہم اُس

چٹان پر بیٹھ گئے۔ ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد سورج بلند پہاڑوں کے پیچھے چھپ گیا اور شام کا دھندلکا بتدریج اندھیرے میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔

ہم اُس وقت سطح سمندر سے تقریباً ساڑھے تین ہزار میٹر کی بلندی پر تھے۔ دن کے وقت تو موسم بڑا خوشگوار تھا مگر سورج غروب ہوتے ہی فضا میں خنکی سی آ گئی تھی جس میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

سورج غروب ہونے کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم وہاں سے چل پڑے۔ اندھیرے میں چٹانوں سے اُترنا خاصا خطرناک کام تھا۔ میں نے انگوری کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور ہم بہت احتیاط سے نیچے اُتر رہے تھے۔ سعید، انور اور اشرف ہم سے آگے تھے۔ انگوری کی وجہ سے میں اُن سے پیچھے رہ گیا تھا۔

ایک جگہ ایک پتھر انگوری کے پیر کے نیچے سے نکل گیا۔ وہ لڑکھڑائی، اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ اگر میں فوراً ہی اُسے نہ سنبھالتا تو کم از کم بیس فٹ نیچے گر کر اُس کی ایک آدھ ہڈی ٹوٹ چکی ہوتی یا کوئی جوڑ ہل گیا ہوتا۔

وہ میرے ساتھ لپٹ گئی تھی۔ میں نے اُسے اپنے بانہوں کے حصار میں لے رکھا تھا۔ اُس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا اور اُس کے سینے کا زیر و بم میرے دل میں بھی گداز سا پیدا کر رہا تھا...... مجھے اپنی گردن پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

○○○

میں نے اُسے اپنے سے الگ کر دیا اور پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر احتیاط سے نیچے اُترنے لگا۔ سعید وغیرہ تقریباً پچاس گز آگے ہمارے انتظار میں رُک گئے تھے۔

آبادی اب زیادہ دُور نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن ہمیں ایک جگہ پھر رُک جانا پڑا۔ ہمارے سامنے بہت گہرائی میں دریا بہہ رہا تھا۔ تیز بہاؤ کی وجہ سے پانی کے شور کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ہمارے سامنے رسوں کا ایک پل تھا۔ تیز ہوا کی وجہ سے پورا پل جھولے کی طرح جھول رہا تھا۔ وہ پل پار کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ البتہ یہ اندیشہ ضرور تھا کہ دوسری طرف بھارتی فوجی گھات لگائے نہ بیٹھے ہوں۔

ہم پل کے ساتھ ایک چٹان کے قریب رُک گئے۔ یہاں سے دریا کا پاٹ سو فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ دونوں طرف عمودی چٹانیں تھیں اور اندھیرے میں دوسری طرف کچھ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اشرف نے اپنی رائفل سعید کے حوالے کر دی اور پل پر چڑھ کر آہستہ آہستہ دوسری طرف چلنے لگا۔ اُس نے پل کے رسے کو بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ کچھ دُور تک تو ہمیں نظر آیا، پھر گہری تاریکی میں غائب ہو گیا۔

ہم چٹان کے قریب کھڑے آنے والے لمحات کا انتظار کرتے رہے۔

تقریباً چالیس منٹ بعد سیٹی کی آواز سنائی دی۔ وہ اشرف کی طرف سے کلیئرنس کا سگنل تھا۔ اُسے پل پار کرنے میں تو زیادہ دیر نہیں لگی تھی لیکن ہمیں سگنل دینے سے پہلے اُس نے آس پاس کی چٹانوں میں گھوم پھر کر اپنا اطمینان کر لیا ہو گا۔

سگنل ملتے ہی ہم پل پر آ گئے۔ سب سے آگے سعید تھا، اُس کے پیچھے میں، میرے پیچھے انگوری اور آخر میں انور تھا۔ ہوا بہت تیز تھی اور پل بری طرح جھول رہا تھا۔ پل کی چوڑائی تین فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ نیچے تختے لگے ہوئے تھے اور ہم نے دونوں طرف سے رسوں کو پکڑ رکھا تھا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ درمیان میں ہوا زیادہ تیز تھی۔ ہم چار آدمیوں کا وزن بھی زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوا تھا اور پل زور زور سے ہچکولے لے رہا تھا۔ ایک موقع پر تیز ہوا کے جھونکے سے پل بہت زیادہ جھول گیا تو انگوری کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے جلدی سے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ہم چند سیکنڈ وہاں رُکے اور جب ہوا کا زور کچھ کم ہوا تو آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔

خدا خدا کر کے ہم چٹان پر پہنچ گئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور انگوری کے منہ سے

بھی گہرا سانس نکل گیا۔

اشرف ہمارا منتظر تھا۔ سعید نے اپنی رائفل اُس کے حوالے کر دی اور ہم ایک بار پھر آگے بڑھنے لگے۔

ابھی تو رات کا ابتدائی حصہ تھا۔ ہم کسی قدر بلندی پر تھے اور قصبے میں لوگوں کی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ مرکزی بازار میں تقریباً ساری ہی دُکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ برقی روشنیوں میں زندگی کی یہ نقل و حرکت بہت بھلی لگ رہی تھی۔

ہم قصبے کے باہر رُک گئے۔ قصبے میں اگرچہ فوج کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن پولیس تو بہرحال موجود تھی۔ اور ہم پولیس کی نظروں میں بھی نہیں آنا چاہتے تھے۔

انور سڑک کے دوسری طرف پہاڑیوں میں رُک گیا۔ ہم نے اپنی رائفلیں اُس کے حوالے کر دیں اور ایک ایک کر کے وہاں سے قصبے کی طرف جانے لگے۔ سعید نے مجھے بتا دیا تھا کہ ہم قصبے کے مرکزی بازار میں واقع پیراڈائز جنرل سٹور پر پہنچ کر عبدالغفور نامی شخص سے رابطہ کر لیں۔

سعید اور اشرف کے جانے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد میں اور انگوری بھی پہاڑیوں سے نکل کر سڑک پر آ گئے اور سڑک پار کر کے تیزی سے آبادی کی طرف چلنے لگے۔

انگوری نے کالی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ یہ چادر اب اُس کے لباس کا مستقل حصہ بن گئی تھی۔ بانڈی پورہ میں جب وہ بھارتی فوجیوں پر مکان کی چھت سے گولیاں برسا رہی تھی تو یہ چادر اُس نے پٹکے کی طرح کمر سے باندھ لی تھی۔

ہم مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے قصبے کے مرکزی بازار میں پہنچ گئے۔ میں نے ایک آدمی سے پیراڈائز جنرل سٹور کے بارے میں دریافت کیا تو اُس نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔

''وہ جہاں سبز بتی جل رہی ہے وہی پیراڈائز سٹور ہے۔''

میں انگوری کا ہاتھ پکڑ کر اُس طرف چلنے لگا۔ ابھی چند ہی گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ بازار میں بھگدڑ سی مچ گئی...... چند آدمی ایک طرف سے دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا لیکن اُس کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ البتہ دُکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگی تھیں...... جس سے مجھے کسی گڑبڑ کا اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی۔

میں انگوری کا ہاتھ پکڑ کر تیز تیز چلنے لگا۔ جب ہم پیراڈائز سٹور کے سامنے پہنچے تو ایک آدمی بڑی عجلت میں شٹر گرا رہا تھا۔ دُکان میں اُس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہی عبدالغفور ہے۔

میں اُس سے بات کرنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ہی کسی طرف سے سعید نمودار ہوا...... اُس وقت غفور نے بھی ہماری طرف دیکھا تھا۔

''اندر چلو...... جلدی کرو!'' سعید نے میرے ہاتھ کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ دُکان کا شٹر آدھے سے زیادہ نیچے آ چکا تھا۔ ہم دونوں بھی اُس کے ساتھ ہی جھک کر اندر داخل ہو گئے۔

سعید نے عبدالغفور کی مدد کرتے ہوئے شٹر پوری طرح گرا دیا۔ عبدالغفور نے شٹر کے دونوں طرف تالے لگا دیئے۔ دُکانوں کے شٹروں کو عام طور پر باہر سے تالے لگائے جاتے ہیں لیکن بہت سے دُکانداروں نے کسی ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لئے اندر کی طرف بھی آہنی کنڈے لگا رکھے تھے جن میں ضرورت کے وقت تالے لگائے جاسکتے تھے۔

عبدالغفور نے سیدھے ہوکر ہماری طرف دیکھا، بڑی گرمجوشی سے مجھ سے اور سعید سے ہاتھ ملایا۔ انگوری کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور دُکان کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''میرے ساتھ آ جاؤ...... باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

ہم دُکان کے پچھلے دروازے سے ایک مکان کے مختصر سے آنگن میں نکل آئے۔ عبدالغفور نے دروازہ بند کر کے یہاں بھی تالا لگا دیا اور مکان کے خارجی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ میں چلتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ یہ آنگن زیادہ بڑا نہیں تھا۔ سامنے برآمدہ تھا اور شاید دو کمرے تھے۔ مگر پورے مکان میں اندھیرا تھا جس کا مطلب ہے کہ یہاں کوئی موجود نہیں ہے۔

ہم ایک تنگ سی گلی میں نکل آئے۔ عبدالغفور نے اُس دروازے کو بھی تالا لگا دیا اور ہم اُس کے پیچھے پیچھے گلی میں تیزی سے چلنے لگی۔ اُسی وقت گاؤں میں کسی طرف سے گولیوں کی آواز سنائی دی...... لگتا تھا جیسے پورا برسٹ مارا گیا ہو۔

گلی بہت تنگ اور تاریک تھی۔ تقریباً پچاس گز چلنے کے بعد ہم ایک اور گلی میں مُڑ گئے۔ اُس طرف سے آتے ہوئے دو آدمی اندھیرے میں عبدالغفور سے ٹکرا گئے۔ اُن میں سے ایک نے معذرت کی تو عبدالغفور نے اُس کی آواز پہچان کر کہا۔

''شہر میں گڑبڑ ہو رہی ہے۔ تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟''

''جلدی آ جائیں گے لالہ جی! آپ چلیں۔'' اُس شخص نے جواب دیا۔

وہ گلی زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئی تھی۔ آگے جا کر بائیں طرف چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد عبدالغفور ایک مکان کے سامنے رُک گیا۔ دستک کے جواب میں فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔

باہر سے بظاہر یہ مکان بہت چھوٹا لگتا تھا مگر اندر سے خاصا وسیع و عریض تھا۔ صحن بہت لمبا چوڑا تھا۔ دو کمرے اُس داخلی دروازے کے ساتھ ہی تھے اور سامنے ایل شیپ کا برآمدہ تھا۔ ایک طرف تین کمرے تھے اور دوسری طرف دو۔ برآمدے کے ایک ستون پر سو واٹ کا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔

اُس مکان میں ایک ادھیڑ عمر عورت نے ہمارا استقبال کیا۔ وہ اگرچہ اپنی جوانی گزار چکی تھی لیکن جسمانی ساخت اور چہرے کے نقوش میں اب بھی بڑی کشش تھی۔ اُس نے پھول دار کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پر کالا رُومال بندھا ہوا تھا مگر دوپٹہ یا چادر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

اُس کی قمیض کا گریبان اگرچہ گلے تک بند تھا مگر دوپٹہ یا چادر نہ ہونے کی وجہ سے اُس کا صحت مند سینہ بڑا نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ عبدالغفور کی ایک دُور کی رشتے دار اور بیوہ عورت تھی۔ اُس کا شوہر بھی بھارتی فوجیوں کی درندگی کا شکار ہوا تھا۔ سولہ سترہ سال کی عمر کی ایک بیٹی تھی جو اُس کے ساتھ رہ رہی تھی مگر عبدالغفور کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ بیٹا بھی سرینگر میں پولیس کے ساتھ ایک جھڑپ میں شہید ہو چکا تھا۔ وہ سیکنڈ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا اور تعلیم ہی کے سلسلے میں سرینگر میں اپنے ماما کے پاس رہائش پذیر تھا۔ دو سال پہلے پولیس نے کچھ بے گناہ لڑکوں کو گرفتار کیا تھا جس پر کالج کے سٹوڈنٹس نے احتجاجی مظاہرے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ایک ایسے ہی مظاہرے کے دوران لال چوک پر پولیس نے گولی چلا دی تھی جس سے دو طالب علم جاں بحق ہوئے تھے اور اُن میں ایک عبدالغفور کا بیٹا تھا۔

عبدالغفور بہت عرصے سے مجاہدین کے لئے کام کر رہا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً اُن کی مالی امداد بھی کرتا، اُنہیں اطلاعات بھی فراہم کرتا اور ضرورت پڑنے پر مجاہدین کو پناہ بھی دیتا۔ اُس کا ایک مکان اُس شاہراہ پر تقریباً تیس میل آگے سمبل نامی بستی میں تھا جو صرف مجاہدین کی سرگرمیوں کے لئے مخصوص تھا۔ مجاہدین کی تلاش میں پولیس کئی مرتبہ اُس مکان پر چھاپہ مار چکی تھی لیکن اُسے وہاں سے کبھی کچھ نہیں ملا تھا۔

''ریشم!'' عبدالغفور نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مہمان آ گئے ہیں...... کھانا تیار ہے یا نہیں؟ انہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔''

''کھانا تیار ہے بھائی جی...... میں ابھی دسترخوان بچھاتی ہوں۔'' ریشم نے جواب دیا۔ ریشم نے اُس وقت انگوری کو سینے سے لپٹا رکھا تھا۔ وہ اُسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ اُدھر غسل خانہ ہے بیٹی! باہر بھی پانی کا ڈرم رکھا ہوا ہے۔ تم منہ ہاتھ دھولو! میں کھانا نکالتی ہوں۔ اور بیٹا! تم لوگ بھی منہ ہاتھ دھولو!'' اُس نے آخری الفاظ میرے اور سعید کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے۔

اور پھر اس کے پندرہ منٹ بعد ہم ایک کمرے میں فرش پر بچھے ہوئے دسترخوان کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ریشم کی بیٹی بتول کو بھی انگوری نے اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا۔ صحت مند ماں کے برعکس وہ دُبلی پتلی اور بڑی پیاری سی لڑکی تھی۔

جب میں اُس مکان میں داخل ہوا تو میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی کمانڈر محب اللہ سے ملاقات ہو گی مگر یہاں کمانڈر کو نہ پا کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ عبدالغفور نے پوچھنے پر بتایا کہ وہ آدھی رات کو یہاں پہنچے گا۔

ہم ابھی کھانا کھا رہے تھے کہ باہر کے دروازے پر دستک کی آواز اُبھری۔ عبدالغفور خود اُٹھ کر باہر گیا۔ اُس کی واپسی تقریباً تین منٹ بعد ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے پر تشویش کے اثرات نمایاں تھے۔

''کیا بات ہے کوئی خاص خبر؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''شہر میں کرفیو لگا دیا گیا ہے۔'' عبدالغفور نے جواب دیا۔ ''لیکن خیر پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہنگامے اور کرفیو تو روز کا معمول ہے۔ میرے مہمانوں کو بھی پتہ ہے کہ انہیں کِن راستے سے آنا ہے اس لئے زیادہ پریشانی کی بات نہیں۔ لیکن......''

''لیکن کیا......؟'' میں نے ایک بار پھر سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''لیکن اگر کرفیو زیادہ طول کھینچ گیا تو پریشانی ہوسکتی ہے۔ اس سے ہمارا اگلا منصوبہ متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔''

''یہاں ہنگامہ کس بات پر ہوا تھا؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''باندی پورہ میں ڈیڑھ درجن بھارتی فوجیوں کا تم لوگوں کے ہاتھوں مارا جانا اور راستے میں آٹھ فوجیوں سمیت ایک ٹرک کی تباہی کی اطلاع سرینگر میں فوج کی ہائی کمان تک پہنچ چکی تھی۔'' عبدالغفور نے جواب دیا اور میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ ہمارے کارناموں کی خبریں ہم سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکی تھیں۔ عبدالغفور بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''باندی پورہ والی خبر تو صبح گیارہ بجے کے قریب یہاں پہنچ گئی۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''پولیس کا ایک مسلمان انسپکٹر عنایت اللہ میرا دوست ہے۔ اُس نے شام سے ذرا پہلے مجھے بتایا تھا کہ باندی پورہ اور گندربل میں چند روز پہلے بھی فوج کافی نقصان اُٹھا چکی ہے اس لئے ان دو واقعات کے حوالے سے فوج فوری طور پر کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ البتہ پولیس کو یہ اطلاع فراہم کر دی گئی تھی کہ ان دونوں واقعات میں ملوث اَفراد وادی گندربل کی طرف ہی آرہے ہیں۔ وہ یہاں پناہ لینے کی کوشش کریں گے۔ پولیس کو چوکس کر دیا گیا تھا کہ وہ مشتبہ افراد پر نگاہ رکھیں اور ایسے مشتبہ لوگوں کی نگرانی بھی شروع کر دیں جن کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ مجاہدین کو پناہ دے سکتے ہیں۔'' وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا اور چند لمحوں بعد بولا۔

''شام سے ذرا پہلے پولیس نے دو لڑکوں کو اُن کے گھروں سے پکڑا تھا۔ اُن پر شبہ تھا کہ وہ ہائی وے پر ٹرک کی تباہی والے حادثہ میں ملوث ہوسکتے ہیں۔ پہلے تو ان لڑکوں کے والدین اور قریبی رشتے دار پولیس آفیسر سے مذاکرات کر کے انہیں چھڑانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ہندو اسسٹنٹ کمشنر انہیں چھوڑنے کو تیار نہیں تھا جس پر شہر کے کچھ لوگوں نے پولیس سٹیشن کے سامنے مظاہرہ کیا۔ پولیس نے انہیں لاٹھی چارج کے ذریعے منتشر کرنے کی کوشش کی مگر ہنگامہ بڑھتا گیا۔ لوگوں نے بڑی تعداد میں تھانے کا گھیراؤ کر لیا جس پر پولیس نے گولی چلا دی۔ ابھی میرا یہ آدمی بتا کر گیا ہے کہ تین آدمی زخمی ہوئے ہیں۔ ہنگاموں پر قابو پانے کے لئے شہر میں کرفیو لگا دیا گیا ہے اور اگر یہ کرفیو طول کھینچ گیا تو ہمارا منصوبہ بھی متاثر ہوسکتا ہے جس کے لئے تم دونوں کو بھی یہاں بلایا گیا ہے۔'' اُس نے بات کرتے ہوئے انگوری اور میری طرف دیکھا۔

''اور وہ منصوبہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو کمانڈر محب اللہ ہی بتائے گا...... مجھے تو صرف یہ حکم ملا تھا کہ تم لوگوں کو تلاش کر کے یہاں بلا لیا جائے۔'' عبدالغفور نے جواب دیا۔ ''شہر میں کرفیو ہو یا کچھ اور...... محب اللہ آدھی رات کے وقت ہر صورت میں یہاں پہنچے گا اور اشرف بھی زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں یہاں آجائے گا۔''

چند لمحوں کو خاموشی رہی، پھر آج صبح باندی پورہ اور پھر یہاں سے چند میل دُور رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ سعید اُنہیں ان دونوں واقعات کی تفصیل بتا رہا تھا۔

''اس سے چند روز پہلے......'' سعید کے خاموش ہونے پر عبدالغفور نے کہا۔ ''فوج کے ایک دستے نے مجاہدین کی تلاش کے بہانے باندی پورہ پر ہلہ بول دیا تھا۔ اُس وقت بھی بھارتی فوجیوں کو اپنے ساتھ فوجیوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا اور پھر آج کا واقعہ......'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ میرا خیال ہے پہلا واقعہ ہے جہاں بھارتیوں کو ایک ہی جگہ اتنا بھاری جانی نقصان اُٹھانا پڑا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس لئے ہائی کمان نے فوری طور پر باندی پورہ کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ بدل دیا ہے کیونکہ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ باندی پورہ میں گولہ بارود کے انبار لگے ہوئے ہیں اور مجاہدین بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ویسے باندی پورہ والے واقعہ میں کمانڈر شمروز اور کمانڈر انگوری کا نام واضح طور پر لیا جا رہا ہے۔''

''اور حقیقت ہے یہ کارنامہ انہی دونوں نے انجام دیا ہے۔'' سعید نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''پہلی گولی کمانڈر شمروز نے چلائی تھی اور کمانڈر انگوری کی چلائی ہوئی آخری گولی نے لاتعداد فوجیوں کے پرخچے اُڑا دیئے تھے۔''

کھانے کے بعد بتول اور انگوری نے دسترخوان سمیٹ لیا اور اُس کے تھوڑی ہی دیر بعد ریشم نے قہوہ تقسیم کر دیا۔ الائچی والا قہوہ بلاشبہ بے حد خوش ذائقہ تھا۔

باہر کی فضا میں گہرا سکوت اور سناٹا تھا۔ کبھی کبھار کسی کتے کے بھونکنے یا اِکا دُکا فائر کی آواز سے یہ سناٹا چند لمحوں کے لئے مجروح ہو جاتا اور اس کے بعد پھر وہی گہرا سکوت چھا جاتا۔

انگوری پر اب غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ وہ بتول کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی جبکہ ہماری گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ کشمیری سیاستدانوں کا کردار بھی زیر بحث آیا۔ یہ لوگ سوائے لیڈری چمکانے کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

ان دنوں فاروق عبداللہ پھر برسر اقتدار تھا۔ وہ وزیر اعلیٰ تھا اور اُس کے زہریلے بیانات عوام میں مزید اشتعال پیدا کر رہے تھے۔ وہ تحریک آزادی کو کچلنے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ یہی وہ بے ضمیر آدمی تھا جس کے باپ نے کشمیر کاز سے غداری کی تھی اور کشمیر کی آزادی کا سودا کر

کے بنیا حکمرانوں کے چرنوں میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ کشمیر کا وزیرِاعلیٰ تو بن گیا تھا لیکن اُس کی غداری سے کشمیری مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا تھا اُس کا ازالہ ممکن نہیں تھا۔ بے چارے معصوم کشمیری آج بھی اُس کے گناہوں کی سزا بھگت رہے تھے۔ اگر شیخ عبداللہ کشمیر کاز سے غداری نہ کرتا تو آج کشمیر کی صورتحال مختلف ہوتی۔ فاروق عبداللہ اُس کا بیٹا تھا اُس کی رگوں میں بھی غدار باپ ہی کا خون دوڑ رہا تھا۔ اُس سے وفا کی کیا توقع کی جاسکتی تھی؟ ان دنوں وہ پھر برسرِاقتدار تھا اور تحریکِ آزادی کو کچل دینے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔

اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز اُبھری تو عبدالغفور فوراً ہی اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ ایک منٹ بعد ہی آنگن سے آوازیں سن کر میں نے دروازے سے باہر جھانکا۔ عبدالغفور کے ساتھ دو اور آدمی کمرے کی طرف آرہے تھے۔ اُن میں ایک اشرف تھا اور دوسرا چہرہ میرے لئے اجنبی تھا۔ اُس شخص نے پشت پر ایک بوری لاد رکھی تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر اُس نے بوری نیچے رکھ دی اور ہم سے ہاتھ ملانے کے بعد ایک طرف بیٹھ گیا۔ اشرف بھی ہاتھ ملا کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔

''کوئی دُشواری تو پیش نہیں آئی؟'' عبدالغفور نے پہلے اشرف اور پھر دوسرے آدمی کی طرف دیکھا۔

''کرفیو کی وجہ سے ذرا لمبا چکر لگا کر آنا پڑا۔ اس کے علاوہ تو کوئی اور دُشواری پیش نہیں آئی۔'' دوسرے آدمی نے جواب دیا۔

ریشم بھی آوازیں سن کر آ گئی تھی۔ عبدالغفور نے اُن دونوں کے لئے کھانا نکالنے کو کہا تو وہ باری باری اُن دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''آؤ بیٹا! تم دونوں باورچی خانے میں ہی آجاؤ۔ وہیں میرے پاس بیٹھ کر کھالینا۔''

وہ دونوں اُٹھ کر ریشم کے ساتھ باورچی خانے میں چلے گئے۔ سعید اپنی جگہ سے اُٹھ کر آگے آ گیا اور بوری کے منہ پر بندھی ہوئی ڈوری کھولنے لگا۔ اُس بوری میں ہماری وہ سب مشین گنیں تھیں جو ہم گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے اشرف کے حوالے کر کے آئے تھے۔ بوری میں فاضل میگزین بھی تھے۔ سعید نے رائفلیں اور تمام میگزین نکال کر بوری تہہ کر کے ایک طرف رکھ دی۔ میں نے اپنی اور انگوری والی رائفلیں اُٹھالیں اور اُنہیں چیک کر کے دیوار کے ساتھ ایستادہ کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد اشرف اور اُس کا دوسرا ساتھی حمید بھی کھانا کھا کر آ گئے۔ حمید بتا رہا تھا کہ شہر میں مکمل سناٹا ہے۔ پولیس بڑی تعداد میں گشت کر رہی ہے۔ اہم مقامات پر فوجی گاڑیاں بھی کھڑی ہیں۔ اُس کے خیال میں رات کا باقی حصہ تو شاید خیریت سے گزر جائے لیکن صبح ہنگاموں کا خطرہ ہے۔ وقت دھیرے دھیرے سے گزر رہا تھا۔ اگرچہ ہم سب ہی بری طرح تھکے ہوئے تھے مگر نیند کسی کو نہیں آرہی تھی۔

دو بجے کے قریب دروازے پر ایک بار پھر دستک کی ہلکی سی آواز اُبھری۔ دروازہ محض ایک اُنگلی سے مخصوص انداز میں بجایا گیا تھا۔ عبدالغفور فوراً ہی اُٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس مرتبہ تین آدمی اُس کے ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ اُن میں ایک کمانڈر محبّ اللہ تھا۔ اُسے دیکھ کر ہم سب ہی احتراماً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے مصافحہ کے لئے کمانڈر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اُس نے مجھے کھینچ کر سینے سے لپٹا لیا اور میری پیشانی پر بوسے دینے لگا۔

''میں نے پہلی بار جب تمہیں دیکھا تھا تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ تم اپنی قوم اور اپنے وطن کے لئے بڑے کارنامے انجام دو گے۔'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تمہاری تمام سرگرمیوں کی رپورٹس ملتی رہی ہیں۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ پوری کشمیری قوم کو تم پر فخر ہے۔ اور وہ کہاں ہے ہماری بیٹی...... کمانڈر انگوری؟''

''انگوری سوگئی ہے...... جگا دُوں؟'' میری بجائے عبدالغفور نے کہا۔

''نہیں...... سونے دو! صبح ملاقات کریں گے۔'' کمانڈر محبّ اللہ نے کہا۔ ''آپ لوگوں کو بھوک لگ رہی ہوگی۔ کھانا تیار ہے...... آپ لوگ منہ ہاتھ دھولیں تو......''

''کھانا اس وقت ہم نہیں کھائیں گے۔ قہوہ چلے گا۔ لیکن پہلے پانی پلا دو!'' کمانڈر محبّ اللہ نے کہا۔ عبدالغفور کمرے سے چلا گیا اور ہم سب لوگ فرش پر بچھے ہوئے نمدے پر بیٹھ گئے۔

عبدالغفور ریشم کو قہوہ بنانے کے لئے کہہ کر واپس آ گیا اور محبّ اللہ کو شہر کی صورتحال کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

تقریباً بیس منٹ بعد انگوری کو ٹرے اُٹھائے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر میں چونک سا گیا۔ اُسے شاید ریشم نے جگا دیا تھا اور قہوہ بھی اُس کے ہاتھ بھجوایا تھا۔ اُس نے قہوے کی ٹرے ہم سب کے درمیان رکھ دی۔ کمانڈر محبّ اللہ نے صرف ایک نظر اُس کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انگوری نے اُسے سلام کیا تو کمانڈر محبّ اللہ نے اُسے سینے سے لگا لیا اور اُس کی پیشانی پر بوسے دینے لگا۔ کمانڈر کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر میرا بھی دل بھر آیا۔

''ہمیں تم پر فخر ہے بیٹی!'' کمانڈر محبّ اللہ کہہ رہا تھا۔ ''ہمیں اُس ماں پر بھی فخر ہے جس نے تم جیسی بیٹی کو جنم دیا۔ کشمیر کی قسمت اب بدلنے والی ہے۔ وہ وقت اب زیادہ دُور نہیں جب اِس وادی میں گولیوں کی سنسناہٹ اور توپوں کی گھن گرج کی بجائے آزادی کے نغمے گونجیں گے اور فضا بارود کے دُھوئیں اور زہریلی بو کی جگہ پھولوں کی مسحور کن خوشبو سے مہک اُٹھے گی۔ زندہ باد کشمیر کی بیٹی۔''

ہم سب بیٹھ گئے اور پھر قہوے کی چسکیوں کے دوران کمانڈر محبّ اللہ ہمیں اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگا جس کے لئے ہمیں یہاں لایا گیا تھا۔

میں کمانڈر محبّ اللہ کی باتیں سن کر کانپ اُٹھا...... بڑا ہی خوفناک منصوبہ تھا۔

○

"آج سے ٹھیک ایک ہفتے بعد..." کمانڈر محب اللہ اپنے منصوبے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "اسلحہ اور گولہ بارود کی ایک بہت بڑی کھیپ سرینگر سے کارگل بھیجی جانے والی ہے۔"

انگوری بھی میرے قریب ہی بیٹھی تھی اور ہم سب بڑی توجہ سے کمانڈر محب اللہ کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"یہ فوجی قافلہ تیس بڑے ٹرکوں اور چار جیپوں پر مشتمل ہوگا۔ اٹھائیس ٹرکوں میں گولہ بارود ہوگا جبکہ دو ٹرکوں میں مسلح فوجی ہوں گے...... ایک ٹرک قافلے کے آگے ہوگا اور ایک پیچھے۔ چار جیپوں پر بھی مسلح فوجی ہوں گے۔ دو جیپیں آگے اور دو جیپیں پیچھے۔ ان جیپوں اور ٹرکوں پر لائٹ اور ہیوی مشین گنیں نصب ہوں گی۔ ایک ٹرک پر چار مشین گنیں جن کے رُخ چاروں طرف ہوں گے۔ جیپوں پر لگی ہوئی لائٹ مشین گنوں کی بھی یہی صورتحال ہوگی۔ اس کا مطلب ہے کہ کسی گڑبڑ کی صورت میں وہ چاروں طرف آزادی سے فائر کھول سکیں گے۔"

کمانڈر ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"کارگل کے حالات بتدریج خراب ہوتے جارہے ہیں...... ایک طرف سے ہمارے مجاہد بھائیوں نے بھارتی فوجیوں پر دباؤ ڈال رکھا ہے۔ وہ موقع ملتے ہی بھارتی فوجی چوکیوں پر حملے کر کے یا تو انہیں تباہ کر رہے ہیں یا بھاری نقصان پہنچا رہے ہیں۔ دوسری طرف سے کنٹرول لائن کے اُس پار سے پاکستانی فوج بھارتیوں پر دباؤ ڈال رہی ہے۔ کارگل میں بھارتی فوج اندھا دُھند گولہ بارود استعمال کر رہی ہے۔ اس طرح اُنہیں کچھ دُشواریاں بھی پیش آرہی ہیں۔ سرینگر ہائی کمان نے فوری طور پر گولہ بارود کی ایک بھاری کھیپ کارگل پہنچانے کا انتظام کیا ہے۔ کچھ گولہ بارود تو ہوائی جہاز کے ذریعے پہنچایا جارہا ہے اور کچھ ٹرکوں کے ذریعے بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ پہلا قافلہ ٹھیک ایک ہفتے بعد آج ہی کے دن صبح سویرے سرینگر سے روانہ ہوگا۔ اس طرح گولہ بارود سے لدا ہوا یہ قافلہ باون میل کا فاصلہ طے کر کے صبح نو بجے کے قریب سونا مارگ پہنچے گا۔ فاصلہ اگرچہ زیادہ نہیں مگر راستہ نہایت خطرناک حد تک پُر پیچ ہونے کی وجہ سے قافلے کی رفتار زیادہ تیز نہیں ہوگی۔ اس طرح اس قافلے کو باون میل کا فاصلہ طے کرنے میں تین گھنٹے لگیں گے۔ میری اطلاع کے مطابق سرینگر سے سونا مارگ تک جہاں راستہ بہت زیادہ خطرناک ہے اور مجاہدین کے حملے کا خطرہ ہے وہاں قافلے کی حفاظت کے خیال سے ایک دن پہلے عارضی فوجی چوکیاں قائم کر دی جائیں گی۔ سونا مارگ سے آگے کچھ علاقہ ایسا ہے جہاں حفاظتی چوکیاں نہیں ہیں۔" وہ خاموش ہو کر باری باری ہماری طرف دیکھنے لگا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہمارے پاس دو آپشن ہیں...... ایک تو یہ کہ سونا مارگ سے ٹھیک تین میل آگے ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہم اپنے مورچے قائم کر سکتے ہیں۔ یہاں سے ہم دریا کے راستے اور ناتھ کے غاروں کی طرف اور وہاں سے پہلگام کی طرف نکل سکتے ہیں یا پھر......" وہ ایک بار پھر خاموش

ہو گیا۔ ہم سب کی نظریں اُس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"یا پھر درّہ زوجی لا یا اس سے چند میل پہلے بیتال کے مقام پر بھی ہم اُس قافلے کو اپنا نشانہ بنا سکتے ہیں۔ بیتال سے بھی ہمیں پہلگام کی طرف نکلنے کا راستہ مل سکتا ہے۔ اب یہ طے کرنا ہے کہ اس قافلے پر حملہ کرنے کے لئے کس جگہ کا انتخاب کیا جائے؟"

"تیس ٹرک اور چار جیپیں......" میں نے کمانڈر محب اللہ کے خاموش ہونے پر کہا۔ "بہت بڑا قافلہ ہوگا۔ ہمارے گروپ میں کتنے آدمی شامل ہوں گے؟"

"تقریباً چالیس۔" کمانڈر محبّ اللہ نے جواب دیا۔ "جس جگہ کا بھی انتخاب کیا جائے گا ہمارے آدمی سڑک کے دونوں طرف پہاڑیوں سے حملہ آور ہوں گے۔"

"کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ ہم اپنی ساری قوت ایک جگہ پر جمع کرنے کی بجائے اُسے ٹکڑیوں میں پھیلا دیں؟" میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ ہم قافلے پر حملے کے لئے جس جگہ کا بھی انتخاب کریں وہاں ہمارے آدمی چھوٹے چھوٹے گروپوں کی صورت میں دُور تک پھیل جائیں تاکہ اُس فوجی قافلے کے کسی ایک ٹرک کو بھی وہاں سے نکلنے کا موقع نہ مل سکے۔"

کمانڈر محب اللہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔" وہ بولا۔ "میں تمہاری اس تجویز سے مکمل طور پر اتفاق کرتا ہوں اور میرے خیال میں اس مقصد کے لئے اب سونا مارگ سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ وہ ایسی جگہ ہے کہ ہمارے آدمی سڑک کے دونوں طرف دُور تک بیٹھ سکتے ہیں۔ میں کل ہی تمام آدمیوں کو اطلاع بھجوا دیتا ہوں۔ وہ لوگ ایک دن پہلے سونا مارگ میں جمع ہو جائیں گے۔ کمانڈر رشید اور کمانڈر شہاب الدین اور کمانڈر یاسین بھی اپنے اپنے آدمی لے کر ایک دن پہلے وہاں جمع ہو جائیں گے۔ یہ ایک بڑی کارروائی ہوگی اور اس میں ہمیں زیادہ سے زیادہ اور تجربہ کار آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔"

"لیکن......" میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "بھارتی فوج کی انٹیلی جنس بھی تو غافل نہیں ہوگی۔ وہ پورے علاقے پر نگاہ رکھیں گے۔ وہ ہر اجنبی پر شک کریں گے۔ ہو سکتا ہے مشتبہ افراد کو روک کر اُن سے کسی قسم کی باز پرس بھی کی جائے۔ ہمارے اتنے سارے آدمی سونا مارگ میں جمع ہوں گے تو اُنہیں شبہ ہو جائے گا۔"

"اس کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے۔" کمانڈر محب اللہ نے کہا۔ "سونا مارگ ایک تفریحی مقام ہے۔ وادی کے حالات نہایت خراب ہونے کے باوجود ہندوستان سے لوگ تفریح کے لئے اس طرف بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ سونا مارگ سے آگے چند میل کے فاصلے پر دریا کے قریب امرناتھ نام کے وہ تاریخی غار ہیں جو ہندوؤں کے لئے بہت مقدس ہیں۔ یہ غار ہزاروں سال پرانے ہیں۔ ان کے اندر چٹانوں پر قدیم دیویوں اور دیوتاؤں کی مورتیاں تراشی ہوئی ہیں۔ ہندوستان سے آنے والے ہندو ان غاروں کی یاترا کے لئے اس طرف جاتے رہتے

ہیں۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے چند آدمی ہندو یاتریوں کے بھیس میں سونا مارگ جائیں گے اور کچھ شہر سے تقریباً ایک میل دُور ایک پہاڑی غار میں چھپے رہیں گے اور وقت مقررہ پر اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔''

''ہمارے آدمی آزادی سے اسلحہ تو ساتھ نہیں لے جا سکیں گے۔'' میں نے کہا۔

''کسی کو اسلحہ لے جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ سب خالی ہاتھ ہوں گے۔'' کمانڈر نے جواب دیا۔ ''ہر قسم کا اسلحہ ایک رات پہلے اُس غار میں پہنچا دیا جائے گا۔ اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہندوستان سے آنے والی ہندو یاتریوں کی ایک پارٹی جس میں سرینگر کے کچھ کشمیری ہندو بھی ہوں گے دو دن پہلے سرینگر سے سونا مارگ پہنچے گی۔ تم اور انگوری بھیس بدل کر اُس پارٹی میں شامل ہو سکتے ہو۔''

''کیا......؟'' میں اُچھل پڑا۔

''ہاں......!'' کمانڈر محب اللہ مسکرایا۔ ''تم دونوں ہندوؤں کے بھیس میں آسانی سے سونا مارگ جا سکتے ہو۔ وہاں تمہیں زیادہ پریشانی نہیں ہوگی۔ تم پہلے کبھی سونا مارگ گئے ہو یا نہیں؟''

''نہیں......'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''یہ چھوٹا سا شہر ہے...... تم اسے وادی کا خوبصورت ترین شہر بھی کہہ سکتے ہو۔'' کمانڈر محب اللہ کہہ رہا تھا۔ ''سطح سمندر سے تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع اس شہر کے ایک طرف دریا ہے اور دوسری طرف سبزے سے ڈھکے ہوئے پہاڑ۔ یہیں سے لداخ اور کارگل کی طرف سڑک جاتی ہے۔ اس سے آگے پہاڑی سلسلہ ایک دم بلند ہوتا چلا گیا ہے۔ درّہ زوجی لا گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اُس درّے سے آگے لداخ کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے لیکن درّہ پار کرتے ہی تمہیں یوں لگے گا جیسے دوسری دنیا میں آ گئے ہو۔ زوجی لا تک تو تمہیں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آئے گا۔ رنگ برنگے خوشنما پھولوں کی چادریں بچھی ہوئی نظر آئیں گی۔ لیکن درّے کے اُس پار یہ سب کچھ اچانک ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ہر طرف بے آب و گیاہ اور ویران خاکستری پہاڑ نظر آئیں گے۔ سبزے کے نام پر تمہیں کہیں گھاس کی ایک پتّی تک نظر نہیں آئے گی۔ بہرحال!'' وہ بات کرتے کرتے رُک گیا، پھر بولا۔ ''تمہیں اس طرف تو نہیں جانا۔ تمہاری منزل سونا مارگ ہے۔ چھوٹا سا شہر ہونے کے باوجود سونا مارگ میں سیاحوں اور ہندو یاتریوں کے لئے رہائش کی کوئی پریشانی نہیں۔ وہاں کئی گیسٹ ہاؤسز ہیں...... لیکن تم لوگوں کے لئے گیسٹ ہاؤسز میں قیام خطرناک ہو سکتا ہے۔ کیونکہ پولیس ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز میں قیام کرنے والوں سے پوچھ گچھ کرتی رہتی ہے۔''

''تو پھر...... ہمیں کہاں ٹھہرنا ہوگا؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''کسی مندر میں؟''

''وہاں دو تین مندر بھی ہیں...... اور ہندو یاتری پیسے بچانے کے لئے عام طور پر مندروں

میں ٹھہرتے ہیں۔ لیکن انگوری کے ساتھ کسی مندر میں رات گزارنا بھی تم لوگوں کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔'' اُس نے خاموش ہو کر انگوری کی طرف دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''مندروں کے پجاری بھارتی فوجیوں اور پولیس سے زیادہ خطرناک ہیں۔ وہ نہ صرف انٹیلی جنس والوں کے لئے مخبری کے فرائض انجام دیتے ہیں بلکہ مندر میں قیام کرنے والی جوان اور خوبصورت عورتوں پر ہاتھ صاف کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ بعض اوقات تو وہ کسی عورت کو اس طرح غائب کر دیتے ہیں کہ اُس کا سراغ بھی نہیں ملتا۔''

''تو پھر......؟'' میں نے ایک بار پھر سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''سونا مارگ پہنچتے ہی تم پریتم سنگھ سے ملاقات کرو گے۔'' کمانڈر محب اللہ نے کہا۔ ''بازار میں اُس کی دودھ دہی کی دُکان ہے۔ پریتم سنگھ امرتسر کا رہنے والا ہے لیکن تقریباً پندرہ سال سے یہاں پر ہے۔ اُس کی دُکان تم بہت آسانی سے تلاش کر لو گے۔ روانگی سے پہلے میں شناخت کے لئے ایک دو باتیں بتا دوں گا۔ تم دونوں اُس کے گھر پر رہو گے اور بعد میں تمہیں اُس سے میرا پیغام بھی مل جائے گا۔''

''ٹھیک ہے...... ہمیں کب جانا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''دو دن پہلے تمہیں بتا دیا جائے گا......'' کمانڈر نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''میرا خیال ہے اب تم لوگ سو جاؤ! کل سارا دن سفر میں رہے ہو اور رات بھی ختم ہونے والی ہے۔''

رات ختم ہو چکی تھی۔ اُس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ انگوری اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ عبدالغفور، انور اور دوسرے آدمیوں کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ میں اور سعید اسی کمرے میں رہ گئے تھے۔ سعید تو جگہ ملتے ہی لمبا ہو گیا تھا اور پھر میں نے بھی ٹانگیں پھیلا دیں۔ کچھ ہی دیر بعد میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

○

حراست میں لئے جانے والے لڑکوں کو پولیس نے چھوڑ دیا تھا اور اُن لڑکوں کی رہائی کی وجہ سے شہر میں سکون تو ہو گیا تھا مگر پولیس کی سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں۔ ہر شخص کو شک کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا تھا۔ کئی لوگوں کو روک کر اُن سے پوچھ تاچھ کی جا رہی تھی۔

ہمارے دوسرے آدمی تو اگلے روز صبح ہی باہر جا چکے تھے مگر مجھے اور سعید وغیرہ کو باہر جانے سے روک دیا گیا تھا۔ البتہ انگوری، ریشم کی بیٹی کے ساتھ آزادی سے شہر میں گھوم پھر رہی تھی۔

اور بالآخر وہ وقت آ گیا جس کا مجھے انتظار تھا...... اُس روز دوپہر دو بجے کی بس سے ہمیں روانہ ہونا تھا۔ یہ بس سرینگر سے آنے والی تھی اور اطلاع کے مطابق اُس میں بھی کم از کم بیس ہندو یاتری سفر کر رہے تھے۔ اُن میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی اور بچے بھی۔

دن کے گیارہ بجے ہی ہمارے حلیئے تبدیل کر دیئے گئے۔ مجھے ہندو کا بھیس بدلنے کے لئے

اپنے بالوں کی قربانی دینی پڑی تھی۔ میرے سر پر اُسترا پھیر دیا گیا۔ البتہ کھوپڑی پر چٹیا کی صورت میں کچھ بال چھوڑ دیئے گئے۔ میری یہ چٹیا بھی تقریباً پانچ انچ لمبی تھی جو سر کی حرکت کے ساتھ پھندنے کی طرح جھول رہی تھی۔ گیروے رنگ کے کپڑے، پیروں میں لکڑی کی کھڑاؤں، گلے میں موٹے موٹے موتیوں والی کئی مالائیں اور ماتھے پر دائیں سے بائیں کشکا۔ تین لمبی سفید لکیریں تھیں جو اُوپر نیچے کھینچی گئی تھیں۔ میرے ایک ہاتھ میں سٹیل کا ایک کڑا تھا اور لکڑی کا ایک ترشول۔ دونوں گالوں پر بھی سرخ رنگ سے لکیریں کھینچ دی گئی تھیں اور مزید ستم یہ ہوا کہ میری بھنویں بھی صاف کر دی گئیں۔

اس حلیئے میں مجھے ایک مکمل سادھو یا سوامی بنا دیا گیا تھا۔ میرے کندھے پر ایک میلا سا تھیلا بھی لٹکا دیا گیا جس میں کھانے کی کچھ چیزیں ڈال دی گئی تھیں۔

انگوری کا حلیہ بھی بدل گیا تھا۔ ماتھے پر بندیا، کانوں میں بالیاں اور ناک میں بھی چوڑی کے سائز کی تار جتنی موٹی ایک نتھ پہنا دی گئی تھی۔ ہندو عورتیں اکثر اس قسم کی بالیاں پہنتی تھیں۔ اُس نے بتول کے کپڑے پہن لئے تھے۔ قمیض انگوری کے بدن پر کچھ ٹائٹ تھی جس سے اُس کا شباب اُمڈ آیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

گندربل میں ہندو گھروں کی بھی کمی نہیں تھی اس لئے ہم پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔

ہم ایک بجے عبدالغفور کے گھر سے نکلے۔ کمانڈر محب اللہ کا ایک آدمی ہم سے پہلے نکل گیا تھا اور ایک آدمی ہمارے بعد گھر سے برآمد ہوا تھا۔ پہلا آدمی ہم سے تقریباً بیس گز آگے تھا۔ ہم اُس کے پیچھے پیچھے گلیوں میں چلتے رہے۔ بعض لوگوں نے مُڑ کر بڑی نفرت بھری نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا تھا۔ ایک آدمی نے تو بہت سخت قسم کی گالی بکتے ہوئے جملہ بھی کسا تھا۔ وہ گالی سن کر میرا خون کھول اُٹھا تھا۔ لیکن میں سر جھکائے خاموشی سے چلتا رہا، ظاہر ہے وہ گالی مجھے نہیں دی گئی تھی۔

گلیوں سے نکل کر ہم مین بازار میں آ گئے اور پھر دوسری سڑک پر ہوتے ہوئے لاری اڈے پر پہنچ گئے۔ اڈے پر اس وقت دو جیپیں اور ایک بس کھڑی تھی۔ ایک جیپ تو سونا مارگ کی طرف جانے والی تھی جبکہ دوسری جیپ اور بس کے سامنے سرینگر کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ مسافر برداری کے لئے کشمیر کے تقریباً تمام ہی علاقوں میں جیپیں بھی بکثرت چلتی ہیں۔

سونا مارگ کی طرف جانے والی بس ابھی نہیں آئی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہمارے آگے پیچھے آنے والے دونوں آدمی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اِدھر اُدھر کھڑے تھے۔ میں انگوری کے ساتھ ایک درخت کے نیچے رُک گیا جہاں کچھ اور لوگ بھی کھڑے تھے اور اُن میں تین چار عورتیں بھی تھیں۔ انگوری عورتوں کے قریب کھڑی ہو گئی اور میں لوگوں سے الگ تھلگ زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

ہمیں تقریباً آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا۔ دو بسیں ایک ساتھ ہی وہاں پہنچی تھیں۔ ایک بس

میں تو تمام ہندو یاتری بھرے ہوئے تھے اُس میں کسی اور مسافر کی گنجائش نہیں تھی۔ البتہ دوسری بس میں کچھ ہندو یاتری اور کچھ کشمیری مسلمان تھے۔ کئی سیٹیں خالی بھی پڑی تھیں۔

اسٹاپ پر بارہ مسافر تھے جنہیں اُس بس میں سوار ہونا تھا۔ تین چار عورتیں بس پر سوار ہو چکیں تو میں نے انگوری کو آگے دھکیل دیا اور اُس کے پیچھے ہی میں بھی ہری اوم ہری اوم کہتے ہوئے اُوپر چڑھ گیا۔ انگوری کو ایک عورت نے اپنے ساتھ جگہ دے دی۔ اُس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ بھی تھا۔ مجھے بھی ایک ہندو کے ساتھ ہی جگہ ملی تھی۔ پہلی سیٹ پر ایک سکھ جوڑا بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں یہاں ایک بات بتاتا چلوں کہ سرینگر، سونا مارگ اور پہلگام اور قرب و جوار کے شہروں میں سکھ بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ اور ہندو پولیس اور فوج کے سورما مسلمانوں کی طرح وقتاً فوقتاً انہیں بھی تنگ کرتے رہتے ہیں۔

ہم جتنی دیر لاری اڈے پر کھڑے رہے تھے پولیس والے بار بار وہاں کھڑے ہوئے یا آنے جانے والے لوگوں کو پریشان کرتے رہے تھے۔

بس سوا دو بجے روانہ ہو کر تین بجے کے قریب اٹھارہ بیس میل کے فاصلے پر کنگن کے اڈے پر رُک گئی۔ دریا کے کنارے پر آباد یہ گاؤں زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہاں تین مسافر اُترے تھے اور دو نئے مسافر سوار ہوئے تھے جنہیں سمبل جانا تھا۔ یہاں میں ایک اور وضاحت کرتا چلوں کہ سمبل نام کے دو گاؤں ہیں۔ ایک سرینگر کے مغرب میں باندی پورہ جانے والی شاہراہ پر سونا مارگ سے تقریباً بیس میل پہلے ہے۔

ہماری بس کنگن سے جیسے ہی آگے نکلی پیچھے سے آنے والی ایک فوجی جیپ نے تیزی سے آگے نکل کر راستہ روک لیا...... بس کو رُکنا پڑا۔ اُس جیپ پر نصف درجن فوجی تھے۔ اُنہوں نے بس کو گھیرے میں لے لیا۔ ایک حوالدار بس میں سوار ہو کر بڑی کڑی نظروں سے مسافروں کا جائزہ لینے لگا۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور کندھے پر سب مشین گن بھی لٹکی ہوئی تھی۔

وہ چند منٹ وہیں کھڑا لوگوں کو گھورتا رہا پھر آگے بڑھ کر بعض مسافروں سے سوالات کرنے لگا۔ اور پھر وہ میرے قریب رُک گیا۔

''کہاں سے آئے ہو سوامی جی؟'' اُس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کرخت لہجے میں پوچھا۔

جب اُس نے بس کے دوسرے مسافروں سے پوچھ گچھ شروع کی تھی تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی لیکن اپنے قریب آنے تک میں اپنی کیفیت پر مکمل طور پر قابو پا چکا تھا۔

''سرینگر سے جی!'' میں نے بھی اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ''ہم پانچ سال سے ہری پربت پر شیوا مندر میں آنے والے یاتریوں کی سیوا کر رہے ہیں۔''

''کہاں جا رہے ہو؟'' اُس نے دوسرا سوال کیا۔

''لو دیکھو......'' میں نے کہا۔ ''اس مورکھ کو یہ پتہ نہیں کہ ہندو یاتری امرناتھ کی طرف کیوں جاتے ہیں۔ ہم بھی امرناتھ کے غاروں کی یاترا کو جا رہے ہیں مہاراج!''

وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا، پھر میرے ہاتھ سے ترشول لے کر اُسے اس طرح اُٹھایا جیسے اُس کے وزن کا اندازہ لگانا چاہتا ہو۔ اُس نے ترشول واپس کر دیا اور آگے بڑھ گیا۔ میں ہری اوم ہری اوم کا ورد کرنے لگا۔

اس چیکنگ کی وجہ سے بس تقریباً پندرہ منٹ تک وہاں رُکی رہی۔ اُس حوالدار نے ڈرائیور اور کنڈیکٹر سے بھی کچھ سوالات کئے تھے۔ اُسے یہ بھی بتا دیا گیا کہ سرینگر سے آنے والے تین مسافر گنگن کے اڈے پر اُترے تھے۔

سمبل اور گندر کے آس پاس بھی بس کو روک کر چیک کیا گیا تھا۔ یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ اس شاہراہ پر فوج کی سرگرمیاں کچھ زیادہ ہی تھیں۔ اس کی وجہ یقیناً یہ تھی کہ دو دن بعد یہاں سے ٹرکوں کا ایک بہت بڑا قافلہ گولہ بارود کی بڑی کھیپ لے کر گزرنے والا تھا۔

سونا مارگ کا راستہ واقعی بہت خطرناک تھا۔ کہیں نہایت تنگ موڑ، کہیں خوفناک گھاٹیاں اور کہیں عمودی ڈھلان۔ ڈرائیور کی معمولی سی غفلت کسی خوفناک حادثے کا باعث بن سکتی تھی۔ اس خطرناک راستے کی وجہ سے بس کی رفتار بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔ اور پھر راستے میں جگہ جگہ چیکنگ بھی ہو رہی تھی جس میں خاصا وقت ضائع ہوا تھا۔ اس طرح بس چھ بجے کے قریب سونا مارگ پہنچی تھی۔ ہندو یاتریوں کی دوسری بس ہم سے چند منٹ پہلے وہاں پہنچ چکی تھی۔

سونا مارگ بہت چھوٹا سا شہر ہے۔ اڈے پر گیسٹ ہاؤسز اور ہوٹلوں کے ایجنٹوں نے بس سے اُترنے والے مسافروں کو گھیر لیا۔ آس پاس کئی پولیس والے بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف فوجی ٹرک بھی کھڑا تھا۔ ایک گیسٹ ہاؤس کے ایجنٹ نے ہمیں بھی گھیرنے کی کوشش کی تو ہم اُسے جھڑک کر بس سے اُترنے والے سکھ جوڑے کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

میں نے کچھ چبھتی ہوئی نظریں بھی انگوری اور اپنی طرف اُٹھتی ہوئی محسوس کی تھیں۔ وہ یقیناً سادہ پوش تھے جو بس سے اُترنے والے مسافروں کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔

میں ہری اوم ہری اوم کا اشلوک پڑھتا ہوا چلتا رہا۔ انگوری بھی میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اُس نے سر پر چنری اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ گھونگھٹ سا بن گیا تھا اور اُس کا چہرہ تقریباً چھپ کر رہ گیا تھا۔ وہ سکھ جوڑا ہم سے تقریباً بیس گز آگے تھا۔ میں نے اپنی رفتار اور بڑھا دی۔ میرا خیال تھا کہ اس سکھ کو روک کر سردار پریتم سنگھ کے بارے میں دریافت کروں گا لیکن پھر بازار میں اور سکھوں کو دیکھ کر اُسے روکنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

یہ ایک لمبا سا بازار تھا۔ تقریباً ساری ہی دُکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ بازار میں چہل پہل تھی۔ پولیس تو تھی ہی، اِدھر اُدھر دو دو کی ٹولیوں میں فوجی بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے سامنے سے آنے والے ایک سکھ کو روک لیا۔

''سردار پریتم سنگھ کی ہٹی کہاں ہے بالک؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی مندر کا پتہ پوچھو سوامی جی! پریتم سنگھ کے پاس جا کر کیا کرنا ہے؟'' اُس نے کہتے ہوئے کن انکھیوں سے انگوری کی طرف دیکھا۔

''جانا تو ہم کو مندر ہی ہے بالک!'' میں نے جواب دیا۔ ''سردار پریتم سنگھ کو ایک سندیسہ دینا ہے۔''

''تو پھر ایسا کرو سوامی جی......'' اُس نے کہا۔ ''وہ سامنے جو کھمبا نظر آ رہا ہے نا اُس کے ساتھ بائیں طرف مُڑ جاؤ! اُس طرف تھوڑا ہی آگے دودھ دہی کی ایک دُکان ہے۔ پریتم سنگھ دُکان پر ہی بیٹھا ہوگا۔''

ہم آگے چل پڑے۔ اور پھر اُس سکھ کے بتائے ہوئے راستے پر مُڑ گئے۔ اُس طرف بھی دُکانیں ہی تھیں مگر یہ بازار زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس طرف گھومتے ہی مجھے دودھ دہی کی وہ دُکان نظر آ گئی۔

وہ دُکان ایسی ہی تھی جیسے دودھ دہی کی دُکان ہونی چاہئے۔ آگے سڑک کے کنارے پر لکڑی کے دو بنچ بچھے ہوئے تھے جن پر تین چار گاہک بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ دُکان کا تھڑا آگے کو نکلا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پتھروں کا بڑا سا چولہا تھا جس پر دودھ سے بھری ہوئی کڑاہی رکھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف دو بڑی بڑی گول سینیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک میں برفی اور دوسری میں جلیبیاں تھیں جن پر چاندی کے ورق لگے ہوئے تھے۔ کڑاہی اور سینیوں کے درمیان چوکی پر ایک ادھیڑ عمر کا سکھ بیٹھا ہوا تھا۔ موسم میں اگرچہ خاصی خنکی تھی مگر اُس کے جسم پر پھولدار کپڑے کی نیکر بنیان کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سر کے بال بھی جوڑا بن کر ایک جالی میں کسے ہوئے تھے۔ اُس کے سامنے ایک اور چوکی سی تھی جس پر گلاس اور پیالے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔

دُکان اندر سے خاصی بڑی تھی۔ دو تین بنچ اندر بھی پڑے ہوئے تھے لیکن اندر کوئی گاہک نہیں تھا۔ دُکان کے پچھلے حصے پر ٹاٹ کا ایک پردہ بھی ٹنگا ہوا تھا۔ پردہ آدھا ہٹا ہوا تھا اور اُس کے دوسری طرف بھی دو بنچ نظر آ رہے تھے۔ ایک گتے پر فیملی رُوم لکھا ہوا تھا۔

میں نے انگوری کو ایک طرف رُکنے کا اشارہ کیا اور خود آگے بڑھ گیا۔

''جی آیا نوں سوامی جی!'' سردار پریتم سنگھ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''کیا سیوا کروں آپ کی سوامی جی؟''

''کھٹی لسی ملے گی سردار جی؟'' میں نے قدرے آگے جھکتے ہوئے اتنے مدھم لہجے میں کہا کہ باہر بنچوں پر بیٹھے ہوئے لوگ نہ سن سکیں۔

''آہو جی...... آہو جی...... اندر آ جاؤ سوامی جی!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اُدھر فیملی رُوم میں بیٹھ جاؤ! اوئے چھوٹے کہاں مر گیا ہے؟ سوامی جی کو اندر بٹھا۔''

دس گیارہ سال کی عمر کا ایک لڑکا پتہ نہیں کہاں سے نکل کر وہاں پہنچ گیا۔ میں اور انگوری اُس

کے ساتھ دُکان میں داخل ہو کر پچھلے حصے میں بینچوں پر بیٹھ گئے۔ لڑکے نے پردہ کھینچ دیا۔

پندرہ منٹ گزر گئے میں دُکان کے اس حصے میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف کوکا کولا اور پیپسی کی بوتلوں کے کئی خالی کریٹ اُوپر نیچے رکھے ہوئے تھے۔ ایک دیوار پر بابا گرونانک کی رنگین تصویر والا پرانا کیلنڈر بھی لٹکا ہوا تھا۔ بائیں طرف ایک دروازہ بھی تھا جس کے سامنے ٹاٹ کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ یہ دروازہ غالباً پہلو کی گلی میں کھلتا تھا۔

پانچ منٹ اور گزر گئے اور پھر پریتم سنگھ لسی کے دو بڑے گلاس لے کر اندر داخل ہوا۔ اُس نے ایک گلاس انگوری کے ہاتھ میں تھما دیا اور ایک میری طرف بڑھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے آگے جھک کر سرگوشی کی۔

''لسی پی کر اس دروازے سے باہر نکل جانا...... چھوٹا باہر کھڑا ہو گا۔ وہ تمہیں میرے گھر پہنچا دے گا۔ ایک گھنٹے بعد میں بھی آ جاؤں گا۔'' اُس نے دوسرے دروازے کا پردہ ایک طرف ہٹا کر دروازہ بھی کھول دیا تھا۔

ہم اطمینان سے بیٹھے لسی پیتے رہے۔ انگوری میری طرف دیکھ کر بار بار مسکرا رہی تھی۔ لسی پینے کے بعد خالی گلاس بنچ پر ہی رکھ دیئے اور میں انگوری کو اشارہ کر کے اُٹھ کر بغلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

یہ ایک تنگ سی گلی تھی۔ اُس وقت شام ہو چکی تھی اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ گلی میں وہ لڑکا ہمارا منتظر تھا۔ ہمیں دُکان سے نکلتے دیکھ کر کچھ کہے بغیر گلی کے اندر کی طرف چل پڑا۔

تقریباً پندرہ منٹ تک مختلف تنگ سی گلیوں میں گھومنے کے بعد وہ ایک مکان کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ ہم باہر ہی رُک گئے۔ دو تین منٹ بعد ایک عورت دروازے میں نمودار ہوئی۔

''آپ باہر کیوں رُک گئے سوامی جی؟ اندر آ جایئے نا'' اُس نے کہا ہم دونوں اندر آ گئے تو عورت نے دروازہ بند کر دیا۔

وہ امریتا کور تھی پریتم سنگھ کی بیوی۔ اُس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ دراز قامت، صحت مند اور خاصی حسین عورت تھی۔ اُس نے ہمیں ایک کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا اور تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے سامنے میز پر کھانا لگا دیا۔

''تسی روٹی کھا لو جی! سردار جی تو ذرا دیر سے آئیں گے۔'' اُس نے کہا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ ان لوگوں کو پہلے سے ہمارے آنے کی اطلاع تھی اس لئے خاص طور پر یہ کھانا تیار کیا گیا تھا۔ بھنی ہوئی مرغی اور آلو کی بھجیا بھی تھی۔ ایک پلیٹ میں سوجی کا حلوہ بھی تھا۔ کئی روز بعد اتنا لذیذ کھانا ہمارے سامنے آیا تھا۔

سردار پریتم سنگھ تقریباً دو گھنٹوں بعد آیا تھا۔ اس وقت اُس نے دھوتی اور کرتہ پہن رکھا تھا۔ سر پر وہی جالی تھی جس میں بال جوڑے کی شکل میں جکڑے ہوئے تھے۔ سردار پریتم سنگھ ہمیں لے کر فوراً ہی پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اُس طرف بھی ایک تنگ سی گلی تھی۔ دو تین گلیاں

گھومنے کے بعد ہم ایک کھلی جگہ پر نکل آئے۔ آگے پہاڑی سلسلہ تھا۔ پہاڑیوں کے دامن میں بھی مکان تھے لیکن ایک دوسرے سے فاصلے پر۔

پریتم سنگھ ایک مکان کے سامنے رُک گیا۔ دستک کے جواب میں دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک نوعمر سکھ تھا۔ یہ دو کمروں کا مکان تھا جس کے دوسری طرف بہت لمبی چوڑی جگہ خاردار تاروں سے گھری ہوئی تھی اور اس طرف سے ایک بھینس کے ڈکرانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ دراصل باڑہ تھا۔ اُس طرف ایک بہت بڑا شیڈ بنا ہوا تھا جس کے نیچے دس بارہ بھینسیں اور گائیں بندھی ہوئی تھیں۔ شیڈ کے بائیں طرف دو اور کمرے تھے۔ ایک کمرے میں بھوسہ وغیرہ بھرا ہوا تھا جبکہ دوسرا کمرہ خالی تھا اور ہمیں اُس کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

اس کمرے میں دری بچھی ہوئی تھی۔ دو چار تکیے بھی اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔

''آپ آرام سے یہاں پر رات گزارو جی!'' سردار پریتم سنگھ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کسی چیز کی ضرورت ہو تو سریندر سنگھ کو بتا دینا...... یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ کوئی غم فکر مت کرنا۔''

''اس وقت چائے مل جائے تو......''

''ضرور ضرور......'' اُس نے میری بات کاٹ دی اور نوجوان سریندر سنگھ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''انہیں چائے بنا کر دو! اور خیال رکھنا پروہنوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔'' وہ میری طرف مُڑ گیا۔ ''اب میں چلتا ہوں جی...... رات کو دُکان بند کر کے آؤں گا۔''

پریتم سنگھ چلا گیا۔ سریندر سنگھ نے دیوار کی ایک ہضمی الماری کھول کر دو کمبل نکال کر دری پر رکھ دیئے اور باہر چلا گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ چائے لے آیا۔ دودھ والی چائے بھی کئی روز بعد پینے کو ملی تھی۔ سریندر سنگھ بھی ہمارے پاس ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ بار بار انگوری کو دیکھ رہا تھا۔

سریندر سنگھ کی عمر بیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ پہلے وہ سرینگر میں تھا اُس نے سرینگر ہی سے گریجویشن کیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ پڑھ لکھ کر بڑا آفیسر بنے گا لیکن کشمیر تو کیا پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی طرح سکھ بھی ہندوؤں کے تعصب کا شکار تھے۔ سرکاری محکموں میں ان پر بھی ملازمتوں کے دروازے بند تھے۔ اگر سفارش اور رشوت سے کسی سکھ کو کلرک کی نوکری مل بھی جاتی تو وہ زندگی بھر کلرک کی کرسی پر بیٹھا قلم گھستا رہتا۔ اُس کے لئے ترقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

گریجویشن کرنے کے بعد سریندر بھی سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے ایک سال تک دھکے کھاتا رہا اور بالآخر پریتم سنگھ نے اُسے اپنے پاس بلا لیا۔ اب وہ مویشیوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور دُکان میں بھائی کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ چائے پینے کے بعد بھی سریندر سنگھ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اس علاقے میں مسلمان مجاہدین کی سرگرمیوں کے حوالے سے بھی باتیں ہوئی

تھیں جن سے پتہ چلا کہ پچھلے دو مہینوں سے اس طرف کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔ اِکا دُکا معمولی واقعات تو ہوتے رہتے تھے لیکن انہیں زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ البتہ ایک بات پر وہ حیران ضرور تھا اس علاقے میں چند روز سے پولیس اور فوج کی سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں۔ اور اُس کے خیال میں یہاں کوئی بڑا آپریشن ہونے والا تھا۔

سریندر سنگھ چلا گیا۔ اُس نے بتا دیا تھا کہ وہ سامنے والے کمرے میں موجود ہوگا کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف اُسے آواز دے لیں۔

سریندر کے جانے کے بعد انگوری نے چیزی اُتار کر ایک طرف دری پر رکھ دی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ بتول دُبلی پتلی سی لڑکی تھی اور انگوری اُس کے مقابلے میں صحت مند۔ بتول کی قمیض اُس کے جسم پر خاصی ٹائٹ تھی۔ اُس کا بدن اس قمیض میں کسا ہوا تھا۔ اُس کے سینے کے اُبھار تو خاصے نمایاں ہو گئے تھے۔

وہ ذرا سا آگے جھکی تو مجھے اپنا دل کن پٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا...... گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میری نظریں قمیض کے گریبان کے اندر تک رینگ گئی تھیں۔ میں اُٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا اور تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

چند منٹ بعد ہی اپنے دونوں کندھوں پر ہلکا سا دباؤ محسوس کر کے میں چونک گیا۔ وہ انگوری تھی جو دبے قدموں کمرے سے نکل کر میرے پیچھے کھڑی ہو گئی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر تھے اور اُس کے سینے کے گداز اُبھار میری پشت کو چھو رہے تھے...... میرے دل کی دھڑکنیں ایک بار پھر بے ترتیب ہونے لگیں۔ میں نے انگوری کا ایک ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے سامنے کر لیا......

OOO

جس جگہ ہم کھڑے تھے وہاں کوئی بلب نہیں تھا البتہ بھینسوں والے شیڈ میں بتی جل رہی تھی جس کی روشنی ہم تک بھی پہنچ رہی تھی۔

''انگوری!'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتی ہو ہم اس وقت کس قسم کے حالات سے دوچار ہیں...... ہم زندگی کے اہم ترین مشن کے ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ ہمیں محتاط رہنا چاہئے۔ کوئی معمولی سی غفلت ہمیں اپنی منزل سے بہت دُور لے جا سکتی ہے۔''

''مجھے احساس ہے......'' انگوری نے جواب دیا۔ ''مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ہم کس کاز کے لئے کام کر رہے ہیں۔ وطن کی آزادی ہمارے لئے سب سے زیادہ اہم ہے۔ اسی کے لئے تو ہم اپنے سروں پر کفن باندھے پھر رہے ہیں...... میں یہ سب کچھ کیسے بھول سکتی ہوں؟ اپنے ماں باپ کے قتل کو کیسے فراموش کر سکتی ہوں......؟ ان ہزاروں شہدا کا خیال ذہن سے کیسے نکال سکتی ہوں جنہوں نے اس آزادی کی جدوجہد میں اس مقدس سرزمین کو اپنا خون پلایا...... کشمیر کی ان ماؤں اور بیٹیوں کو کیسے بھول سکتی ہوں جنہیں ان بھیڑیوں نے ہوس کا نشانہ بنا کر زندگی بھر کے لئے انہیں زندہ درگور کر دیا...... میں زینب کو کیسے بھول سکتی ہوں جس نے میرے سامنے جان دی اور......''

''اگر تم میں یہ احساسات اور جذبات نہ ہوتے تو آج تمہارے ہاتھوں میں رائفل نہ ہوتی۔'' میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کوئی معمولی سی غفلت یا کوتاہی ہمیں اپنی منزل سے بھٹکا سکتی ہے۔''

''ایسا نہیں ہوگا شمروز!'' انگوری نے جواب دیا۔ ''میری زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کاز کے لئے وقف ہے۔ لیکن میں تمہارا خیال بھی ذہن سے نہیں نکال سکتی۔ کبھی میں محسوس کرتی ہوں کہ تم بیٹھے تو میرے قریب ہو لیکن مجھ سے بہت دُور چلے گئے ہو۔''

''یہ محض تمہارا وہم ہے......'' میں نے جواب دیا۔ ''میں تو چوبیس گھنٹے تمہارے پاس ہی رہتا ہوں لیکن......''

''لیکن کیا......؟'' اُس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

''لیکن وعدہ کرو کہ ہم اپنی کسی ذاتی خوشی یا غرض کو زندگی کے اس عظیم ترین مقصد پر حاوی نہیں ہونے دیں گے جس کے لئے ہم نے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''وعدہ......'' انگوری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اُس کی آنکھیں روشن ستاروں کی طرح چمک اُٹھی تھیں۔ وہ چند لمحے میری آنکھوں میں جھانکتی رہی اور پھر بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔

میں نے اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اُس وقت نہ تو میرے جسم میں سنسنی پھیلی تھی اور نہ ہی انگوری نے بے چینی کا اظہار کیا تھا۔

''باہر سردی ہو رہی ہے...... آؤ! اندر چل کر بیٹھیں۔'' میں نے اُسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ کوئی ہمیں اس طرح لپٹے ہوئے دیکھ نہ لے۔ اس طرح بات کچھ سے کچھ ہو جاتی۔

باہر واقعی سردی ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ فضا میں گوبر کی ناگوار سی بو بھی پھیلی ہوئی تھی۔

ہم اندر آ گئے اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ انگوری نے اپنی ٹانگیں سامنے کو پھیلا لی تھیں۔ میں نے ایک کمبل کھول کر اُس پر ڈال دیا اور دوسرا خود لے لیا۔ ہم اسی طرح بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اور پھر انگوری اونگھنے لگی۔ میرے ذہن پر بھی غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ میں نے انگوری کو پوری طرح کمبل اوڑھا دیا اور اس سے کچھ فاصلے پر اپنے اُوپر کمبل لپیٹ کر لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر بعد میری آنکھ لگ گئی......

باتوں کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ گیا۔ دروازے کے قریب ہی کمرے میں تین آدمی تھے۔ ایک پریتم سنگھ تھا اور اُس کے ساتھ دو آدمیوں کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ دونوں ہندو تھے اور دوپہر کو گندربل کے لاری اڈے پر ہمارے ساتھ ہی اُس بس پر سوار ہوئے تھے۔ وہ پچھلی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ سونا مارگ کے اڈے پر بھی میں نے اُنہیں بس سے اُترتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ دوسرے ہندو مسافروں کے ساتھ چلے گئے تھے اور میں انگوری کے ساتھ اُس سکھ جوڑے کے پیچھے چل پڑا تھا۔

''متر جی......'' پریتم سنگھ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے دو متر اور آ گئے ہیں۔ اب تمہاری خوب گپ شپ رہے گی۔ یہ عبدالستار ہے اور یہ حبیب الرحمٰن۔'' اُس نے باری باری دونوں کی طرف اشارہ کیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''اب تم لوگ آرام کرو! سویرے ملاقات ہو گی۔ اُس وقت تک رب راکھا۔''

سردار پریتم سنگھ چلا گیا۔ میں نے الماری سے دو کمبل نکال کر اُن کے حوالے کر دیئے اور خود اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔ اُن میں سے ایک نے مجھے میرے نام سے مخاطب کیا تو میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اور پھر دلچسپ انکشاف ہوا کہ وہ کمانڈر محب اللہ کے آدمی تھے اور اُنہیں اس خیال سے ہمارے پیچھے بھیجا گیا تھا کہ اگر ہم راستے میں کسی اُلجھن میں پھنس جائیں تو وہ ہماری مدد کر سکیں۔ سونا مارگ پہنچ کر جب ہم سردار پریتم سنگھ کی دُکان میں داخل ہو گئے تھے تو وہ دونوں مطمئن ہو کر واپس چلے گئے تھے اور پھر اُنہوں نے کچھ اور لوگوں سے بھی رابطے کئے تھے اور بالآخر یہیں آ گئے تھے۔

آوازوں سے انگوری کی آنکھ نہیں کھلی تھی وہ اطمینان سے سوئی تھی۔ میں بھی کمبل میں منہ لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

میں رات کو اگرچہ دیر سے سویا تھا۔ مگر صبح سویرے بھینسوں کی آوازیں سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ اُس وقت اچھی خاصی سردی تھی۔ میں ایک کمبل لپیٹ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ پریتم سنگھ کا چھوٹا بھائی سریندر سنگھ بھینسوں کو گتاوا (چارہ) ڈال رہا تھا اور دو آدمی بھینسوں کا دودھ نکال رہے تھے۔ وہ دونوں بھی سکھ ہی تھے۔

ابھی ملگجا سا اُجالا تھا۔ دن کی روشنی پوری طرح پھیلنے سے پہلے پہلے وہ دونوں آدمی اپنے کام سے فارغ ہو گئے۔ دودھ کے چار بڑے کین تھے اور میرے خیال میں ہر کین پینتیس چالیس سیر کا تو ہو گا۔ اُنہوں نے کین اُٹھا کر باہر ریہڑے پر رکھے اور رخصت ہو گئے۔

سریندر سنگھ اپنے کام میں مصروف رہا۔ بھینسوں اور گائیوں کو چارہ ڈالنے کے بعد وہ گوبر صاف کرنے لگا۔ شیڈ کے ایک کونے میں گوبر کا ڈھیر لگا کر وہ شیڈ کے دوسرے حصے میں چلا گیا جہاں چار خچر بندھے ہوئے تھے۔ اُس نے خچروں کی بھی ٹہل سیوا کی، اُنہیں چارہ وغیرہ ڈالا اور ایک طرف لگے ہوئے ہینڈ پمپ پر جا کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔

اُس وقت دھوپ نکل رہی تھی۔ سریندر سنگھ اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔ وہ کرتے کے دامن سے ہاتھ پونچھتا ہوا میری طرف آ گیا۔

''چائے چلے گی یا دودھ کا گلاس لے آؤں؟'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''چائے ہی ٹھیک رہے گی۔'' میں نے جواب دیا اور آہٹ پا کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ انگوری بھی کمرے سے نکل کر باہر آ گئی تھی۔ اُس نے بھی کمبل لپیٹ رکھا تھا۔

''ٹھیک ہے...... میں دس منٹ میں چائے لے کر آتا ہوں۔'' سریندر سنگھ تیز تیز چلتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

اُس روز ناشتہ بھی بڑا زوردار تھا۔ سریندر سنگھ گھر سے پراٹھے بنوا کر لایا تھا۔ میرے خیال میں اگر چند روز یہاں رہنے کا موقع ملتا تو ایسی خوراک کھا کر ہٹے کٹے ہو جاتے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم سردار پریتم سنگھ سے رخصت ہو گئے۔ اس مرتبہ عبدالستار اور حبیب الرحمٰن ہمارے ساتھ ہی تھے۔ ہم لوگ بازار کی طرف جانے کی بجائے باہر ہی باہر چلتے ہوئے پہاڑی کے دامن میں واقع ایک گیسٹ ہاؤس میں پہنچ گئے۔ یہاں گیسٹ ہاؤس کے باہر ہجوم تھا اور لوگ بھی جمع تھے۔ وہ سب ہندو تھے۔ اُن میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی اور بچے بھی۔ کچھ کشمیری مسلمان بھی خچر اور گدھے لئے اُن کے آس پاس موجود تھے۔ بعض لوگوں سے خچروں کے معاملے میں سودے بازی ہو رہی تھی۔ انگوری عورتوں کے بیچ میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک کشمیری ہمارے قریب آ گیا۔ اُس نے حبیب الرحمٰن کی طرف جھک کر کچھ کہا اور ہم اُس کے ساتھ چل پڑے۔

چند گز دُور ایک درخت کے نیچے ایک دُبلا پتلا سا آدمی چار خچر لئے کھڑا تھا۔ یہ خچر ہمارے لئے تھے۔ اُن کا انتظام کس نے کیا تھا؟ مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔

انگوری بھی ہماری طرف آ رہی تھی لیکن میں نے اُسے وہیں رُکے رہنے کا اشارہ کیا اور درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور پھر میں نے اُونچی آواز میں ایک بھجن گانا شروع کر دیا۔

ہمارے گاؤں میں ہندوؤں کے چند گھر بھی ہوا کرتے تھے۔ ہمارے پڑوس میں ایک پنڈت رہا کرتا تھا وہ اکثر یہ بھجن گایا کرتا تھا اور اس وقت اتفاق سے مجھے یہ بھجن یاد آ گیا تھا۔

میری آواز بھی اچھی پاٹ دار تھی۔ ڈاک بنگلے کے سامنے کھڑے ہوئے لوگ میری طرف دیکھنے لگے۔ میں آنکھیں بند کئے اُونچی آواز میں بھجن گاتا رہا۔

بھجن ختم کرنے کے بعد بھی میں آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا۔

''چلئے مہاراج! قافلہ روانگی کے لئے تیار ہے۔''

یہ آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک ادھیڑ عمر ہندو ہاتھ جوڑے میرے سامنے کھڑا تھا۔ دوسرے لوگ بھی میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں ہری اوم کا نعرہ لگاتا ہوا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

سب لوگ خچروں پر سوار ہو چکے تھے۔ میں بھی اپنے خچر پر سوار ہو گیا۔ کشمیری مسلمان خچروں کی باگیں پکڑے آگے آگے چل رہے تھے۔ بعض سواروں نے اپنے خچروں کی باگیں خود ہی سنبھال رکھی تھیں۔

مجھے ابھی تک پتہ نہیں تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ بہرحال یہ اطمینان تھا کہ یہ سب کچھ پلاننگ کے تحت ہو رہا ہے۔ ہمیں کسی ایسی جگہ پہنچایا جائے گا جہاں سے ہم اصل منزل کی طرف جا سکیں گے۔ حبیب الرحمٰن کا خچر میرے ساتھ تھا اور وہ مجھے بتا رہا تھا......

''یہاں سے چار کوس کے فاصلے پر دریا کے کنارے پہاڑیوں میں مہا دیو مندر ہے جس میں بھگوان کرشن کی صدیوں پرانی مورتیاں رکھی ہوئی ہیں۔ پہاڑ کی کھوہ میں واقع اس مندر کے اندر رکھی ہوئی مورتیوں کو بڑے بڑے چٹانی پتھروں سے تراش کر بنایا گیا ہے...... اس مندر کو بھی بہت مقدس سمجھا جاتا ہے اور اماوس کی رات اس مندر میں خاص پوجا ہوتی ہے۔ یہ سب لوگ رات اس مندر میں رہیں گے۔''

''کیا ہم لوگ بھی ان کے ساتھ رہیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں کمانڈر......'' حبیب الرحمان نے جواب دیا۔ ''رات کے اندھیرے میں ہم اُس مندر سے نکل جائیں گے اور......''

ایک اور خچر سوار ہندو کو اپنی طرف آتے دیکھ کر حبیب الرحمٰن خاموش ہو گیا۔ وہ ہندو اپنا خچر میرے سامنے لے آیا۔ پہلے میرے بھجن کی تعریفیں کرتا رہا پھر بولا۔

''مہاراج! سب لوگوں کی اچھا ہے کہ آپ وہ بھجن ایک بار پھر سنائیں۔ اُمید ہے کہ آپ

مایوس نہیں کریں گے۔''

میں نے حبیب الرحمٰن کی طرف دیکھا اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور پھر میں نے اُونچی آواز میں وہ بھجن گانا شروع کر دیا۔

شہر سے باہر نکلتے ہی فوجی چوکی پر ہمیں روک لیا گیا۔ ایک لیفٹیننٹ گہری نظروں سے ایک ایک شخص کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ بعض لوگوں سے کچھ سوالات بھی کئے۔ پھر ہمارے قافلے کو آگے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

سڑک پر تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمارا قافلہ دریا کی طرف مُڑ گیا۔ وہ شخص سب سے آگے تھا جس نے مجھ سے بھجن کی فرمائش کی تھی۔ وہی اس قافلے کا رہنما بھی تھا۔

ایک طرف پہاڑیاں تھیں جو پہلے بتدریج بلند ہوتی چلی گئی تھیں اور دوسری طرف ذرا گہرائی میں دریا بہہ رہا تھا۔ دریا اور چٹانوں کے درمیان ایک تنگ سا پتھریلا راستہ تھا اُس پتھریلے راستے پر صرف خچروں اور گدھوں پر ہی سفر کیا جا سکتا تھا۔ کسی مشینی سواری کے اس طرف آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہمارا قافلہ اُس تنگ سے راستہ پر چلتا رہا۔ کہیں ہم دریا کے بالکل کنارے پر پہنچ جاتے اور کہیں چٹانوں کے بیچ میں جہاں راستہ زیادہ دُشوار تھا۔

پانچ کوس کا فاصلہ تقریباً دو گھنٹوں میں طے ہوا۔ وہ مندر دریا کے عین سامنے تھا۔ چٹانوں میں ایک بہت بڑا غار تھا۔ دہانے کے دونوں طرف اور اُوپر کی دیواروں کو تراش کر کرشن بھگوان کی مورتیاں بنائی گئی تھیں۔ غار کے اندر بالکل سامنے چٹانی پتھر سے تراشی ہوئی کرشن بھگوان کی ایک بہت بڑی مورتی ایستادہ تھی۔ غار میں اندھیرا دُور کرنے کے لئے کئی مشعلیں جل رہی تھیں۔ دیواروں کو بھی تراش کر مورتیاں اُبھاری گئی تھیں۔

اُس مندر میں پہلے سے کئی پجاری موجود تھے۔ قافلے میں آئے ہوئے لوگ اپنے ساتھ لائی ہوئی چیزیں کرشن بھگوان کی مورتی کے سامنے بھینٹ کرنے لگے۔ اُن میں ناریل اور کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ کئی قیمتی چیزیں بھی شامل تھیں۔ بہت سی عورتوں نے اپنے سونے چاندی کے زیورات بھگوان کے قدموں میں ڈال دیئے تھے۔ سکوں اور نوٹوں کا بھی ڈھیر لگ گیا تھا۔

میں اندر کا ایک مختصر سا چکر لگا کر باہر آ گیا۔ یہاں مندر کے سامنے دریا کے کنارے پر ایک بہت بڑا پختہ چبوترا بنا ہوا تھا۔ کئی لوگ اُس چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اور انگوری بھی ایک طرف بیٹھ گئے۔ حبیب الرحمٰن اور عبدالستار ابھی مندر کے اندر ہی تھے۔

شام ہونے سے پہلے یاتریوں میں بھنڈارہ (کھانا) تقسیم ہونے لگا۔ مٹی کی کٹوریوں میں دال اور روٹیاں تھیں۔ اس کھانے کا انتظام پہلے ہی سے کیا گیا تھا۔

انگوری نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارہ کیا اور کھانا کھانے لگا۔ انگوری نے بھی کھانا

شروع کر دیا۔ حبیب اور عبدالستار بھی اپنا کھانا لے کر وہیں آ گئے تھے۔

سورج غروب ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد شام کا اندھیرا گہرا ہونا شروع ہو گیا۔ مندر کے اندر مشعلیں جل رہی تھیں۔ دو مشعلیں دروازے کے دائیں بائیں بھی لگی ہوئی تھیں جن کی روشنی آس پاس تک ہی محدود تھی۔

فضا میں گہری تاریکی تھی۔ یہ اماوس کی رات تھی۔ آسمان بہت دُور تھا۔ ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کی روشنی زمین تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ چاند کا تو نام و نشان تک نہیں تھا۔

مندر کے اندر اب ناقوس اور گھنٹیاں بجنے لگیں تھیں۔ اور پھر کسی کے بھجن گانے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ہی گھنگھروؤں کی جھنکار بھی سنائی دے رہی تھی۔ باہر بیٹھے ہوئے لوگ بھی اُٹھ اُٹھ کر اندر جانے لگے۔

مجھے شبہ تھا کہ بھجن گانے کے لئے مجھے بھی بلایا جائے گا۔ مجھے صرف وہی ایک بھجن یاد تھا جو میں دو مرتبہ اُن لوگوں کو سنا چکا تھا۔ اگر کسی اور بھجن کی فرمائش کی گئی تو میں پھنس جاؤں گا۔

''میرا خیال ہے اب کھسک لینا چاہئے۔'' حبیب الرحمٰن نے کھسک کر میرے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ان کے بھجن شروع ہوئے ہیں، پھر پوجا پاٹ ہو گی اور یہ سلسلہ رات بھر چلتا رہے گا۔ اس وقت موقع ہے ہم اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ سب لوگ مندر کے اندر ہیں بعد میں شاید ایسا موقع نہ ملے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ دونوں دریا کے ساتھ ساتھ اُوپر کی طرف چلتے رہیں۔ راستہ بالکل صاف ہے۔''

میں انگوری کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کو مندر کی طرف دیکھا، اندر کوئی عورت رقص کر رہی تھی۔ میں چبوترے سے اُتر گیا اور انگوری کا ہاتھ پکڑے اندھیرے میں ایک طرف چلنے لگا۔ تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کر کے ہم رُک گئے۔ اور اس کے چند سیکنڈ بعد ہی پیچھے سے چھوٹے چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہم ایک بڑے پتھر کے ساتھ چپک کر کھڑے ہو گئے۔

''کمانڈر......'' یہ حبیب الرحمٰن کی آواز تھی۔ میں نے جواب دے کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ وہ دونوں ہمارے قریب آ گئے۔

''ہمارے پیچھے چلتے رہو کمانڈر!'' حبیب الرحمٰن نے کہا اور وہ دونوں ہمارے آگے آگے چلنے لگے۔ ہم اُن کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ میں نے انگوری کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ تاریکی اس قدر گہری تھی کہ دو قدم آگے کی چیز بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کئی مرتبہ مجھے اور انگوری کو پتھروں سے ٹھوکریں لگی تھیں۔ ہم تقریباً ایک گھنٹہ دریا کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ تاریکی اور سناٹے میں دریا کے بہتے ہوئے پانی کی آواز بڑا پُراسرار تاثر دے رہی تھی۔

ہم بالآخر ایک جگہ رُک گئے۔ آگے دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے پتھر تھے اور بائیں طرف تقریباً سو گز ہٹ کر چٹانوں کا سلسلہ تھا۔ حبیب الرحمٰن کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتا

رہا، پھر چٹانوں کی طرف چلنے لگا۔

اندھیرے میں چٹانوں میں چلنا خاصا دُشوار تھا۔ بار بار ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔ اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ ہم میں سے کوئی کسی سنگین حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔ تھوڑا اور فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر رُک گئے۔

''میرا خیال ہے ہم چٹانوں میں کافی اندر آ چکے ہیں۔ اور اب ٹارچ روشن کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' حبیب الرحمٰن نے کہتے ہوئے اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے سے ٹارچ نکال لی۔

ٹارچ خاصی طاقتور تھی۔ ہم اس کی تیز روشنی میں آگے چلنے لگے۔ اس مرتبہ ہماری رفتار میں بھی تیزی آ گئی تھی۔ ہمارا رُخ مسلسل بلندی کی طرف تھا۔ ایک تو بلندی، آڑھا ترچھا اُونچا نیچا راستہ اور پھر درختوں اور جھاڑیوں کی بھرمار تھی جن کی وجہ سے چلنے میں اور بھی دُشواری پیش آ رہی تھی۔

انگوری ہانپنے لگی۔ میرا بھی سانس پھولنے لگا تھا اور حبیب الرحمٰن اور عبدالستار بھی ہانپنے لگے۔ حبیب الرحمٰن نے ٹارچ کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھا، کسی طرف سے پانی کے گرنے کی ہلکی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ غالباً کوئی جھرنا تھا۔ ہم اُس آواز کے تعاقب میں چل پڑے۔

ہمیں زیادہ دُور نہیں جانا پڑا۔ اس چٹان کے دوسری طرف گھومتے ہی وہ جھرنا نظر آ گیا۔ پتھروں میں دو تین فٹ کی بلندی سے گر رہا تھا۔ ہم اُس جگہ بیٹھ گئے۔ موسم میں اگرچہ خاصی خنکی تھی مگر پیاس سے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ میں نے جی بھر کے پانی پیا اور وہیں پتھروں پر لیٹ گیا۔ انگوری بھی میرے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

مسلسل چلتے رہنے سے ہمیں خنکی کا احساس نہیں ہوا تھا مگر رُکنے کے تھوڑی ہی دیر بعد سردی کا احساس ہونے لگا۔ چند روز سے موسم میں بھی کچھ تبدیلی آ رہی تھی۔ اور اس وقت ویسے بھی ہم اُس مندر سے تقریباً نو ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ دبیز سبزے اور تیز ہواؤں سے سردی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم پھر چل پڑے۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے ہم آسمان کو چھونے جا رہے ہوں۔ ہم رات بھر چلتے رہے۔ اس دوران کئی مرتبہ رُک کر تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے آرام بھی کیا گیا تھا۔

چار بج گئے۔ اب دن کا بہت مدھم سا اُجالا پھیلنے لگا تھا۔ اس وقت ہم ایک چشمے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ رات بھر چلتے رہنے سے کھایا پیا ہضم ہو گیا تھا اور پیٹ میں اینٹھن سی ہونے لگی۔ انگوری تو کچھ زیادہ ہی بے چین ہو رہی تھی۔ اس وقت سردی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور دوسروں کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر میرے ساتھ چپکی بیٹھی تھی۔

دن کا اُجالا واضح ہو گیا تھا۔ حبیب الرحمٰن نے ٹارچ بند کر کے تھیلے میں ڈال لی اور اُٹھ کر

ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''اب ہماری منزل زیادہ دُور نہیں رہ گئی۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہم زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔''

ہم ایک بار پھر چل پڑے...... اس مرتبہ ہم نشیب کی طرف جا رہے تھے۔ دن کا اُجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ روشنی میں ہمیں چلنے میں بھی دُشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ حبیب الرحمٰن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہم ایک گھنٹے بعد منزل پر پہنچ گئے۔ ہمارا استقبال ایک گرجتی ہوئی آواز نے کیا تھا۔

''کون ہے...... رُک جاؤ! خبردار اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔''

وہ کڑکتی ہوئی آواز دائیں طرف سے آئی تھی۔ ہم رُک گئے۔ حبیب الرحمٰن کی طرح ہم نے بھی ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھا دیئے تھے۔ میرے دل کی دھڑکن اگرچہ تیز ہو گئی تھی لیکن وہ لہجہ خالص کشمیری تھا اس لئے میں مطمئن تھا کہ وہ کوئی بھارتی فوجی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے گردن گھما کر آواز کی سمت دیکھا لیکن گنجان جھاڑیوں میں کوئی بھی نظر نہیں آیا۔

''ٹائیگر شکار کی تلاش میں نکلا ہوا ہے...... ہمارا راستہ مت روکو!'' حبیب الرحمٰن نے جھاڑیوں کی طرف رُخ کر کے اُونچی آواز میں کہا۔

''شکار آگے ملے گا...... راستہ یہی ہے۔'' دوسری طرف سے جواب ملا۔

''ٹائیگر بھوکا ہے...... راستہ چھوڑ دو۔'' حبیب الرحمٰن نے کہا۔

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی اور پھر جھاڑیوں میں حرکت پیدا ہوئی اور دو نوجوان لڑکے ہمارے سامنے آ گئے۔ اُن میں سے کسی کی عمر بھی سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ دونوں کے ہاتھوں میں سب مشین گنیں تھیں۔ اُنہوں نے بڑی گرمجوشی سے ہم سے ہاتھ ملایا۔ اس دوران مختلف سمتوں سے دو اور لڑکے سامنے آ گئے۔ اُنہوں نے بھی ہم سے ہاتھ ملایا۔

''کمانڈر شمروز اور کمانڈر رانگوری......'' حبیب الرحمٰن نے ان سے ہمارا تعارف کرایا۔

ان میں سے ایک لڑکا ہمارے ساتھ چلنے لگا جبکہ باقی تین وہیں رُک گئے تھے۔ ہم چیڑ اور چنار کے درختوں سے لدی ہوئی پہاڑیوں میں تنگ سے راستوں پر چکراتے ہوئے آدھے گھنٹے میں ایک غار کے دہانے پر پہنچ گئے۔ ایک چٹان غار پر سائبان کی طرح آگے کو جھکی ہوئی تھی۔ آس پاس گنجان درختوں اور گھنی جھاڑیوں سے بھی غار کا دہانہ چھپ گیا تھا۔ یہ غار بے حد محفوظ تھا۔ اسے فضا سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ غار کے آس پاس بھی حفاظتی انتظامات موجود تھے۔ نگرانی کرنے والے ایسی جگہوں پر چھپے ہوئے تھے کہ اُنہیں دیکھ لیا جانا ممکن نہیں تھا۔

غار کے دہانے پر کمانڈر محب اللہ اور کمانڈر رشید نے ہمارا استقبال کیا۔ کمانڈر رشید نے تو مجھے سینے سے لگا کر اس قدر زور سے بھینچا کہ مجھے سینے میں اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

اس غار میں بیس بائیس آدمی تھے۔ میرا حلیہ دیکھ کر بہت سے لڑکے مسکرا دیئے تھے لیکن جب اُن سے میرا تعارف کرایا گیا تو اُن سب کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور سب

ی آگے بڑھ بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کرنے لگے۔ بہت سے لڑکے ایسے تھے جن کی عمریں سترہ ٹھارہ سال سے زیادہ نہیں تھیں۔ میری عمر بھی تقریباً اتنی ہی تھی۔

یہ وہ عمر تھی جب ہمارے ہاتھوں میں قلم اور کتابیں ہونی چاہئے تھیں لیکن وقت نے ہمارے ھوں میں رائفلیں تھما دی تھیں۔ اپنے وطن کی آزادی کے لئے ہم جیسے نوعمر لڑکوں نے سروں پر فن باندھ لئے تھے اور ایک ایسے دشمن سے برسرِ پیکار تھے جو بہت خونخوار، چالاک اور عیار تھا۔ ھیں یقین تھا کہ ہم ان غاصبوں کو ایک نہ ایک دن مار بھگائیں گے اور ہماری آنے والی نسلیں زاد فضاؤں میں سانس لیں گی۔ کسی نوعمر لڑکے کے ہاتھ میں رائفل نہیں ہو گی۔ اُن کے ھوں میں کتابیں نظر آئیں گی، وادی کی فضا میں بارود کا دھواں نہیں پھیلا ہو گا، پھولوں کی شبو سے مہکتی ہوئی فضا میں آزادی کے ترانے گونجا کریں گے۔

یہ غار بہت بڑا تھا۔ یہاں کم سے کم سو افراد کے رہنے کی گنجائش تھی۔ اس کے پچھلی طرف ک حصہ اُوپر سے کھلا ہوا تھا جہاں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ غار کے پچھلے حصے میں کھانا پکانے انتظام تھا۔ کھانا دن کا اُجالا پھیلنے سے پہلے ہی تیار کر لیا گیا تھا۔ دن میں یہ اندیشہ تھا کہ ان کی طرف اُٹھنے والا دُھواں اس جگہ ہماری موجودگی کی نشاندہی کر سکتا تھا۔

غار کے باہر دُھوپ چمکنے لگی تھی جس سے غار کے اندر بھی کچھ روشنی ہو رہی تھی۔ ہمارے ئے فوراً ہی کھانے کا بندوبست کیا گیا۔ کھانے کے بعد ہمیں آرام کا موقع بھی دیا گیا۔ رات بھر اس سفر نے ہمیں بری طرح تھکا دیا تھا۔ انگوری تو لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد بھی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

میں دوپہر دو بجے کے قریب بیدار ہوا تھا۔ اُس وقت تک کمانڈر یاسین اور کمانڈر شہاب ین بھی پہنچ چکے تھے اور کچھ اور مجاہدین کی آمد ابھی جاری تھی۔ یہ ایک بہت بڑا اور بہت ناک آپریشن تھا اور اس کے لئے نہایت تجربہ کار کمانڈوز جمع کئے جا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد سعید، اشرف اور انور بھی پہنچ گئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم پانچ چھ غار سے نکل کر پہاڑوں میں نشیب کی طرف اُترنے لگے۔ کمانڈر محب اللہ سب سے آگے اس کے پیچھے میں، پھر کمانڈر یاسین، کمانڈر شہاب الدین، سعید اور انور تھے۔

میرا حلیہ بدل گیا تھا۔ سر کی چٹیا صاف کر دی گئی تھی۔ اور میں نے سیاہ رنگ کا رُومال سر پر ندھ لیا تھا۔ گیروے رنگ کے یوگیوں والے کپڑے اُتار کر دوسرے کپڑے پہن لئے تھے۔ ار کے ایک حصے میں گولہ بارود کے انبار کے علاوہ کچھ ایسی چیزیں بھی تھیں جو مجاہدین کے تی تھیں اور یہ کپڑے میں نے وہیں سے لئے تھے۔

پہاڑوں میں تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کر کے ایک جگہ رُک گئے۔ سامنے نشیب میں سونا ے درّہ زوجی لا کی طرف جانے والی شاہراہ نظر آ رہی تھی جہاں سے کل اس فوجی قافلے کو رتھا جسے تباہ کرنے کے لئے ہم سب یہاں جمع ہوئے تھے۔

ہم چٹانوں میں ایسی جگہ کھڑے تھے جہاں کہیں سے بھی ہمیں نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ ہم گنجان درختوں اور اُونچی جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے مزید آگے بڑھتے گئے اور بالآخر ایک جگہ رُک گئے۔ سڑک اب ہم سے صرف پچاس گز کے فاصلے پر تھی۔ سڑک کے دونوں طرف عمودی چٹانیں تھیں اور اُن کے پیچھے بلند عمودی پہاڑ تھے۔ اس طرح تقریباً نصف میل تک ایک درّہ سا بن گیا تھا۔

کمانڈر محب اللہ ہمیں پچویشن سمجھا رہا تھا۔ اور بالآخر ہم چاروں کمانڈروں نے یہ طے کر لیا کہ کس کو اپنے آدمی لے کر کہاں مورچہ لگانا ہوگا۔ کمانڈر یاسین اور کمانڈر شہاب الدین کو اپنے آدمی لے کر سڑک کے دوسری طرف جانا تھا اور درمیان میں سو گز کا فاصلہ رکھ کر مورچے لگانے تھے۔ جبکہ اس طرف مجھے، کمانڈر محب اللہ اور کمانڈر رشید کو ہر سو گز کے فاصلے پر مورچے قائم کرنے تھے۔ اس طرح وہ پورا درّہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہماری زد میں ہوتا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک اس کا جائزہ لینے کے بعد ہم غار میں واپس آ گئے۔ اس وقت تک کچھ اور مجاہدین بھی پہنچ چکے تھے۔ شام تک مجاہدین کی تعداد ساٹھ ہوگئی اور پھر ان مجاہدین کو پانچ پارٹیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ میری پارٹی میں دس آدمی تھے۔ انگوری، سعید، انور، اشرف، حبیب الرحمٰن اور عبدالستار کے علاوہ وہ دولڑکے اور تھے۔

وہ رات قافلے پر حملے کی حکمت عملی تیار کرتے ہوئے گزری تھی۔ اور پھر رات دو بجے کے قریب ہم اپنی اپنی پارٹیاں لے کر تھوڑے تھوڑے وقفے سے غار سے روانہ ہوگئے۔

ہماری پارٹی کا ہر شخص اسلحہ اور گولہ بارود سے لدا ہوا تھا۔ دولڑکوں کے پاس راکٹ لانچر تھے۔ ہر لانچر کے لئے چار چار راکٹ تھے۔ دستی بم، سب مشین گنیں اور اُن کے کئی کئی فاضل میگزین۔ اچھا خاصا بوجھ تھا جو ہر لڑکا اُٹھا کر چل رہا تھا۔ انگوری کے پاس بھی اسلحے کا اتنا ہی بوجھ تھا۔

دو گھنٹوں بعد ہم اپنی اپنی جگہوں پر مورچے سنبھال چکے تھے۔ کمانڈر یاسین اور کمانڈر شہاب الدین نے بھی سڑک کے دوسری طرف اپنی اپنی جگہوں پر مورچے سنبھال لئے تھے۔ مختلف جانوروں کی آوازیں نکال کر ایک دوسرے کو آگاہ کر دیا گیا تھا۔ میں نے اپنے آدمیوں کو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پھیلا دیا تھا۔ انگوری میرے قریب ہی تھی۔

رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری ہو رہا ہو۔ فوجی قافلے کو صبح پانچ بجے سرینگر سے روانہ ہو کر آٹھ بجے کے قریب یہاں سے گزرنا تھا۔

رات بیت گئی، دن نکل آیا، دھوپ چمکنے لگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور پھر دفعتہً فضا میں ہیلی کاپٹر کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سن کر میں اُچھل پڑا......

''کوئی ہیلی کاپٹر پر فائر نہ کرے اور جھاڑیوں میں چھپ جائے'' میں نے چیخ کر کہا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

چند سیکنڈ بعد ایک گن شپ ہیلی کاپٹر ایک پہاڑی کی چوٹی کے اُوپر سے ہوتا ہوا سامنے آ گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور میں گہری نظروں سے ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

ہیلی کاپٹر سڑک کے اُوپر گندربل کی طرف سے آ رہا تھا۔ کسی وقت وہ بائیں طرف اور کبھی دائیں طرف پہاڑیوں پر پرواز کرنے لگتا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ وہ نگران ہیلی کاپٹر تھا اور غالباً نہیں بلکہ یقیناً اُس ہیلی کاپٹر کے ذریعے یہ چیک کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ راستے میں کسی جگہ فوجی قافلے کو خطرہ تو نہیں؟ اس ہیلی کاپٹر کی آمد کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ فوجی قافلہ اب پہنچنے ہی والا ہے......

میں اور میرے ساتھی قد آدم جھاڑیوں میں چھپ گئے تھے۔ ان پہاڑیوں پر جھاڑیاں اور پودے اس قدر گنجان تھے کہ ان میں چھپے ہوئے کسی شخص کو فضا سے بھی دیکھ لیا جانا ممکن نہیں تھا۔

ہیلی کاپٹر فضا میں پرواز کرتا ہوا ہمارے سروں کے اُوپر سے گزر گیا۔ میں فکرمند تھا کہ ہمارے مجاہدین میں سے کوئی اُس پر فائرنگ نہ شروع کر دے۔ ہیلی کاپٹر پہاڑیوں کے اُوپر سو ڈیڑھ سو میٹر کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ اُسے نشانہ بنانا بالکل آسان تھا۔ اُسے تو آسانی سے گرایا جا سکتا تھا لیکن اس طرح اصل مشن ناکام ہو جاتا۔ ہیلی کاپٹر کی تباہی کے بعد فوجی قافلہ دُور ہی کہیں رُک جاتا اور ہمارا مقصد پورا نہ ہوتا۔

گن شپ ہیلی کاپٹر پہاڑیوں پر پرواز کرتا ہوا بہت آگے جا کر اُونچی پہاڑیوں کے پیچھے غائب ہوگیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میری طرح دوسرے کمانڈروں کے ذہن میں بھی یہی بات آئی ہوگی کہ اگر ہیلی کاپٹر کو گرا لیا گیا تو ہمارا اصل مشن خطرے میں پڑ جائے گا۔

ہیلی کاپٹر کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کی آواز بھی اب معدوم ہو چکی تھی۔ یہ ہیلی کاپٹر روسی ساخت کا تھا۔ افغانستان میں بھی مجاہدین کے ٹھکانوں پر حملوں کے لئے یہی گن شپ ہیلی کاپٹر استعمال ہو رہے تھے۔ بھارت میں اگرچہ اسلحہ اور دیگر جنگی ساز و سامان بنانے کی کئی فیکٹریاں تھیں لیکن جنگی جنون میں مبتلا بھارتی حکمرانوں نے ہر اُس ملک سے اسلحہ اور گولہ بارود حاصل کیا تھا جہاں سے ملنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ روس ان ممالک میں پیش پیش تھا۔ بھارتی فوج میں استعمال ہونے والا اسّی فیصد سے زائد جنگی سامان روس سے درآمد شدہ تھا۔ اور یہ ہیلی کاپٹر بھی روسی تھا۔

دنیا کی دوسری سب سے بڑی طاقت سوویت یونین کئی سال سے افغانستان پر قبضہ کرنے کے لئے ایڑھی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ اُس نے اپنی ساری طاقت افغانستان کی جنگ میں جھونک دی تھی لیکن افغانستان روسیوں کا قبرستان بنتا جا رہا تھا۔ افغان مجاہدین بے سرو سامانی کی حالت میں بھی روسیوں کو ناکوں چنے چبوا رہے تھے اور روسی اب افغانستان سے بوریا بستر سمیٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔

دفعتہً گرر گرر کی آواز سن کر میں چونک گیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور پھر میرے ہونٹوں پر

مسکراہٹ آ گئی۔ وہ بھاری ٹرکوں کی آواز تھی جو ہوا کے دوش پر کبھی قریب سے اور کبھی دُور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا، دُور دُور تک ہیلی کاپٹر کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اور پھر میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کر دیا...... میرے تمام ساتھی قد آدم جھاڑیوں اور پودوں میں رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اور پھر میرا اشارہ پا کر مختلف جگہوں پر پوزیشن سنبھالنے لگے۔

میں نے بڑی تیزی سے گھوم کر ہر مجاہد کی پوزیشن کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر انگوری کے ساتھ ایک پتھر کی آڑ میں پودوں میں پوزیشن لے کر بیٹھ گیا۔

سڑک ہم سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھی۔ ہمارے آگے تقریباً عمودی چٹان تھی جس کے اختتام پر سڑک کے کنارے تقریباً آٹھ فٹ اُونچی دیوار سی بن گئی تھی جبکہ سڑک کے دوسری طرف کی پہاڑیاں زیادہ بلند نہیں تھیں اس طرف قد آدم جھاڑیاں اور پودے بہت گنجان تھے۔

میری نظریں سڑک پر مرکوز تھیں، اور کان گرر گرر کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ اور پھر پچھلے موڑ سے پہلی جیپ کو سامنے آتے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی......

جیپ پر بھارتی ترنگا لہرا رہا تھا۔ یہ بغیر ہڈ کی جیپ تھی۔ سامنے ونڈ اسکرین کے فریم کے اُوپر ایک آہنی پائپ بھی لگا ہوا تھا جس پر لائٹ مشین گن فٹ تھی۔ ایک فوجی گن کے سامنے سیٹ پر بالکل چاق و چوبند کھڑا تھا۔ جیپ کی پچھلی دو سیٹیں آگے پیچھے کی بجائے آمنے سامنے تھیں۔ ہر سیٹ پر تین تین فوجی سب مشین گنیں سنبھالے بیٹھے تھے۔ اُن کے رُخ باہر کی طرف تھے۔ جیپ کے پیچھے ایک ٹرک تھا اُس پر آگے ایک ہیوی مشین گن اور دائیں بائیں ایک ایک لائٹ مشین گن نصب تھی۔ تقریباً دو درجن فوجی سب مشین گنیں سنبھالے ٹرک کے اندر کھڑے تھے۔ اُن ٹرکوں میں لکڑی کے تختوں کی سیٹیں اس طرح بنائی گئی تھیں کہ فوجی ان پر آسانی سے کھڑے ہو سکیں۔ اُس ٹرک کے پیچھے اسلحہ اور گولہ بارود سے لدے ہوئے ٹرک تھے جن پر ترپال پڑے ہوئے تھے۔ ان ٹرکوں کی کیبن کی چھتوں پر بھی دو دو فوجی سب مشین گنیں سنبھالے بیٹھے تھے۔

میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

وہ ٹرک ہلکی رفتار سے ہمارے سامنے سے گزرتے رہے۔ اس دوران پیچھے سے آتی ہوئی ایک جیپ تیزی سے آگے نکل گئی۔

میں ان ٹرکوں کو گنتا رہا۔ ان کی تعداد تیس تھی۔ آخر میں بھی دو جیپیں تھیں۔ اُن جیپوں پر بھی آگے پیچھے لائٹ مشین گنیں فٹ تھیں اور ہر جیپ پر چھ چھ فوجی سب مشین گنیں سنبھالے بیٹھے تھے۔ ٹرکوں اور جیپوں پر بیٹھے ہوئے تمام فوجی دائیں بائیں پہاڑیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

پروگرام کے مطابق سب سے پہلے میری پارٹی کو قافلے کے آخری ٹرکوں اور جیپوں پر حملہ

رہا تھا۔ ہماری طرف سے پہلا فائر ہوتے ہی سڑک کے دونوں طرف دُور تک گھات لگائے ہوئے مجاہدین سمجھ جاتے کہ قافلہ اب مکمل طور پر گھیرے میں آ چکا ہے اور وہ بھی فائر کھول دیتے۔

ہمارے سامنے اب تین ٹرک تھے اور دو جیپیں۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا اور پھر نعرۂ تکبیر بلند کر دیا...... یہ میری طرف سے اپنے ساتھیوں کو سگنل تھا۔ جواب میں ''اللہ اکبر'' کی صدائیں گونجیں اور پھر فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اُٹھی......

ہمارے پہلے حملے میں ٹرکوں پر بیٹھے ہوئے تین فوجی جہنم رسید ہوئے تھے اور پھر اس کے ساتھ ہی جیپوں اور دوسرے ٹرکوں پر ہم نے فائر کھول دیا تھا...... سب مشین گنوں اور لائٹ مشین گنوں کی گولیاں ہمارے آس پاس پتھروں پر لگ رہی تھیں یا ہمارے سروں کے اُوپر سے گزر رہی تھیں۔

بھارتی فوجی غالباً یہ سمجھے تھے کہ ان پر حملہ ایک ہی جگہ سے ہوا ہے لیکن بہت جلد اُن کی یہ غلط فہمی دُور ہو گئی۔ ٹرکوں کا وہ قافلہ تقریباً دو سو گز تک پھیلا ہوا تھا اور دو سو گز کے اس حصے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سڑک کے دونوں طرف سے اُن پر گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔

ہماری پارٹی میں دو لڑکوں کے پاس راکٹ لانچر تھے اور دونوں کے پاس چار چار راکٹ تھے۔ اُن میں سے ایک نے راکٹ فائر کر دیا جو ایک ٹرک پر لگا اور گویا وہاں قیامت مچ گئی...... ایک زوردار دھماکہ ہوا اور پھر مسلسل دھماکوں کے ساتھ ٹرک میں لدا ہوا گولہ بارود پھٹنے لگا۔

قافلے کی آخری جیپ تیزی سے مُڑی اور واپس جانے کے لئے دوڑنے لگی۔ انگوری نے اپنی سب مشین گن کا رُخ اُس طرف موڑ دیا مگر جیپ زد میں نہیں آئی اور تیزی سے دوڑتی ہوئی پہلا موڑ گھوم کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

پہاڑیوں میں دو سو گز تک سڑک کا پورا ٹکڑا محاذِ جنگ بنا ہوا تھا۔ ہمارے مجاہدین نے اُس قافلے پر بھرپور حملہ کیا تھا۔ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ جنگ یکطرفہ تھی۔ مجاہدین تو قافلے پر انگارے برسا رہے تھے جبکہ بھارتی فوجیوں کو کچھ کرنے کا بہت کم موقع مل رہا تھا۔

جگہ جگہ دھماکے ہو رہے تھے...... مجاہدین رائفلوں کے علاوہ دستی بم اور راکٹ بھی استعمال کر رہے تھے۔ زوردار دھماکوں سے فضا گونج رہی تھی اور پہاڑیاں تھرا رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے بیک وقت کئی آتش فشاں پھٹ پڑے ہوں...... ٹرکوں میں پھٹتے ہوئے راکٹ اور گولے اب چاروں جانب پھیل رہے تھے۔ راکٹ چٹانوں پر لگ لگ کر پھٹ رہے تھے۔

پروگرام کے مطابق ہمیں یہ کارروائی آدھے گھنٹے میں مکمل کرنی تھی لیکن میرے خیال میں تو سب کچھ چند منٹ میں ہی ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔

دفعتہً اُن پے در پے دھماکوں میں پھڑپھڑاہٹ کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ ہیلی کاپٹر ایک میل آگے کا چکر لگا کر واپس آ رہا تھا۔ اور اُس سے نہ صرف ہیوی مشین گن سے فائرنگ ہو رہی تھی بلکہ راکٹ بھی برسائے جا رہے تھے۔

وہ گن شپ ہیلی کاپٹر پہاڑیوں پر ہمارے سروں کے اُوپر سے ہوتا ہوا تیزی سے آگے نکل گیا۔ مشین گن کی لاتعداد گولیاں ہمارے پاس گری تھیں...... ایک راکٹ ہم سے تقریباً پچاس گز آگے ایک چٹان پر لگا اور ایک زوردار دھماکے سے پتھروں کے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے۔

ہیلی کاپٹر کافی آگے جا کر واپس پلٹا۔ اس مرتبہ وہ نسبتاً زیادہ بلندی پر تھا۔ ہم نے اپنی سب مشین گنوں سے فائرنگ شروع کر دی لیکن ہماری گولیاں اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں البتہ ہمارا ایک ساتھی ناصر مشین گن کی ایک گولی کی زد میں آ گیا تھا۔

ناصر کی چیخ سن کر میں تیزی سے اُس کی طرف لپکا۔ بھاری مشین گن کی گولی نے اُس کے سینے میں بہت بڑا سوراخ کر دیا تھا...... ہر طرف خون بکھرا ہوا تھا۔ میں اُسے دیکھ کر کانپ کر رہ گیا۔ اُس کے لئے اب کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے اپنی رائفل کندھے پر اُٹھا لی اور ناصر کا راکٹ لانچر سنبھال لیا۔ اُس کے پاس صرف ایک راکٹ بچا تھا۔ میں نے وہ راکٹ لانچر لوڈ کیا اور اُوپر دیکھا۔ ہیلی کاپٹر پہاڑیوں پر گولیوں اور راکٹوں کی بارش کرتا ہوا بہت آگے نکل گیا تھا...... اس طرف سے بھی ہیلی کاپٹر پر فائرنگ ہو رہی تھی مگر وہ محفوظ ہی رہا۔

میں نے اپنے مجاہدین کو اُوپر جانے کا حکم دیا اور انگوری کا ہاتھ پکڑ کر خود بھی بلندی کی طرف دوڑنے لگا۔

ہیلی کاپٹر ایک طویل چکر کاٹ کر ایک مختلف سمت سے ہماری طرف آنے لگا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو چیخ کر پتھروں کے پیچھے پناہ لینے کا حکم دیا اور خود بھی ایک بڑے پتھر کی آڑ لے کر لانچر سے اُس کا نشانہ باندھنے لگا۔ ہیلی کاپٹر بڑی تیزی سے گولیاں برساتا ہوا آ رہا تھا۔ میرا ایک اور ساتھی گولیوں کی زد میں آ کر شہید ہو گیا...... میں ایک لمحہ اُس کی طرف متوجہ ہوا اور اُسی لمحہ ہیلی کاپٹر بائیں طرف مُڑ گیا جس طرف پہاڑیوں میں دُور تک ہمارے مجاہدین پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے کاپٹر کا نشانہ لے کر راکٹ فائر کر دیا۔ اسی لمحہ دوسری طرف سے بھی پہاڑیوں میں کسی جگہ سے ایک راکٹ فائر ہوا اور پھر دوسرے ہی لمحہ فضا ایک کان پھاڑ دینے والے دھماکے سے گونج اُٹھی...... گن شپ ہیلی کاپٹر پہلے آگ کے گولے میں تبدیل ہوا اور پھر اُس کے جلتے ہوئے ٹکڑے چاروں طرف پہاڑیوں میں بکھر گئے......

سڑک کی طرف اب بھی پے در پے خوفناک دھماکے ہو رہے تھے۔ اب ہمیں اُوپر سے کوئی خطرہ نہیں تھا ہم نے وہ فوجی قافلہ تباہ کر دیا تھا۔ ہمارا مشن پورا ہو گیا تھا۔ اگر اُس قافلے میں کچھ بچا بھی ہو گا تو گولہ بارود میں ہونے والے دھماکے اُسے بھی ختم کر دیں گے۔ مجھے ایک جیپ کے بچ کر نکل جانے کا افسوس تھا۔ اُس جیپ میں یقیناً وائرلیس بھی ہو گا اور اب تک اُنہوں نے سرینگر ہائی کمان کو اطلاع کر دی ہو گی اور مجھے یقین تھا کہ اس علاقے کو دُور دُور تک گھیرے میں لینے کی کوشش کی جائے گی۔

ٹرکوں یا جیپوں پر امدادی پارٹیوں کو پہنچنے میں خاصا وقت لگ سکتا تھا لیکن اگر ہیلی کاپٹر بھی ہماری تلاش میں روانہ ہو گئے تو ہمارے لئے بہت سی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔

تقریباً ایک ہزار فٹ کی بلندی پر آ کر ہم سب لوگ ایک جگہ پر جمع ہو گئے اور پھر میں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ بکھر کر اپنے اپنے طور پر محفوظ مقامات کی طرف جانے کی کوشش کریں۔ ہم سب نے بڑی گرمجوشی سے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ میں نے انگوری کا ہاتھ پکڑا اور ہم ایک مختلف سمت میں چل پڑے۔

میرا خیال درست نکلا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہیلی کاپٹروں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی...... میں انگوری کو پکڑ کر گنجان جھاڑیوں میں لے گیا۔ اُس وقت ہم سطح سمندر سے چار ہزار آٹھ سو میٹر کی بلندی پر تھے۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے بھی تیر رہے تھے۔ سورج کبھی بادل کے کسی ٹکڑے کے پیچھے چھپ جاتا اور کبھی دُھوپ چمکنے لگتی۔ تیز ہوا سے پودوں اور جھاڑیوں کے سرسرانے کی آوازیں چاروں طرف سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔

ایک محفوظ جگہ پر پہنچ کر میں نے اُوپر دیکھا۔ وہ دو گن شپ ہیلی کاپٹر تھے جو ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر پرواز کرتے ہوئے ہائی وے کی طرف جا رہے تھے۔ وہ ہیلی کاپٹر جیسے ہی ایک پہاڑی چوٹی کی آڑ میں نگاہوں سے اوجھل ہوئے میں انگوری کا ہاتھ پکڑ کر ایک بار پھر دوڑنے لگا۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ انگوری بری طرح ہانپ رہی تھی۔ میرا سانس بھی پھولنے لگا تھا۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے رُکتے اور پھر دوڑنے لگتے۔

ہم ایک بار پھر رُک گئے۔ انگوری ہانپ گئی تھی۔ اُس کے منہ سے کف بہنے لگا تھا۔ میرا سانس بھی قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم دونوں دیر تک بیٹھے ہانپتے رہے اور بتدریج نارمل ہوتے چلے گئے۔

''میرا حلق خشک ہو رہا ہے...... بہت شدت کی پیاس لگ رہی ہے۔'' انگوری گلا سہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ خشک ہونٹوں کو زبان سے تر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرے ہونٹوں پر بھی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، قرب و جوار میں کسی ندی یا چشمے کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

''اس طرف چلتے ہیں۔ شاید کوئی ندی یا چشمہ مل جائے۔'' میں نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ہم ایک بار پھر چلنے لگے۔ سامنے بہت دُور تقریباً چھ ہزار میٹر بلند پہاڑی چوٹی پر برف جمی نظر آ رہی تھی۔ ہمارا رُخ اُسی طرف تھا۔ بعض چوٹیوں پر سال بھر برف جمی رہتی تھی۔ برف پگھلنے سے پانی ندیوں اور جھرنوں کی صورت میں پہاڑوں پر بہتا رہتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ پانی کی تلاش میں ہمیں زیادہ دُور نہیں جانا پڑے گا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم ایک چشمے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اُس چشمے کے آس پاس اُونچے پودے یا جھاڑیاں وغیرہ نہیں تھیں۔ دُور دُور تک البتہ دبیز گھاس پھیلی ہوئی تھی۔ ہم نے جی بھر کے پانی پیا۔ انگوری گھاس پر لیٹ گئی میں بھی کہنی کے بل دراز ہو گیا اور انگوری کی طرف دیکھنے لگا۔

سورج نصف النہار سے آگے جا چکا تھا۔ میرے خیال میں دو بج رہے ہوں گے۔ گزشتہ رات دو بجے کے قریب ہی ہم غار سے روانہ ہوئے تھے اور اس وقت قہوے کے ساتھ کچھ روٹی کھائی تھی۔ صبح نو بجے کے قریب ہم نے قافلے پر حملہ کیا تھا اور اس کے بعد سے اب تک مسلسل بلندیوں کی طرف دوڑ رہے تھے اور مجھے بھوک کا احساس ہونے لگا تھا۔ بھوک انگوری کو بھی لگ رہی ہو گی لیکن ابھی تک اُس نے اس سلسلے میں زبان نہیں کھولی تھی۔ راستے میں ہمیں کوئی پھلدار درخت بھی نظر نہیں آیا تھا کہ کسی پھل ہی سے پیٹ بھر لیا جاتا۔

''اب آگے چلنا چاہئے......'' میں نے اُٹھ کر اپنی رائفل سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''شاید اس طرف ہمیں کوئی پھلدار درخت مل جائے۔ ورنہ پتہ نہیں ہمیں کب تک بھوکا رہنا پڑے۔''

انگوری بھی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اپنی چادر سنبھالنے لگی۔ یہ سیاہ چادر اُس کی شناخت بن گئی تھی۔ اب تک اُس نے چادر ایک بل دے کر گردن پر لپیٹ رکھی تھی اس طرح اُسے کچھ اُلجھن بھی ہو رہی تھی۔

''ایک منٹ......'' وہ بولی۔ ''میں یہ چادر پٹکے کی طرح کمر پر باندھ لوں۔ چلنے میں بھی آسانی رہے گی۔''

اُس نے چادر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر جھٹک دی اور پھر لمبائی کے رُخ پر اُسے تہہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ تیز ہوا کے جھونکے سے چادر اُس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اُس نے لپک کر چادر پکڑنے کی کوشش کی مگر ہوا کے جھونکے نے چادر کو اُوپر اُٹھا دیا۔

میں نے اپنی جگہ سے اُچھل کر چادر کو پکڑنا چاہا مگر ہوا کا ایک اور زوردار جھونکا اُسے اُڑا کر مزید اُوپر لے گیا......

چادر کٹی پتنگ کی طرح ہوا میں اُڑ رہی تھی۔ میں اُس کے پیچھے دوڑنا چاہتا تھا مگر اسی لمحہ ہیلی کاپٹر کی آواز سن کر میں رُک گیا۔ انگوری بھی چیخ اُٹھی......!

○○○

''شمروز...... رُک جاؤ! ہیلی کاپٹر اس طرف آ رہا ہے۔''

میں نے مُڑ کر دیکھا۔ ہیلی کاپٹر ایک پہاڑی چوٹی کے پیچھے سے نمودار ہو کر اس طرف آ رہا تھا۔ انگوری نے جلدی سے رائفل اُٹھا لی اور میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر چٹانوں کی طرف دوڑنے لگا۔ ہم اس وقت کھلی جگہ پر تھے۔ ہیلی کاپٹر والوں کی نظروں میں آ سکتے تھے۔ اور پھر ہوا میں اُڑتی ہوئی چادر ہماری موجودگی کی نشاندہی کر سکتی تھی۔

میرا خدشہ درست نکلا۔ ہمیں دیکھ لیا گیا تھا...... کاپٹر اُس وقت کافی بلندی پر تھا لیکن دوسرے ہی لمحہ بڑی تیزی سے نیچے آنے لگا......

میں انگوری کا ہاتھ پکڑے دوڑتا رہا۔ اور پھر دفعتہً فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اُٹھی۔ ہم پر مشین گن سے گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔ انگوری ٹھوکر کھا کر گری۔ میں نے اُسے دوبارہ ہاتھ سے پکڑ کر اُٹھایا اور قریبی چٹان نما پتھر کی طرف چھلانگ لگا دی۔

کئی گولیاں اُس چٹان نما پتھر پر لگی تھیں۔ ہیلی کاپٹر آگے نکل گیا تھا۔ میں انگوری کا ہاتھ پکڑے چٹانوں میں دوڑتا رہا۔ انگوری ایک بار پھر لڑکھڑا کر گری، میں نے اُسے دوبارہ اُٹھا دیا۔

''یہاں رُکے تو وہ ہمیں چھلنی کر دیں گے۔'' میں نے کہا۔

''مجھ سے نہیں چلا جاتا۔ میری ٹانگیں شل ہو رہی ہیں۔'' انگوری نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''ہمت سے کام لو......'' میں نے کہا۔ ''وہ ہمیں ایسی اذیت ناک موت ماریں گے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔''

میں انگوری کو پکڑے چٹانوں میں آڑھے ترچھے راستوں پر دوڑتا رہا۔ فضا میں ہیلی کاپٹر کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ کبھی کبھی چٹانیں مشین گن کی فائرنگ کی آواز سے بھی گونج اُٹھتیں۔ کچھ دیر بعد اپنے سروں پر ہیلی کاپٹر کی آواز سن کر میں انگوری کو گھسیٹتا ہوا ایک چٹان کے ساتھ چپک گیا۔ چٹان کے اُوپر ایک بہت بڑا پتھر سائبان کی طرح آگے جھکا ہوا تھا اور اُس کی وجہ سے ہمیں فضا سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

ہیلی کاپٹر فضا میں معلق ہو گیا تھا۔ اُس کا سایہ کچھ دُور بائیں طرف کی ایک چٹان پر دکھائی دے رہا تھا۔ تقریباً ایک منٹ بعد وہ سایہ حرکت میں آیا اور کاپٹر کی آواز بتدریج دُور ہوتی چلی گئی۔

ہم دو تین منٹ اسی چٹان سے چپک کر کھڑے رہے اور پھر آہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگے۔ انگوری کی حالت ناگفتہ ہو رہی تھی۔ وہ بار بار لڑکھڑا جاتی۔ اگر میں اُسے نہ سنبھالے ہوتا تو

وہ یقیناً گر پڑتی اور پھر رُکنے کا نام نہ لیتی۔

میں ایک دراڑ کے قریب رُک گیا۔ وہ دراڑ اتنی کشادہ تھی کہ دو آدمی پہلو بہ پہلو آسانی سے چل سکتے تھے۔ فضا میں تھرتھراہٹ کی بڑھتی ہوئی آواز سن کر میں سمجھ گیا کہ ہیلی کاپٹر دوبارہ اس طرف آ رہا تھا۔ میں انگوری کو کھینچتا ہوا اُس دراڑ میں گھستا چلا گیا۔

یہ دراڑ تقریباً دس گز آگے جا کر دائیں طرف مُڑ گئی تھی۔ اُس طرف گھومتے ہوئے میں نے اُوپر دیکھا، بہت اُوپر چٹانیں ایک دوسرے کے بہت قریب تھیں اور اُن کے درمیان روشنی کی ایک باریک سی لکیر نظر آ رہی تھی۔ مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اگر کسی چٹان کا کوئی حصہ گر جائے تو یہ دراڑ ہمارا مقبرہ بن جاتی۔ لیکن میں نے سر جھٹکتے ہوئے اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ یہ چٹانیں ہزاروں سال سے بلکہ نجانے کب سے اس جگہ اسی طرح کھڑی تھیں۔ اور اب ان کے گرنے کا سوچنا حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔

انگوری میری گرفت سے ہاتھ چھڑا کر چٹان کے ساتھ سرکتی ہوئی دو زانوں ہو کر بیٹھ گئی تھی اور آگے کو جھکی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اُس کے منہ سے کف بہہ رہا تھا اور وہ آستین سے بار بار منہ پونچھ رہی تھی۔ میں نے اُسے اُٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ خود بھی اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ یہاں ہم کسی حد تک محفوظ تھے اور کچھ دیر آرام کر سکتے تھے۔

بیس پچیس منٹ گزر گئے..... ہیلی کاپٹر کی آواز اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے صرف ایک اندیشہ تھا کہ بھارتی فوجی کاپٹر سے اُتر کر ان چٹانوں میں ہماری تلاش نہ شروع کر دیں۔ ایک اطمینان یہ بھی تھا کہ ان سنگلاخ اور نوکیلی چٹانوں میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں ہیلی کاپٹر اُتر سکتا۔

ہم ایک بار پھر آگے چلنے لگے۔ دراڑ چٹانوں میں کبھی دائیں مُڑ جاتی اور کبھی بائیں۔ کسی جگہ تو یہ اس قدر کشادہ ہو جاتی کہ آٹھ دس آدمی آرام سے ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔ اور کہیں اس قدر تنگ کہ ہمیں آگے پیچھے ہو کر چٹان کے ساتھ گھسٹ کر چلنا پڑتا۔

تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر رُک گئے۔ یہ جگہ کافی کشادہ تھی اور اُوپر بھی آسمان نظر آ رہا تھا۔ چند منٹ بعد میں پھر آگے بڑھنے لگا۔ بیس گز آگے دراڑ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ میں دائیں طرف مُڑ گیا۔ اُس طرف راستہ کافی کشادہ تھا۔ انگوری اب پھر بار بار رُک رہی تھی۔

''میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے..... اب مجھ سے نہیں چلا جا رہا۔'' وہ ایک ہاتھ پیٹ پر رکھ کر دوہری ہو گئی۔

''تھوڑا سا اور.....'' میں نے کہا۔ ''ہم جلد ہی کسی کھلی جگہ پر نکل آئیں گے اور کسی محفوظ جگہ پر بیٹھ کر آرام کر لیں گے۔ ان چٹانوں سے نکل کر کسی نہ کسی جگہ ہمیں پانی بھی مل جائے گا۔''

''مم..... مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ کراہتے ہوئے بولی۔

''ان چٹانوں سے باہر نکلیں تو شاید کوئی چیز کھانے کو بھی مل جائے۔'' میں نے جواب دیا۔

بھوک مجھے بھی لگ رہی تھی لیکن ظاہر ہے میں انگوری کی طرح کراہ نہیں سکتا تھا۔ اس کے برعکس میں اُس کا حوصلہ بڑھاتا رہا اور اُسے ہاتھ سے پکڑے کھینچتے ہوئے چلتا رہا۔

دراڑ بائیں طرف مُڑ گئی اور اس کے ساتھ ہی میں رُک گیا۔ اس سے آگے ایک غار تھا اور یہ غار کسی سرنگ کی طرح خاصا طویل تھا۔ اُس کے دوسرے سرے پر روشنی کا دائرہ سا نظر آ رہا تھا۔ وہ غار کا دہانہ تھا۔

''اس غار کے دوسری طرف ہمیں یقیناً پانی بھی مل جائے گا اور کچھ.....''

''کھانے کو بھی.....'' انگوری نے ہنستے ہوئے میری بات کاٹ دی۔ ''تم دوسروں کو بہلانا خوب جانتے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے ہم ان چٹانوں سے کبھی باہر نہیں نکل سکیں گے۔''

''میں مایوس نہیں ہوں انگوری.....'' میں نے جواب دیا۔ ''کیا تمہیں یہ احساس نہیں ہوا کہ ہم ان سنگلاخ چٹانوں ہی کی وجہ سے محفوظ ہیں۔ اگر کھلی جگہ پر ہوتے تو اب تک مارے جا چکے ہوتے۔ ہمت نہ ہارو! اُمید رکھو کہ اس غار سے نکل کر ہمیں مایوسی نہیں ہوگی۔''

غار میں اندھیرا سا تھا۔ میں انگوری کا ہاتھ پکڑے چلتا رہا۔ تقریباً دس منٹ بعد ہم غار کے دوسرے دہانے پر پہنچ گئے اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ غار کے دوسری طرف عمودی ڈھلان تھی اور نیچے اُترنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سامنے ہزاروں فٹ نیچے سرسبز وادی پھیلی ہوئی تھی..... میرے قریب کھڑی ہوئی انگوری نے بھی یہ منظر دیکھا۔ اُس کے منہ سے بھی اس طرح گہرا سانس نکلا جیسے غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔ وہ نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا اور پھر خود بھی شکست خوردہ انداز میں اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ ہم تقریباً پانچ منٹ تک خاموش بیٹھے رہے۔ انگوری بھوک پیاس اور تھکن سے نڈھال ہو رہی تھی۔ میں اور کچھ بولنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ میری بات پکڑ لیتی۔

''تم کہتے تھے ان پہاڑوں نے ہمیں پناہ دی ہے۔ اب یہی چٹانیں ہمارے لئے موت کے جال بن گئی ہیں۔'' انگوری نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھر وہی مایوسی کی باتیں.....'' میں نے کہا۔ ''یہ وادیاں اور یہ سنگلاخ چٹانیں ہی زندگی کی علامت ہیں۔ مایوس نہ ہو! کوئی نہ کوئی راستہ مل جائے گا۔''

میں دہانے کے قریب آ گیا اور صورتحال کا جائزہ لینے لگا۔ دُھوپ اب نرم ہو گئی تھی۔ سورج اگرچہ غار کے اُوپر والی چٹانوں کے عقب میں تھا مگر سامنے وادی میں پھیلی ہوئی دُھوپ کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ڈیڑھ دو گھنٹوں میں سورج غروب ہونے والا ہے۔

میں دہانے کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ ڈھلان اس قدر عمودی تھی کہ اس پر اُترنے کی کوشش کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ البتہ دائیں طرف چٹان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پتھر اُبھرے ہوئے تھے اور تیس چالیس فٹ نیچے کشادہ اور محفوظ جگہ تھی جس سے آگے

گنجان درخت تھے۔ میں نے انگوری کو اشارے سے قریب بلا لیا...... اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ راستہ مشکل ضرور ہے۔لیکن اگر کوشش کی جائے تو ہم نیچے اُتر سکتے ہیں۔''

''اور اگر بیچ میں ہاتھ یا پیر پھسل گیا تو ہماری ہڈیوں کا بھی سراغ نہیں ملے گا۔'' انگوری نے کہا۔

''باہر کو اُبھرے ہوئے پتھر کافی بڑے بڑے ہیں۔کوشش کی جا سکتی ہے۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔''پہلے میں اُترتا ہوں،تم میرے پیچھے پیچھے چلی آنا۔''

میں نے رائفل کندھے پر لٹکالی اور ان پتھروں پر اُترنے لگا۔چند گز کا فاصلہ طے کرتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ اس طرح نیچے اُترنا اتنا آسان نہیں تھا جتنا میں نے سمجھا تھا۔تیز ہوا کے جھونکے مجھے مسلسل دھکیل رہے تھے۔

''انگوری......!'' میں نے اُوپر دیکھتے ہوئے آواز لگائی۔''ہوا تیز ہے لیکن پتھر خاصے بڑے ہیں۔ان پر ہاتھ پیر جمانا زیادہ مشکل نہیں۔ہمت کرو اور احتیاط سے نیچے اُتر آؤ۔''

انگوری نے اپنے اندر حوصلہ پیدا کر ہی لیا اور وہ بھی میری طرح پتھروں پر ہاتھ پیر جما کر نیچے اُترنے لگی۔ڈر اور خوف سے اُس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

واقعی بہت کٹھن اور جان لیوا کام تھا۔تیس چالیس فٹ کا فاصلہ پندرہ بیس منٹ میں طے ہوا تھا۔نیچے کشادہ جگہ پر آتے ہی انگوری گھاس پر دراز ہو گئی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔میں بھی اُس کے قریب بیٹھ گیا اور اُس کی طرف دیکھنے لگا۔وہ پشت کے بل لیٹی ہوئی تھی...... اُس کے سینے کا زیر و بم میرے اندر عجیب سی کیفیت پیدا کرنے لگا لیکن میں فوراً ہی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ہم اُس جگہ سے نجانے کتنی دُور نکل آئے تھے۔فضا میں ہیلی کاپٹروں کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔میرے خیال میں اب ہم محفوظ تھے۔کچھ ہی آگے گنجان درختوں کا سلسلہ تھا۔اگر کاپٹر آ بھی گئے تو ہم ان درختوں میں پناہ لے سکتے تھے۔

میں انگوری کو وہیں چھوڑ کر درختوں کی طرف آ گیا۔اور پھر میں خوشی سے ناچ اُٹھا...... وہ خوبانی کے درخت تھے۔اُن پر پھل نہیں لگا ہوا تھا البتہ نیچے گھاس پر اِدھر اُدھر خوبانی کی لاتعداد گٹھلیاں بکھری ہوئی تھیں۔تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ان درختوں کا پھل توڑنے والا کوئی نہیں تھا۔پھل نیچے گر کر گل سڑ گیا تھا اور اُن کی گٹھلیاں رہ گئی تھیں۔جگہ جگہ سوکھی ہوئی خوبانیاں بھی نظر آ رہی تھیں اور مزے کی بات یہ تھی کہ چند گز آگے ان درختوں میں شفاف پانی کی ایک چھوٹی سی ندی بھی بہہ رہی تھی۔

میں نے انگوری کو آواز دے کر بلا لیا۔پہلے ہم نے ندی سے پانی پیا اور پھر میں سوکھی ہوئی خوبانیاں اور بکھری ہوئی گٹھلیاں جمع کرنے لگا۔

ہماری پیاس بھی بجھ گئی اور پیٹ کی آگ بھی۔لیکن اب پریشانی کی جو سب سے بڑی بات تھی وہ یہ تھی کہ سورج غروب ہونے والا تھا اور ہمارے پاس پناہ کی کوئی جگہ نہیں تھی۔موسم میں بھی خاصی خنکی آ گئی تھی اور میں جانتا تھا کہ کھلی جگہ پر رات گزارنا قیامت سے کم نہیں ہوگا۔

میں نے ایک میلی سی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی جبکہ انگوری نے شلوار اور کرتہ پہنا ہوا تھا۔کرتے کے دونوں طرف جیبیں تھیں۔ہم نے اپنی جیبوں میں سوکھی ہوئی خوبانیاں بھر لیں اور درختوں کے نیچے چلتے ہوئے نشیب میں اُترنے لگے۔

ہمارے سامنے ہزاروں فٹ نیچے تاحدِ نگاہ سرسبز وادی پھیلی ہوئی تھی۔بظاہر ایسی کوئی جگہ دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن مجھے اُمید تھی کہ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے کہیں کوئی ایسی جگہ مل جائے گی جہاں ہم رات گزار سکیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہی سورج برف پوش چوٹیوں کے پیچھے روپوش ہو گیا۔فضا میں سرمئی دھندلکا پھیلنے لگا اور خوش قسمتی سے ہمیں ایک چھوٹا سا غار بھی مل گیا...... اُس غار کا دہانہ مغرب کے رُخ پر تھا اور اندر ابھی تک مدھم سا اُجالا تھا۔میں اندر گھس گیا۔غار کافی لمبا تھا جبکہ چوڑائی دس بارہ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔بہرحال یہاں رات گزاری جا سکتی تھی۔

ہم غار کے دہانے کے قریب ہی بیٹھ گئے اور اب تک کی صورتحال پر تبصرہ کرنے لگے۔

اندھیرا پھیل گیا۔اب غار کے باہر بھی چند فٹ سے زیادہ دُور کی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔آسمان پر بادلوں کی وجہ سے اندھیرا کچھ زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔وقت کی رفتار جیسے تھم گئی تھی۔باہر تیز ہوا چل رہی تھی اور درختوں اور پودوں کی سرسراہٹ وحشت سی طاری کر رہی تھی۔

دفعتہً ایک زوردار دھماکہ ہوا اور اس کے فوراً بعد فضا میں اس طرح چمک پیدا ہوئی کہ ایک لمحہ کو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں...... وہ بادلوں کے گرجنے کی آواز تھی اور اس کے ساتھ ہی بجلی کڑاکے سے چمکی تھی۔انگوری چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی۔میں نے اُسے اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے لیا۔اور دوسرے ہی لمحے مجھے دماغ میں آندھیاں سی چلتی محسوس ہونے لگیں۔پورے بدن میں سنسناہٹ سی پھیل گئی۔انگوری میرے ساتھ اس طرح لپٹی ہوئی تھی کہ اُس کے دل کی دھڑکن میں اپنے سینے میں محسوس کرنے لگا تھا۔میں نے اُسے غیر ارادی طور پر اپنی بانہوں میں لے لیا۔

تیز بارش شروع ہو گئی تھی۔پانی کے چھینٹے اندر بھی آ رہے تھے۔انگوری مجھ سے الگ ہو گئی۔

''سردی لگ رہی ہے...... بارش کی بوچھاڑ بھی اندر آ رہی ہے۔ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ جائیں نا کونے میں۔'' انگوری نے کہا۔

میں اُسے بازو سے پکڑ کر غار کے آخری حصے میں لے آیا۔یہاں بارش اور تیز ہوا سے تو بچ گئے تھے تاہم خنکی تو بہرحال موجود تھی۔

بارش کی پُرشور آواز دلوں پر وحشت سی طاری کر رہی تھی۔بادل ایک بار پھر گرجے اور

انگوری پھر مجھ سے لپٹ گئی......

''تم تو بہت بہادر لڑکی ہو۔ بادلوں سے ڈور ہی ہو۔'' میں نے کہا۔

''مجھے بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی کڑک سے ڈر لگتا ہے۔'' انگوری نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

بجلی ایک بار پھر کڑکی اور انگوری نے چیخ کر مجھے اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ مجھ سے اس طرح چپک گئی جیسے کبھی الگ نہ ہو گی۔ میں نے بھی اُسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا اور ایک ہاتھ سے اُس کی پشت سہلانے لگا۔ مجھ پر ایک بار پھر وہی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ میرا ایک ہاتھ انگوری کی پشت کو سہلاتا رہا۔ مجھے اپنے سینے پر انگوری کی سانس کی حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ اور پھر سانس کی یہ حرارت میرے گلے پر محسوس ہونے لگی۔

اُسی وقت کڑاکے کے ساتھ بجلی چمکی، غار آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے والی تیز روشنی سے بھر گیا۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

مجھے یوں لگا تھا جیسے بجلی باہر کسی چیز پر نہیں میرے اُوپر گری ہو۔ میں نے تڑپ کر انگوری کو اپنے آپ سے الگ کر دیا لیکن انگوری پھر مجھ سے لپٹ گئی۔

''انگوری......'' میں نے اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''جانتی ہو ہم نے ایک دوسرے سے کیا وعدہ کیا تھا...... کیا تم بھول تو نہیں گئیں؟''

''نن...... نہیں......'' انگوری ہکلائی۔ ''مجھے وہ وعدہ یاد ہے۔''

انگوری مجھ سے الگ ہٹ کر بیٹھ گئی۔ مجھے اُس کے تیز اور بے ربط سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں خاموش بیٹھا غار کی تاریکی میں گھورتا رہا اور کبھی باہر دیکھنے لگتا جہاں بارش کے شور کے سوا کچھ نہیں تھا۔

وقت دھیرے دھیرے سے گزر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ رات کسی طرح جلد بیت جائے مگر وقت کو اپنی رفتار سے چلنا ہوتا ہے۔ وہ کسی کی خواہش کے تابع نہیں ہوتا۔

انگوری شاید سو گئی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے نیند کے جھونکے میں میرے اُوپر جھک گئی۔ میں نے اُس کا سر اپنے گھٹنے پر رکھ لیا اور اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میری آنکھیں بھی بند ہونے لگیں۔

میری آنکھ کھلی تو غار میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ انگوری سمٹی ہوئی میرے ساتھ پڑی ہوئی تھی۔ میں نے باہر دیکھا بارش رات ہی کو کسی وقت بند ہو گئی تھی اور باہر دُھوپ چمک رہی تھی۔ میں نے انگوری کو جگا دیا اور ہم دونوں غار سے باہر آ کر دُھوپ میں بیٹھ گئے۔ آسمان پر کہیں بادلوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ہر طرف دُھوپ پھیلی تھی۔ پہاڑوں پر بارش کا پانی طوفانی ندی نالوں کی صورت میں بہہ رہا تھا اور ایسی حالت میں ہمارے لئے سفر جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔

ہم نے ایک ندی کے کنارے پر بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا، پانی پیا اور اپنی جیبوں سے خوبانیاں

ل کر کھانے لگے۔ یہی ہمارا ناشتہ تھا۔ خوبانیوں کی گٹھلیاں توڑ کر اُن کی گریاں کھانے کا ایک ی مزہ آ رہا تھا۔ میں نے انگوری کی طرف دیکھا وہ اس وقت میری طرف ہی دیکھ رہی تھی لیکن اپنی طرف متوجہ پا کر اُس نے نظریں جھکا لیں۔

دوپہر ہو گئی۔ ندی نالوں میں پانی کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ میں غار میں جا کر رائفلیں اُٹھا لایا انگوری نے اپنی رائفل لے کر کندھے پر لٹکا لی اور ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

اگلی رات بھی ہمیں ایک غار ہی میں گزارنی پڑی۔ دوسرے دن صبح سویرے ہم پھر چل ے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس وقت ہم کہاں ہیں اور کسی منزل پر پہنچ بھی سکیں گے یا زندگی بھر ن پہاڑوں میں بھٹکتے رہیں گے؟

انگوری کی حالت خاصی ابتر ہو رہی تھی۔ بھوک اور تھکن نے اُسے بری طرح نڈھال کر رکھا میں اُسے حوصلہ دلاتا رہا اور وہ لشتم پشتم میرے ساتھ گھسٹتی رہی۔

دوسرے دن شام کو نشیب میں بہت دُور ایک جگہ سے دُھوئیں کی ایک لکیر اُٹھتے دیکھ کر ہم گئے۔ وہاں یقیناً کوئی بستی تھی۔ لیکن ہم اندھا دُھند اس بستی میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ نے بھارتی فوج کو بہت بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ نہ صرف کروڑوں روپے کا گولہ بارود تباہ کیا تھا اس کے ساتھ درجنوں فوجیوں کو بھی جہنم رسید کر دیا تھا۔ وہ ہیلی کاپٹر جس طرح ہماری تلاش ئی گھنٹوں تک پہاڑوں پر پرواز کرتا رہا تھا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ بھارتی فوج کارروائی میں حصہ لینے والے مجاہدین کو ہر صورت میں تلاش کرنا چاہتی ہے۔

یہ دوسرا دن تھا اور مجھے توقع تھی کہ بھارتی فوج چپے چپے پر پھیل چکی ہو گی۔ کوئی گاڑی، کوئی ان سے محفوظ نہیں ہو گی۔ میں دوسرے ساتھیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ اُن سے کوئی پکڑا گیا تھا یا سب لوگ پناہ کی تلاش میں ہماری طرح بھٹک رہے تھے؟

ہم درختوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھ گئے۔ جیبوں میں بھری ہوئی خوبانیاں آج صبح ختم ہو چکی ں اور ہمیں کوئی پھلدار درخت بھی نہیں ملا تھا۔ ہم صبح سے بھوکے تھے۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد میں نے انگوری کا ہاتھ پکڑا اور محتاط انداز میں اُس بستی کی ف بڑھنے لگا جس کا ہم نے دُور سے صرف ایک ہی مکان دیکھا تھا اور دُھواں بھی اُسی مکان منی سے اُٹھ رہا تھا۔

ہم بہت محتاط انداز میں چلتے ہوئے اُس مکان کے قریب پہنچ گئے۔ ایک کھڑکی میں لالٹین روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھا اور پھر یہ انکشاف ہوا کہ صرف وہی مکان تھا۔ اور غالباً یہ کوئی فارم ہاؤس تھا۔

میں اور انگوری دبے قدموں چلتے ہوئے مکان کے قریب پہنچ گئے۔ میں نے محتاط انداز میں کی میں جھانک کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی چونکے بغیر نہ رہ سکا......

چارپائی پر ایک نوجوان لیٹا ہوا تھا۔ اُس کے بازو اور سینے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں جو خون

سے تر ہو رہی تھیں۔ چار پائی کے قریب ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی اُس نوجوان کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ میں اُس نوجوان کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر دفعۃً اپنے عقب میں بھیڑیئے جیسی غراہٹ سن کر اُچھل پڑا......

''اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا......تم دونوں میری رائفل کی زد پر ہو۔''

انگوری کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

''رائفلیں پھینک کر ہاتھ اُٹھا لو ورنہ بھون کر رکھ دُوں گا۔'' وہی غراہٹ دوبارہ سنائی دی۔

میں نے رائفل پھینک کر ہاتھ اُوپر اُٹھا دیئے۔ انگوری نے بھی میری تقلید کی تھی۔ میں اپنی جگہ پر بے حس وحرکت کھڑا آنے والے لمحات کا انتظار کر رہا تھا۔

○

کمرے میں بیٹھی ہوئی عورت بھی مُڑ کر اس طرف دیکھنے لگی تھی۔ اور پھر وہ اُٹھ کر تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔ چار پائی پر پڑے ہوئے زخمی نوجوان کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔

اُس شخص نے ہمیں پیچھے مُڑنے کا حکم دیا۔ میں جیسے ہی مُڑا میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ وہ بھارتی فوجی نہیں تھا، کشمیری کاشتکار تھا جس نے ہمیں رائفل کی زد میں لے رکھا تھا۔ وہ ہمیں مکان کے سامنے کی طرف لے آیا۔ یہاں برآمدے میں ایک لالٹین جل رہی تھی اور وہ عورت ایک لاٹھی اُٹھائے برآمدے میں کھڑی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اُس نے لاٹھی پھینک دی اور حیرت سے انگوری کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم کون ہو......؟'' اُس نے انگوری کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''میں انگوری ہوں...... کشمیر کی بیٹی...... ایک مجاہدہ......'' انگوری نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ''ہم اُونچے پہاڑوں سے آئے ہیں اور ہمیں پناہ کی تلاش ہے۔''

وہ شخص بھی ہمارے سامنے آ گیا جس نے ہمیں رائفل کی زد پر لے رکھا تھا۔ اُس نے رائفل جھکا لی۔ پہلے انگوری کی طرف دیکھا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اگر یہ انگوری ہے تو تم یقیناً شمروز ہو۔''

''ہاں......!'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''چلو...... اندر چلو!'' اُس شخص نے اشارہ کیا۔

ہم اُس کمرے میں آ گئے۔ بستر پر پڑے ہوئے زخمی نوجوان نے ہماری طرف دیکھا اور پھر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اب میں نے بھی اُسے پہچان لیا تھا۔ وہ ان چالیس مجاہدین میں سے ایک تھا جو اس رات بھارتی فوجی قافلے پر حملہ کرنے کے لئے غار سے روانہ ہوئے تھے۔

سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک دوسری چار پائی بچھی ہوئی تھی۔ انگوری تو اُس چار پائی پر

اس طرح ڈھیر ہو گئی جیسے اُس کی ہمت اب بالکل جواب دے گئی ہو۔ میں چار پائی کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ وہ عورت کمرے سے باہر چلی گئی۔ اُس کا شوہر غلام رسول میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اور پھر باتوں باتوں میں یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا شہباز نام کے اس مجاہد کا تعلق کمانڈر عبدالغنی کے گروپ سے تھا۔ فوجی قافلے پر کارروائی کے بعد وہ پہاڑوں میں بھاگ رہے تھے کہ کمانڈر عبدالغنی ہیلی کاپٹر سے چلائی جانے والی گولیوں کی زد میں آ کر شہید ہو گیا۔ اس گروپ کے تین آدمی اور شہید ہوئے تھے۔ وہ خود یعنی شہباز بھی زخمی ہوا تھا، اور پہاڑوں میں بھٹکتا ہوا دو دن بعد یہاں پہنچا تھا۔ غلام رسول اور اُس کی بیوی اُس کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔

غلام رسول نے یہ بھی انکشاف کیا کہ اس فوجی قافلے کی تباہی کے بعد پوری وادی میں بھارتی فوج کی سرگرمیوں میں تیزی آ گئی تھی۔ مجاہدین کے ٹھکانوں پر حملے کئے جا رہے تھے۔ ہر گاؤں اور بستی میں بے گناہ نوجوانوں کو گرفتار کر کے اُنہیں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

یہ فارم ہاؤس پہلگام سے تقریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ غلام رسول کے کہنے کے مطابق دو دنوں میں کم از کم تین مرتبہ فوجی اس طرف آ چکے تھے۔ ہر مرتبہ اُنہوں نے مکان کی تلاشی لی تھی اور غلام رسول اور اُس کی بیوی کو ڈرا دھمکا کر گئے تھے۔ شہباز آج شام سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے یہاں آیا تھا۔

ایک دلچسپ اور سنسنی خیز انکشاف یہ ہوا کہ فوجی قافلے کی تباہی کی تمام تر ذمہ داری انگوری اور شمروز پر (یعنی ہم پر) ڈال دی گئی تھی۔ پہاڑوں میں ہوا سے اُڑ جانے والی انگوری کی کالی چادر بھارتی فوجیوں کے ہاتھ آ گئی تھی۔ وہ کالی چادر انگوری کی شناخت تھی جس سے یہ طے کر لیا گیا تھا کہ اُس فوجی قافلے پر حملہ ہم نے ہی آرگنائز کیا تھا۔

غلام رسول کی بیوی رابعہ چائے بنا کر لے آئی۔ انگوری بھی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی حالت تو بہت ہی خستہ ہو رہی تھی۔

''ہم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔'' وہ رابعہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے بولی۔ ''بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ اگر کچھ کھانے کو ہو تو......''

''میں نے چاول چڑھا دیئے ہیں۔'' رابعہ نے جواب دیا۔ ''چائے پی لو! آدھے گھنٹے میں چاول بھی تیار ہو جائیں گے۔''

چائے کے دوران میں شہباز سے باتیں کرتا رہا۔ اُس نے بتایا کہ ہیلی کاپٹر کی فائرنگ سے اُس کے گروپ کے کمانڈر عبدالغنی سمیت پانچ مجاہدین شہید ہوئے تھے۔ دوسروں کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ لوگ محفوظ ٹھکانوں پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے یا نہیں؟

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم نے کھانا کھایا۔ اُبلے ہوئے چاول اور پتلی سی مسور کی دال ہمارے لئے یہ بھی بہت بڑی نعمت تھی۔ کھانے کے بعد رابعہ انگوری کو ساتھ والے کمرے میں لے گئی۔ میں بھی تھکن سے چور ہو رہا تھا اور چار پائی پر نیم دراز ہو گیا۔ اور پھر کچھ ہی دیر بعد میری آنکھیں

بند ہونے لگیں۔

میں پتہ نہیں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا گیا۔ ''اُٹھو...... جلدی کرو!'' غلام رسول کہہ رہا تھا۔ ''فوجیوں نے مکان کو گھیرے میں لے لیا ہے۔''

میں ہڑبڑا کر اُٹھ گیا، میری نیند کافور ہو گئی تھی۔ شہباز نے بھی زخمی ہونے کے باوجود رائفل سنبھال لی تھی۔ میں بھی اُٹھ کر دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی اپنی رائفل کی طرف لپکا۔ انگوری بھی دوسرے کمرے سے نکل کر دوڑتی ہوئی اس طرف آ گئی۔ اُس نے بھی اپنی رائفل اُٹھا لی۔

میں نے سامنے والی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ تقریباً پچاس گز دُور ایک جیپ کھڑی تھی۔ اس کے علاوہ اور کوئی ٹرک یا جیپ نظر نہیں آئی۔ جس کا مطلب تھا کہ اس جیپ پر آنے والے فوجیوں کی تعداد چھ سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔

غلام رسول کے ہاتھ میں بھی آٹومیٹک رائفل نظر آ رہی تھی۔ گویا اُس نے بھی مقابلے کی ٹھان لی تھی۔ غلام رسول پچھلی کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ شہباز نے سامنے والی کھڑکی کے قریب پوزیشن سنبھال لی۔ میں انگوری کو لے کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ رابعہ بھی رائفل اُٹھائے کھڑی تھی۔ میں نے انگوری کو ایک کھڑکی کے سامنے پوزیشن لینے کو کہا اور خود دوسرف طرف کے دروازے کے قریب آ گیا۔ میں نے بڑی آہستگی سے چند انچ کے قریب دروازہ کھولا اور باہر جھانکنے لگا۔ باہر گہری تاریکی تھی اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

دفعتہً فضا فائر کی آواز سے گونج اُٹھی۔ فائر دوسرے کمرے سے ہوا تھا۔ غالباً غلام رسول یا شہباز نے گولی چلائی تھی۔ جواب میں چاروں طرف سے مکان پر گولیوں کی بارش ہونے لگی۔

ہم بھی پوزیشن لے کر فائرنگ کرنے لگے۔ میں دروازے کے قریب زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ کئی گولیاں دروازے پر لگی تھیں۔ سامنے درختوں میں ایک ہیولے کو متحرک دیکھ کر میں نے فائر کر دیا۔ ایک چیخ کی آواز گونجی اور دوڑتا ہوا وہ ہیولا ڈھیر ہو گیا۔

مکان چاروں طرف سے گھیرے میں تھا۔ اس طرف سے میں نے ایک فوجی کو ڈھیر کر دیا تھا، دوسرا رابعہ کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال اُبھرا۔ اگر ہم مکان کے اندر رہے تو آسانی سے مارے جائیں گے۔ جبکہ اس طرف سے کچھ راستہ بن گیا تھا اور ہم باہر نکل سکتے تھے۔

میں دوڑ کر دوسرے کمرے میں آ گیا اور غلام رسول کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

''تم ان لوگوں کو لے کر نکلنے کی کوشش کرو۔ میں اس طرف سے اُنہیں اپنی طرف متوجہ رکھتا ہوں۔'' غلام رسول نے جواب دیا۔ ''شہباز! تم بھی ان لوگوں کے ساتھ جاؤ۔''

''نہیں......'' شہباز نے جواب دیا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کمانڈر! تم خواتین کو لے کر نکل جاؤ۔ ہم انہیں اس طرف اُلجھائے رکھتے ہیں۔''

میں دوڑ کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ اس طرف اب فائرنگ نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے

رابعہ اور انگوری کو اشارہ کیا اور دروازہ کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ اس طرف کوئی نقل و حرکت بھی دکھائی نہیں دی۔ میں اُن دونوں کو لے کر باہر نکل آیا اور ہم تینوں تیزی سے درختوں کی طرف دوڑنے لگے۔

دفعتہً دائیں طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی رابعہ کی چیخ سنائی دی...... وہ لڑکھڑاتی ہوئی گر گئی۔ میں نے مُڑ کر اُسے اُٹھانے کی کوشش کی۔

''مجھے چھوڑ دو!'' رابعہ کراہی۔ ''مجھے کم از کم چار گولیاں لگی ہیں۔ میں نہیں بچ سکتی۔ تم انگوری کو لے کر نکل جاؤ...... جلدی کرو!''

اس وقت گولیوں کی ایک اور بوچھاڑ آئی۔ گولیاں ہمارے سروں کے اُوپر سے گزر گئیں۔ میں نے رابعہ کو چھوڑ دیا اور انگوری کے ساتھ درختوں کی طرف دوڑنے لگا۔

فائرنگ مسلسل ہو رہی تھی۔ دفعتہً انگوری کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑا گئی...... میں نے مُڑ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے کھینچتا ہوا دوڑنے لگا......

گولیوں کی ایک اور بوچھاڑ آئی۔ اور اس مرتبہ انگوری کے ساتھ میرے بھی منہ سے چیخ نکل گئی...... میری بائیں ران میں گولی لگی تھی اور انگوری کا تو جسم چھلنی ہو گیا تھا...... وہ تیورا کر گر گئی۔

''جج...... جاؤ...... بھاگ جاؤ......'' وہ کراہتے ہوئے رُک رُک کر بولی۔ ''مم مجھے چھوڑ دو...... اپنے آپ کو...... بچاؤ...... کشمیر کو تمہاری...... ضرورت ہے اور کشمیر...... ضرور...... آزاد ہو گا...... خدا...... حافظ......''

انگوری خاموش ہو گئی...... ہمیشہ کے لئے...... کشمیر کی بیٹی نے کشمیر کی آزادی کے لئے اپنی جان دے دی تھی......

مجھ پر جنون سا طاری ہو گیا۔ میں نے اندھا دُھند فائرنگ شروع کر دی۔ ایک چیخ سنائی دی۔ میں وہاں رُکا نہیں، لنگڑاتا ہوا درختوں کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

اور پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا اور میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا...... غلام رسول کا مکان شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ ایک اور دھماکہ ہوا اور آگ کا وہ گولہ غبارے کی طرح پھٹا اور جلتے ہوئے ٹکڑے چاروں طرف بکھرنے لگے۔

○

میں پہلگام کے اُوپر سے ہوتا ہوا رات بھر پہاڑوں میں سفر کرنے کے بعد بٹا کھو کی طرف آ گیا۔

ران پر لگنے والی گولی گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ غلام رسول کے مکان کی تباہی کے بعد دُشمن فوجیوں نے فائرنگ کرتے ہوئے میرا پیچھا کیا تھا مگر میں تاریکی سے فائدہ اُٹھاتا ہوا نکل اور پہاڑوں میں ان سے بہت دُور نکل گیا تھا اور پھر ایک جگہ رُک کر میں نے اپنی شرٹ اُتار لی اور اُسے پھاڑ کر پٹیاں سی بنا لیں۔ پتلون نیچے کر کے میں نے زخم پر پٹیاں کس لیں اور

پتلون چڑھالی۔ اس طرح خون بہنا رُک گیا تھا مگر چلنے میں کافی تکلیف ہو رہی تھی۔

میں صبح کی روشنی پھیلنے سے کچھ ہی دیر پہلے بٹا کھوکی نواحی پہاڑیوں میں پہنچا۔ رات بھر چلتے رہنے سے میری حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ مجھے فوری طور پر علاج کی ضرورت تھی۔ لیکن میں کسی بستی میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ بھارتی فوجی وادی کے چپے چپے میں پھیل گئے تھے۔

تقریباً دو گھنٹے بٹا کھوکی نواحی پہاڑیوں میں رُکنے کے بعد میں نے اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔ اس مرتبہ میں دریائے لدھر کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ٹانگ کے زخم کی وجہ سے مجھے چلنے میں خاصی دُشواری پیش آ رہی تھی۔ لیکن میں چلتا رہا اور شام کے وقت اننت ناگ سے چند میل دُور بھون نامی ایک چھوٹے سے گاؤں کے نواح میں پہنچ گیا۔

بھوک اور تھکن سے میری بری حالت ہو رہی تھی۔ زخم سے بھی رہ رہ کر خون رِسنے لگا تھا۔ لیکن میں نے اپنا سفر جاری رکھا تھا۔

اُس وقت شام کا دھندلکا پھیل گیا تھا۔ میرے سامنے مرغزار پھیلا ہوا تھا اور تقریباً نصف میل کے فاصلے پر بھون نامی بستی تھی۔ میں ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مجھے بستی میں داخل ہونا چاہئے یا نہیں؟ کہ دفعتہً میں گھنٹیوں کی آواز سن کر چونک گیا۔ میں نے پتھروں کی آڑ سے نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا اور میرا اندازہ درست نکلا۔

وہ بھیڑوں کا ایک ریوڑ تھا۔ بھیڑوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیاں فضا میں عجیب سا تاثر پیدا کر رہی تھیں۔ خچر پر سوار ایک ادھیڑ عمر آدمی بھیڑوں کو اِدھر اُدھر سے گھیر کر سیدھے راستے پر لیجانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے چیخ کر اُس شخص کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اُس نے خچر کا رُخ فوراً ہی میری طرف موڑ دیا اور قریب آ کر خچر سے اُتر گیا۔ میری حالت دیکھ کر وہ چونک گیا۔ میں نے اُسے اپنا نام نہیں بتایا لیکن میری حالت دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ میں کوئی مجاہد ہی ہو سکتا ہوں۔

''بستی میں جانا تمہارے لئے مناسب نہیں ہے۔'' اُس بوڑھے نے کہا۔ ''تم یہیں رُکو! میں تمہارے لئے کوئی بندوبست کرتا ہوں۔''

وہ بوڑھا خچر پر سوار ہو کر بھیڑوں کو ہانکتا ہوا چلا گیا۔

اُس کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ وہ میرے لئے نہ صرف کھانا لے کر آیا تھا بلکہ مرہم بھی لے آیا تھا۔ میں نے پہلے زخم پر مرہم لگا کر پٹی باندھی اور پھر روٹی کھانے لگا۔ وہ تین موٹی موٹی روٹیاں لے کر آیا تھا۔ ساتھ میں مرچوں کا اچار تھا۔ میں نے دو روٹیاں کھالیں اور تیسری بچا کر رکھ لی۔

اُس بوڑھے سے بڑے سنسنی خیز انکشافات ہوئے تھے۔ کل صبح دو مجاہدین پہلگام میں ایک سکھ گھرانے سے پکڑے گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں ہندو فوجیوں نے مسلمان مجاہدین کو پناہ دینے کے الزام میں شہر کے چالیس سکھوں کو ایک جگہ جمع کر کے گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔

اُس بوڑھے کی باتوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ اننت ناگ میں بھی بڑے زوردار ہنگامے ہو رہے تھے۔ یہاں مجاہدین نے ایک فوجی چوکی بھی تباہ کر دی تھی۔ مجاہدین کی تلاش میں بھارتی فوجی دستے قرب و جوار کی چھوٹی چھوٹی بستیوں پر بھی چڑھائی کرتے رہتے تھے۔

اُس بوڑھے چرواہے نے مہربانی یہ کی کہ اپنا خچر مجھے دے دیا اور میں اُس کا شکریہ ادا کر کے رات ہی رات سفر کرتا ہوا درّہ بنیال سے ہوتا ہوا ہنگ پورہ کی طرف نکل آیا۔

سطح سمندر سے تین ہزار فٹ کی بلندی پر واقع یہ بستی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ میں دن کے گیارہ بجے کے قریب یہاں پہنچا تھا۔ رات بھر سردی میں ٹھٹھرتا رہا اور اب چمکتی ہوئی تیز دُھوپ میرے برہنہ جسم کو جھلسائے دے رہی تھی۔

ہنگ پورہ سے کچھ پہلے چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ میں کچھ دیر پہاڑیوں میں کھڑا بستی کا جائزہ لیتا رہا اور پھر خچر کا رُخ بستی کی طرف موڑ دیا۔

پوری وادی میں کوئی جگہ بھارتی بھیڑیا صفت فوجیوں کی سرگرمیوں سے محفوظ نہیں تھی۔ فوجی دستے اُس بستی پر بھی چڑھائی کرتے رہتے تھے لیکن پچھلے دو دن سے فوج کی کسی پارٹی نے اس طرف کا رُخ نہیں کیا تھا۔

بستی کے لوگوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مجھے بشیر احمد نامی ایک شخص کے گھر پہنچا دیا گیا۔ سب سے پہلے میرے کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا اور پھر ایک بوڑھا میرے زخم کا معائنہ کرنے لگا۔

عبدالحفیظ حکیم تھا۔ میرا زخم دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ میں تین دن سے بھاگ دوڑ کر رہا تھا اور اس بھاگ دوڑ اور کوئی علاج نہ ہونے کی وجہ سے بھی زخم بگڑنے لگا تھا۔

''تمہیں علاج کے ساتھ آرام کی بھی ضرورت ہے بیٹا!'' حفیظ نے کہا۔ ''اگر زخم زیادہ بگڑ گیا تو تمہاری یہ ٹانگ مفلوج ہو جائے گی۔''

''آرام......'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''آرام تو اس وقت ہی ملے گا جب ہم ہندو غاصبوں کو اس وادی سے نکال دیں گے۔''

''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں...... ہر کشمیری مسلمان کا عہد یہی ہے لیکن......'' حکیم حفیظ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ''لیکن ان غاصبوں کو وادی سے نکالنے کے لئے اپنے ہاتھوں پیروں کا تندرست ہونا ضروری ہے۔ تم چند روز یہاں رہو! میں تمہارا علاج کروں گا۔ تم انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

حکیم حفیظ نے جڑی بوٹیوں سے تیار کیا ہوا ایک مرہم میرے زخم پر باندھ دیا۔

مجھے اُس بستی میں دو دن گزر گئے۔ اس زخم اور مسلسل بھاگ دوڑ کی وجہ سے اب میں اپنے آپ میں کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔ حکیم حفیظ روزانہ میری پٹی تبدیل کر رہا تھا لیکن ظاہر ہے

دو دن میں زخم ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس نے مجھے چند روز آرام کرنے کو بھی کہا تھا۔ لیکن تیسرے روز شام کے وقت اچانک ہی بھارتی فوجیوں کے ایک دستے نے گاؤں پر ہلہ بول دیا۔ اُنہیں اطلاع ملی تھی کہ بستی والوں نے کسی زخمی مجاہد کو پناہ دے رکھی ہے۔

میں کسی نہ کسی طرح موقع پا کر اُس بستی سے نکل گیا اور پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ اُس وقت میرے جسم پر ایک پاجامہ اور کرتہ تھا۔ میری ٹانگ میں رہ رہ کر ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ ایک قدم اُٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ لیکن میں پہاڑوں میں رات بھر سفر کرتا رہا۔ کبھی چند منٹ آرام کرنے کے لئے بیٹھ جاتا اور پھر چل پڑتا۔

اس بستی میں رہتے ہوئے میں نے اپنا اصل نام نہیں بتایا تھا لیکن بستی والوں سے جو باتیں معلوم ہوئی تھیں اُن سے پتہ چلا تھا کہ انگوری ماری گئی تھی اور شمروز زخمی ہو کر فرار ہو گیا تھا۔ وہ بھارتی فوج کو سب سے زیادہ مطلوب تھا اُس کے ساتھ ہی فوج کو کمانڈر محب اللہ، کمانڈر الیاس اور دوسرے نامور مجاہد لیڈروں کی بھی تلاش تھی۔

میں نے راہِ فرار اختیار نہیں کی تھی۔ مجھے کسی ایسی منزل کی تلاش تھی جہاں چند روز آرام کر سکوں اور مجاہدین کی ایک نئی طاقت جمع کر کے بھارتی غاصبوں کے خلاف از سرِ نو کارروائیاں شروع کر سکوں۔

رات بیت گئی...... سردی کی وجہ سے میرے زخم کی تکلیف بھی بڑھ گئی تھی مگر میں سورج نکلنے کے بعد بھی چلتا رہا۔ میں اُس وقت دریا کے ساتھ ساتھ ہی سفر کرتا رہا۔ بھوک، تھکن اور زخم کی تکلیف سے میری حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے بار بار اندھیرا اچھل رہا تھا۔ اور بالآخر میری ہمت جواب دے گئی...... میں لڑکھڑا کر گرا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھلتا چلا گیا...... اور اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔

مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک غار کے پتھریلے فرش پر پڑے ہوئے پایا۔ میرے اُوپر کوئی جھکا ہوا تھا...... میری آنکھوں کے سامنے دُھند پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چہرہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اُسی لمحہ ایک کھنکتی ہوئی مترنم سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''شکر ہے تم ہوش میں تو آئے...... میں تو پریشان ہو گئی تھی۔''

میں سر جھٹکنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے سے دُھند چھٹنے لگی اور وہ چہرہ واضح ہوتا چلا گیا......

وہ وجیہہ ملیح چہرہ بہت ہی حسین تھا۔ میرے ذہن میں انگوری کا خیال اُبھرا۔ لیکن وہ انگوری نہیں تھی۔ انگوری نے ماتھے پر کبھی بندیا نہیں لگائی تھی۔ اور پھر مجھے یاد آ گیا کہ انگوری تو اب اس دنیا میں ہی نہیں رہی تھی......

وہ بہت حسین تھی۔ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں جن میں ستاروں جیسی چمک تھی اور ماتھے پر سرخ بندیا بہت بھلی لگ رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی آگے کو جھکی ہوئی تھی۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

میں غور سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے حواس بحال ہو رہے تھے۔ اُس کے ماتھے پر چمکتی ہوئی بندیا دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ہندو تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی...... میں پلک جھپکے بغیر اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

OOO

اُس چہرے اور اُس آواز نے مجھے مسحور سا کر دیا اور ایک لمحہ کو میں یہ بھول گیا کہ میں کون ہوں؟ کس حال میں ہوں اور کہاں ہوں......؟

''کیسے ہو جی......؟'' وہ جلترنگ سی آواز پھر میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''تم جتنی دیر بے ہوش رہے ہم نے بھگوان سے پرارتھنا کی کہ تم ہوش میں آ جاؤ۔ سیانے ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ دل سے مانگی ہوئی دُعا ضرور پوری ہوتی ہے۔ تم ہوش میں آ گئے۔ میری دُعا پوری ہوگئی۔ اب تم چنتا مت کرو! بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔''

میں چند لمحے اُس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اُٹھنے کی کوشش کی تو درد کی ایک شدید لہر برقی رو کی طرح میرے بدن میں پھیلتی چلی گئی۔ میں بے اختیار کراہ اُٹھا اور دوبارہ پتھریلے فرش پر لیٹ گیا۔ میری زخمی ٹانگ میں شدید درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ میں نے دانت بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں اور ذہن پر زور دے کر سوچنا لگا کہ میں کہاں ہوں؟ میری ٹانگ کیسے زخمی ہوئی تھی؟

میں اور انگوری فوجی قافلے کی تباہی کے بعد دو تین دن اُونچے پہاڑوں میں سفر کرنے کے بعد پہلگام سے چند میل دُور غلام رسول نامی ایک کاشتکار کے فارم ہاؤس میں پہنچے تھے جہاں ایک زخمی مجاہد پہلے ہی موجود تھا۔ اور پھر اُسی رات بھارتی فوجیوں نے اُس فارم پر حملہ کر دیا...... ہم مقابلے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھے۔ غلام رسول اور اُس کی بیوی نے ہمیں وہاں سے بھگا دینا چاہا تھا کیونکہ اُن کے خیال میں میری اور انگوری کی زندگیاں سب سے اہم تھیں اور کشمیری قوم کو ہماری ضرورت تھی۔

فارم ہاؤس سے فرار کی کوشش میں انگوری بھارتی فوجیوں کی گولیوں سے چھلنی ہوگئی اور میری ٹانگ میں بھی گولی لگی۔ لیکن میں وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔

میں دو دن تک پہاڑوں میں بھٹکتا رہا۔ مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں میں چند روز آرام کر سکوں اور اپنے بکھرے ہوئے ساتھیوں سے رابطہ کر کے اُنہیں ایک جگہ جمع کر سکوں۔ لیکن مجھے ایسی کوئی جگہ نہیں ملی۔ ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر بستی میں بھارتی فوجی موجود تھے۔ مجھے جنگلوں اور پہاڑوں میں بھی تلاش کیا جا رہا تھا۔

میری ٹانگ کا زخم پھیلتا جا رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر طبی امداد نہ ملی تو زہر پھیل جائے گا اور ٹانگ مفلوج ہو جائے گی۔ میں کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں پہاڑوں میں بھٹکتا رہا اور بالآخر میری ہمت جواب دے گئی اور میں گر کر بے ہوش ہوگیا...... اور اب جو ہوش آیا تو نہ صرف اپنے آپ

کو ایک غار میں پڑے ہوئے پایا بلکہ ایک حسینہ بھی میرے اُوپر جھکی ہوئی تھی۔

میں اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کراہ اُٹھا تو اُس نے جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے سہارا دے کر بٹھا دیا۔ میں نے اپنے آپ کو گھسیٹ کر دیوار سے ٹیک لگا لی۔ میری دونوں ٹانگیں آگے کو پھیلی ہوئی تھیں۔ جس ٹانگ میں گولی لگی تھی وہ لکڑی کے تختے کی طرح اکڑی ہوئی تھی...... پتلون کا وہ حصہ خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ خون سوکھ گیا تھا اور پتلون کا کپڑا بھی اکڑا ہوا تھا۔

''تم بہت گھائل ہو جی......'' وہ حسینہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیسے لگی گولی تمہاری ٹانگ میں؟''

''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ مجھے گولی لگی ہے؟'' اپنی تکلیف کے باوجود اُس کی بات سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''ہم نے دیکھا تھا جی......'' اُس نے نظریں جھکاتے ہوئے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ ''ہم تو وید جی کو بلانے جا رہے تھے مگر اس کارن ہم نے ارادہ بدل دیا۔''

''کس کارن؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''تم مسلمان ہو جی......'' اُس نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔ ''اگر ہم وید جی کو بلا لاتے تو وہ تمہیں سینکوں کے حوالے کر دیتے۔ اس لئے ہم نے وید جی کو نہیں بلایا اور تمہارے ہوش میں آنے کا انتظار کرتے رہے۔ اب بتاؤ جی...... ہم تمہارا کریں کیا؟ تمہارا کشٹ ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔''

میں گہری نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ ہندو تھی اور اُس نے یہ بھی جان لیا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ لیکن اس کے باوجود اُسے مجھ سے ہمدردی ہو رہی تھی اور میری تکلیف اُس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اُس نے کسی وید کو اس لئے نہیں بلایا تھا کہ وہ مجھے فوجیوں کے حوالے کر دے گا۔

''تم کون ہو...... یہ جگہ کون سی ہے اور مجھے اس غار میں کون لایا تھا؟'' میں نے ایک وقت میں کئی سوال کر ڈالے۔

''ہمارا نام سیتا ہے جی...... سیتا دیوی۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''یہ جگہ ڈوڈا سے پانچ کوس دُور ہے۔ وہ اُدھر ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ چند گھر ہیں۔ میرا ماما وہاں رہتا ہے۔ اُس کی زمین ہے۔ سیب کے باغ ہیں اور وہ بستی کا مکھیا بھی ہے۔ ہم جے پور سے آئے ہوئے ہیں جی......'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''ہم سیر کو اس طرف آئے تھے لیکن تمہیں وہاں بے ہوش پڑے دیکھا۔ آس پاس اور کوئی نہیں تھا۔ ہم تمہیں اُٹھا کر اس غار میں لے آئے اور ندیا سے پانی لا لا کر تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے۔''

''مجھے تو یہاں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی...... تم پانی کس میں لائی تھیں؟ اور ندیا یہاں سے کتنی دُور ہے؟'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ندیا ادھر نیچے کی طرف ہے جی......" اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "ہم ندیا پر جا کر اپنی ساڑھی کا پلو بھگو لیتے تھے اور یہاں آ کر تمہارے منہ پر نچوڑ دیتے تھے۔ پر تم بہت بے ہوش تھے اور جانتے ہو دو گھنٹوں بعد ہوش میں آئے ہو۔"

"تم ہندو ہو اور تم نے یہ بھی جان لیا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کے باوجود تم نے بستی والوں کو میرے بارے میں اطلاع نہیں دی۔" میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"تم تو پہلے ہی گھائل ہو......" وہ بولی۔ "بستی والے تمہیں سینکوں کے حوالے کر دیتے اور وہ تمہیں مار دیتے۔"

"اور تم نہیں چاہتیں کہ میں مار دیا جاؤں۔" میں نے ایک بار پھر اُس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"ہم نے جے پور میں سنا تھا کہ کشمیر میں مسلمان ہندوؤں پر بہت ظلم کرتے ہیں۔ ہمارے پتا جی تو ہمیں یہاں آنے نہیں دیتے تھے لیکن ہم زبردستی آ گئے۔ یہاں ایک مہینہ سے ہیں اور جو کچھ دیکھا وہ بہت افسوسناک ہے جی۔"

"یعنی مسلمان ہندوؤں پر ظلم ڈھا رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں جی......" اُس نے جواب دیا۔ "بات تو اس کے اُلٹ ہے جی...... ہمارے ماما کی بستی میں زیادہ گھر ہندوؤں کے ہیں جی۔ پانچ چھ گھر مسلمانوں کے بھی تھے۔ ہندوؤں نے اُنہیں ڈرایا دھمکایا تو وہ اپنے گھر اور اپنی زمینیں بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ اب مسلمانوں کا صرف ایک گھر ہے۔ چاچا قربان علی...... بہت اچھا آدمی ہے۔ وہ بوڑھا آدمی ہے۔ ایک جوان بیٹی ہے۔ میرے ماما سے اُن کی بچپن کی دوستی ہے اس لئے بستی کے ہندو چاچا قربان علی کو تنگ نہیں کرتے۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ "ادھر مسلمانوں پر بہت ظلم ہوتا ہے۔ جموں میں، کشمیر میں، ہر جگہ اُنہیں تنگ کیا جاتا ہے۔ سینک اُن کے گھروں میں گھس جاتے ہیں۔ ان پر گولیاں چلاتے ہیں۔ مسلمان عورتوں کو بالوں سے پکڑ کر سڑکوں پر گھسیٹتے ہیں۔ ان کا بلادکار کرتے ہیں۔ ڈوڈا میں ہم نے خود دیکھا ہے جی۔"

"بلادکار کرتے ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی......" وہ جلدی سے بولی۔ "عورتوں کو بالوں سے پکڑ کر سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے اور اُنہیں ٹھوکریں مارتے ہوئے۔"

"گویا تمہیں کشمیر کے مسلمانوں سے ہمدردی ہے...... کیا تم نے کبھی اپنے ماما سے یہ بات کہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک بار کہی تھی جی جب ہم شروع میں یہاں آئے تھے۔" سیتا دیوی نے جواب دیا۔ "ماما نے ہمیں ڈانٹ دیا تھا کہ آئندہ ہم محتاط رہیں اور کسی کے سامنے ایسی باتیں نہ کریں۔ پر میں وہ

دن کیسے بھول سکتی ہوں جی جب چار لڑکے ڈوڈا کی طرف سے پہاڑیوں میں بھاگتے ہوئے اس طرف آ گئے تھے اور سینکوں نے رام مندر والے چشمے کے قریب اُنہیں گھیر کر گولیوں سے بھون دیا تھا۔ ہم نے سب کچھ دیکھا تھا۔ مگر ماما سے کچھ نہیں کہا۔ ہمیں بہت دُکھ ہوا تھا۔ ہم ماما سے اپنے دُکھ کا اظہار کرتے تو وہ ہمیں بڑے زور سے ڈانٹتے۔ اور اب......" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اور اب تم آ گئے ہو۔ بہت گھائل ہو۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم تمہارا کیا کریں؟"

میں نے پہلی مرتبہ غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ بھرا بھرا گداز جسم، لانبا قد، چہرے کے نقوش بڑے غضب کے۔ اُس نے آسمانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بلاؤز کا وی شیپ کا گریبان خاصا فراخ تھا۔ وہ گھٹنوں پر کسی قدر آگے کو جھکی بیٹھی تھی۔ میری نظریں اُس کے گریبان کے اندر بھٹکنے لگیں اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی...... اُس نے میری نظروں کو تاڑ لیا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"تم میری مدد کرنا چاہتی ہو سیتا؟" میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "تم چاہتی ہو کہ میں بھارتی سینکوں کے ہتھے نہ چڑھوں؟"

"ہاں...... میں یہی چاہتی ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری مدد کس طرح کروں...... تمہارا علاج نہ ہوا تو......"

"تم ایک طرح سے میری مدد کر سکتی ہو۔" میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "تم نے بتایا تھا کہ تمہاری بستی میں ایک مسلمان گھرانہ بھی ہے اور تمہارا ماما اس بوڑھے مسلمان قربان علی کا بچپن کا دوست ہے۔"

"ہاں......" سیتا دیوی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا تم قربان علی کو میرے بارے میں بتا سکتی ہو اس طرح کہ کسی اور کو پتہ نہ چلے؟" میں نے کہا۔

"ارے ہاں......" سیتا دیوی بولی۔ "چاچا قربان علی کو تو ہم بھول ہی گئے تھے۔ وہ بھی حکمت جانتا ہے۔ ہم ابھی جا کر اُس کو بتاتے ہیں۔" وہ ایک دم جانے کو تیار ہو گئی۔

"ابھی رُک جاؤ......" میں نے کہا۔ "مجھے بڑی شدت سے پیاس لگ رہی ہے۔ کسی طرح مجھے ایک گھونٹ پانی پلا دو۔"

"پانی...... ہم ابھی لاتے ہیں۔" وہ یہ کہتے ہوئے اُٹھ کر غار سے باہر چلی گئی۔

میں ایک ہاتھ سے اپنی زخمی ٹانگ کو دبانے لگا جس میں شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ میں بڑی مشکل سے تکلیف ضبط کئے ہوئے تھا۔ سیتا دیوی کے جانے کے بعد میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ غار زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پندرہ بیس آدمی اُس میں آسانی سے سما سکتے تھے۔ ایک طرف سے اُس کی چھت اس قدر نیچی تھی کہ جھک کر چلنا پڑتا تھا اور دوسری طرف بیس بائیس فٹ تک اُوپر

چلی گئی تھی۔ ایک طرف جہاں چھت نیچے تھی دیوار کے ساتھ تین پتھر چولہے کی طرح رکھے ہوئے تھے جس میں جلے ہوئے کوئلے اور ایک دو ادھ جلی لکڑیاں بھی پڑی تھیں۔ وہ دیوار دھوئیں سے کالی ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ غار باقاعدہ رہائش کے لئے بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کبھی مجاہدین نے یہاں ٹھکانہ بنا رکھا ہو......

میں ابھی اس غار کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ سیتا دیوی غار میں داخل ہوئی۔ اُس نے ساڑھی کا پلو سمیٹ کر دونوں ہاتھوں میں اُٹھا رکھا تھا اور ہاتھ سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی میرے قریب آ کر گھٹنوں کے بل جھک کر بیٹھ گئی اور ساڑھی کا بھیگا ہوا پلو میرے منہ کے قریب لے آئی۔

ساڑھی کا پلو پانی سے تر تھا۔ بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ میں نے منہ کھول دیا۔ وہ بھیگا ہوا کپڑا نچوڑنے لگی۔ پانی کے قطرے حلق سے ٹپکنے لگے۔ پھر میں نے اُس کی ساڑھی کا پلو ہاتھ میں لے لیا اور اُسے منہ میں ڈال کر چوسنے لگا۔

میری پیاس پوری طرح تو نہیں بجھی لیکن حلق تر ہو گیا تھا اور وہ بے چینی ختم ہو گئی تھی جو میں کچھ دیر پہلے محسوس کر رہا تھا۔

''اب ہم جائیں؟'' اُس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''ہم چاچا قربان علی کو تمہارے بارے میں بتا کر اُن سے کوئی دوا لے لیں گے۔''

''ہاں...... جاؤ لیکن...... میں تمہیں اپنے زخم کے بارے میں اچھی طرح سے بتا دُوں۔'' میں نے کہا۔ ''گولی گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اگر گولی اندر رہ جاتی تو شاید میں زندہ نہ بچ سکتا۔ علاج نہ ہونے اور دو تین دن تک مسلسل چلتے رہنے سے زخم بگڑ گیا ہے اور......''

''ہم نے تمہارا زخم دیکھا تھا۔'' وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''ہم چاچا قربان علی کو اچھی طرح سمجھا دیں گے۔ اور تم ادھر ہی رہنا جی...... باہر مت نکلنا۔ بستی کا کوئی مورکھ گھومتا ہوا ادھر نکل آیا اور اُس نے تمہیں دیکھ لیا تو ہماری ساری محنت رائیگاں جائے گی۔''

''ٹھیک ہے...... میں اس غار سے باہر نہیں نکلوں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اُٹھ کر باہر کی طرف جانے لگی۔ دھانے کے قریب رُک کر اُس نے میری طرف دیکھا اور پھر باہر نکل گئی۔

سیتا دیوی کے جانے کے بعد میں دیر تک اُس کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ہندو تھی لیکن اُسے کشمیری مسلمانوں سے ہمدردی تھی۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ جموں اور کشمیر میں ہندوؤں پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ لیکن یہاں آ کر اُسے معاملہ اس کے برعکس نظر آیا۔ مسلمان ہندوؤں پر نہیں، ہندو مسلمانوں پر مظالم ڈھا رہے تھے۔ اُنہیں اُن کے گھروں سے بے دخل کر رہے تھے۔ یہ بڑی اچھی بات تھی کہ سیتا نے حقیقت کا اعتراف کر لیا تھا۔ سارے ہی ہندو کٹر اور ظالم نہیں تھے۔ ایسے بھی تھے جو حقیقت کا ادراک رکھتے تھے لیکن اُن کی تعداد آٹے میں نمک کے

برابر تھی اور اُن کی آواز کوئی اثر نہیں رکھتی تھی۔

میں نے سیدھا ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی تو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میری پتلون کی بیلٹ اور اُوپر کا ہُک کھلا ہوا تھا۔ سیتا دیوی نے میری پینٹ نیچے کھینچ کر ٹانگ کے زخم کا جائزہ لیا تھا، پھر پینٹ تو اُوپر کھینچ دی تھی مگر ہُک اور بیلٹ نہیں لگا سکی تھی۔

میں نے پینٹ کو مزید اوپر کھینچ کر ہُک اور بیلٹ لگایا اور ایک بار پھر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ غار کے باہر دھوپ چمک رہی تھی اور ہوا بھی تیز چل رہی تھی۔ غار سے بہت دُور نظر آنے والے رخت جھوم رہے تھے۔ دفعتہً پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سن کر میں چونک گیا...... سیتا دیوی کو گئے ہوئے بمشکل دس منٹ ہوئے تھے۔ وہ اتنی جلدی واپس نہیں آ سکتی تھی۔ ہوسکتا ہے یہ کوئی ور ہو...... وہ کوئی بھی ہوا گر غار میں آ گیا تو میرے لئے بڑی مشکل پیدا ہو سکتی تھی۔ میں تو اپنا رفاع کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔

میں نے ایک بار پھر غار میں اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا اُس طرف بڑھنے لگا جہاں پتھروں سے چولہا بنا ہوا تھا۔ چولہے سے تقریباً پانچ فٹ بائیں طرف دیوار کا ایک کونا تدرے آگے کو نکلا ہوا دیکھ کر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید اس طرف چھپنے کی کوئی جگہ ہو۔

اُس طرف بڑھتے ہوئے مجھے اچانک ہی اپنی رائفل کا خیال آ گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر یکھا۔ رائفل غار میں کہیں بھی نظر نہیں آئی...... مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ گر کر بے ہوش ہونے سے پہلے رائفل میرے کندھے پر لٹکی ہوئی تھی۔

پتھر لڑھکنے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ یہ آواز غار کے دہانے کے قریب سے نائی دی تھی۔ میں اپنے آپ کو تیزی سے گھسیٹنے لگا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ آگے کو نکلی ہوئی یوار کے پچھلی طرف ایک لمبی سی دراڑ تھی اور وہ دراڑ اس قدر کشادہ تھی کہ تین چار آدمی پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ اندر کسی طرف سے مدھم سی روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔

اُس دراڑ میں ایک طرف لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور اس کے اُوپر ہی میری رائفل بھی پڑی ہوئی تھی۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے رائفل اُٹھا لی اور اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے مزید پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ تقریباً پانچ گز آگے دراڑ بائیں طرف مُڑ گئی تھی۔ میں بھی اُسی طرف گھوم گیا۔ موڑ کے دوسری طرف دراڑ تنگ تھی اور تقریباً دو سو گز آگے جا کر بند ہو گئی تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور رائفل سنبھال لی۔

میرے ذہن میں طرح طرح کے خیال اُبھر رہے تھے۔ سیتا نے بتایا تھا کہ بھارتی سینک اِدھر اُدھر گھومتے رہتے تھے۔ ہوسکتا ہے انہیں کوئی شبہ ہو گیا ہو یا بستی والوں کو بھنک پڑ گئی ہو۔ اگر وہ لوگ غار کے اندر آ گئے تو میرے لئے فرار کے تمام راستے بند ہو جاتے۔ یہ غار میرے لئے چوہے دان بن گیا تھا......

غار میں اب دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن قدموں کی وہ

آوازیں بھاری نہیں تھیں اور چند سیکنڈ بعد ہی میرے اس خیال کی تصدیق بھی ہوگئی۔

وہ نوعمر لڑکے تھے اور اُن کی تعداد چار یا پانچ رہی ہوگی۔ وہ غار میں اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔ اُن کی آواز غار میں گونجتی تو وہ مزے لینے کے لئے اور بھی زور سے چیخنے لگتے۔

اب میں صورتحال سمجھ گیا تھا۔ بستی کے نوعمر لڑکے شاید کھیلتے ہوئے اس طرف آنکلے تھے۔ مجھے اپنا لڑکپن یاد آگیا...... میں بھی تو ہم عمر لڑکوں کے ساتھ اپنے قصبے کے نواح میں پہاڑیوں پر گھومتا رہتا تھا۔ یہ لڑکے بھی یقیناً کھیلنے ہی کے لئے نکلے ہوئے تھے لیکن اگر اُنہیں غار میں میری موجودگی کا احساس ہوگیا تو میری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

دفعتہً ایک آواز سن کر میں چونک گیا...... وہ آواز لڑکوں کی آوازوں سے مختلف تھی۔ وہ آواز دوبارہ سنائی دی تو مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ اُس لڑکی کی عمر بھی بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ گاؤں دیہات کا معاشرتی ماحول اب بھی وہی تھا جو برسوں پہلے تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور لڑکے رات کو گلیوں میں دیر تک ٹیلو اور لکن میٹی کھیلتے تھے۔ ماں باپ کو کوئی فکر یا پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ یہ لڑکی بھی اگر اپنی عمر کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتی ہوئی بستی سے باہر آگئی تھی تو اُس کے ماں باپ کو یقیناً کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

لیکن چند سیکنڈ بعد ہی ایک اور آواز سن کر میں اُچھل پڑا۔ وہ آواز ایسی تھی جیسے منہ چوما گیا ہو...... پھر لڑکی کی منمناتی ہوئی آواز بھی سنائی دی۔

''رمیش! چھوڑ دو مجھے...... میں پتا جی سے تمہاری شکایت کردوں گی۔''

''کردینا شکایت......'' یہ آواز غالباً رمیش کی تھی۔ ''آج تو تم قابو آگئی ہو لکشمی۔ ہم تمہارے چمے ہی نہیں کچھ اور بھی لیں گے۔''

''چھوڑ دو مجھے...... میں ابھی جا کر پتا جی سے شکایت کرتی ہوں۔'' اس مرتبہ لڑکی کی آواز میں کسی قدر غصہ بھی شامل تھا۔

''تم یہاں سے جاؤ گی تو شکایت کرو گی نا'' رمیش کی آواز سنائی دی۔ اُس کی آواز سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اُس کی عمر پندرہ سال ضرور رہی ہوگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''اس کی چڈی اُتارو سندر...... میں دیکھتا ہوں یہ کیسے شکایت کرے گی اپنے پتا جی سے۔''

میرا خون کھول کر رہ گیا۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ چار پانچ لڑکے لکشمی نامی اُس لڑکی کو دھوکے سے یہاں لے آئے تھے اور اب اُس کے ساتھ شیطانی کھیل کھیلنا چاہتے تھے اور وہ لڑکی اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہی تھی۔

''چھوڑ دو مجھے...... میں مکھیا کاکا سے تمہاری شکایت کروں گی۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''مکھیا کاکا تمہاری کھال ادھیڑ دیں گے۔''

''ہم برہمن ہیں۔ اور تم نچلی ذات کے موچی کی بیٹی۔'' یہ رمیش ہی کی آواز تھی۔ ''تمہاری

ت کا یقین کون کرے گا؟ ہم جب مکھیا کاکا کو بتائیں گے کہ تم نے مجھ سے دو روپے لینے کے ئے ہمارے سامنے اپنے کپڑے اُتار دیئے تھے تو وہ ہماری بات کو کبھی نہیں جھٹلائیں گے۔ اگر تم ر مچاؤ گی تو یہاں تمہاری آواز بھی کوئی نہیں سنے گا۔''

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ یہ تھی ہندوؤں کی گندی ذہنیت۔ بڑے تو بڑے عمر لڑکے بھی اُونچی ذات کا حق استعمال کرنا سمجھتے تھے۔ اُونچی ذات کے ہندو نیچی ذات کے دوؤں کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ اُنہیں ملیچھ اور ناپاک سمجھتے تھے۔ وہ اُنہیں اپنے ھروں میں نہیں گھسنے دیتے تھے کہ گھر ناپاک ہو جائے گا۔ مگر جنسی بھوک مٹانے کے لئے نچلی ت کی عورتوں کو روندتے تھے تو اُنہیں کوئی شرم نہیں آتی تھی۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھا کھولتا رہا...... اُس لڑکی کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ اگر میں سامنے آتا تو ن تمام لڑکوں کو موت کے گھاٹ اُتارنا پڑتا۔ اُن میں سے ایک بھی بچ کر نکل جاتا تو میری گی خطرے میں پڑ جاتی۔ میں اُس لڑکی کو تو برباد ہونے سے بچا لیتا مگر وہ بستی میں واپس جا کر رے بارے میں بتاتی تو بستی والے اس طرف دوڑ پڑتے اور میرا زندہ بچنا مشکل ہو جاتا۔ دوڑ تو کیا چل بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر میری ٹانگ ٹھیک ہوتی تو میں ان لڑکوں کو ڈرا دھمکا کر بھگا تا اور خود یہاں سے کسی اور طرف نکل جاتا۔

''اوہ...... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ایک اور آواز سن کر میں اُچھل پڑا۔ وہ سیتا دیوی کی آواز تھی۔

''دیدی...... دیدی...... مجھے بچا لو ان سے۔'' اُس لڑکی کی روتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''یہ گ مجھے دھوکے سے یہاں لے آئے تھے اور......''

''یہ جھوٹ بولتی ہے سیتا دیوی!'' ایک لڑکے نے چیختے ہوئے اُس کی بات کاٹ دی۔ یہ ش کی آواز تھی اور میرا خیال تھا کہ وہی لڑکوں کی اس ٹولی کا سرغنہ تھا۔ ''یہ جھوٹ بولتی ہے دی! یہ خود ہمیں یہاں لے کر آئی تھی۔''

''میں سب سمجھتی ہوں۔ تمہاری بدمعاشیاں بڑھتی جارہی ہیں۔ آج میں ماما سے کہہ کر تمہارا ندوبست کرتی ہوں۔ شرم آنی چاہئے تمہیں۔'' یہ سیتا دیوی کی آواز تھی۔ ''چلو بھاگو تم لوگ اں سے۔ اور لکشمی! تم کپڑے پہنو۔''

''تم مہمان آئی ہوئی ہو سیتا دیوی!'' رمیش نے کہا۔ ''اپنے لئے مشکلات پیدا مت کرو۔''

''آج میں تمہاری مشکلات تو حل کردوں گی۔ مجھے اپنی مشکلات کی پرواہ نہیں ہے۔ بھاگتے یہاں سے یا نہیں؟'' سیتا نے چیخ کر کہا۔ اس کے بعد لڑکوں کی آواز سنائی نہیں دی۔

''لکشمی کی بچی! تمہیں اتنے بڑے بڑے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ چل ں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔ تیری ماں سے کہوں گی تمہیں پٹہ ڈال کر رکھے اور اس غار کے بھوت! یہیں رہنا۔'' یہ سیتا کی آواز تھی۔ آخری الفاظ اُس نے یقیناً مجھے مخاطب کر کے کہے تھے۔

ے غار میں نہ پا کر وہ سمجھ گئی ہوگی کہ میں کہاں ہوں۔ کیونکہ اس دراڑ میں میری رائفل تو اُسی

نے چھپائی تھی۔

غار میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ میں اپنی جگہ پر دبکا رہا۔ دراڑ میں جس جگہ میں بیٹھا ہوا تھا وہاں ہوا کی آمد و رفت بالکل نہیں تھی۔ پسینے سے میرا جسم تر ہونے لگا تھا۔ میں کچھ دیر اور وہیں بیٹھا رہا، پھر اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا دوسری طرف لکڑیوں کے ڈھیر کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ یہاں کچھ ہوا آ رہی تھی۔

تقریباً دس منٹ بعد پھر غار میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں محتاط ہو گیا۔ ''اے جی..... کہاں ہو تم؟'' یہ سیتا کی آواز تھی۔ ''اب باہر آ جاؤ! کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

میں اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا اُس دراڑ سے باہر آ گیا۔ سیتا غار کے دہانے سے چند فٹ آگے کھڑی اس طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی بھی تھی۔

''تم اتنی جلدی واپس آ گئیں..... میرا مطلب ہے تم تو اس لڑکی کو بستی میں چھوڑنے گئی تھیں۔'' میں نے کہا۔

''اُسے میں نے نیلم کے ساتھ بھیج دیا ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''نیلم کون؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''چاچا قربان علی کی بیٹی۔ وہ میرے ساتھ آئی تھی۔'' سیتا نے کہا۔

''مجھے افسوس ہے سیتا! میں اُس لڑکی کی کوئی مدد نہیں کر سکا تھا۔ اگر تم بروقت نہ آ جاتیں تو اُس لڑکی کے ساتھ نجانے کیا ہوتا؟'' میں نے کہا۔

''ہوتا کیا.....'' سیتا بولی۔ ''وہ اُس کا بلادکار کرتے اور جب بستی والوں کو پتہ چلتا تو وہ چند روز کے لئے کہیں غائب ہو جاتے۔ ہمارے دھرم میں یہی تو سب سے زیادہ قابلِ نفرت بات ہے۔ ایک ہی دھرم کو ذاتوں میں تقسیم کر کے کوئی اعلیٰ ذات کا بن بیٹھا ہے اور کسی کو نیچ بنا دیا گیا ہے۔ نیچ کو پلید اور ناپاک سمجھا جاتا ہے۔ ان کی ہوا بھی اُونچی ذات والوں کو چھو جائے تو قیامت آ جاتی ہے۔ لیکن بڑے بڑے دھرماتما جب کسی نیچ ذات کی عورت کو اپنے بستر کی زینت بناتے ہیں تو اُنہیں ذات پات کا کوئی خیال نہیں آتا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''یہ رمیش جموں کے ایک مندر کے پنڈت کا بیٹا ہے۔ یہاں اس کی زمین ہے۔ پنڈت خود تو جموں میں رہتا ہے اور اس کی بیوی اور بیٹا یہیں رہتے ہیں۔ بیس دن پہلے بھی اس نے بستی کی ایک لڑکی کے ساتھ بلادکار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کا باپ پنڈت منوہر لال آج کل یہاں آیا ہوا ہے۔ میں اُس کی شکایت ضرور کروں گی اور ماما سے بھی کہوں گی۔ یہ دن بدن پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کا بندوبست کیا جانا ضروری ہے۔''

میں گہری نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر غصے کی سرخی نمایاں تھی۔ میں نے اُس میں ایک تبدیلی بھی محسوس کی تھی۔ پہلے مجھ سے باتیں کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو ہم کہتی رہی تھی اور اب اپنے لئے بھی واحد کا صیغہ استعمال کر رہی تھی۔

''معاف کرنا جی.....'' وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہارے لئے کپڑے اور کھانا وغیرہ لے کر آئی ہوں۔ ان کم بختوں کی وجہ سے اتنی دیر ہو گئی۔'' اُس نے پوٹلی کھول لی۔ ''میں نے چاچا قربان علی کو تمہارے بارے میں بتا دیا تھا۔ اُس نے ایک مرہم دیا ہے اور فوری طور پر لگانے کے لئے کہا ہے۔ وہ کل صبح سویرے آ کر تمہیں دیکھ لے گا۔ لو..... پہلے روٹی کھا لو! نیلم آ جائے تو ہم تمہارے زخم پر مرہم بھی لگا دیں گے اور کپڑے بھی بدل دیں گے۔''

''تت تم میرے کپڑے بدلو گی، یعنی تم اور نیلم؟'' میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

''مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ اچھی نرس اور ڈاکٹر ثابت ہوتی ہیں۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ویسے چنتا مت کرو! ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گی۔ جب تمہاری مرہم پٹی کرنے لگیں تو تم آنکھیں بند کر لینا۔''

اُس نے پوٹلی میں سے کندوری (چھوٹا دستر خوان) نکال کر الگ رکھ دیا۔ یہ بھی پوٹلی کی طرح بندھا ہوا تھا۔ اُس میں چار روٹیاں اور ایک کٹورے میں بھنی ہوئی ماش کی دال تھی۔

''تم روٹی کھاؤ..... میں تمہارے لئے پانی لے کر آتی ہوں۔'' اُس نے بڑی پوٹلی میں کپڑوں میں رکھا ہوا ایلومینیم کا ایک چھوٹا ڈول نکال لیا۔ اُس میں پانچ چھ گلاس پانی آ سکتا تھا۔ وہ ڈول لے کر غار سے باہر چلی گئی اور میں روٹی کھانے لگا۔ میں پتہ نہیں کب سے بھوکا تھا۔ نوالے تقریباً ثابت ہی نگلتا جا رہا تھا۔ چند منٹ بعد سیتا پانی لے کر آ گئی تو میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد نیلم بھی آ گئی۔ اُسے دیکھ کر میں پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ مانا سیتا بھی بہت حسین تھی لیکن نیلم کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اُس کی عمر بیس اکیس کے لگ بھگ ہی ہو گی۔ بھرپور جوانی تھی جو دیکھنے والے کو مسحور کر دیتی تھی۔

''دیکھو! بات یہ ہے کہ.....'' میں نے باری باری اُن دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے سامنے کپڑے اُتارتے ہوئے مجھے شرم آ رہی ہے۔ وہ مرہم مجھے دے دو میں خود ہی لگا لوں گا اور کپڑے بھی بدل لوں گا۔ تم دونوں غار سے باہر چلی جاؤ۔''

سیتا نے پوٹلی میں سے ایک گول ڈبیہ اور ایک بوتل نکال کر میرے سامنے رکھ دی اور غالباً پرانی ساڑھی پھاڑ کر ایک پٹی بھی تیار کی گئی تھی۔

''یہ سپرٹ ہے.....'' اُس نے بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ ''پہلے زخم کو اچھی طرح صاف کر لینا۔ اگر ہمت نہ ہو تو ہمیں آواز دے لینا۔''

وہ دونوں غار سے باہر چلی گئیں اور پھر جس طرح میں نے سپرٹ سے زخم صاف کر کے مرہم لگا کر پٹی باندھی وہ میں ہی جانتا تھا۔ اور پھر میں نے کپڑے بھی بڑی مشکل سے تبدیل کئے تھے۔ اور پھر میری آواز سن کر وہ دونوں اندر آ گئیں۔

''میرا خیال ہے اسے یہاں رکھنا مناسب نہیں ہے..... کوئی نہ کوئی اس طرف آ سکتا ہے۔''

نیلم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''تو پھر کیا اسے بستی میں لے چلیں؟'' سیتا بولی۔
''نہیں......'' نیلم نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''حضوری بابا کے مزار اور چشمے کے قریب ہی ایک غار ہے۔ پہلے جب گاؤں میں مسلمان رہتے تھے تو اُس مزار پر لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ مسلمانوں کے یہاں سے چلے جانے کے بعد یہ مشہور کر دیا گیا کہ وہاں بدروحوں کا ڈیرہ ہے۔ ہندو تو ویسے ہی توہم پرست ہوتے ہیں۔ کوئی اس طرف جانے کی ہمت نہیں کرتا۔ اور میرا خیال ہے وہ جگہ اس کے لئے سب سے زیادہ محفوظ رہے گی۔''
''کیا نام بتایا تم نے حضوری بابا؟'' سیتا بولی۔ ''ہاں...... مجھے یاد آ رہا ہے۔ جب میں یہاں آئی تھی تو ماما نے کہا تھا کہ جہاں بھی چاہوں گھومتی پھرتی رہوں مگر حضوری بابا کے مزار کی طرف نہ جاؤں۔ ویسے وہ جگہ یہاں سے کتنی دُور ہے؟''
''اُس طرف...... آدھا کوس۔'' نیلم نے ایک طرف اشارہ کیا۔
''اتنی دیر تک چل سکو گے؟'' سیتا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔
''کوشش کر لوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔
نیلم نے ساری چیزیں سمیٹ لیں۔ سیتا نے مجھے سہارا دے کر اُٹھا دیا۔ میں رائفل کو لاٹھی کی طرح ٹیکتا ہوا اُن کے ساتھ چل پڑا۔ لیکن میں زیادہ دُور نہیں چل سکا۔ اُن دونوں نے مجھے دونوں طرف سے سہارا دیا اور ہم چٹانوں میں گھومتے ہوئے نصف کوس کا فاصلہ تقریباً ایک گھنٹے میں طے کر سکے۔
وہ غار میرے حساب سے بھی واقعی بہت محفوظ تھا۔ ایک چھوٹا سا چشمہ تھا جس کا پانی ایک چھوٹی سی ندی کی صورت میں گنگناتا ہوا نشیب کی طرف بہہ رہا تھا۔ چشمے کے بائیں طرف تقریباً بیس گز کے فاصلے پر چٹان کے دامن میں ایک پختہ قبر تھی جس پر سبز رنگ کیا ہوا تھا۔ قبر پر اور اُس کے اردگرد چبوترے پر سوکھے ہوئے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ چشمے کے دوسری طرف ایک اُونچی پہاڑی تھی جو سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اور وہ غار اُس پہاڑی پر زمین کی سطح سے تقریباً سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ غار کے دہانے کے سامنے درختوں اور قد آدم جھاڑیوں کی بھرمار تھی۔ میں غار کے دہانے پر ان جھاڑیوں میں بیٹھ کر نہ صرف اس چشمے بلکہ تقریباً ایک کوس دُور نشیب میں بستی کو بھی دیکھ سکتا تھا۔ اور سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اس غار کے پچھلی طرف ایک تنگ سا راستہ بھی تھا جو ضرورت کے وقت فرار کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔
غار صاف ستھرا تھا۔ ایک طرف لمبی چوڑی جگہ پر پرالی (گیہوں کے خشک پودے) کی لمبی چوڑی دبیز تہہ بچھی ہوئی تھی جسے بستر کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ جب حضوری بابا کے مزار پر لوگ آتے ہوں گے تو یہ غار استعمال ہوتا ہو گا۔
سورج غروب ہونے میں تقریباً ایک گھنٹہ باقی تھا۔ غار کے باہر دُھوپ ماند پڑ چکی تھی۔

''ہم چلتے ہیں۔'' نیلم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بابا کبھی مزار پر پھول وغیرہ النے کے لئے ادھر آ جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی یہاں نہیں آتا۔ میں بابا کو بتا دوں گی۔ ہ صبح سویرے تمہارے لئے کھانا بھی لے آئے گا۔ ویسے تم بھی ذرا محتاط رہنا۔ غار سے باہر ت نکلنا۔''
''اس ڈول میں میرے لئے پانی لا دو۔'' میں نے کہا۔ نیلم ڈول لے کر غار سے باہر چلی گئی ر میں سیتا کی طرف دیکھنے لگا۔
''تم کب آؤ گی؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔
''دن چڑھے آؤں گی۔'' سیتا دیوی نے لجا کر جواب دیا۔ ''تم اپنا خیال رکھنا جی...... کسی کو س پاس دیکھو تو پچھلی طرف سے چٹانوں میں نکل جانا۔''
''تمہیں میری اتنی فکر کیوں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''تم مجھے اچھے لگتے ہو۔'' اُس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔ ''اگر اچھے نہ لگتے تو میں تمہیں ٹھا کر اُس غار میں نہ لے جاتی۔''
''شکریہ سیتا دیوی جی! میں کل تمہارا انتظار کروں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
نیلم پانی لے آئی۔ میں نے ڈول پرالی کے قریب رکھ دیا۔ وہ دونوں میری طرف دیکھتے ئے رخصت ہو گئیں۔ میں غار کے دہانے پر بیٹھا جھاڑیوں کی آڑ سے اُنہیں اُس وقت تک کھتا رہا جب تک وہ نظر آتی رہیں۔
شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد بھی میں دیر تک وہیں بیٹھا رہا اور پھر اُٹھ کر پرالی پر آ گیا۔ دھیرا ہوتے ہی مچھروں نے یلغار کر دی تھی۔ یہ غنیمت تھا کہ سیتا میرے اوڑھنے کے لئے ب چادر بھی لے آئی تھی۔ میں نے مچھروں سے بچنے کے لئے چادر اوڑھ لی اور منہ بھی چھپا ا۔ اور پھر پتہ نہیں کب میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

○

چاچا قربان علی صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ اُسی نے مجھے جگایا تھا۔ ایک لمحہ کو تو ابدحواس ہو گیا تھا۔ لیکن اُس کی صورت دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا۔
قربان علی کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ خشخشی سفید داڑھی، سر کے بال بھی ف کی طرح سفید تھے۔ وہ مجھ سے بڑی ہمدردی سے پیش آیا۔ وہ مجھے ایک عام کشمیری مجاہد سمجھ تھا لیکن جب میں نے اُسے اپنا نام بتایا تو اُس کی آنکھوں میں تشویش کی لہریں اُبھر آئیں۔
''تمہیں تلاش کرنے کے لئے تو پوری فوج حرکت میں آ چکی ہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں ں بھی تمہیں تلاش کیا جا رہا ہے۔ یوں تو ماضی میں بھی مجاہدین کے بعض لیڈروں کی تلاش کے سلے میں پولیس اور فوج سرگرم رہی ہے لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ کسی کی تلاش میں ہیلی کاپٹر تعمال کئے جا رہے ہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ بچ کر یہاں تک آن پہنچے ہو۔ لیکن اپنے آپ کو

محفوظ مت سمجھنا۔ تمہیں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔''

''سیتا دیوی کیسی ہے...... کیا اُس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اعتماد......'' قربان علی مسکرا دیا۔ ''اگر وہ قابل اعتماد نہ ہوتی تو اب تک تمہاری زندگی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ ویسے تو زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اس وقت تمہیں سیتا ہی کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ اگر وہ اس طرف نہ آ نکلتی تو تم ان پہاڑیوں میں بے ہوشی کی حالت میں ہی ختم ہو چکے ہوتے۔ ویسے یہ لڑکی میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ اس کا ماما جسونت سنگھ کٹر ہندو ہے۔ کالی کی پوجا کرنے والا۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ سیتا کے خیالات اپنے خاندان والوں سے اتنے مختلف کیوں ہیں؟ تمہیں اُس کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ''اُس نے تمہیں زخمی اور بے ہوش پڑے ہوئے دیکھا تھا تو ہو سکتا ہے محض انسانی ہمدردی کی بناء پر تمہیں اُٹھا کر غار میں لے گئی ہو۔ لیکن تمہاری ٹانگ کا زخم دیکھتے ہوئے جب اُس پر انکشاف ہوا کہ تم مسلمان ہو تو تم سے اُس کی ہمدردی اور بڑھ گئی۔ اُس نے مجھے کل ہی تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور مجھ سے تمہاری مدد کی درخواست کی تھی۔ تمہیں غار میں چھپا کر اور تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کر کے اُس نے اپنی زندگی بھی خطرے میں ڈال دی ہے۔ وہ اب اپنی جان تو دے دے گی مگر تمہارے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔''

ہم کافی دیر تک سیتا کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس دوران قربان علی نے میرے زخم کا معائنہ کر کے نئی پٹی باندھ دی تھی۔

''تمہارا زخم کافی بگڑ چکا ہے۔ مگر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ البتہ تمہیں چند روز مکمل آرام کی ضرورت ہے۔'' قربان علی نے کہا۔ ''تمہارے لئے یہ جگہ محفوظ ہے۔ اس طرف کوئی نہیں آتا۔ صرف میں ہفتے میں ایک مرتبہ یعنی جمعرات کے دن حضوری بابا کے مزار پر آیا کرتا ہوں۔ اب ہر دو دن بعد آیا کروں گا تمہیں دیکھنے کے لئے۔ اس طرف میری زیادہ آمد و رفت کسی کے دل میں شبہ پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن یہ لڑکیاں تمہاری دیکھ بھال کے لئے آتی رہیں گی۔ نیلم نے حکمت کے حوالے سے مجھ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ تمہارا خیال رکھے گی۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر جیب سے گول ڈبیاں نکالتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس گولیاں اور انجکشن وغیرہ تو نہیں ہیں لیکن یہ دوائیں ایسی ہیں جو گولیوں اور انجکشنوں سے زیادہ موثر ہیں۔ یہ دونوں دوائیں دن میں تین مرتبہ کھانی ہیں۔ ایک ایک خوراک تو ابھی کھا لو، پھر دوپہر اور شام کو کھانی ہوگی۔

دونوں ڈبیوں میں معجون جیسی کوئی چیز بھری ہوئی تھی۔ اُن کے رنگ مختلف تھے مگر دونوں بے حد خوش ذائقہ تھیں۔ میں نے اُنگلی سے لگا کر ہی چاٹ لیں۔

''یہ کالے رنگ کی دوا تمہارا زخم خشک کرے گی۔'' قربان علی کہہ رہا تھا۔ ''اور یہ سفید دوا نہ

صرف تمہارے درد کو کم کرے گی بلکہ تمہیں توانائی بھی فراہم کرے گی۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں پائی جانے والی جڑی بوٹیوں میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے۔''

وہ دیر تک جڑی بوٹیوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ باہر دُھوپ پھیلنے لگی تھی۔

''اب تم ناشتہ کر لو اور آرام کرو...... زیادہ چلنے پھرنے کی کوشش مت کرنا۔ دوپہر کو نیلم تمہارے لئے کھانا لے کر آ جائے گی۔ اور اگر کسی وقت زیادہ تکلیف ہو تو نیلم کو بتا دینا۔'' قربان علی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پانی کا ڈول اُٹھا کر باہر چلا گیا۔

قربان علی میرے لئے ناشتے کے علاوہ کھانے کی ایک دو اور چیزیں بھی لے کر آیا تھا۔ دس منٹ بعد وہ ڈول میں چشمے سے تازہ پانی لے آیا اور مجھے محتاط رہنے اور آرام کرنے کا مشورہ دے کر رُخصت ہو گیا۔

میں نے ڈول کے کچھ پانی سے منہ دھویا، کلی کی اور ناشتہ کرنے لگا۔ ناشتے کے بعد میں غار کے دہانے پر جھاڑیوں کی آڑ میں بیٹھ گیا اور نشیب میں پھیلی ہوئی وادی کو دیکھنے لگا۔ بستی کے کئی گھروں سے دُھویں کی لکیریں اُٹھتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو غار کے اندر آ کر پرالی پر لیٹ گیا۔ میری ٹانگ میں اگرچہ ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا لیکن شدید تناؤ اور کھنچاؤ کی جو کیفیت پہلے تھی اُس میں بڑی حد تک کمی آ گئی تھی۔

نیلم اور سیتا تین بجے کے قریب آئی تھیں۔ میں اُس وقت غنودگی میں تھا لیکن ان کے آ جانے سے میری نیند کافور ہو گئی۔ وہ میرے لئے کھانا اور کپڑوں کا ایک جوڑا اور ایک کمبل بھی لے کر آئی تھیں۔ گزشتہ رات اگرچہ میں نے چادر اوڑھ رکھی تھی لیکن رات بھر سردی سے ٹھٹھرتا رہا تھا۔ کمبل کے لئے صبح میں نے ہی قربان علی سے کہا۔

سیتا نے چشمے سے پانی لا کر میرا منہ ہاتھ دُھلایا۔ پانی لانے کے لئے وہ گھی کا ایک خالی ڈبہ ساتھ لے کر آئی تھی۔ میں کھانا کھا رہا تھا اور وہ دونوں میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ سیتا بڑے غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' میں نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہاری عمر کتنی ہو گی؟'' میں نے سوال کیا۔

''سترہ سال......'' میں نے جواب دیا۔ ''بلکہ سترہ سال ایک مہینہ اور چھ دن۔''

''چاچا قربان علی نے بتایا تھا کہ تمہارا نام شمروز ہے۔'' سیتا بولی۔ ''کیا واقعی تم وہی شمروز ہو جس کی تلاش میں پوری ریاست کی پولیس اور فوج پہاڑوں اور جنگلوں کی خاک چھانتی پھر رہی ہے؟ اور جس نے چند روز پہلے اپنے ساتھیوں کی مدد سے گندربل کے قریب ایک بہت بڑا فوجی کانوائے تباہ کیا تھا؟''

''ہاں...... میں وہی شمروز ہوں۔ لیکن کیا تم مجھے اپنے سینکوں کے حوالے کرنے کا ارادہ کر

رہی ہو؟'' میں نے کہا۔

''نہیں......'' وہ مسکرا دی۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا۔ اور تمہارے ساتھ ایک لڑکی بھی تو تھی جو پہلگام کے قریب کسی جگہ ہمارے سینکوں کے ہاتھوں شہید ہوگئی تھی۔''

''میں بھی اُسی جھڑپ میں زخمی ہوا تھا۔'' میں نے بتایا۔

''مجھے اُس لڑکی کے بارے میں بتاؤ!'' سیتا بولی۔ ''کاش وہ زندہ ہوتی۔ میں اُس کے پیر دھو دھو کر پیتی۔ ایسی بہادر لڑکیاں تو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔''

''تم بھی بہت عظیم ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کون ہوں، میرے ہاتھوں تمہاری سینا کو کتنا نقصان ہو چکا ہے، میری تلاش میں ہیلی کاپٹر تک استعمال کئے جا رہے ہیں، تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے اور......''

''اس کی وجہ میں بتا چکی ہوں۔'' سیتا نے میری بات کاٹ دی۔ ''مجھے انگوری کے بارے میں بتاؤ۔ تم دونوں کا نام ہمیشہ ایک ساتھ سنا گیا ہے۔ ماما سے جو باتیں سنی ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری سینا پر تمہارے نام کی بڑی دہشت ہے۔ اس لئے تمہاری تلاش میں ہیلی کاپٹر تک استعمال کئے جا رہے ہیں۔ انگوری...... کاش! وہ زندہ ہوتی۔ اور کاش......! میں انگوری بن سکتی۔''

''تم بھی انگوری بن سکتی ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ میری نظریں اُس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ''مجھے یہاں پناہ دے کر اور میری مدد کر کے تم نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ انگوری نے رائفل اُٹھا کر اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی تھی اور تم نے رائفل کو ہاتھ لگائے بغیر مجھے پناہ دے کر اپنی زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔ اگر کسی کو اس کا پتہ چل جائے تو تمہارا جو حشر کیا جائے گا تم اس کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ تم نے انجانے میں مجھے پناہ دے کر جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کے لئے پوری کشمیری قوم تمہاری احسان مند ہوگی۔''

''انجانے میں نہیں......'' سیتا بولی۔ ''کسی اُگر وادی کو پناہ دینا بھی سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔ میں نے جب تمہیں زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں اُٹھایا تھا تو اُس وقت میرے دل میں صرف انسانی ہمدردی تھی۔ لیکن تمہارے زخم کا جائزہ لیتے ہوئے جب میں نے دیکھا کہ تم مسلمان ہو تو مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ تم مجاہد ہو...... زخمی ہونے کے بعد چھپتے چھپاتے اس طرف نکل آئے ہو۔ اور آج جب چاچا قربان علی نے تمہارا نام بتایا تو مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔''

مجھے سیتا کی باتیں سن کر واقعی حیرت ہو رہی تھی۔ کیا واقعی اُسے کشمیری مسلمانوں سے اتنی ہمدردی تھی؟ اور کیوں، اس کی وجہ کیا تھی؟ کیا وہ کشمیری مسلمانوں کو واقعی مظلوم سمجھ کر اُن سے ہمدردی کا اظہار کر رہی تھی یا اس کی وجہ کچھ اور تھی...... اور وہ کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

نیلم اس دوران خاموش بیٹھی میری طرف دیکھتی رہی تھی۔

تقریباً دو گھنٹوں بعد وہ واپس چلی گئیں۔ میرے پاس کھانے پینے کی اتنی چیزیں موجود تھیں کہ میں رات کو بھی پیٹ بھر کر کھا سکتا تھا اور صبح کا ناشتہ بھی ہو سکتا تھا۔

تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران قربان علی دو مرتبہ یہاں آیا تھا۔ میرے زخم میں ابھی کوئی خاص بہتری نہیں ہوئی تھی لیکن پہلے جیسی صورتحال بھی نہیں رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اسی توجہ سے علاج ہوتا رہا اور مجھے آرام کرنے کا موقع ملا تو چند روز بعد میرا زخم مندمل ہونا شروع ہو جائے گا۔

قربان علی سے مجھے صورتحال کا بھی پتہ چلتا رہتا تھا۔ انگوری کی شہادت کو بھارتی فوج اپنا ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دے رہی تھی۔ جن بھارتی فوجیوں نے اُس کارروائی میں حصہ لیا تھا اُنہیں نہ صرف ترقیاں دی گئی تھیں بلکہ اُنہیں گرانقدر نقد انعامات سے بھی نوازا گیا تھا۔

میری تلاش کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔ گو کہ اس میں پہلے جیسی گرم جوشی نہیں رہی تھی تاہم میری تلاش میں پہلگام اور اس کے گرد و نواح کی بستیوں میں مسلسل چھاپے مارے جا رہے تھے۔ اس جھڑپ میں چونکہ میں بھی زخمی ہوا تھا اس لئے بھارتی فوجیوں کو یقین تھا کہ میں اُس علاقے سے زیادہ دُور نہیں گیا ہوں گا اور کسی بستی یا فارم ہاؤس میں پناہ لئے ہوئے ہوں یا پہاڑوں میں کسی غار میں چھپا ہوا ہوں۔ اس علاقے میں دُور دُور تک پہاڑوں اور جنگلوں میں بھی مجھے تلاش کیا جا رہا تھا۔ یہ بات تو شاید وہ لوگ سوچ بھی نہیں سکے ہوں گے کہ میں زخمی حالت میں دو دن تک مسلسل سفر کرتے ہوئے وہاں سے اتنی دُور پہنچ چکا ہوں گا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ ڈوڈا کی طرف میری تلاش پر زیادہ زور نہیں دیا جا رہا تھا۔

دوسری طرف بھارتی فوجیوں کے خلاف مجاہدین کی سرگرمیاں بھی جاری تھیں۔ پوری وادی میں فوجی چھاؤنیوں، کیمپوں اور فوجی قافلوں پر مجاہدین کے حملے جاری تھے۔ ڈوڈا میں بھی مجاہدین کی سرگرمیوں کی خبریں مجھے قربان علی سے ملتی رہتی تھیں۔ ابھی دو دن پہلے ڈوڈا سے چند میل دوسری طرف ایک کارروائی میں مجاہدین نے پندرہ فوجیوں کو ہلاک کر دیا تھا جن میں ایک کرنل بھی شامل تھا۔ بھارتی فوجی ڈوڈا کے گرد و نواح میں چھوٹی چھوٹی بستیوں پر بھی کشمیری مجاہدین کی تلاش میں چھاپے مارتے رہتے تھے۔ لیکن یہ بستی اُن کی چیرہ دستیوں سے محفوظ تھی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک گھر کے سوا اس بستی کی تمام آبادی کٹر ہندوؤں پر مشتمل تھی اور یہاں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

چند روز اور گزر گئے...... اب میرا زخم مندمل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ سیتا اور نیلم روزانہ ہی کسی نہ کسی طرح چھپ چھپا کر یہاں آ جاتی تھیں۔ اُن کی وجہ سے بھی مجھے بڑا حوصلہ ملا تھا۔ سیتا دیوی کی باتوں سے میری بڑی ڈھارس بندھتی تھی۔ اُن سے بھی مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں۔

نیلم کچھ لئے دیئے رہتی تھی لیکن سیتا مجھ سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گئی تھی۔ مجھے بھی وہ

اچھی لگنے لگی تھی اور میں بھی زیادہ تر اُس سے باتیں کرتا تھا۔ جبکہ نیلم خاموش بیٹھی ہماری باتیں سنتی رہتی تھی۔ کبھی وہ ہم دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر غار سے باہر چلی جاتی۔ ایسے ہی ایک موقع پر سیتا باتیں کرتے ہوئے میری طرف جھک گئی اور پھر اچانک ہی اُس نے مجھے اپنی گرفت میں لے کر اپنے ہونٹ میرے گال پر رکھ دیئے......

میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ پورے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ غار کے باہر قدموں کی آہٹ سن کر سیتا نے تو مجھے چھوڑ دیا لیکن میں دیر تک اپنے گال پر اُس کے ہونٹوں کی تپش محسوس کرتا رہا۔ نیلم نے اندر داخل ہو کر ہماری طرف دیکھا اور پھر اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ میرے چہرے کو دیکھ کر شاید اُس نے صورتحال کا اندازہ لگا لیا تھا۔

اُس روز وہ معمول سے زیادہ دیر تک میرے پاس رہی تھیں۔ اُن کی وجہ سے مجھے بڑا سہارا تھا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ کسی کو اُن پر شبہ نہیں ہوا تھا کہ وہ بستی سے نکل کر کہاں غائب رہتی ہیں۔ ایک روز میں نے اُن سے یہ بات پوچھی بھی تھی اور سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''میں سیر وتفریح کے لئے یہاں آئی ہوئی ہوں گھر میں قید ہو کر بیٹھنے کے لئے نہیں۔ میرا ماما بستی کا مکھیا ہے۔ کوئی میری طرف اُنگلی اُٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ اور ویسے بھی ہم بستی سے نکل کر نجانے کہاں کہاں گھومتی ہوئی اس طرف آتی ہیں۔ کسی کو ہم پر شبہ نہیں ہو سکتا۔''

بیس بائیس دن گزر گئے۔ میرا زخم اب کافی بہتر ہو گیا تھا اور میں غار کے اندر تھوڑا بہت چلنے بھی لگا تھا۔ چاچا قربان علی اب بھی دوسرے تیسرے دن چکر لگا لیتا تھا۔ اُس کی توجہ سے ہی میں اُٹھ کر چلنے کے قابل ہو سکا تھا۔

سیتا اب کبھی کبھی اکیلی بھی آ جاتی تھی۔ اور جب وہ اکیلی آتی تھی تو کچھ زیادہ ہی کھلنے کی کوشش کرتی۔ میری مزاحمت اُس کے ارادوں میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔

اُس روز دوپہر کو میں اونگھ گیا اور پھر ہلکی سی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میری نظریں فوراً ہی غار کے دہانے کی طرف اُٹھ گئیں۔ مجھے ایک رنگین آنچل سا لہراتا ہوا نظر آیا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

میرے بستر کے قریب ہی ایک پوٹلی رکھی ہوئی تھی۔ اُس میں کھانا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سیتا آج بھی اکیلی ہی آئی تھی۔ مجھے سوتے دیکھ کر وہ پوٹلی رکھ کر باہر چلی گئی تھی۔ میں اُسے آواز دینا چاہتا تھا مگر پھر ارادہ بدل دیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر غار کے دہانے کی طرف آ گیا۔

سیتا جھاڑیوں میں غائب ہو گئی تھی۔ میں اس طرف دیکھتا رہا۔ جھاڑیاں ہلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اور پھر سیتا چشمے کے قریب جھاڑیوں سے برآمد ہوئی اور چشمے کے پانی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ متجسس نظروں سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ منظر دیکھ کر میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں اور مجھے اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا..... سیتا نے بلاؤز اُتار دیا تھا..... اور پھر وہ کمر پر ساڑھی کے بل

کھولنے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی تیز سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اور جب میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا......

سیتا چشمے کے پانی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ شفاف پانی میں اُس کا بدن صاف نظر آ رہا تھا۔ میرے پورے جسم میں بجلی کی لہریں سی دوڑنے لگیں......

چشمے کے چاروں طرف اُونچی جھاڑیاں تھیں۔ اس طرف کسی کے آنے کا خدشہ بھی نہیں تھا اور اسی لئے سیتا کپڑے اُتار کر پانی میں اُتر گئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اُس نے ایک دو مرتبہ غار کی طرف بھی دیکھا تھا۔ لیکن میں بھی جھاڑیوں کی آڑ میں تھا اس لئے وہ مجھے نہیں دیکھ سکی تھی۔

مجھے ایسا لگا جیسے وقت تھم گیا ہو...... مجھے اپنے پورے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اور پھر سیتا کو چشمے سے نکلتے دیکھ کر میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ وہ اپنے کپڑے اُٹھا کر جھاڑیوں کی آڑ میں چلی گئی۔ اور جب وہ دوبارہ سامنے آئی تو کپڑے پہن چکی تھی۔

اُسے اُوپر کی طرف آتے دیکھ کر میں رینگتا ہوا غار میں اپنے بستر پر پہنچ گیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اور پھر غار کے باہر آہٹ سن کر میں نے آنکھیں بند کر لیں...... میں اُس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اُس کے آنے کے بعد میں بیدار ہوا تھا یا اپنی جگہ سے اُٹھا تھا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ میرے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

''شمروز...... اُٹھو...... میں آئی ہوں۔'' سیتا کی آواز مجھے میلوں دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ مجھے آواز دینے کے ساتھ ہی اُس نے اپنے سر کو بھی ہولے سے جھٹکا دیا تھا۔ اُس کے بالوں سے نچڑتے ہوئے پانی کی چند بوندیں میرے چہرے پر پڑیں اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ میرے اُوپر جھکی ہوئی تھی۔ اُس کے بلاؤز کا اُوپر والا ایک بٹن کھلا ہوا تھا اور بلاؤز کے اندر کا منظر میرے حواس اُڑا دینے کے لئے کافی تھا...... اور پھر میں واقعی اپنے حواس کھو بیٹھا...... میں نے سیتا کو بانہوں سے پکڑ لیا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک دم سرخی تیر گئی۔ اُس نے ایک لمحے کو میری آنکھوں میں جھانکا اور میرے اُوپر جھکتی چلی گئی...... ہمارے بیچ تمام فاصلے مٹ گئے......!

○

اُس غار میں ڈیڑھ مہینہ بیت گیا۔ اس دوران صرف ایک مرتبہ بھارتی فوجیوں کی ایک پارٹی بستی میں آئی تھی۔ وہ صبح دس بجے سے دوپہر تین بجے تک مکھیا کے مہمان رہے تھے۔ مکھیا نے اُن کی خوب خاطر مدارت کی تھی اور اُنہیں اطمینان دلایا تھا کہ بہت عرصے سے اس طرف کوئی بھگوڑا مجاہد نہیں آیا۔ یہاں سب شانتی ہی شانتی ہے۔ اس بیچارے کو کیا پتہ تھا کہ اُس کی

بھانجی مجاہدین کے سب سے خطرناک لیڈر کو نہ صرف پناہ دیئے ہوئے ہے بلکہ اُس کے ساتھ جوانی کے مزے بھی لوٹ رہی ہے۔

مجھے افسوس بھی ہوتا تھا کہ میں یہ سب کچھ کیوں کر رہا ہوں؟ میں نے اب تک ایک مجاہد کی سی زندگی گزاری تھی۔ انگوری عرصہ تک میرے ساتھ رہی تھی۔ کئی ایسے موقعے بھی آئے تھے کہ ہم پٹڑی سے اُتر گئے تھے لیکن ہم نے ہر مرتبہ اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور اپنے کاز کو اوّلیت دی تھی۔ غاصب ہندوؤں سے کشمیر کی آزادی ہماری زندگی کا پہلا اور آخری مقصد تھا اور ہم اس مقصد کو پس پشت نہیں ڈال سکتے تھے۔

لیکن سیتا...... اُس نے مجھے راستے سے بھٹکا دیا تھا۔ لیکن میں فوراً ہی سنبھل گیا۔ ایک مرتبہ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اُسے میں اپنی بھول کہہ سکتا تھا۔ دوسری مرتبہ سیتا میرے قریب آئی تو میں نے اُسے سمجھا دیا کہ وہ ایک مخلص اور بے لوث دوست کی طرح میرے ساتھ رہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اور اس کے بعد سیتا نے واقعی کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔

اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ ہندو ہونے کے باوجود سیتا کو ہندوؤں سے اتنی نفرت اور کشمیری مسلمانوں سے اتنی ہمدردی کیوں تھی؟ یہ بات مجھے سیتا ہی نے بتائی تھی۔

سیتا کے چچا کا بیٹا گوپال سنگھ انڈیا آرمی میں کیپٹن تھا اور چھ مہینے کشمیر میں ڈیوٹی دے کر گیا تھا۔ یہ پچھلے سال کی بات تھی۔ سیتا جے پور میں تھی اور گریجویشن کی تیاری کر رہی تھی۔ بشیر احمد نام کا ایک مسلمان لڑکا بھی سیتا کا دوست تھا۔ وہ اُس کا کلاس فیلو تھا اور وہ دونوں اکثر مل کر اسٹڈی کیا کرتے تھے۔ کئی بار ایسے مواقع بھی آئے تھے کہ بشیر احمد چاہتا تو سیتا کے ساتھ بہت کچھ کر سکتا تھا۔ مگر اس نے کبھی سیتا کو چھوا تک نہیں تھا۔ بشیر کی شرافت کے قائل تو سیتا کے گھر والے بھی تھے اسی لئے اُنہوں نے اُن دونوں کے ملنے پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

گوپال سنگھ کشمیر سے واپس آنے کے بعد جیسلمیر چھاؤنی میں تعینات ہوا تھا۔ وہ مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ جے پور ضرور آتا تھا۔

ایک روز سیتا گھر میں اکیلی تھی کہ گوپال سنگھ آ گیا۔ اُس نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے سیتا کو دبوچ لیا۔ مزاحمت کے باوجود سیتا اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکی اور بے بس چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔

اتفاق سے اسی وقت بشیر بھی پہنچ گیا۔ اُسے صورتحال کا اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی۔ اُس نے گوپال سنگھ کو برا بھلا کہا تو گوپال سنگھ اسی پر پلٹ پڑا اور اُسے پیٹنے لگا۔ بشیر دبلا پتلا کمزور سا لڑکا تھا۔ پٹتا رہا۔

یہ ہنگامہ جاری تھا کہ سیتا کے ماتا پتا بھی گھر پہنچ گئے۔ گوپال سنگھ نے سارا الزام بشیر پر دھر دیا اور اُنہیں بتایا کہ اُس نے اُسے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ سیتا ماں باپ کو بتا رہی تھی کہ اُس کے ساتھ بلادکار بشیر نے نہیں گوپال نے کیا ہے۔ مگر گوپال اُلٹا اُسی پر چڑھ دوڑا کہ وہ اپنے

عاشق کو بچانے کے لئے اُسے الزام دے رہی ہے۔ سیتا کا بھائی بشیر کو پیٹنے لگا۔ وہ گوپال کے ساتھ مل کر اُسے دیر تک پیٹتا رہا پھر گوپال اُسے تھانے لے گیا۔

بشیر غریب گھرانے کا لڑکا تھا اور مسلمان تھا۔ گوپال ایک معزز ٹھاکر گھرانے کا فرد تھا اور فوج میں کیپٹن تھا۔ اُس کی بات کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ بشیر کو تھانے میں اُلٹا لٹکا کر اتنا پیٹا گیا کہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ پولیس نے اُس کے مُردہ جسم میں دو گولیاں اُتار دیں اور لاش سڑک پر پھینک دی اور یہ مشہور کر دیا کہ اس نے تھانے سے بھاگنے کی کوشش کی تھی مقابلے میں مارا گیا۔

سیتا رو رو کر اپنے ماں باپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی کہ بشیر بے قصور تھا۔ اُس کے ساتھ زیادتی گوپال نے کی تھی لیکن اُس کی بات پر کسی نے یقین نہیں کیا۔ بشیر کا غریب اور مسلمان ہونا ہی اُس کا سب سے بڑا جرم تھا۔ اُس کے قتل کی تحقیقات بھی نہیں کی گئی اور یہ کیس ٹھپ ہو گیا۔

سیتا کو اپنے دھرم، اپنے ماں باپ اور اپنے بہادر سینکوں سے شدید نفرت ہو گئی۔ وہ تو اب تک یہ سنتی رہی تھی کہ کشمیر میں مسلمان ہندوؤں پر شدید مظالم ڈھا رہے ہیں۔ فوج ہندوؤں کو بچانے کے لئے کشمیر بھیجی گئی ہے لیکن اب وہ حقیقت جان گئی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ بھارتی فوج کشمیر میں کیا کر رہی تھی۔

اتفاق سے دو مہینے بعد اُس کا ماما جے پور آیا۔ وہ چند روز بعد واپس لوٹا تو سیتا بھی ماں باپ سے ضد کر کے اُس کے ساتھ گئی اور یہاں آ کر اُس نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا۔

وہ اپنے دھرم اور اپنے ماں باپ سے اتنی شدید نفرت کرنے لگی کہ اُس نے کشمیری مجاہدین کی کسی پارٹی میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس غرض سے وہ دو تین مرتبہ ڈوڈا شہر بھی گئی تھی جہاں وہ ایسے لوگوں سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی جو اُسے مجاہدین تک پہنچا سکتے تھے۔ لیکن اُس کا ہندو ہونا آڑے آ گیا۔ اور اب اتفاق سے سیتا سے میری ملاقات ہو گئی۔ اسی لئے اُس نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر میری مدد کی تھی۔

سیتا بہت خوش تھی کہ بالآخر ایک کشمیری مجاہد سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور میں سیتا سے ملاقات پر اپنی جگہ خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ سیتا سے ہندوؤں کے خلاف کس طرح کام لیا جائے......؟

○○○

وہ دوپہر کا وقت تھا۔ میں غار میں اپنے بستر پر لیٹا اونگھ رہا تھا کہ ایک نسوانی چیخ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ غار میں کوئی نہیں تھا اور کوئی معمولی سی آہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نسوانی چیخ کی آواز کو اپنا واہمہ سمجھا اور میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ دراصل میری زندگی کا پچھلا کچھ عرصہ ایسا ہی ہنگامہ خیز گزرا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے درندہ صفت بھارتی فوجیوں کو مسلمانوں کی بستیوں کو تاراج کرتے دیکھا تھا۔ آگ، خون اور لاشیں...... عورتوں اور جوان لڑکیوں کی چیخیں ہر طرف سنائی دیتی تھیں۔ ان بستیوں پر حملوں کے کئی روز بعد بھی معصوم اور بے گناہ عورتوں اور لڑکیوں کی چیخیں میرے کانوں میں گونجتی رہتی تھیں اور پھر اسی طرح کا کوئی نیا واقعہ رونما ہو جاتا۔ اس طرح کشمیر میں تباہی اور بربادی کا ایک تسلسل تھا جو عرصے سے چل رہا تھا۔ میں پچھلے دو مہینوں سے اگرچہ آبادی سے دُور اس غار میں تھا۔ سیتا دیوی اور نیلم میرا ہر طرح سے خیال رکھے ہوئے تھیں۔ اگرچہ یہ غار لڑائی ہنگاموں سے بہت دُور تھا لیکن اس لڑائی کو میں نے کبھی ایک لمحہ کو بھی فراموش نہیں کیا تھا جو کشمیری مسلمان طویل عرصے سے اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے۔

اس غار میں میرے لئے مکمل طور پر سکون ہونے کے باوجود میرے دماغ میں کبھی کبھی دھماکے ہونے لگتے اور بھیڑیا صفت بھارتی فوجیوں کی بربریت کا شکار ہونے والی معصوم لڑکیوں اور بے گناہ عورتوں کی چیخیں میرے کانوں میں گونجنے لگتیں۔ اور اس وقت میں نسوانی چیخ کی اس آواز کو اپنا واہمہ ہی سمجھا تھا۔

میں نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ نجانے کیا بات تھی کہ نیند اس وقت بڑی شدت سے مجھ پر غلبہ پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی چیخ کی آواز دوبارہ سنائی دی تو میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ میرا واہمہ نہیں ہو سکتا تھا۔ چیخ کی وہ آواز بہت واضح طور پر سنائی دی تھی۔

میں اپنی رائفل اُٹھا کر تیزی سے غار کے دہانے کے قریب پہنچ گیا۔ اس دوران چیخ کی آواز دوبارہ سنائی دی...... میں دہانے سے کچھ اور آگے بڑھ کر سرسراتی ہوئی جھاڑیوں کی آڑ سے جھانکنے لگا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے مجھے سینے میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا......

چشمے کے قریب دو بھارتی فوجیوں نے سیتا کو دبوچ رکھا تھا اور سیتا اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ ایک فوجی نے اُس کا منہ دبا رکھا تھا اور جب کسی وقت ہاتھ منہ سے ہٹ جاتا تو سیتا کی گھٹی گھٹی سی چیخ فضا میں پھیل جاتی۔

سیتا کی ساڑھی اُس کے جسم سے الگ ہو چکی تھی۔ صرف پیٹی کوٹ اور بلاؤز بدن پر رہ گیا ۔ ایک فوجی نے ایک ہاتھ سے اُس کا منہ دبا رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ اُس کے سینے پر لپیٹے اُسے بو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ دوسرا فوجی اُس کا پیٹی کوٹ نیچے کھینچنے کے چکر میں تھا اور تا اپنے آپ کو بچانے کے لئے بری طرح لاتیں چلا رہی تھی۔

دونوں فوجیوں کی سب مشین گنیں چشمے کے کنارے پتھروں پر پڑی ہوئی تھیں۔ میں رائفل فائے قد آدم جھاڑیوں کی آڑ میں بڑی احتیاط سے نیچے اُترنے لگا۔ ایک تو جھاڑیاں بہت نچی تھیں۔ اگر میں کھڑے ہو کر بھی چلتا تو چشمے کی طرف سے مجھے دیکھا نہیں جا سکتا تھا اور پھر ستہ ان جھاڑیوں میں بل کھاتا ہوا تھا۔ اس طرح دیکھے جانے کا امکان نہیں تھا مگر اس کے جود میں جھک کر بڑی احتیاط سے چل رہا تھا۔

سیتا کی گھٹی گھٹی سی چیخ ایک بار پھر سنائی دی۔ میں نے رُک کر جھاڑیوں میں سے جھانکا، سیتا نے آپ کو کسی طرح چھڑا کر ایک طرف کو بھاگ کھڑی ہوئی تھی لیکن اُن دونوں فوجیوں نے سے پھر دبوچ لیا تھا اور اُسے اُٹھا کر چشمے کے دوسری طرف لے جا رہے تھے۔

بستی کا فاصلہ وہاں سے اتنی دُور تھا کہ اگر سیتا پھیپھڑوں کی پوری قوت سے بھی چیختی تو اُس ا آواز بستی تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ قرب و جوار میں موجود کوئی شخص اُس کی وازسن لے۔ لیکن لگتا تھا اس وقت اس نواح میں کوئی نہیں تھا جو اُس کے چیخنے کی آواز سن لیتا۔

میں نے اُس کی آواز سن لی تھی اور اُسے بچانے کے لئے نکل کھڑا ہوا تھا۔ سیتا کو بھی شاید ین ہوگا کہ میں اُس کی آواز سن لوں گا اور اس کی مدد کو ضرور آؤں گا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی لہ اُس نے ایک مرتبہ بھی میرا نام لے کر مدد کے لئے نہیں پکارا تھا جس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ن کا منہ دبا رکھا گیا تھا اور اُسے میرا نام پکارنے کا موقع نہیں مل رہا تھا یا وہ اُن فوجیوں کے امنے جان بوجھ کر میرا نام نہیں پکارنا چاہتی تھی۔

وہ فوجی اُسے چشمے کے دوسری طرف ایک چٹان کے پیچھے لے گئے۔ اس طرف سیتا کے یخنے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ میں تیزی سے جھاڑیوں سے نکل کر چشمے کے قریب آ گیا۔ جیوں کی دونوں سب مشین گنیں اس جگہ پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے محتاط نظروں سے نشیب ما بہت دُور بستی کی طرف اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ دُور دُور تک کوئی ذی رُوح دکھائی نہیں دیا تھا یا کا مطلب تھا کہ ان فوجیوں کا کوئی تیسرا ساتھی آس پاس موجود نہیں تھا۔ اگر ان کے کوئی اتھی ہوں گے بھی تو بہت دُور کسی اور بستی کی طرف ہوں گے اور یہ دونوں شاید گشت کرتے ئے یا راستہ بھٹک کر اس طرف آ نکلے تھے اور ایک جوان اور حسین لڑکی کو اکیلے پا کر اُن کی ندی فطرت کے عین مطابق اُن کی ہوس جاگ اُٹھی تھی۔

میں دبے قدموں چشمے کے اُوپر سے گھوم کر اُس چٹان کے قریب پہنچ گیا۔ دوسری طرف ے سیتا کی گھٹی گھٹی سی چیخوں اور دھینگا مشتی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ غالباً سیتا اپنے

آپ کو بچانے کے لئے اب بھی بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔ میں چند قدم محتاط انداز میں آگے بڑھا اور پھر چھلانگ لگا کر چٹان کے دوسری طرف آ گیا اور اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے...... رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی جس سے میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں......

سیتا زمین پر چت پڑی تھی۔ ایک فوجی نے اُس کی بانہوں میں ہاتھ ڈال کر اُسے پوری طرح گرفت میں لے رکھا تھا۔ سیتا کے منہ میں ایک رُومال ٹھنسا ہوا تھا جس سے اُس کی چیخیں اُس کے سینے ہی میں دم توڑ رہی تھیں۔ سیتا کا بلاؤز بھی پھٹ چکا تھا وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے پوری قوت سے لاتیں چلا رہی تھی۔ اور دوسرا فوجی اُسے مکمل طور پر بے بس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر سامنے آیا تو آواز سن کر دونوں فوجی چونک گئے۔ ایک لمحے کو ان پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی لیکن انہوں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اُن دونوں فوجیوں کی رائفلیں تو چشمے کے قریب ہی پڑی ہوئی تھیں البتہ دونوں کی سنگینیں اُن کے بیلٹوں سے لگے ہوئے ہولسٹروں میں تھیں۔

جو فوجی سیتا کو ٹانگوں سے پکڑ کر قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا وہ سنگین کے دستے پر ہاتھ ڈالتا ہوا میری طرف لپکا لیکن میں نے اُسے سنگین ہولسٹر سے نکالنے کا موقع نہیں دیا اور بڑی پھرتی سے رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ کر لٹو کی طرح گھما دیا۔ رائفل کا بٹ پوری قوت سے اُس کے سر پر لگا۔ پٹاخ کی آواز اُبھری اور اُس کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے۔ خون کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ اُس کا بھیجا بھی بکھر گیا اور اُس کے منہ سے صرف ایک آواز نکلی تھی۔ وہ تیورا کر گرا اور پانی سے نکالی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔

دوسرے فوجی نے بھی سیتا کو چھوڑ دیا۔ اُس کے چہرے پر شدید خوف اور آنکھوں میں بے پناہ وحشت اُبھر آئی تھی۔ میں نے بڑی پھرتی سے رائفل کو گھما کر بٹ کی طرف سے پکڑا اور اُسے زد میں لے لیا۔ اُس بزدل فوجی نے دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھا دیئے تھے۔

سیتا چند لمحوں تک متوحش نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتی رہی پھر اپنی جگہ سے اُٹھی اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے رائفل کو سنبھالے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔

''اپنے حواس قابو میں رکھو سیتا!'' میں نے کہا۔

''مار دو شمروز...... مار دو اسے...... چھلنی کر دو اسے......'' وہ ایک دم پھٹ پڑی۔ ''اس نے ہندو ہو کر ایک ہندو ناری کی عزت لوٹنے کی کوشش کی ہے۔ تم مسلمان ہو...... تم نے مجھے ان درندوں سے بچایا۔ ختم کر دو اسے بھی۔'' اُس نے جذبات میں آ کر مجھ سے رائفل چھیننے کی کوشش بھی کی تھی۔

''ہوش میں آؤ سیتا!'' میں نے کہا۔ ''تم اس طرف بیٹھ جاؤ اور دیکھو میں اس کا کیا حشر کرتا

ہوں۔''

اور پھر میں نے بڑی مشکل سے سیتا کو اپنے آپ سے الگ کیا۔ وہ دونوں گھٹنے سمیٹ کر ٹان کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ دونوں بانہیں اُس نے اپنے گھٹنوں پر لپیٹ لی تھیں۔

میں نے ایک مرتبہ دوسرے فوجی کی طرف دیکھا وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ اُس ا کھوپڑی سے بہنے والا خون اور بھیجے کے لوتھڑے ادھر اُدھر پتھروں پر بکھرے ہوئے تھے۔

میں لاش سے نظریں ہٹا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس جگہ دو چٹانیں آپس میں اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ ان کے بیچ میں تقریباً دو سو مربع گز پر مشتمل ایک تکون میدان سا بن گیا تھا۔ دوسری ٹان کے ساتھ ایک بیس بائیس فٹ چوڑا راستہ جو پچھلی طرف نشیب میں چلا گیا تھا اور میدان کے اختتام پر ایک گہرا کھڈ تھا۔

میں نے میدان کے کنارے پر پہنچ کر نیچے جھانک کر دیکھا۔ بالکل عمودی ڈھلان تھی جو ہنکڑوں فٹ گہرائی تک چلی گئی تھی۔ اُس ڈھلان پر پیر جمانا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔ ھلان کے اختتام پر گہرائی میں پتھر بکھرے ہوئے تھے اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں بھی تھیں۔

میں نے ایک بڑا سا پتھر اُس ڈھلان پر لڑھکا دیا۔ وہ پتھر ایک بڑے سائز کے مٹکے کے ابر تھا۔ وہ ایک مرتبہ ڈھلان کی سطح سے ٹکرایا پھر گیند کی طرح ہوا میں اُچھلا اور بیسیوں فٹ نیچے ب بار پھر چٹانی ڈھلان سے ٹکرا کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ نیچے پہنچنے پر وہ پتھر چھوٹے چھوٹے تعداد ٹکڑوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔

میں نے مُڑ کر اُس فوجی کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھائے کھڑا ا۔ اُس کے چہرے پر بے پناہ خوف تھا اور وہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اُس کی عمر تیس اور بتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ ٹوتھ برش ٹائپ مونچھیں خاصی خوفناک لگ رہی تھیں۔

''تم لوگوں کو یہ وردی پہنائی جاتی ہے دیش اور جنتا کی رکشا کے لئے...... لیکن تم لوگوں نے اس خطے کو شکار گاہ سمجھ رکھا ہے۔ طاقت کے گھمنڈ میں تم لوگ انسانیت کو بھی بھول گئے ہو۔ ر انسانیت تو تم لوگوں میں کبھی تھی ہی نہیں۔ تم لوگ بہادر تو بہت ہو۔ نہتے اور مظلوم بے گناہ لوں پر گولیاں برسانا اور کمزور عورتوں کو پامال کرنے کو ہی تم لوگوں نے بہادری سمجھ لیا ہے۔ ہاں مقابلہ کرنے والے چار آدمی سامنے آتے ہیں تم لوگ ہیجڑوں کی طرح ہتھیار پھینک کر اگ کھڑے ہوتے ہو۔ اس لڑکی کو اکیلے دیکھا تو اپنی بہادری اور جوانمردی کے جوہر دکھانے تیار ہو گئے۔ مگر یہ سورما تو ایک ہاتھ بھی برداشت نہیں کر سکا۔ اور تمہاری موت تو اس سے بھی یادہ بھیانک ہوگی۔''

''مم...... مجھے شما کر دو مہاراج!'' اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ اُس کے منہ سے آواز ی مشکل نکل رہی تھی۔

''ہاتھ اُوپر......!'' میں غرایا۔ اُس نے ہاتھ فوراً ہی سر سے اُوپر اُٹھا دیئے۔

''اس کو مار دو شمروز...... ختم کر دو اسے۔'' سیتا چیختی ہوئی اپنی جگہ سے اُٹھ گئی اور دوڑ کر ایک بار پھر مجھ سے رائفل چھیننے کی کوشش کرنے لگی۔

''ہوش میں آؤ سیتا!'' میں نے کہا۔ ''اس نے تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ یہ تمہارے ہی ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے گا۔'' میں نے سیتا کو اپنے سے الگ ہٹا کر ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور اُس فوجی کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔

''یہ لاش اُٹھا کر اس کھڈ میں پھینک دو!'' میں نے اُسے رائفل کی زد پر لیتے ہوئے حکم دیا۔

اُس کا چہرہ ایک دم دُھواں ہو گیا۔ وہ کبھی لاش کی طرف دیکھتا اور کبھی ہم دونوں کی طرف۔

''یہاں اس کی چتا کا بندوبست نہیں کیا جا سکتا۔ لاش اُٹھا کر پھینک دو کھڈ میں۔'' میں نے غراتے ہوئے کہا۔

وہ جھک کر لاش اُٹھانے لگا۔ اُس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ وہ لاش اُٹھا کر کھڈ کی طرف بڑھا تو اُس کی ٹانگیں بھی کانپ رہی تھیں۔ لگتا تھا کسی بھی وقت گر جائے گا۔

کھڈ کے کنارے پر پہنچ کر وہ رُک گیا۔ اُس کی ٹانگیں اب بھی کانپ رہی تھی۔ اور پھر میری دھاڑ سن کر اُس نے لاش کھڈ میں پھینک دی۔ میں نے سیتا کو اشارہ کیا۔ فوجی نے لاش پھینک کر جیسے ہی مُڑنا چاہا سیتا نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر اُس کے کولہے پر زوردار لات رسید کر دی۔ فوجی لڑکھڑا گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور کھڈ میں گر گیا...... اُس کی آخری چیخ بہت بھیانک تھی جو دیر تک پہاڑیوں میں گونجتی رہی۔

میں نے جھانک کر نیچے دیکھا۔ دونوں لاشیں نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ شاید ان کے اتنے ٹکڑے ہو چکے ہوں گے کہ انہیں جمع کرنا بھی ممکن نہیں رہا ہو گا۔

میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر سنسنی کے تاثرات تھے۔ اور پھر وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

جب تک اُن دونوں درندوں کا انت نہیں ہو گیا تھا میں بھی سنسنی کی لپیٹ میں رہا تھا۔ لیکن اب میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ میں سیتا کی برہنہ پشت سہلاتے ہوئے اُسے تسلی دینے لگا۔

''ہم سارا دن یہاں کھڑے نہیں رہ سکتے سیتا!'' میں نے کہا۔ ''اپنے کپڑے اُٹھاؤ اور یہاں سے ہٹ چلو۔ اگر کوئی اس طرف آ گیا تو......''

''یہاں کوئی نہیں آتا۔'' اُس نے میری بات کاٹ دی اور چہرہ اُوپر اُٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''اگر تم نہ ہوتے تو یہ درندے پتہ نہیں میرا کیا حشر کرتے۔ تم نے مجھے نیا جیون دیا ہے...... میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔''

''ٹھیک ہے...... مگر اس وقت یہاں سے چلو!'' میں نے کہا۔

سیتا مجھ سے الگ ہو گئی۔ اُس نے اپنا پیٹی کوٹ اور پھٹا ہوا بلاؤز اُٹھایا اور ہم دونوں چٹان

کی آڑ سے نکل کر چشمے کی طرف آ گئے۔ میں نے ان فوجیوں کی دونوں رائفلیں بھی اُٹھا لیں۔ سیتا کی ساڑھی بھی قریب ہی پڑی تھی جو میں نے اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دی۔

''لو...... یہ لپیٹ لو اور اُوپر چلو!''

''تم تھوڑی دیر یہیں رُک جاؤ!'' سیتا بولی۔ اب وہ اپنی حالت پر بڑی حد تک قابو پا چکی تھی۔ ''اُنہوں نے اپنے گندے ہاتھوں سے میرے شریر کو چھوا تھا۔ میں اشنان کر لوں تو اُوپر چلتے ہیں۔''

میں چشمے سے چند گز دُور رُخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ چند منٹ تک پانی میں چھپاکوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں، پھر سیتا کی آواز سنائی دی۔

''میں نے کپڑے پہن لئے ہیں...... اب تم اس طرف دیکھ سکتے ہو۔''

میں پیچھے مُڑ گیا۔ سیتا اپنے جسم پر ساڑھی لپیٹ چکی تھی اور بلاؤز بھی کسی نہ کسی طرح اُس نے اٹکا لیا تھا۔ پھر چشمے کے قریب ہی جھاڑیوں کے قریب جھک کر اُس نے ایک پوٹلی اُٹھا لی۔ اُس کے قریب ہی پیتل کی ایک گڑوی بھی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تمہارے لئے کھانا لے کر ہی آئی تھی۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''اور پھر یہ سوچا تھا کہ اس گڑوی میں پانی بھی لیتی چلوں کہ اچانک ہی وہ دونوں میرے سامنے آ گئے۔ کچھ دیر مجھ سے اُلٹے سیدھے سوال کرتے رہے پھر ان دونوں نے مجھے دبوچ لیا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''چلو! اُوپر غار میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

اُس نے چشمے پر اُوپر سے، جہاں سے پانی نیچے گر رہا تھا، گڑوی میں پانی بھر لیا۔ میں نے رائفلیں اپنے کندھوں پر لٹکا لیں اور ہم دونوں جھاڑیوں میں بل کھاتے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے غار میں آ گئے۔

''لو! تم روٹی کھاؤ میں تمہیں بتاتی ہوں اُن دونوں نے کس طرح مجھے گھیرنے اور بے بس کرنے کی کوشش کی تھی۔'' سیتا کہتے ہوئے میرے سامنے بیٹھ گئی۔

چند منٹ پہلے جو کچھ بھی ہوا تھا اُس کے پیش نظر میری بھوک اُڑ جانی چاہئے تھی مگر حیرت ہے میری بھوک چمک اُٹھی تھی۔ اور میں بڑے بڑے نوالے توڑ کر منہ میں رکھ رہا تھا۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی سیتا بتا رہی تھی کہ کس طرح ان دونوں فوجیوں نے اُسے اکیلا دیکھ کر موقع سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔

میں ہوں ہاں کرتے ہوئے کھانا کھا رہا تھا۔ ایک مرتبہ میری نظریں اُس کی طرف اُٹھ گئیں اور نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا۔ سیتا گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے پھٹے ہوئے بلاؤز کو اپنے بدن پر پھنسانے کی کوشش کی تھی مگر بلاؤز ایک طرف سے ہٹ کر نیچے ہو گیا تھا اور اُس کا سینہ ایک طرف سے اس طرح برہنہ ہو رہا تھا کہ مجھے سینے میں اپنا سانس رُکتا

ہوامحسوس ہونے لگا۔

میں نے گڑوی اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لی۔ پانی کے چند بڑے بڑے گھونٹ بھر کر حلق میں اٹکا ہوا نوالہ نیچے اُتارا اور اُس کے چہرے کو تکنے لگا۔

''کیا ہوا؟'' سیتا نے پوچھا۔

''پھندہ لگ گیا تھا..... نوالہ حلق میں اٹک گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''آرام سے کھانا کھاؤ نا..... کوئی تم سے چھین تو نہیں رہا۔'' سیتا مسکرا دی۔

''کیا تمہارے خیال میں یہ جگہ اب رہنے کے لئے مناسب ہے؟'' میں نے اس مرتبہ نسبتاً چھوٹا نوالہ منہ میں رکھا۔ ''یہ فوجی گشت کرتے ہوئے اس طرف آ گئے تھے۔ انہیں کسی نہ کسی وقت اپنی چوکی پر واپس تو پہنچنا ہوگا۔ اور جب یہ لوگ وہاں نہیں پہنچیں گے تو ان کی تلاش شروع ہو جائے گی۔ تلاش کرنے والی کوئی پارٹی تمہاری بستی میں بھی آئے گی اور اس طرف بھی چیک کیا جائے گا۔'' میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ''یہاں انہیں لاشیں تو نہیں ملیں گی۔ ان لاشوں کو تلاش کر لینا آسان نہیں ہوگا لیکن اس چٹان کے دوسری طرف پتھروں پر بکھرا ہوا خون تلاش کرنے والوں کو ساری کہانی سنا دے گی۔ جب وہ لوگ اس طرف آئیں گے تو یہ غار بھی ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکے گا۔''

''یہی میں بھی سوچ رہی ہوں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''یہ جگہ اب واقعی خطرناک ہو گئی ہے۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم یہ غار ہی نہیں یہ علاقہ بھی چھوڑ دیں گے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

''یہاں سے قریب ترین ہماری بستی ہے۔'' سیتا نے کہا۔ ''اپنے دو فوجیوں کی گمشدگی پر وہ سب سے پہلے ہماری ہی بستی میں آ کر پوچھ گچھ کریں گے اور جب یہاں پتھروں پر جگہ جگہ خون کے دھبے ملیں گے تو انہیں صورتحال کا اندازہ لگانے میں دُشواری نہیں ہوگی۔ بستی کے سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ میں آس پاس گھومتی رہتی ہوں۔ مجھ سے پوچھ گچھ کی جائے گی اور شاید میں......''

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''کہاں جانا چاہتی ہو..... میرا مطلب ہے کوئی متبادل انتظام؟''

''ایک جگہ ہے میری نظروں میں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''ہماری بستی کے دوسری طرف پہاڑیوں میں کچھ گھپائیں ہیں جہاں کسی کو تلاش کر لینا آسان نہیں ہوگا۔ تم ایک دو دن وہاں رہ جاؤ اس کے بعد ہم جموں کی طرف نکل جائیں گے۔''

''ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' میں نے اُسے گھورا۔ ''کیا تم بھی اپنا گھر چھوڑ کر میرے ساتھ جانا چاہتی ہو؟''

''ہاں...'' سیتا نے جواب دیا۔ ''اب تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ مسلمان تو مسلمان یہاں تو ان وحشیوں سے ہندو عورتوں کی عزتیں بھی محفوظ نہیں۔ سب سے پہلے میرے

کزن نے مجھے بے آبرو کیا اور اب یہ ہندو فوجی..... کیا اب بھی ایسی کوئی گنجائش باقی ہے کہ میں ان پر بھروسہ کروں؟ اگر انہیں شبہ بھی ہو گیا کہ میں دو ہندو فوجیوں کے قتل میں ملوث ہوں تو وہ میرا حشر مسلمان عورتوں سے بھی بدتر کریں گے۔ میرے گھر والوں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا۔ ہو سکتا ہے اس بستی ہی کو جلا کر راکھ کر ڈالا جائے اور وہ لوگ کبھی نہیں مانیں گے کہ ان دو ہندو فوجیوں نے میرا ابلادکار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس لئے ہمیں یہ غار ہی نہیں بستی بھی چھوڑ دینی ہوگی۔''

''وہ گھپائیں یہاں سے کتنی دُور ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بستی کے اس طرف۔'' اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''لیکن وہاں تک جانے کے لئے بستی کی طرف نہیں جانا پڑے گا۔ حضوری بابا کے مزار والی چٹان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔''

''تو پھر انتظار کیوں کیا جائے؟'' میں نے کہا۔ ''کیوں نہ ابھی یہاں سے نکل چلیں؟''

''یہی مناسب رہے گا۔'' سیتا بولی۔ ''تم تیار ہو جاؤ! ہم ابھی نکل چلتے ہیں۔''

کھانا ختم کرنے کے بعد میں نے بستر کی چادر اور کمبل تہہ کر لیا۔ سیتا نے باقی چیزیں اُٹھا کر غار کے پچھلی طرف تنگ سی دراڑ میں چھپا دیں۔ اُس نے کمبل اور چادر میرے ہاتھ سے لے لی۔ میں نے ہندو فوجیوں کی رائفلیں تو اپنے کندھوں پر لٹکا لیں اور اپنی رائفل ہاتھ میں سنبھال لی اور ہم غار سے نکل آئے۔

حضوری بابا کے مزار کے قریب سے گزرتے ہوئے سیتا ایک لمحے کو رُک گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر وہ زیرِ لب کچھ بڑبڑائی اور میرے ساتھ چلنے لگی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم پہاڑیوں کے دامن میں درختوں کی آڑ لے کر چلتے ہوئے بستی کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ اُس طرف پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹی سی جھیل تھی جس کے چاروں طرف دبیز گھاس اور جھاڑیاں تھیں اور پوری جھیل کی سطح کنول کے چوڑے پتوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں ان پودوں میں پھول بھی کھلے ہوئے تھے جو ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔

ان چٹانوں میں لاتعداد گھپائیں تھیں۔ ان گھپاؤں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اندر سے یہ چٹانیں پانی سے کٹی تھیں۔ پانی سے چٹانوں کے کٹاؤ کا یہ عمل صدیوں میں یہاں تک پہنچا ہوگا۔ ان گھپاؤں کے اندر چھت پر کہیں کہیں سے پانی ٹپک رہا تھا اور یہی پانی بہتا ہوا باہر والی جھیل میں جا گرتا تھا۔

کہیں کہیں اُوپر سے چٹانیں کھلی ہوئی تھیں اور روشنی ان گھپاؤں کے اندر تک پہنچ رہی تھی۔ میں سیتا کے ساتھ چلتا رہا۔ پانی کے کٹاؤ سے لاتعداد قدرتی ستون بن گئے تھے اور یہ گھپائیں بہت دُور تک چلی گئی تھیں۔ سیتا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ایسی جگہ پر کسی کو تلاش کر لینا ممکن نہیں تھا۔ ایک جگہ سیتا رُک گئی۔ یہ جگہ قدرے صاف ستھری تھی اور اُوپر چٹانوں میں کچھ کھلی جگہ تھی جہاں

سے آسمان بھی دکھائی دے رہا تھا۔ جس جگہ ہم رُکے تھے اُس کے قریب ہی تقریباً ایک فٹ چوڑی ندی کی صورت میں پانی بھی نشیب کی طرف بہہ رہا تھا۔ پانی کی گہرائی چھ سات انچ سے زیادہ نہیں تھی۔

''سوری شریمان جی!'' سیتا نے کمبل اور چادر چٹانی دیوار کے قریب زمین پر رکھ دی اور اُن کے اُوپر وہ چھوٹی سی پوٹلی جس میں بچی ہوئی روٹی تھی۔ ''اس سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ......''

''یہ تو بہت اچھی جگہ ہے۔'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''میں نے تو ایسی ایسی جگہوں پر شب و روز گزارے ہیں جہاں......''

''میں جانتی ہوں۔'' اُس نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی۔ ''یہ جگہ بہت محفوظ ہے۔ لیکن اگر اتفاق سے کوئی اس طرف آ بھی گیا تو تم اُس راستے سے اوپر چلے جانا۔ وہ اوپر تمہیں چیڑ کا ایک جھومتا ہوا درخت نظر آ رہا ہے نا؟'' اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اُوپر اشارہ کیا۔ ''وہاں سے تم پہاڑیوں کے اندر جا کر کسی محفوظ جگہ پر پناہ لے سکتے ہو۔ اگر ایسی کوئی صورتحال ہوئی تو میں اس طرف آ جاؤں گی۔''

''لگتا ہے یہ سارا علاقہ تم نے بہت اچھی طرح دیکھا ہوا ہے۔'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ سیتا نے جب ہاتھ اُٹھا کر اوپر اشارہ کیا تھا تو اُس کی ساڑھی کا پلو نیچے گر گیا تھا اور پھٹا ہوا بلاؤز بھی ایک طرف سے ہٹ گیا تھا اور وہ قیامت خیز منظر میرے دل پر قیامت ڈھا رہا تھا۔

''میں صبح سے شام تک گھومتی رہتی ہوں اور اس علاقے کے بارے میں اتنا کچھ جان چکی ہوں کہ یہاں کے رہنے والے بھی نہیں جانتے اور......'' وہ بات کرتے کرتے رُک گئی۔ اُس نے میری نگاہوں کا مرکز تاڑ لیا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''سوری ڈیئر!'' اُس نے دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ ''میں تمہاری......'' میں سیتا کو جملہ مکمل کرنے کا موقع دیئے بغیر ایک قدم آگے بڑھ گیا اور میں نے بھی بانہیں پھیلا دیں۔ سیتا والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ میری کنپٹیاں سلگ رہی تھیں اور دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اُس کے گداز سینے کے لمس نے میرے اندر لاوا سا بھر دیا تھا۔ سیتا نے مجھے اپنی بانہوں کے شکنجے میں جکڑ لیا...... ہم زیادہ دیر تک اپنے پیروں پر کھڑے نہیں رہ سکے اور زمین پر جھکتے چلے گئے......

میں اس وقت یہ بھول گیا تھا کہ میں نے اپنے دل سے عہد کیا تھا کہ سیتا کے اتنے قریب نہیں آؤں گا کہ جذبات بھڑک اُٹھیں مگر اب کمبخت وہی دل بے قابو ہو گیا تھا۔ اس میں سیتا کا کیا قصور؟

میں اپنے آپ کو ہلکے پھلکے بادلوں کی طرح ہواؤں میں اُڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اور یہ

کیفیت بہت دیر تک برقرار رہی۔ حواس بحال ہونے پر میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ سیتا میرے بازو پر سر رکھے میرے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

''سیتا!'' میں نے اُسے ہولے سے پکارا۔ لیکن اُس کے بدن میں حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ تیسری مرتبہ پکارنے پر وہ کسمسا کر رہ گئی۔

''ہوں......'' اُس کی آواز بہت مدھم تھی جیسے بہت گہری نیند میں ہو۔

''اُٹھو...... بہت دیر ہو گئی۔ تمہیں بستی واپس جانا ہے۔'' میں نے کہا۔ سیتا نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ چند لمحے مخموری سی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر میرے سینے پر سر رکھ دیا۔

چند منٹ بعد میں نے اُسے اپنے سے الگ کیا۔ وہ اُس کے بعد بھی کافی دیر تک زمین پر لیٹی گہرے گہرے سانس لیتی رہی پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اس طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگی جیسے یہ جاننا چاہتی ہو کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟ اور پھر وہ اُٹھ کر اپنا لباس درست کرنے لگی۔

سیتا چلی گئی اور میں اپنی جگہ پر بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں اپنے راستے سے کیوں بھٹک رہا ہوں؟ دفعتہً میرے ذہن میں ایک اور خیال اُبھرا...... سیتا ہندو تھی...... اور کشمیر کے مسلمان آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ کشمیر میں موجود سات لاکھ بھارتی فوجی اس تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے کشمیریوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔ کشمیری مجاہدین بھی بھارتی فوج کو جانی و مالی نقصان پہنچا رہے تھے۔ روزانہ درجنوں بھارتی فوجی کشمیری مجاہدین کے ہاتھوں مارے جا رہے تھے اور ظاہر ہے ہندوؤں کی تمام تر ہمدردیاں اپنے سینکوں کے ساتھ تھیں۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا سیتا جان بوجھ کر مجھے راستے سے بھٹکا رہی ہے؟ اُس نے جب مجھے زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں اُٹھا کر غار میں پہنچایا تھا تو میرے زخم کو دیکھتے ہوئے اُسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ میں کوئی کشمیری مجاہد ہوں۔ اور بعد میں اُسے میرا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔ وادی کا بچہ بچہ میرے نام سے واقف ہو چکا تھا۔ بھارتی فوجیوں کے لئے تو میرا نام دہشت کی علامت بن گیا تھا۔ انگوری ماری جا چکی تھی اور میں کشمیر میں بھارتی فوج کو سب سے زیادہ مطلوب تھا۔ میرے مُردہ یا زندہ گرفتاری پر لاکھوں روپے انعامات مقرر تھے۔

میرے بارے میں جاننے کے بعد سیتا نے شاید سوچا ہو کہ اگر اُس نے مجھے بستی والوں کے ذریعے پولیس یا فوج کے حوالے کرنے کی کوشش کی تو شاید میں بھاگ جاؤں۔ اور مجھے راستے سے ہٹانے کے لئے اُس نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ اپنے بارے میں ایک جھوٹی کہانی سنا کر میری بھی ہمدردیاں حاصل کیں اور خود بھی میری ہمدرد بن گئی اور اپنے حسن و شباب کے سنہرے جال میں پھنسا کر وہ مجھے میرے راستے سے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور میں ہی وہ بیوقوف تھا جو اُس کی چال میں آ گیا تھا اور اُس کے سنہرے جال میں پھنس کر غیر شعوری طور پر اپنے اصل

مقصد سے بنتا جا رہا تھا۔

لیکن نہیں...... شاید ایسا نہیں تھا۔ میں نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ آج جو کچھ ہوا تھا اس سے ہندو فوجیوں سے سیتا کی نفرت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اُس نے میرے خلاف کوئی سازش نہیں کی تھی...... وہ واقعی میری مدد کر رہی تھی...... اور یہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس میں شاید اُس کے ارادے کو بھی دخل نہیں ہو گا۔ جوانی تو ہوتی ہی خطرناک ہے اس کا اندازہ مجھے بھی ہو چکا تھا۔ سیتا کی جوانی بھی اُسے بہکا رہی تھی۔ بار بار......

غاروں میں بتدریج اندھیرا سا پھیلنے لگا۔ ابھی شام تو نہیں ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے باہر ابھی دُھوپ چمک رہی ہو لیکن روشنی براہِ راست ان گھپاؤں کے اندر تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے یہاں اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

میں نے سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا، چٹان کے اُوپر والے دہانے کے قریب چیڑ کا فلک بوس درخت ہوا میں جھوم رہا تھا اور اُس کی شاخوں پر دُھوپ چمک رہی تھی۔ دفعتہً میرے ذہن میں ایک خیال آیا یہاں تاریکی میں دبکے رہنے سے تو بہتر تھا کہ میں اُوپر چلا جاؤں اور جب تک دن کی روشنی ہے وہیں بیٹھا رہوں۔ اور ممکن ہو تو رات میں اوپر ہی کھلی فضا میں گزاروں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کمبل اور ایک رائفل اُٹھا لی اور سیتا کے بتائے ہوئے راستے پر اُوپر چڑھنے لگا۔ وہ راستہ زیادہ دُشوار نہیں تھا۔ سیڑھیوں کی طرح تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پتھر اُبھرے ہوئے تھے۔ میں بڑی آسانی سے اُوپر پہنچ گیا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کم از کم ایک گھنٹہ باقی تھا۔ فلک بوس درختوں اور اُونچی پہاڑیوں کی چوٹیوں میں دُھوپ چمک رہی تھی۔ وہ درخت جو غار کے اندر سے بھی نظر آ رہا تھا وہ دہانے سے دس بارہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں اُسی درخت کے قریب ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ درخت کے نیچے جھاڑیوں میں چلغوزے اور اُن کے لٹو نما پھل بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے قریب سے کچھ چلغوزے جمع کر لئے۔ یہ حسین وادی ایسی ہی تھی۔ قدرت نے اسے بے شمار نعمتوں سے نوازا تھا۔ پھل دار درخت تو پہاڑوں میں اس طرح پھیلے ہوئے تھے کہ کوئی اُن تک پہنچنے والا نہیں تھا اور اُن درختوں کا پھل اسی طرح ضائع ہو جاتا تھا۔

میں چلغوزے چھیلتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ڈوڈا سری نگر سے بہت دُور تھا۔ یہاں کی جغرافیائی صورتحال بھی سری نگر اور کشمیر کے باقی حصوں سے مختلف تھی۔ پہاڑ زیادہ تر خاکستری اور بنجر تھے۔ سبزہ بھی کم تھا اور درخت بھی کہیں کہیں تھے۔ اس طرف سے جیسے جیسے جموں کی طرف چلتے جائیں یہ تبدیلی نمایاں ہوتی جائے گی۔ جموں کے پہاڑ زیادہ تر بنجر اور خشک تھے۔

ریاست جموں و کشمیر دنیا کا واحد خطہ ہے جو طبیعات، موسم، جغرافیائی اور فطری حسن کے اعتبار سے تین حصوں میں منقسم ہے۔ جموں کشمیر اور لداخ کے نہ صرف موسمی مزاج مختلف ہیں

بلکہ ان کی تہذیب و معاشرہ اور زبانیں بھی ایک دوسرے سے قطعی جداگانہ اور مختلف ہیں۔ مذہبی عقائد کے لحاظ سے بھی یہ تینوں حصے ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔ جموں اور کشمیر میں سکھ بھی آباد ہیں اور ہندو بھی۔ ہندو لاتعداد مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں۔ مسلمان ایک خدا کے آگے سر جھکاتے ہیں اور لداخ کے رہنے والے مہاتما بدھ کے پیروکار ہیں۔ یہ خطہ اس لحاظ سے بھی دنیا بھر میں منفرد مقام رکھتا ہے کہ یہاں جنگلوں اور پہاڑوں میں بھی قدرت نے ایسی ایسی نعمتیں پیدا کی ہیں جو دنیا کے کسی اور خطے میں میسر نہیں ہیں۔

میں چلغوزے چھیل کر کھاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ سیتا کی بستی یہاں سے نظر نہیں آ رہی تھی لیکن بہت دُور نشیب میں ایک سرمئی سی بل کھاتی ہوئی لکیر چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ سڑک تھی یا کوئی دریا۔

بتدریج مغرب کی طرف جھکتا ہوا سورج ایک بلند پہاڑی چوٹی کے پیچھے غائب ہو گیا۔ دن کی روشنی دھندلکے میں بدلنے لگی۔ میں نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور بڑے بڑے پتھروں کی آڑ میں ایک ایسی جگہ منتخب کر لی جہاں تیز ہواؤں سے بچا جا سکتا تھا اور آرام سے رات گزاری جا سکتی تھی۔

شام کا دھندلکا آہستہ آہستہ رات کی تاریکی میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی خنکی بھی بڑھ رہی تھی۔ میں نے کمبل آدھا نیچے بچھا لیا اور آدھا اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور نیم دراز ہو کر آسمان کو گھورنے لگا۔ اندھیری رات میں ایسا روشن آسمان میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں جھلملاتے ہوئے ستارے عجیب منظر پیش کر رہے تھے مگر ان کی روشنی زمین تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

تیز ہوا سے درختوں اور جھاڑیوں کی سرسراہٹ سے فضا بڑی پُر ہول سی ہو گئی تھی۔ یہاں رات کی تاریکی میں کسی انسان کے آنے کا اندیشہ تو نہیں تھا لیکن کسی جنگلی جانور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے رائفل اپنے پہلو میں رکھ لی تھی تاکہ کسی ایسی صورتحال میں اُس پر فوراً ہاتھ ڈالا جا سکے۔

آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو گھورتے ہوئے میں ایک بار پھر سیتا کے بارے میں سوچنے لگا۔ اور پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے پاس ہو...... میرے ساتھ ہو...... میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اُس حسین تصور میں کھو کر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

○

تڑتڑاہٹ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں ہڑبڑا کر اُٹھ گیا......

وہ فائرنگ کی آواز تھی جیسے آٹومیٹک رائفل کا پورا برسٹ مارا گیا ہو۔ میں نے بڑی پھرتی سے کمبل ہٹا کر رائفل سنبھال لی اور پتھروں کی آڑ سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ فائرنگ کی آواز دوبارہ سنائی نہیں دی۔

سورج بہت دیر پہلے طلوع ہو چکا تھا۔ دُھوپ کی تپش بڑھ رہی تھی۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہونے لگی کہ میں اس قدر گہری نیند سویا رہا کہ دن چڑھے تک آنکھ نہیں کھل سکی۔

میں نے کمبل لپیٹ لیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر پتھروں کی آڑ سے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دُور دُور تک کسی ذی رُوح کا نام ونشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اور میرے لئے یہ اندازہ لگانا بھی دُشوار تھا کہ فائرنگ کی وہ آواز کس طرف سے آئی تھی؟ آیا بستی میں کوئی گڑبڑ ہوئی تھی یا کسی اور طرف۔

میں نے کمبل اُٹھایا اور اُس کھوہ میں اُترتا چلا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ سیتا ضرور آئے گی اور مجھے اس گپھاہ میں نہ پا کر پریشان ہوگی۔ غار میں ابھی تک اندھیرا تھا۔ میں ٹٹولتا ہوا اُس جگہ پہنچ گیا جہاں چادر اور بھارتی فوجیوں والی دونوں رائفلیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے قریب ہی وہ پوٹلی بھی پڑی تھی جس میں کل دوپہر کی بچی ہوئی روٹی تھی۔ میں نے پوٹلی کی طرف ہاتھ بڑھایا، پھر رُک گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد غار میں بھی اُوپر سے آنے والی روشنی سے مدھم سا اُجالا ہوگیا۔ میں کپڑے اُتار کر اُس چھوٹی سی ندی میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور گڑوی سے پانی اپنے اُوپر ڈالنے لگا۔

میں نے نہا کر کپڑے پہنے ہی تھے کہ ان گپھاؤں میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ آواز بھارتی بوٹوں کی نہیں ہلکے قدموں کی تھی۔ وہ سیتا ہی ہوسکتی تھی۔ مگر میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میں رائفل سنبھال کر ایک چٹانی ستون کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔

''شمروز...... شمروز...... کہاں ہوتم؟'' وہ سیتا کی آواز تھی۔ میں ستون کی آڑ سے نکل آیا۔

''میں یہاں ہوں سیتا...... اس طرف۔'' میں نے جواب دیا۔

ٹھیک ایک منٹ بعد سیتا چٹانی ستونوں کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ قریب آتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اُسے سہارا دے کر دیوار کے قریب کمبل پر بٹھا دیا۔

''کیا ہوا...... تم اتنی بدحواس کیوں ہو؟ کیا فوجیوں نے بستی پر حملہ کر دیا ہے؟ میں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی۔'' میں نے کہا۔

''انہوں نے چاچا قربان علی کو مار دیا......'' سیتا نے اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''چاچا قربان علی ہر جمعرات کی صبح اور شام کو حضوری بابا کے مزار پر جاتا تھا۔ آج صبح سویرے جب وہ وہاں گیا تو وہاں پہلے سے چھ ہندو فوجی موجود تھے۔ انہوں نے غار میں وہ چیزیں بھی تلاش کر لی ہیں جو ہم نے وہاں چھپائی تھیں۔ انہوں نے چٹان کی دوسری طرف پتھروں پر خون اور بھیجے کے دھبے بھی دیکھ لئے تھے۔ وہ چاچا قربان علی سے دو

گمشدہ فوجیوں کے بارے میں پوچھتے رہے، پھر اُسے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ فائرنگ کی آواز ہم نے بستی میں بھی سنی تھی......'' سیتا رُکے بغیر بولے جا رہی تھی۔

''ہندو سینک چاچا قربان علی کی لاش گھسیٹتے ہوئے بستی میں لے آئے۔ لاش بستی کے چوک پر ڈال کر دو فوجی چاچا قربان علی کے گھر میں گھس گئے اور نیلم کو بالوں سے پکڑ کر مارتے گھسیٹتے ہوئے چوک پر لے آئے۔ بستی کے ہندوؤں سے اُنہوں نے کچھ نہیں پوچھا۔ اُنہیں اپنے دو گمشدہ سینکوں کی موت کا یقین ہو چکا تھا اور اُن کا خیال ہے کہ اُنہیں کسی مسلمان نے ہی قتل کر کے لاشیں کسی کھڈ میں پھینک دی ہیں۔ چاچا قربان علی کا گھر اُس بستی کا واحد مسلمان گھر ہے۔ اُنہوں نے چاچا قربان علی کو تو مار دیا اور نیلم پر تشدد کرنے لگے۔ اُنہوں نے نیلم کو بستی والوں کے سامنے ننگا کر دیا اور اُسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے رہے۔ اُنہیں یہ بھی شبہ تھا کہ اس غار میں کوئی مجاہد پناہ لئے ہوئے تھا اور چاچا قربان علی اور اُس کی بیٹی اُس کی مدد کر رہے تھے۔ وہ نیلم سے اُس مجاہد کے بارے میں پوچھ رہے تھے مگر نیلم نے زبان نہیں کھولی۔''

''تم نے بستی سے بھاگ کر غلطی کی۔'' میں نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''بستی والے جانتے ہیں کہ تم اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہو۔ تم بستی سے بھاگ آئی ہو تو اُنہیں تم پر شبہ ہوسکتا ہے۔''

''شبہ ہی نہیں اُن سینکوں کو یقین آ چکا ہے کہ ان دو ہندو فوجیوں کے قتل میں میرا بھی ہاتھ ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' میں اُچھل پڑا۔

''کل جب اُن دو فوجیوں نے مجھے دبوچ رکھا تھا تو دھینگا مشتی میں میرے گلے کا لاکٹ زنجیر ٹوٹ کر وہاں گر گیا تھا۔ وہ لاکٹ اُنہیں وہیں سے ملا ہے جہاں آس پاس پتھروں پر خون بکھرا ہوا ہے۔ اُس لاکٹ کے اندر میرا نام کندہ ہے۔ وہ لوگ بستی میں مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ اگر میں اُن کے ہاتھ آ جاتی تو وہ میرا نیلم سے بھی برا حشر کرتے۔ میں بڑی مشکل سے بستی سے نکل کر اس طرف آئی ہوں۔ اب ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ہوسکتا ہے وہ لوگ ہمیں تلاش کرتے ہوئے اس طرف آ جائیں۔''

''بستی میں میرے بارے میں کوئی اور بھی جانتا ہے؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''کوئی نہیں......'' سیتا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''چاچا قربان علی ختم ہوگیا۔ نیلم اُن کے قبضے میں ہے اور ہوسکتا ہے وہ زیادہ دیر تک تشدد برداشت نہ کر سکے اور تمہارا نام بھی اُس کے منہ سے نکل جائے۔''

''کیا اُسے معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں......'' سیتا نے جواب دیا۔ ''اب دیر مت کرو۔ یہ کمبل ومبل یہیں چھوڑ دو اور اپنی رائفل اُٹھاؤ۔ ایک رائفل میں لے لیتی ہوں اور دوسری رائفل یہیں پڑی رہنے دو۔''

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہو گیا تھا کہ مجھے کچھ سوچنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میرے ذہن میں اس وقت صرف ایک ہی بات تھی۔ نیلم اُن کے قبضے میں تھی۔ وہ معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کب تک تشدد برداشت کر سکے گی؟

میں نے ایک رائفل اُٹھا کر سیتا کے حوالے کر دی۔ دوسری رائفل اُٹھا کر اُس کا میگزین نکالا اور رائفل پانی میں پھینک دی۔ کمبل، چادر اور پیتل کی گڑوی وہاں سے اُٹھا کر آگے پھینک دی جہاں کسی قدر اندھیرا تھا۔ سیتا اُوپر جانے والے راستے کی طرف لپکی۔ میں بھی اُس کے پیچھے ہی تھا۔

پوری طرح باہر آنے سے پہلے سیتا نے دہانے سے سر اُبھار کر باہر دیکھا اور پھر مجھے اشارہ کر دیا۔ میں بھی اُس کے ساتھ ہی اُس چٹان کے کھوکھلے سینے سے باہر نکل آیا۔ سیتا اشارہ کرتی ہوئی ایک طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں بھی اُس کے پیچھے ہی لپکا اور اسی وقت پہاڑیوں میں فائرنگ کی آواز گونج اُٹھی..... شاید آٹو میٹک رائفل کا پورا برسٹ مارا گیا تھا۔

میں رُک گیا اور پیچھے مُڑ کر دیکھنے لگا۔ آواز پہاڑیوں میں چاروں طرف گونجتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ فائرنگ بستی میں ہوئی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلم کا چہرہ گھوم گیا..... میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

سیتا مجھ سے چند گز آگے تھی۔ اُس نے مُڑ کر میرا ہاتھ پکڑا اور پتھروں میں ایک طرف دوڑنے لگی۔ ہم کچھ دُور بلندی پر جانے کے بعد دوسری طرف نشیب میں اُترنے لگے۔ دوڑتے دوڑتے سیتا کا سانس پھول گیا۔ مگر اُس پر اس قدر خوف طاری تھا کہ وہ سانس لینے کو بھی کہیں نہیں رُک رہی تھی۔ اور پھر دفعتہً وہ لڑکھڑا گئی۔ اُس جگہ چھوٹے چھوٹے پتھر تھے۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن اُن پتھروں پر اُس کے پیر نہیں جم سکے۔ وہ نیچے گری اور ڈھلان پر لڑھکتی چلی گئی.....

میں نے اُس کے پیچھے چھلانگ لگا دی اور چند گز لڑھکنے کے بعد اُسے پکڑ لیا۔ اُسے گرفت میں لینے کے بعد بھی ہم کتنی دُور تک لڑھکتے چلے گئے اور پھر میں نے ایک بڑے پتھر پر پیر جما دیئے۔ میں تو رُک گیا تھا مگر سیتا نیچے کی طرف پھسلتی گئی اور اُس کے ساتھ ہی میرے ہوش اُڑ گئے۔ اس پتھر سے آگے ڈھلان اچانک ہی ختم ہو گئی تھی..... اُس چٹان نے ایک عمودی دیوار کی شکل اختیار کر لی تھی اور تقریباً دس فٹ نیچے ایک اور مسطح ڈھلان تھی جو دُور تک چلی گئی تھی.....

سیتا کو میں نے کلائی سے پکڑ رکھا تھا اور وہ نیچے لٹکی چیخ رہی تھی۔ میں نے جس پتھر پر پیر جما رکھے تھے وہ اگرچہ کافی بڑا تھا مگر عین کنارے پر تھا اور میرے دباؤ کی وجہ سے آہستہ آہستہ اپنی جگہ چھوڑ رہا تھا۔

''سیتا.....!'' میں نے اُس کے خوفزدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بلندی زیادہ نہیں ہے۔ میں تمہارا ہاتھ چھوڑ رہا ہوں۔ اپنے آپ کو سنبھال کر بائیں طرف ہٹ جانا۔ یہ پتھر بھی جگہ چھوڑ

رہا ہے۔''

''نہیں نہیں..... مجھے مت.....''

''ہوشیار.....!'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی اور اس کے ساتھ ہی اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

سیتا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ وہ بھد سے نیچے گری۔ اُس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اُٹھ کر بائیں طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔

پتھر اپنی جگہ چھوڑ رہا تھا..... میں نے سینے کے بل اوندھے ہو کر اُوپر چند جھاڑیوں کو پکڑ لیا اور اپنے پیر کو آہستہ آہستہ پتھر سے ہٹانے لگا بلکہ پتھر خود ہی میرے پیروں سے ہٹنے لگا۔ پتھر اپنی جگہ سے اُکھڑ کر دس بارہ فٹ نیچے گرا اور گڑگڑاہٹ کی مہیب آواز پیدا کرتا ہوا نیچے والی ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ میرے پیروں کے قریب سے اور بھی لاتعداد پتھر اُکھڑ کر نیچے گرے تھے مگر میں جھاڑیوں کو پکڑے سینے کے بل زمین سے چپکا رہا۔ دو تین منٹ بعد میں نے اپنے آپ آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھایا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سیتا نیچے پتھروں پر بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھی اور چیخ چیخ کر مجھے محتاط رہنے کا مشورہ دے رہی تھی۔ اُوپر والی ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے ہم دونوں کی رائفلیں چند گز اُوپر گر گئی تھیں۔ میں محتاط انداز میں چلتا ہوا اُوپر پہنچ گیا اور دونوں رائفلیں اُٹھا کر آہستہ آہستہ پھسلتا ہوا نیچے آ گیا۔ کنارے پر پہنچ کر میں نے دونوں رائفلیں نیچے لٹکا کر سیتا کو پکڑا دیں اور پھر خود چھلانگ لگا کر نیچے آ گیا۔

اب ہمارے سامنے وسیع و عریض پتھریلا میدان تھا جو بتدریج نشیب کی طرف چلا گیا تھا۔ اس میدان کے اختتام پر اُونچے پہاڑ تھے۔ اس بنجر میدان میں پتھر اور چھوٹی چھوٹی خشک جھاڑیوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ البتہ بہت دُور درختوں کا ایک جھنڈ سا دکھائی دے رہا تھا۔

سیتا زمین پر بیٹھی اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں بھی اُس کے قریب بیٹھ گیا اور اس وقت میں نے پہلی مرتبہ اُس پر توجہ دی تو پتہ چلا کہ وہ ننگے پیر تھی۔ اُس نے اگرچہ شلوار قمیص پہن رکھی تھی لیکن چنری نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ پتھروں پر ننگے پیر دوڑتے ہوئے اُس کے پیروں کے تلوے سرخ ہو گئے تھے۔

''تمہارے سینڈل شاید راستے میں کہیں گر گئے ہیں۔'' میں نے اُس کے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں.....'' سیتا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں تو گھر سے ہی ننگے پیر بھاگی تھی اور دوپٹہ بھی نہیں لے سکی تھی۔ اگر چپل وغیرہ کی تلاش میں رہتی تو پکڑی جاتی کیونکہ جس وقت میں مکان کے پچھلے دروازے سے نکل رہی تھی اُس وقت ایک فوجی سامنے والے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ میں گلیوں میں چھپتی چھپاتی بستی سے باہر آ گئی اور اس طرف درختوں میں گھس کر دوڑتی ہوئی جھیل کی طرف آ گئی۔''

''اُنہیں یہ پتہ چل گیا ہو گا کہ تم گاؤں کے مکھیا کی بھانجی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''کیا وہ

تمہارے ماما کو نہیں پکڑیں گے؟''

''ماما کل شام سے ذرا پہلے کسی کام سے ڈوڈا چلا گیا تھا۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''اُسے اناج کے آڑھتی سے سال بھر کا حساب کرنا ہے۔ وہ اس وقت تو ڈوڈا ہی میں ہوگا مگر یہ سینک اُسے چھوڑیں گے نہیں۔ ہوسکتا ہے ڈوڈا ہی سے اُسے گرفتار کرلیا جائے۔ اُس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو گا مجھے افسوس ہوگا۔ مگر سب سے زیادہ افسوس تو مجھے چاچا قربان علی اور نیلم کا ہے...... چاچا قربان علی بے گناہ مارا گیا اور بیچاری نیلم......اُسے میں نے جس حال میں دیکھا ہے وہ سوچ کر اب بھی میری آتما کانپ اُٹھتی ہے۔''

''جب ہم ان گپھاؤں سے نکل کر بھاگے تھے تو اُس وقت بھی فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی......'' میں نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے اُسے بھی اُس کے باپ کی طرح گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا ہو۔''

''میرا خیال ہے نہیں......'' سیتا بولی۔ ''تم ان ہندو سینکوں کو نہیں جانتے۔ نیلم جوان اور حسین لڑکی ہے۔ وہ لوگ پہلے خونخوار بھیڑیوں کی طرح اُسے بھنبھوڑیں گے، اُس کی بوٹیاں نوچیں گے اور اُس وقت تک اُسے روندتے رہیں گے جب تک اُس کی آتما اُس کے شریر کا ساتھ نہیں چھوڑ دیتی۔''

میری بہن کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا...... درندہ صفت ہندو فوجی سوپور پر حملے کے وقت اُسے اُٹھا کر لے گئے تھے اور پھر وہ تین چار مہینوں بعد مجھے ہندواڑہ میں ایک سڑک پر اس طرح پڑی ہوئی ملی تھی کہ اُس کی زندگی کا سارا رس نچوڑ لیا گیا تھا...... اُس کی رُوح کو بری طرح کچل دیا گیا تھا...... صرف اپنی بہن کیا میں نے وادی کی اور بھی کئی مسلمان لڑکیوں کو اس حال میں دیکھا تھا۔ اُنہیں پامال کر کے اُن کی رُوح کو کچل کر اس طرح پھینک دیا جاتا تھا کہ وہ کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہتی تھیں۔ اُنہیں یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ کون ہیں، کہاں ہیں؟ دوسروں کو تو کیا وہ اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکتی تھیں۔

نیلم بھی جوان تھی اور بے حد حسین تھی۔ شومئی قسمت سے وہ ان بھیڑیوں کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ سیتا ٹھیک ہی تو کہتی تھی کہ وہ اُسے گولیوں سے چھلنی کر کے ضائع نہیں کریں گے۔ پہلے اُس کے خوبصورت جسم سے اُس کی زندگی ایک ایک قطرہ کر کے نچوڑ لی جائے گی اور پھر اُسے بھی زینب کی طرح کہیں پھینک دیا جائے گا......

''لیکن فائرنگ کی وہ آواز......؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے سیتا کی طرف دیکھا۔

''چاچا قربان علی بہت اچھا آدمی تھا......'' سیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''بستی کے کسی شخص کو اُس سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی۔ سب ہی لوگ اُس کی بہت عزت کرتے تھے۔ نیلم کو بھی سب لوگ بہت چاہتے تھے۔ ہر گھر میں اُس کا اس طرح آنا جانا تھا جیسے وہ اُس کا اپنا ہی گھر ہو۔ ہوسکتا ہے......'' وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''ہوسکتا ہے اُس کی

بے بسی اور فوجیوں کے ہاتھوں اُس کی ذلت اور رسوائی دیکھ کر بستی ہی کے کسی آدمی کی غیرت جاگ اُٹھی ہو اور وہ اُسے بچانے کے لئے آگے بڑھا ہو تو اُن وحشیوں نے اُسے گولیوں سے بھون ڈالا ہو......''

''ہوسکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو۔'' میں نے سر ہلا دیا۔

چند لمحے خاموشی میں گزر گئے اور پھر سیتا اپنا گلا سہلاتے ہوئے بولی۔

''مجھے پیاس لگ رہی ہے۔''

میں ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دُھوپ تیز ہوگئی تھی۔ پتھر تپ گئے تھے۔ آس پاس سائے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ میری نظریں درختوں کے اُس جھنڈ پر جم گئیں جو وہاں سے کم از کم نصف میل دُور تھا۔ جہاں درخت یا کچھ سبزہ ہو وہاں پانی لازمی ہونا چاہئے۔

''درختوں کا وہ جھنڈ دیکھ رہی ہو؟'' میں نے اُس طرف اشارہ کیا۔ ''وہاں شاید پانی مل جائے۔ ہوسکتا ہے کوئی چشمہ ہو یا اُس طرف کوئی ندی ہو۔ وہاں تک چل سکو گی؟ دُھوپ بھی تیز ہورہی ہے۔ کچھ دیر درختوں کے سائے میں آرام بھی کرلیں گے۔''

''چلو......'' سیتا اُٹھ کر کھڑی ہوگئی اُس نے اپنی رائفل کندھے پر لٹکا لی تھی۔

میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن چند گز چلنے کے بعد ہی سیتا بار بار کراہنے لگی۔ اُس نے جوش اور موت کے خوف سے ننگے پیر پتھروں پر دوڑتے ہوئے ایک طویل فاصلہ طے کرلیا تھا۔ لیکن اب جبکہ ہم خطرے کی حدود سے نکل چکے تھے وہ ہمت ہار بیٹھی تھی۔ پیروں میں پتھر چبھتے تو وہ بے اختیار کراہ اُٹھتی اور پھر گرمی کا احساس بھی اب ہونے لگا تھا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی اور پتھر بھی تپ کر آگ اُگل رہے تھے۔ میری قمیض بھی پسینے سے تر ہورہی تھی۔ پسینے کی دھاریں کیچوؤں کی طرح گردن پر قمیض کے نیچے کمر پر رینگ رہی تھیں۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ دُھوپ کی تپش سے اُس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا اور گردن پر پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ نصف میل کا یہ فاصلہ طے نہیں کر سکے گی۔

''ایک منٹ...... رُک جاؤ!'' میں نے کہا اور زمین پر بیٹھ کر اپنے جوگرز اُتارنے لگا۔ یہ جوگرز میں بہت عرصہ سے استعمال کررہا تھا۔

''لو......تم میرے جوتے پہن لو! چلنے میں آسانی رہے گی۔'' میں نے کہا۔ سیتا نے پہلے تو انکار کیا پھر جوتے پہن لئے۔ جوتے پہنتے ہوئے بھی وہ بے اختیار کراہ اُٹھی تھی۔ میرے یہ جوتے اُس کے پیروں میں اگرچہ خاصے بڑے تھے مگر وہ پیر گھسٹ گھسٹ کر چلتی رہی۔

اگر میں سیتا کو اپنے جوتے نہ پہناتا تو وہ نصف میل کا یہ فاصلہ کبھی بھی طے نہیں کر سکتی تھی۔ اب میں ننگے پیر تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں پتھروں پر نہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر چل رہا ہوں...... نوکیلے پتھر چبھتے تو میں بے اختیار کراہ اُٹھتا۔

OOO

خدا خدا کر کے کسی نہ کسی طرح درختوں کے جھنڈ تک پہنچ گئے اور اس کے ساتھ ہی ہم دونوں کے چہروں پر رونق سی آ گئی......

اُس جگہ سے آگے نشیب تھا۔ دُور سے تو چند ہی درخت نظر آ رہے تھے لیکن آگے نشیب میں ایک جنگل پھیلا ہوا تھا۔ درخت اگرچہ چھدرے تھے لیکن دُور دُور تک نظر آ رہے تھے اور اُن میں زیادہ تر انجیر کے درخت تھے اور بعض درخت تو پھل سے لدے ہوئے تھے۔

جنوب کی طرف سے آنے والا ایک برساتی نالا اُس جنگل میں بل کھاتا ہوا کہیں غائب ہو گیا تھا۔ برسات کے موسم میں تو اس نالے میں یقیناً سیلابی کیفیت رہتی ہو گی مگر ان دنوں وہ صورتحال نہیں تھی۔ بہت کم پانی تھا جو نالے کے عین وسط میں بہہ رہا تھا۔

سیتا نالے میں اُتر کر گری سی گئی اور کسی جانور کی طرح منہ ڈال کر پانی پینے لگی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔

میرا حلق بھی پیاس کی شدت سے خشک ہو رہا تھا۔ میں نے بھی سیر ہو کر پانی پیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے پانی سر پر ڈالنے لگا۔ گرمی سے میرا دماغ پگھلا جا رہا تھا۔ ابھی دن کا ابتدائی حصہ تھا۔ میرے خیال میں گیارہ بجے ہوں گے مگر گرمی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے اپنے پیروں کو دیکھا، گرم تپتے ہوئے پتھروں پر چلنے سے تلوے بالکل سرخ ہو رہے تھے۔ میں نے پیر پانی میں ڈال دیئے۔ سیتا نے بھی جوتے اُتار کر پھینک دیئے تھے اور وہ بھی پانی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔

ہم جس جگہ بیٹھے ہوئے تھے وہاں دُھوپ تھی۔ میں نالے کے بہاؤ کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید کوئی ایسی جگہ ہو جہاں یہ نالہ درختوں کے سائے سے گزرتا ہو۔ تقریباً بیس گز آگے ایسی جگہ نظر آ گئی۔ میں نے گردن گھما کر سیتا کی طرف دیکھا تو میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

سیتا نے قمیض اُتار دی تھی اور اُس کا پنڈا دُھوپ میں کندن کی طرح چمک رہا تھا...... میں نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور قریب پڑی ہوئی دونوں رائفلیں اُٹھاتے ہوئے بولا۔ ''دُھوپ بہت تیز ہے...... اُس طرف چلو! وہاں سایہ ہے۔''

سیتا نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا اور اُٹھ کر لڑکھڑاتی ہوئی سائے والی جگہ کی طرف چل پڑی۔ اُس نے اپنی قمیض اور جوتے بھی وہیں چھوڑ دیئے جو مجھے اُٹھانے پڑے۔

سائے میں جا کر سیتا پھر پانی میں پیر ڈال کر بیٹھ گئی۔ میں نے رائفلیں اور جوتے ایک

طرف رکھ دیئے اور خود بھی شرٹ اُتار دی۔ پسینہ دھاروں کی صورت میں جسم پر بہہ رہا تھا۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا اُس کے کندن جیسے بدن پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

میں اپنا دھیان بٹانے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ریش، کیکٹس اور انجیر کے درخت ایک دوسرے سے فاصلے پر تھے اور دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ کیکٹس میں تو ظاہر ہے کوئی پھل نہیں لگتا۔ ریش بھی ایسا ہی درخت تھا اُس میں کوئی پھل نہیں آتا لیکن یہ اُونچا اور سایہ دار درخت ہوتا ہے اور اس کی لکڑی عام طور پر جلانے کے کام ہی آتی ہے۔ انجیر کا درخت زیادہ اُونچا تو نہیں ہوتا لیکن یہ پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اس کا پھل زمین پر کھڑے کھڑے آسانی سے توڑا جا سکتا ہے۔

ہم ریش کے درخت کے گھنے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پسینے میں بھیگے ہوئے جسم کو چھوتی ہوئی ہوا بہت بھلی لگ رہی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ہوا بھی گرم ہوتی چلی جائے گی۔

میں اُٹھ کر انجیر کے ایک درخت کی طرف آ گیا۔ شاخیں پھل سے لدی ہوئی تھیں۔ پھل میں بہت ہلکا سا گلابی پن آ گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ پھل پک رہا تھا۔ میں نے ایک انجیر توڑ کر منہ میں ڈالی۔ انجیر میٹھی اور رس سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے نیچے والی شاخوں سے خوب پکی ہوئی کئی انجیریں توڑ لیں اور سیتا کے قریب آ گیا۔ انجیریں پانی میں دھو کر پتھروں پر رکھ دیں۔

''کھاؤ...... بہت مزیدار ہیں۔'' میں نے ایک انجیر اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دی۔

سیتا نے میری طرف دیکھا اور انجیر لے کر کھانے لگی۔ میں بھی ایک انجیر کھاتے ہوئے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے جسم کے بالائی حصے پر مختصر سا انڈر گارمنٹ تھا جس سے سینے کے گلابی اُبھار قیامت خیز منظر پیش کر رہے تھے۔ میں اُس کی طرف سے نظریں چرانے کی کوشش کرتا رہا۔

پیٹ بھرنے کے بعد سیتا ندی کے کنارے چھوٹے چھوٹے پتھروں پر لیٹ گئی۔ اُس وقت میری نظریں اُس کے پیروں کی طرف اُٹھ گئیں اور میں کانپ اُٹھا۔ پیروں کے تلوے بالکل سرخ ہو رہے تھے جیسے ابھی خون بہہ نکلے گا۔

وہ شہر کی رہنے والی دولت مند گھرانے کی فرد تھی۔ بڑے ناز و نعم میں پلی تھی۔ یہاں تو وہ اپنے ماما کے پاس سیر و تفریح کے لئے آئی تھی لیکن اس مصیبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ اُس نے زندگی میں کبھی کوئی مشقت کا کام نہیں کیا ہو گا لیکن یہاں اپنی جان بچانے کے لئے اُسے ننگے پیر میلوں دُور تک تپتے ہوئے پتھروں پر دوڑنا پڑا تھا۔ اُس کے پیروں کو دیکھ کر میں کہہ سکتا تھا کہ اگر کچھ دُور اور ننگے پیر پتھروں پر چلنا پڑتا تو اُس کے تلوؤں سے خون بہنا شروع ہو جاتا۔

میں نے اپنی اور سیتا کی پسینے میں بھیگی ہوئی قمیض دھو کر دُھوپ میں ڈال دی اور سیتا سے کچھ فاصلے پر لیٹ گیا۔ دوپہر ہو چکی تھی اور ہوا میں بھی حدت پیدا ہو رہی تھی۔ یہاں اگرچہ

درختوں کا سایہ میسر تھا مگر چاروں طرف بنجر، خشک اور تپتے ہوئے پہاڑ تھے جن کی وجہ سے ہوا بھی گرم ہو رہی تھی۔ ایسی صورتحال میں سفر آگے جاری رکھنا ناممکن نہیں تو انتہائی دُشوار ضرور تھا۔ اور پھر ننگے پیر ہونے کی وجہ سے معاملہ کچھ اور بھی سنگین ہو گیا تھا۔ سیتا کے لئے تو اب ننگے پیر چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لئے میں نے اپنے جوتے اُسے دے دیئے تھے۔

ہم پوری دوپہر ندی کے کنارے درختوں کے سائے میں پڑے رہے۔ سہ پہر کے قریب دُھوپ میں تپش کم ہوئی تو میں نے وہاں سے روانگی کا فیصلہ کر لیا۔ سیتا کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم اس وقت کہاں ہیں؟ اور میں بھی نہیں جانتا تھا کہ ہمیں کس طرف جانا ہے۔ کوئی باقاعدہ راستہ تو تھا نہیں۔ ہم شتر بے مہار کی طرح منہ اُٹھائے درختوں میں ایک طرف چلتے رہے۔

میں نے کچھ انجیریں توڑ کر رکھ لی تھیں لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ زیادہ انجیریں کھانے سے پیٹ میں گڑبڑ ہو سکتی ہے۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ سایہ دار درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اور اب کہیں کہیں کیکٹس کے پودے نظر آ رہے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیل گیا۔ ہم رُک رُک کر چلتے رہے۔ سیتا نڈھال ہو رہی تھی۔ اُس کے پیروں میں تکلف بڑھ گئی تھی جس سے چلنے میں اور بھی دُشواری پیش آ رہی تھی۔

آدھی رات کے قریب ہم ایک جنگل میں پہنچ گئے جو زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس جنگل سے باہر نکلتے ہی ہم ٹھٹھک کر رُک گئے...... سامنے ایک جگہ کسی قدر بلندی پر مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر میں اُس ٹمٹماتی ہوئی روشنی کی طرف دیکھنے لگا۔

○

وہ غالباً ایک ہی مکان تھا جس کا ہیولہ تاریکی میں نظر آ رہا تھا...... اور وہ مدھم سی زرد روشنی اُس مکان کی کھڑکی سے جھلک رہی تھی۔ اُس کمرے کے اندر لالٹین یا لیمپ روشن تھا۔ میں نے گردن گھما کر سیتا کی طرف دیکھا۔

''وہ شاید کوئی فارم ہاؤس ہے۔'' میں نے مدھم لہجے میں کہا۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''اس طرف بھی ایک مکان کا ہیولہ دکھائی دے رہا ہے۔ وہ اُس طرف......'' اُس نے اشارہ کیا۔ پہلے مکان سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ایک اور مکان کا ہیولہ دکھائی دے رہا تھا لیکن وہاں روشنی نہیں تھی۔ وہ مکان گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''کیا خیال ہے......'' میں نے کہا۔ ''آگے بڑھا جائے؟''

''رسک تو ہے۔'' سیتا بولی۔ ''اگر یہ فارم ہاؤس کسی مسلمان کا ہوا تو ہمیں پناہ مل سکتی ہے۔ پورے جموں کشمیر میں مسلمان مجاہدین کو اپنے گھروں میں پناہ دے دیتے ہیں اور ان کی بھرپور

مدد کرتے ہیں۔ لیکن اگر یہ ہندو گھرانہ ہوا تو پھنس جائیں گے۔''

''لیکن...... تم تو ہندو ہو۔ تمہیں تو کسی بھی ہندو گھرانے میں پناہ مل سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ہندو عورتیں اس طرح رائفلیں اُٹھائے رات کی تاریکی میں پہاڑوں میں نہیں بھٹکتیں۔''

سیتا نے جواب دیا۔ ''ہم کیا بہانہ کریں گے؟''

''ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم اپنے بھگوان کو یاد کرو اور میں اپنے اللہ کو یاد کرتا ہوں اور ہم آگے چلتے ہیں۔ اگر ہندو گھرانہ ہوا تو تم بات کو سنبھالنے کی کوشش کرنا اور بتانا کہ مسلمان مجاہدین نے ہماری بستی پر حملہ کر دیا تھا اور ہم بڑی مشکل سے اپنی جانیں بچا کر بھاگے ہیں اور رات بھر پہاڑوں میں بھٹکنے کے بعد اس طرف آ نکلے ہیں۔ اور اگر یہ کسی مسلمان کا گھر ہوا تو میں معاملے کو سنبھال لوں گا۔''

''گویا ففٹی ففٹی۔'' سیتا بولی۔ ''ٹھیک ہے...... ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن ذرا رُک جاؤ...... تھکن سے بری حالت ہو رہی ہے۔ چند منٹ یہاں رُک کر دم لے لو۔ پھر آگے بڑھتے ہیں۔''

وہ زمین پر بیٹھ گئی اور میں بھی اُس کے قریب بیٹھ کر سامنے والے مکان کی طرف دیکھنے لگا جس کی ایک کھڑکی سے روشنی جھلک رہی تھی۔ اُس کے آس پاس صرف ایک مکان کا ہیولہ دکھائی دے رہا تھا جس کی نشاندہی سیتا نے کی تھی۔ اس کے علاوہ اور کوئی مکان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ قرب و جوار میں درختوں کے ہیولے ہوا سے جھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

ہم تقریباً دس منٹ تک وہاں بیٹھے رہے اور پھر اُٹھ کر اُس مکان کی طرف چلنے لگے جس کی ایک کھڑکی سے روشنی جھلک رہی تھی۔ وہ مکان تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر تھا۔ ہم محتاط انداز میں آگے بڑھتے رہے۔ ابھی ہم مکان سے دُور ہی تھے کہ ایک کتا بھونکتا ہوا ہماری طرف لپکا...... سیتا چیخ کر میرے ساتھ لپٹ گئی۔ اس اچانک افتاد پر میں بھی بدحواس ہو گیا تھا۔ میں نے سیتا کو بڑی مشکل سے اپنے آپ سے الگ کیا اور کتے کو ہشکارنے لگا جو ہم سے چند گز کے فاصلے پر اُچھل اُچھل کر بھونک رہا تھا۔ میں نے زمین پر ٹٹول کر ایک پتھر اُٹھایا اور کتے کی طرف اُچھال دیا۔ کتا پیچھے ہٹا اور چند سیکنڈ بعد دوبارہ ہماری طرف لپکا۔

''گولی مار دو اسے۔'' سیتا خوفزدہ لہجے میں بولی۔ وہ ڈر کر میرے پیچھے ہو گئی تھی۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا......'' میں نے کہا۔ ''اگر اس کتے کو گولی مار دی گئی تو معاملہ بگڑ جائے گا۔''

''اے...... کون ہے اِدھر......'' مکان کی طرف سے ایک گونجتی ہوئی بھاری آواز سنائی دی۔

''مسافر ہیں بھائی...... اس کتے کو پیچھے ہٹاؤ!'' میں نے جواب دیا۔

''اپنی جگہ پر رُک جاؤ...... ورنہ گولی مار دوں گا۔'' وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔

میں نے سیتا کو اشارہ کیا۔ اس مرتبہ اُس نے چیختے ہوئے کہا۔

''ہم چور یا ڈاکو نہیں ہیں۔ مصیبت کے مارے ہوئے ہیں۔ راستہ بھٹک کر اس طرف آ گئے

ہیں۔اس کتے کو یہاں سے ہٹاؤ!''

میری توقع کے عین مطابق نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ایک عورت کی آواز سن کر اُس شخص کو شاید کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔ وہ کتے کو ہشکارنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی قدموں کی ہلکی سی آواز بھی سنائی دینے لگی۔اور پھر وہ آدمی تاریکی سے نکل کر سامنے آ گیا۔ میں صرف اُس کا ہیولہ ہی دیکھ سکتا تھا۔وہ قریب پہنچا تو اُس کے ہاتھوں میں ایک بندوق بھی نظر آ گئی۔

''کون ہو تم لوگ اور اس وقت......''

''ہم مصیبت کے مارے ہوئے ہیں۔'' سیتا نے اُس کی بات کاٹ دی۔''کیا تم ہمیں آگے آنے کو نہیں کہو گے؟ ہم طویل فاصلہ طے کر کے آئے ہیں اور تھکن اور بھوک سے ہماری بہت بری حالت ہو رہی ہے۔''

وہ شخص چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔''ٹھیک ہے...... آ جاؤ!''

ہمیں آگے بڑھتے دیکھ کر کتا غرانے لگا۔اُس شخص نے کتے کو ڈانٹ دیا۔اُسے ٹھوکر مارنے کے لئے پیر اُٹھاتے دیکھ کر کتا ایک طرف بھاگ گیا۔ اسی دوران ایک اور آدمی لالٹین لئے برآمدے میں آ گیا۔ لالٹین کی روشنی میں اُس شخص کو دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ وہ مسلمان تھا۔ سفید نوکدار چھوٹی داڑھی اور سر پر دھاگے کی بنی ہوئی گول ٹوپی...... اُس کے چہرے اور سفید بالوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پچاس سال سے اوپر ہی کا ہے۔ جو شخص لالٹین لے کر آیا تھا وہ کلین شیو تھا اور اُس کی عمر کا اندازہ تیس بتیس سال تک کا لگایا جا سکتا تھا۔

ہمارے ہاتھوں میں رائفلیں دیکھ کر سفید داڑھی والے کی آنکھوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی حالانکہ اُس کے ہاتھ میں ڈبل بیرل بندوق تھی۔لیکن وہ اس بات کو بھی سمجھتا تھا کہ دو سب مشین گنوں کے سامنے اس بندوق کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

''آپ گھبرایئے مت......'' میں نے اُس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے کہا۔''ہم آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ہم تو خود پناہ کی تلاش میں ہیں۔آج کی رات گزار کر ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''مجاہدین سے مجھے کوئی خوف نہیں آتا۔ان کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔آؤ...... اندر آ جاؤ!'' بوڑھے نے کہا۔

وہ ہمیں ایک کمرے میں لے آئے۔اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد گھر کے دوسرے افراد بھی وہاں جمع ہو گئے۔ ایک بوڑھی عورت تھی۔ دوسری کی عمر ستائیس اٹھائیس سال رہی ہو گی۔اور ایک لڑکی تھی سولہ سترہ سال کی جبکہ گیارہ بارہ سال کی عمر کا ایک لڑکا بھی دروازے میں کھڑا جھانک رہا تھا۔

خدا بخش نامی سفید داڑھی والا شخص اُس کنبے کا سربراہ تھا۔کلین شیو والا اُس کا بیٹا اور دوسری عورت اُس کی بہو تھی۔نوجوان لڑکی اُس کی بیٹی اور نوعمر لڑکا بیٹا تھا۔

''آرام سے بیٹھ جاؤ...... یہاں تم لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' بوڑھے خدا بخش نے کہا اور پھر اپنی بہو کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''یہ بہت تھکے ہوئے ہیں اور انہیں بھوک بھی لگ رہی ہو گی۔ ان کے کھانے کا کچھ بندوبست کرو۔''

بہو اور خدا بخش کی بیٹی فوراً ہی کمرے سے چلی گئیں۔خدا بخش کی بیوی سیتا کے پاس بیٹھ گئی اور خدا بخش میرے ساتھ سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔اُس کا بڑا بیٹا امیر دین دوسرے لڑکے کے ساتھ دروازے میں کھڑا تھا۔

''تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ تم لوگ بہت دُور سے سفر کر کے آ رہے ہو۔'' خدا بخش باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔''کون ہو تم لوگ...... اور کہاں سے آئے ہو؟''

''میرا نام شمروز ہے...... اور یہ سیتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''سیتا......؟'' خدا بخش چونک گیا۔''اوہ...... تو تم شمروز ہو۔اس کا مطلب ہے کہ تم لوگ اتم نگر سے آئے ہو۔''

اس مرتبہ چونکنے کی باری میری تھی۔اتم نگر سیتا کی بستی کا نام تھا۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔اُس کے چہرے کے تاثرات بھی بدل گئے تھے۔

''وادی کے ایک سرے پر کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو اس کی خبر آناً فاناً دوسرے سرے تک پہنچ جاتی ہے۔'' خدا بخش نے کہا۔''ہمارا یہ فارم ہاؤس اگرچہ کسی آبادی سے کم از کم پانچ کوس دُور ہے لیکن کل صبح سویرے اتم نگر میں جو کچھ ہوا اس کی خبر ہم تک پہنچ چکی ہے۔شمروز نام کا ایک مجاہد اور بستی کے مکھیا کی بھانجی بستی میں قتل و غارت مچا کر بھاگے ہیں۔ پہاڑوں میں اور ڈوڈا کی طرف انہیں تلاش کیا جا رہا ہے۔تم لوگ ٹھیک جگہ پر پہنچ گئے ہو۔ یہاں فی الحال تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مجھے تو شمروز جیسے مجاہد کو اپنے غریب خانے میں پا کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' اُس نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر میری پیشانی پر بوسہ دیا اور دوبارہ اُس جگہ بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر میں اُس کے دِلی جذبات کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

''اور یہ لڑکی......'' وہ سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔''اس کا کردار قابلِ تعریف ہے۔ اس نے حق کو پہچان لیا ہے۔ اس نے تمہاری مدد کی...... اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر تمہیں وہاں سے نکال کر لے آئی۔ خدا اسے اس نیکی کا اجر ضرور دے گا۔''

خدا بخش کی بیوی کنیز فاطمہ بھی سیتا کے ساتھ بہت محبت اور ہمدردی سے پیش آئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اس گھر میں بڑی پذیرائی ملی تھی۔تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہمارے لئے چاول تیار ہو گئے۔ سالن پہلے ہی سے موجود تھا۔ ہم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سیتا تو خواتین کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور مجھے خدا بخش اپنے کمرے میں لے آیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس کی کھڑکی سے روشنی ہم نے دُور سے دیکھی تھی۔

رات کو اگرچہ ہم دیر تک جاگتے رہے تھے لیکن صبح میری آنکھ بھی جلدی ہی کھل گئی۔ دوسرے مکان میں خدا بخش کا چھوٹا بھائی اللہ بخش اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ اُسے رات کو ہمارے آنے کی خبر نہیں ہوسکی تھی لیکن اس وقت وہ بیوی بچوں کے ساتھ یہاں موجود تھا۔

یہ ان کی پشتی زمین تھی جہاں زیادہ تر دھان کی کاشت ہوتی تھی۔ یہ دونوں بھائی اس اراضی کو سنبھالے ہوئے تھے۔ رات کو جسے ہم جنگل سمجھے تھے وہ دراصل انجیر کا بہت بڑا باغ تھا۔ درختوں کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی تھیں اور پھل کچھ عرصہ میں پکنے ہی والا تھا۔ دھان کی فصل بھی تیار ہونے والی تھی۔ فضا میں ہر طرف دھان کی مہک رچی ہوئی تھی۔ خدا بخش نے مجھے اپنے بیٹے امیر دین کے کپڑے دے دیئے اور میں نہانے کے لئے چشمے پر چلا گیا۔ میں نے نہا کر کپڑے بدلے اور اپنے کپڑے دھو کر دُھوپ میں ڈال دیئے۔

جب میں واپس آیا تو سیتا بھی بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے امیر دین کی بیوی کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

ناشتے کے بعد میں اور خدا بخش گھر کے سامنے درختوں کے نیچے بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ خدا بخش کشمیری حقہ گڑگڑاتے ہوئے باتیں بھی کر رہا تھا۔

یہ انکشاف میرے لئے خاصا سنسنی خیز ثابت ہوا کہ خدا بخش کا یہ فارم ہاؤس رام نگر نامی ایک بڑے قصبے سے پانچ چھ کوس کے فاصے پر ہے۔ رام نگر ضلع جموں میں واقع تھا اور جموں شہر وہاں سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر تھا۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ میں سونا مارگ کے قریب فوجی قافلے کو تباہ کرنے کے بعد انگوری کے ساتھ کسی نہ کسی طرح پہلگام کے قریب ایک فارم ہاؤس میں پہنچ گیا تھا جہاں بھارتی فوج کے ایک دستے نے چھاپہ مارا۔ اس چھاپہ مار کارروائی میں انگوری شہید ہو گئی اور میں زخمی ہو کر رات کی تاریکی میں وہاں سے بھاگ نکلا اور تین دن تک پہاڑوں میں بھٹکتا ہوا ایک جگہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔

سیتا میرے لئے فرشتہ رحمت ثابت ہوئی۔ اُس نے مجھے اُٹھا کر ایک غار میں پہنچا دیا۔ ہوش میں آنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ غار ڈوڈا شہر سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ ہندو ہونے کے باوجود سیتا نے میری مدد کی اور بستی میں رہنے والے واحد مسلمان چاچا قربان علی سے بڑی رازداری سے میرا علاج کروایا۔ میں دو مہینوں تک اس غار میں رہا۔ میری موجودگی سے صرف تین افراد واقف تھے۔ سیتا، چاچا قربان علی اور اُس کی بیٹی نیلم۔ لیکن سیتا مجھ میں سب سے زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ اپنوں ہی سے چوٹ کھائے ہوئے تھی۔ وہ میری دیکھ بھال کرتی رہی۔ اور پھر دو ہندو فوجیوں نے سیتا کو بے آبرو کرنے کی کوشش کی۔ میں نے نہ صرف سیتا کو ان سے بچایا بلکہ ایک فوجی بھی میرے ہاتھوں مارا گیا دوسرے کو سیتا نے سینکڑوں

فٹ گہرے کھڈ میں دھکیل دیا۔

بھارتی فوجیوں کی ایک پارٹی اپنے گمشدہ دو فوجیوں کی تلاش میں اس طرف نکل آئی۔ انہوں نے پتھروں پر خون کے دھبے دیکھ لئے اور پھر اتفاق سے چاچا قربان علی ان کے ہاتھ لگ گیا جسے انہوں نے گولیوں سے چھلنی کر دیا اور بستی میں پہنچ کر نیلم کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ اُن فوجیوں کو خون آلود پتھروں کے قریب سے ایک لاکٹ بھی ملا تھا جس پر سیتا کا نام لکھا ہوا تھا۔ اُنہیں سیتا کی تلاش تھی اور سیتا بستی سے بھاگ کر پہاڑی گپھاؤں میں میرے پاس آ گئی اور ہم دونوں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

سیتا نے میری خاطر اپنی زندگی خطرے میں ڈال رکھی تھی اور میرے ساتھ چلچلاتی دُھوپ میں انگاروں کی طرح تپتے ہوئے پتھروں پر دوڑتے ہوئے اُس کے پیر چھلنی ہو گئے تھے۔ مجھے سیتا کی نیت پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ اُس نے مجھے موت کے منہ سے بچایا تھا۔ اگر وہ مجھے بے ہوشی کی حالت میں اُٹھا کر چاچا قربان علی سے میرا علاج نہ کرواتی تو شاید میں وہیں پڑے پڑے ختم ہو چکا ہوتا۔ یا یہ بھی ہوتا کہ وہ بستی والوں کو میرے بارے میں اطلاع دے دیتی اور مجھے پولیس یا فوج کے حوالے کر دیا جاتا اور اس طرح میری کہانی ختم ہو چکی ہوتی۔ لیکن سیتا نے مجھ سے ہمدردی کی اور مجھے موت کے منہ سے بچا کر یہاں لے آئی۔ سیتا کی نیت پر شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن اب میں محسوس کرنے لگا تھا کہ سیتا غیر محسوس انداز میں مجھے میرے محاذ سے دُور لے جا رہی تھی۔ اس میں اُس کی نیت یا ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ تو میری ہمدردی کر رہی تھی۔ مجھے میرے دشمنوں سے بچانا چاہتی تھی۔

جموں اور کشمیر اگرچہ ایک ہی خطہ تھا۔ پچھلی نصف صدی سے بھارتی سامراج کے ظلم و ستم کا شکار ہو رہا تھا۔ آزادی کی تحریک اس خطے میں بھی شروع ہی سے چل رہی تھی۔ اس میں اُتار چڑھاؤ آتے رہتے تھے۔ کبھی لگتا تھا کہ طاغوتی قوتیں غالب آ رہی ہیں اور کبھی لگتا مٹھی بھر مجاہدین طاقتور بھارتی فوج کو نیست و نابود کر دیں گے۔ لیکن میرے خیال میں فیصلہ کن مرحلہ ابھی نہیں آیا تھا۔

ایک ہی خطہ ہونے کے باوجود جموں اور کشمیر موسمی، معاشرتی، جغرافیائی اور تہذیبی لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ کشمیر سرسبز تھا۔ وہاں کے پہاڑ جنگلوں سے لدے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ جھیلیں تھیں۔ دھرتی سبز مخملی گھاس اور رنگ برنگے پھولوں کی چادر سے ڈھکی رہتی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیاں بارہ مہینے سفید برف سے ڈھکی رہتی تھیں اور یہی برف پگھل کر گنگناتی ہوئی ندیوں، جھرنوں اور آبشاروں کو جنم دیتی تھی۔ کشمیر اگر جنت نظیر تھا تو جموں اس کے برعکس جہنم کا نمونہ پیش کرتا تھا۔

سلسلہ کوہ ہمالیہ کے انتہائی جنوب میں واقع جموں خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا ان بے آب و گیارہ پہاڑوں کے درمیان کہیں کہیں وسیع و عریض بنجر وادیاں پھیلی ہوئی

تھیں جہاں کیکٹس کے پودے تو بکثرت نظر آتے ہیں مگر کوئی اور پھل دار یا سایہ دار درخت دکھائی نہیں دیتا۔ تاہم جہاں پانی میسر ہے وہاں انجیر اور دھان کی کاشت ہوتی ہے۔ جموں کی آبادی کا زیادہ حصہ ڈوگروں، سکھوں اور ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ مسلمان بھی کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ مگر ہندو سامراج نے ان کا جینا حرام کر رکھا ہے اور وہ اپنے حق کے لئے بندوق اُٹھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اُنیسویں صدی میں کشمیر اور جموں پر راجہ گلاب سنگھ کی حکمرانی تھی۔ اور پھر اُس نے یہ خطہ کوڑیوں کے مول انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دیا اور اس طرح اس وادی کی تاریخ نے ایک نیا موڑ لیا۔ 1947ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تو جموں اور کشمیر کا خطہ ایک تنازعہ بن گیا۔ اُس وقت اس خطے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور وہ پاکستان سے الحاق چاہتے تھے۔ مگر ہندو اس خطے سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہندوؤں کو لا کر یہاں بسایا جانے لگا تاکہ یہاں ہندوؤں کی اکثریت ثابت کی جا سکے۔

یہ خطہ اب ہندو کے گلے میں پھنسی ہوئی وہ ہڈی بن چکا ہے جسے نہ تو وہ نگل سکتا ہے اور نہ ہی اُگل سکتا ہے۔ ہر طرح کے جدید ترین اسلحہ اور گولہ بارود سے لیس سات لاکھ سے زائد ہندو فوج کشمیریوں کی جنگ آزادی کو نہیں دبا سکی۔

کشمیر کی طرح جموں کی آبادی بھی پہاڑوں میں بکھری ہوئی ہے۔ یہاں موسم گرما میں شدید گرمی پڑتی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ڈوگروں اور سکھوں کو کھیتی باڑی کے لئے شدید محنت کرنا پڑتی ہے۔ جبکہ ہندو اپنی فطری اور روایتی چالاکی سے یہاں کے کاروبار اور معیشت پر قابض ہیں۔

ہمیں خدا بخش کے اس فارم ہاؤس میں چار دن گزر گئے۔ یہ جگہ ہمارے لئے واقعی محفوظ تھی۔ رام نگر قصبہ وہاں سے سات آٹھ کوس دُور تھا اور قصبے کی طرف جانے والی سڑک بھی وہاں سے کم از کم تین میل کے فاصلے پر تھی۔ رام نگر میں ہندو آبادی کی اکثریت تھی۔ مسلمان کم تعداد میں تھے اس لئے وہاں زیادہ ہنگامے نہیں ہوتے تھے اور اس لئے یہ فارم ہاؤس بھی محفوظ تھا۔ تاہم اودھم پور، ریاسی، اکھنور اور جموں میں پولیس اور فوج کے بیچ مسلمان مجاہدین کی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔

چار روز کے آرام اور ایک مخصوص مرہم لگانے سے سیتا کے پیر بھی بالکل ٹھیک ہو گئے تھے اور وہ ایک نئے سفر کے لئے تیار تھی۔ اور پھر اُس روز اُس کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ وہ مجھے جموں لے جانا چاہتی تھی۔ جہاں بقول اُس کے ایک دُور کے رشتے دار موجود تھے۔ اُس کے کہنے کے مطابق چند روز جموں میں رہنے کے بعد ہم پنجاب اور پھر راجستھان کی طرف چلے جائیں گے۔

سیتا کے پروگرام نے مجھے چونکا دیا۔ وہ مجھے میرے محاذ سے دُور لے جانا چاہتی تھی اور یہ مجھے کسی طرح قبول نہیں تھا۔ میں اپنی سرزمین سے دُور نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں اس مٹی سے پیدا

ہوا تھا، یہیں پر میرے والدین، بزرگوں اور ان لوگوں کی ہڈیاں دفن تھیں جنہوں نے وطن کی آزادی کے لئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے تھے۔ میں نے بھی اس وادی میں رہتے ہوئے مجاہدانہ زندگی کا آغاز کیا تھا اور عرصہ سے آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ لیکن اب سیتا مجھے یہاں سے دُور لے جانا چاہتی تھی اور یہ مجھے قبول نہیں تھا۔ میں نے بہر حال یہ طے کر لیا تھا کہ جموں میں کسی مجاہد سے رابطہ کر کے ایک بار پھر تحریک میں شامل ہو جاؤں گا۔ اس سلسلے میں، میں نے خدا بخش سے بات بھی کر لی تھی۔ اُس نے مجھے جموں کے ایک دُکاندار کا پتہ بتا دیا تھا جس کے ذریعے میں مجاہدین کی ایک تحریک سے رابطہ کر سکتا تھا۔

ہم دو دن اور فارم ہاؤس میں رہے اور پھر اُن کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کر کے اُن سے رخصت ہو گئے۔ سیتا نے امیر بخش کی بیوی کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ دوپٹہ بھی تھا۔ مجھے صورت سے تو کوئی نہیں پہچانتا تھا کہ میں کون ہوں البتہ سیتا کا خطرہ تھا۔ میرے ساتھ اُسے بھی تلاش کیا جا رہا تھا اور اندیشہ تھا کہ اسے کہیں شناخت نہ کر لیا جائے۔ اسی لئے اُس نے دوپٹہ بھی لے لیا تھا تاکہ وہ اپنا چہرہ چھپائے رکھے۔

ہمیں بس پر سفر کرنا تھا اور ظاہر ہے ہم اپنی رائفلیں ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ وہ دونوں رائفلیں خدا بخش کے پاس چھوڑ دی گئیں اور اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ یہ رائفلیں ایک دو دن میں جموں کے دُکاندار سہیل کو پہنچا دے گا۔

مین روڈ وہاں سے تقریباً تین میل دُور تھی۔ ہم صبح سات بجے فارم ہاؤس سے روانہ ہوئے تو امیر بخش بھی ہمارے ساتھ تھا۔ خدا بخش نے ہمیں کچھ رقم دے دی تھی تاکہ جموں میں ہمیں کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہم آدھے گھنٹے میں سڑک پر پہنچ گئے۔ سیتا ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک بس آئی تو امیر بخش نے ہاتھ کے اشارے سے بس رُکوائی لیکن کنڈیکٹر نے بتایا کہ یہ بس جموں نہیں کھٹورو جا رہی ہے۔ اودھم پور سے جموں کی طرف جانے والی بس کے لئے ہمیں مزید آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ امیر بخش مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا اور ہم بس پر سوار ہو گئے۔ اتفاق سے ہم دونوں کو ایک ہی سیٹ پر جگہ ملی تھی۔ وہ دراصل تین مسافروں کی سیٹ تھی۔ ایک بوڑھا ہندو پہلے ہی سے وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کنارے پر آ گیا۔ سیتا کھڑکی کی طرف بیٹھ گئی اور میں اُس کے ساتھ۔

سیتا نے دوپٹے سے اس طرح گھونگھٹ نکال رکھا تھا کہ اُس کا چہرہ نظر نہ آئے۔ روانہ ہونے سے پہلے ہی ہم نے طے کر لیا تھا کہ راستے میں اگر کہیں چیکنگ ہوئی تو ہم اپنے آپ کو میاں بیوی ظاہر کریں گے۔ اُس کا نام عذرا اور میرا نام سلطان ہو گا۔

سڑک کہیں کچی تھی اور کہیں پختہ۔ اس طرح بس کی رفتار بھی کبھی تیز اور کبھی ہلکی ہو رہی تھی۔ چاروں طرف دُور دُور بنجر اور خشک پہاڑ تھے۔ کہیں کہیں سبزہ اور چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی تھیں۔ دُھوپ جیسے جیسے تیز ہو رہی تھی ہوا میں بھی تپش بڑھ رہی تھی۔ رام نگر سے جموں کا فاصلہ

اگرچہ چالیس میل کے لگ بھگ تھا مگر بس نے یہ فاصلہ تین گھنٹوں میں طے کیا۔ راستے میں اگرچہ تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے کئی جگہوں پر رُکی تھی لیکن تھلورہ نامی قصبے میں یہ بس تقریباً آدھا گھنٹہ رُکی رہی تھی۔ تھلورہ کو ایک جنکشن کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں سے ایک سڑک رام نگر، دوسری جموں، تیسری اودھم پور، چوتھی سمبا اور پانچویں سڑک رام کوٹ سے ہوتی ہوئی کٹھوا کی طرف چلی گئی تھی۔

جموں ایک بہت بڑا اور پھیلا ہوا شہر تھا۔ کوہ ہمالیہ کا جنوبی سلسلہ یہاں پر ختم ہو جاتا تھا۔ اس سے آگے بتدریج ڈھلان تھی جو میدانی علاقے سے مل کر پنجاب سے جا ملتا تھا۔ اس کے ایک طرف مغربی پنجاب (پاکستان) کے شہر سیالکوٹ، گجرات اور شکر گڑھ تھے تو دوسری طرف مشرقی پنجاب کا پہلا شہر پٹھانکوٹ تھا۔

جموں میں ایک بہت بڑا ریلوے سٹیشن بھی تھا۔ یہاں سے شروع ہونے والی ریلوے لائن پٹھان کوٹ سے ہوتی ہوئی امرتسر، دہلی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کو ملاتی تھی۔

جب ہم جموں کے لاری اڈے پر بس سے اُترے تو ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ گرم ہوا کے تھپیڑے چل رہے تھے۔ سیتا نے دوپٹہ اس طرح اوڑھ رکھا تھا کہ کوئی اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ شدید گرمی سے پیاس بھی بھڑک اُٹھی تھی اور حلق خشک ہو رہا تھا۔ ہم لاری اڈے سے نکل کر ایک مسلمان کی دُکان پر آ گئے جہاں لسّی اور دیگر مشروبات فروخت ہو رہے تھے۔ دو دو گلاس لسّی پینے کے بعد ہم پتہ پوچھ کر نہرو مارکیٹ کی طرف روانہ ہو گئے جہاں مجھے سہیل نامی دُکاندار سے رابطہ کرنا تھا۔ لیکن سیتا کا خیال تھا کہ پہلے لاہوری محلے میں سوامی نارائن نامی اُس کے رشتہ دار کا گھر تلاش کیا جائے اس کے بعد ہی کہیں اور جائیں گے۔

لاہوری محلّہ وہاں سے بہت دُور تھا۔ دُھوپ بہت کڑی تھی۔ میری قمیض پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ سیتا کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی لیکن وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلتی رہی۔

لاہوری محلّہ گنجان آبادی والا علاقہ تھا۔ تنگ اور پُر پیچ گلیاں، کھیلتے ہوئے ننگ دھڑنگ بچے۔ سیتا گلیوں کے ایک چوراہے پر رُک گئی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''تم آخری مرتبہ یہاں کب آئی تھیں اور راستہ یاد بھی ہے یا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''دو سال پہلے آئی تھی۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے اس طرف آگے ایک موڑ گھوم کر دوسری گلی میں ہے۔''

شدید گرمی میں گلی میں کھیلتے ہوئے بچے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ دس گیارہ سال کی عمر کے ایک لڑکے نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے کچھ کہا تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

ہم دائیں طرف والی گلی میں مُڑ گئے۔ چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سیتا ایک بار پھر رُک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''وہ مکان اسی گلی میں ہونا چاہئے، مگر پہچان میں نہیں آ رہا۔'' وہ بڑبڑائی اور قریب سے

گزرتے ہوئے ایک بوڑھے آدمی کو روک لیا۔ حلیے سے وہ مسلمان ہی لگتا تھا۔

''لالہ جی!'' سیتا اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لالہ سوامی نارائن کا مکان کون سا ہے؟''

سوامی نارائن کا نام سن کر وہ شخص چونک گیا۔ پہلے اُس نے گھونگھٹ کے اندر سیتا کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی پھر میری طرف دیکھنے لگا۔

''تم لوگ ڈوڈا سے آئے ہو؟'' وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ لڑکی مسلمان نہیں، سیتا ہے۔ اور.....''

''لالہ جی آپ.....'' سیتا نے اُس کی بات کاٹ کر کچھ کہنا چاہا مگر وہ شخص اُسے اپنی بات پوری کرنے کا موقع دیئے بغیر بولا۔

''میں مسلمان ہوں اور میرا نام عبدالرؤف ہے۔'' وہ سرگوشیانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''لالہ سوامی نارائن کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ سادہ لباس میں پولیس اُس کے گھر کی نگرانی کر رہی ہے۔ انہیں سیتا اور اُس کے ایک مسلمان ساتھی کا انتظار ہے جو ڈوڈا کے قریب ایک بستی میں قتل و غارت کر کے بھاگے ہیں۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''لالہ سوامی نارائن کا مکان یہاں نہیں، ساتھ والی گلی میں ہے۔ میں اُس کا پڑوسی ہوں اور مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ دو سادہ لباس پولیس والے اُس کے گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ تم لوگ جیسے ہی وہاں پہنچو گے دھر لئے جاؤ گے۔ میرے ساتھ آؤ!''

میں نے اور سیتا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے اُس کے ساتھ چل پڑے۔ اُس گلی میں واپس چلتے ہوئے ہم ایک اور گلی میں داخل ہو گئے۔ یہ گلی نسبتاً کشادہ تھی اور یہاں لوگوں کی آمدورفت تھی۔ بوڑھا عبدالرؤف ہمارے ساتھ چلتے ہوئے اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے ہم اُس کے قریبی عزیز ہوں۔ آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ سرسری سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

ایک اور گلی میں داخل ہو کر عبدالرؤف ایک مکان کے سامنے رُک گیا۔ دستک کے جواب میں دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ عبدالرؤف نے پہلے ہمیں اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا اور ہمارے بعد اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک ادھیڑ عمر بھاری بھرکم عورت تھی جو اُلجھی ہوئی نظروں سے کبھی عبدالرؤف اور کبھی ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

''یہ کون ہیں بھائی صاحب؟'' بالآخر وہ عورت خاموش نہیں رہ سکی۔

''ابھی بتاتا ہوں شریفاں..... پہلے ان کے لئے لسّی پانی کا بندوبست کر! گرمی میں دُور سے چل کر آئے ہیں پیاس لگ رہی ہوگی۔'' عبدالرؤف نے جواب دیا اور ہمیں اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

مختصر سا صحن عبور کر کے ہم ایک کمرے میں آ گئے۔ یہ کمرہ گھر کے دوسرے کمروں سے الگ تھلگ تھا اور بیٹھک کے طور پر آراستہ تھا۔ فرش پر موٹی دری بچھی ہوئی تھی۔ ریگزین کا ایک

صوفہ سیٹ تھا اور چند کرسیاں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے بیچ میں ایک تپائی بھی پڑی ہوئی تھی۔ عبدالرؤف نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پنکھا کھول دیا تھا اور ہمیں آرام سے بیٹھنے کو کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں اور سیتا ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اُس نے دوپٹہ سر سے اُتار لیا تھا اور اُس کے پلو سے پسینے سے تر چہرہ پونچھ رہی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد عبدالرؤف ایک ٹرے اُٹھائے اندر داخل ہوا۔ اُس میں شربت کے تین بڑے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ٹرے میز پر رکھ کر اُس نے ایک ایک گلاس ہماری طرف بڑھا دیا۔

''آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ہم ڈوڈا سے آئے ہیں؟ اور آپ نے یہ اندازہ کس طرح لگا لیا کہ یہ سیتا ہے اور میں ایک مسلمان مجاہد؟'' میں نے شربت کا گھونٹ بھر کر سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''یہ میری بہن کا گھر ہے۔ جبکہ میں لالہ سوامی نارائن کے پڑوس میں رہتا ہوں۔'' عبدالرؤف نے جواب دیا۔ ''کئی روز پہلے پولیس نے لالہ سوامی نارائن کے گھر پر چھاپہ مارا تھا۔ اُنہیں سیتا نامی ایک لڑکی اور ایک مسلمان مجاہد کی تلاش تھی جو ڈوڈا کے قریب ایک بستی میں قتل و غارت کر کے بھاگے تھے۔ سیتا لالہ سوامی نارائن کی رشتہ دار ہے اور اس بستی کا مکھیا اُس کا ماما ہے۔ پولیس کو یقین تھا کہ سیتا پناہ لینے کے لئے یہاں ضرور آئے گی۔ یہاں جموں میں اس کے ایک دو اور رشتہ داروں کے گھر بھی ہیں۔ پولیس نے ان گھروں کے تمام مردوں کو بھی پکڑ لیا ہے اور عورتوں کی بھی بستی کے ایک آدمی سے شناخت کرائی گئی تھی۔ پولیس کو اب بھی یقین ہے کہ وہ مسلمان مجاہد ہیں تو سیتا ان میں سے کسی ایک کے گھر ضرور آئے گی۔ ہر گھر میں دو دو سادہ لباس میں مسلح پولیس والے موجود ہیں تاکہ سیتا اپنے مسلمان مجاہد ساتھی کے ساتھ جیسے ہی کسی گھر میں داخل ہو اُنہیں پکڑ لیا جائے۔''

''اس میں شبہ نہیں کہ ہم ہی اُس بستی سے بھاگے ہیں۔ لیکن ہم نے وہاں کوئی قتل و غارت نہیں کی۔ ہم نے تو ایک گولی بھی نہیں چلائی بلکہ پکڑے جانے کے خوف سے پہاڑوں کی طرف بھاگ نکلے تھے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن سننے میں تو یہ آیا ہے کہ سیتا اور اس کے ساتھی نے بستی سے کچھ دُور دو ہندو فوجیوں کو مار دیا تھا۔ اُن کی لاشیں بھی ایک کھڈ سے مل گئی ہیں اور پھر سیتا اور اس کے ساتھی نے بستی میں فوجیوں کی پارٹی پر حملہ کر دیا تھا جس سے ایک اور فوجی مارا گیا۔ وہ دونوں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد میں بستی کی ایک مسلمان لڑکی نے بتایا کہ سیتا کے ساتھ مجاہد لیڈر رشمروز تھا جو کئی روز سے بستی سے کچھ دُور ایک غار میں پناہ لئے ہوئے تھا۔''

''یہ درست ہے کہ میں کئی روز سے اُس غار میں چھپا ہوا تھا اور سیتا میری مدد کر رہی تھی۔ یہ بھی درست ہے کہ وہاں دو ہندو فوجی مارے گئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے سیتا کو اکیلے پا کر اسے بے آبرو کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن......'' میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے

ہوئے بولا۔ ''لیکن ہم نے فوجی پارٹی پر حملہ نہیں کیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بستی میں آنے والے فوجیوں نے اس بستی میں رہنے والے واحد مسلمان قربان علی کو دو ہندو فوجیوں کے قتل کے شبے میں گولیوں سے بھون ڈالا اور اُس کی جوان بیٹی کو بستی کے چوک میں برہنہ کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ہو سکتا ہے بستی کے کسی غیرت مند ہندو ہی نے لڑکی کو بچانے کے لئے فوجیوں پر حملہ کر دیا ہو اور کوئی فوجی اُس کے ہاتھوں مارا گیا ہو۔

''مجھے تمہاری بات پر کوئی شبہ نہیں۔ لیکن سچ وہی سمجھا جائے گا جو سرکار کہتی ہے......'' عبدالرؤف نے کہا۔ ''وادی میں تو مسلمانوں کے سچ کو بھی سچ نہیں سمجھا جاتا۔ اسلحہ یا مجاہدین کی تلاش میں ہندو فوجی مسلمانوں کی بستیوں پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ عورتوں کو بے آبرو کیا جاتا ہے بے گناہ نوجوانوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جاتا ہے اور بستیوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا جاتا ہے اور سرکار اسے معمولی سا واقعہ قرار دیتی ہے۔ لیکن کوئی ایک بھارتی فوجی مجاہدین کے ہاتھوں مارا جائے تو اسے قیامت کہا جاتا ہے اور انتقام لینے کے لئے فوجی دستے ایک بار پھر مسلمان بستیوں پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ مسلمان مجبور اور بے بس ہو کر رہ گئے ہیں۔''

''وادی کے مسلمان مجبور اور بے بس نہیں ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم نے تو غلامی کی زنجیریں توڑنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ ہمارے نوجوان نہ مجبور و بے بس ہیں اور نہ بزدل۔ ہم نے عہد کر رکھا ہے کہ وادی میں کہیں بھی ہندو فوج کو ٹکنے نہیں دیں گے۔ جب تک ان غاصبوں کو نکال باہر نہیں کریں گے ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔''

''تم نوجوانوں ہی سے تو اُمیدیں وابستہ ہیں۔'' عبدالرؤف نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بہر حال اچھا ہوا کہ میں راستے میں تم لوگوں کو مل گیا ورنہ غلط فہمی میں مارے جاتے۔ اگر تم لوگوں کے پاس کوئی اور ٹھکانہ نہ ہو تو تم لوگ چند روز یہاں رہ سکتے ہو۔ میری بہن شریفاں یہاں اپنی بیٹی کے ساتھ اکیلی رہتی ہے۔ پڑوسیوں کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تم لوگ ہمارے رشتے دار ہو اور پٹھان کوٹ سے آئے ہو۔ اور تم......'' اُس نے میری طرف دیکھا۔ ''تمہیں تو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ جس روز تم لوگ ڈوڈا کی بستی سے بھاگے تھے اس سے اگلے روز یہاں بھی تمہاری تلاش میں چیکنگ شروع ہو گئی تھی۔ اس طرف سے آنے والی ہر بس کے مسافروں کو روک کر بڑی سختی سے اُن سے پوچھ گچھ کی جاتی رہی تھی۔ اب اگرچہ سرگرمیاں کچھ ماند پڑ گئی ہیں لیکن تم لوگوں کو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ میرا تو مشورہ یہی ہے کہ کہیں اور جانے کی بجائے تم لوگ یہیں رہ جاؤ۔ یہ گھر تم لوگوں کے لئے سب سے زیادہ محفوظ ہے۔''

میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا جیسے وہ یہاں رہنے کو تیار ہو۔

''ٹھیک ہے......'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہم چند روز یہاں رہ لیتے ہیں۔ لیکن اس دوران آپ کو میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ بلکہ آج ہی۔''

"ہاں کہو......!" عبدالرؤف نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں چند لمحے خاموش رہا پھر اُسے نہرو مارکیٹ میں سہیل نامی دُکاندار کے بارے میں بتانے لگا۔

"اطمینان رکھو...... میں آج ہی سہیل سے ملوں گا۔ اور ہاں میری واپسی شام کے بعد ہی ہو گی۔ تم لوگ پریشان مت ہونا۔" عبدالرؤف نے کہا اور آواز دے کر اپنی بہن شریفاں کو بلا لیا۔ "دیکھو شریفاں! یہ ہمارے دُور کے رشتہ دار ہیں اور پٹھان کوٹ سے آئے ہیں۔ یہ میاں بیوی ہیں ان کے نام......"

"سلمان اور عذرا۔" میں بیچ میں بول پڑا۔

"ہاں...... یہ سلمان ہے اور یہ عذرا۔" عبدالرؤف نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ہم لوگوں سے ملنے آئے ہیں اور چند روز یہاں رہیں گے۔ تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟"

"نہیں بھائی صاحب...... مجھے کیا مسئلہ ہوگا؟ مجھے تو مہمانوں کی خدمت کر کے خوشی ہوگی۔ ایسے مہمان روز روز تو نہیں آتے۔" شریفاں نے جواب دیا۔ وہ بھی شاید سمجھ گئی تھی کہ ہم کون ہو سکتے ہیں۔

"ٹھیک ہے...... میں شام کو چکر لگاؤں گا۔" عبدالرؤف نے کہا اور ہماری طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔

شریفاں کچن میں چلی گئی۔ میں اور سیتا کچھ دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ اور پھر آج کے اس واقعہ پر تبصرہ کرنے لگے۔ یہ واقعی ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم نے گلی میں عبدالرؤف کو روک کر لالہ سوامی نارائن کے مکان کا پتہ پوچھ لیا تھا اور ہمیں نہ صرف صحیح صورتحال کا پتہ چل گیا تھا بلکہ ہم بال بال بچ گئے تھے۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے سیتا کی طرف دیکھا۔

"دو چار روز تو یہیں رہنا پڑے گا...... اس کے بعد ہی کچھ فیصلہ کریں گے۔" سیتا نے جواب دیا۔

"ایک تجویز ہے میرے ذہن میں۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟" اُس نے پوچھا۔

"دو چار روز یہاں رہ کر تم جے پور چلی جاؤ اور میں اپنے محاذ پر لوٹ جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"شاید تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" اُس نے مجھے گھورا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ انہوں نے میری گرفتاری کے لئے جے پور میں میرے گھر پر چھاپہ نہیں مارا ہوگا؟ وہ مجھے ہر اُس جگہ تلاش کریں گے جہاں میرا کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ نہیں ڈیئر...... میں تو اب تمہارے ہی کھونٹے سے بندھ گئی ہوں۔ کہیں اور نہیں جا سکتی۔ جہاں بھی جاؤں گی ماری جاؤں گی۔"

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ شریفاں کی بیٹی خالدہ نے آ کر بتایا کہ کھانا تیار ہو چکا

ہے۔ خالدہ تیرہ چودہ سال کی ایک بھولی بھالی اور حسین لڑکی تھی۔ وہ ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی اور ابھی سکول سے واپس آئی تھی۔

ہم دوسرے کمرے میں آ گئے جہاں دری پر دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ خالدہ اور شریفاں بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئیں۔ شریفاں بیٹی کو بتا رہی تھی کہ میں رشتے میں اس کا ماموں لگتا ہوں۔

کھانے کے بعد شریفاں نے ہمیں ایک اور کمرہ دے دیا جہاں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ سیتا کچھ دیر بعد خالدہ کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور میں چارپائی پر لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر بعد میں نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

اور پھر اُس شام عبدالرؤف سے ملنے والی خبریں بڑی خوفناک تھیں......

پولیس اور فوج کی انٹیلی جنس نے کسی طرح پتہ لگا لیا تھا کہ مجاہدین کا سب سے خطرناک لیڈر شمروز (یعنی میں) ڈوڈا کے قریب ہندوؤں کی ایک اور چھوٹی سی بستی میں تباہی مچا کر فرار ہونے کے بعد رام نگر کے قریب ایک فارم ہاؤس میں پناہ لئے ہوئے تھا۔ اس کے ساتھ سیتا نام کی وہ ہندو لڑکی بھی تھی جو دو فوجیوں کے قتل میں ملوث تھی۔ یہ دونوں تقریباً ایک ہفتہ اُس فارم ہاؤس میں رہنے کے بعد جموں کی طرف فرار ہو گئے تھے۔

فوج کی ایک پارٹی نے اُس فارم ہاؤس پر چھاپہ مارا تھا اور اُس خاندان کے سربراہ خدا بخش نے بتایا تھا کہ شمروز جموں کی نہرو مارکیٹ میں سہیل نامی ایک دُکاندار سے رابطہ کرے گا۔ سہیل مجاہدین کی ایک تنظیم کا سرگرم ایجنٹ ہے اور مجاہدین کے درمیان رابطے کا کام کرتا ہے۔

فوج کی ایک پارٹی نے آج شام سے ذرا پہلے سہیل کو گرفتار کر لیا اور اُس سے شمروز کے بارے میں پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ سہیل کی گرفتاری کے ساتھ ہی شہر کی پولیس کو بھی الرٹ کر دیا گیا تھا اور شمروز کی گرفتاری کے لئے مشتبہ مقامات پر چھاپے مارے جا رہے تھے اور ایسے لوگوں کو حراست میں لیا جا رہا ہے جو مجاہدین سے تعاون اور اُن کی امدادی سرگرمیوں میں ملوث سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سیتا کی تلاش میں بھی سرگرمیاں بڑھا دی گئی ہیں۔ جموں میں آباد اُس کے دو چار دُور کے رشتہ داروں کے گھروں کے علاوہ اُسے مندروں میں بھی تلاش کیا جا رہا ہے کیونکہ شبہ ہے کہ وہ کسی مندر میں بھی پناہ لے سکتی ہے۔

دوسری طرف اس سے زیادہ خوفناک خبر یہ تھی کہ کشمیر میں فوج نے ایک بار پھر سوپور پر حملہ بول دیا تھا اور کئی بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے بعد شہر کے کئی گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا تھا......

○○○

سرینگر کے بعد سوپور ہی کشمیر کا دوسرا بڑا شہر سمجھا جاتا تھا۔ یہ کشمیر میں اسلام پسندوں کا مضبوط گڑھ تھا...... آزادی کی تقریباً تمام تحریکوں کی وابستگی بھی اسی شہر سے تھی۔ دوسرے لفظوں میں اُسے کشمیر میں اسلام کا قلعہ کہا جاتا تھا اور درندہ صفت بھارتی فوجوں نے گویا اُس شہر کو نیست و نابود کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آئے دن مختلف حیلوں بہانوں سے اس شہر پر حملے اور قتل و غارت یہی ثابت کرتے تھے۔ لیکن یہاں کے لوگ بھی بڑے عجیب تھے۔ ان پر گولیاں برسائی جاتی تھیں، اُن کے خون سے ہولی کھیلی جاتی تھی، اُن کے گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا تھا مگر یہ لوگ ہر مرتبہ ایک نئے حوصلے اور جذبے کے تحت ان باطل قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے تھے جو اُنہیں مٹانے کے درپے تھیں۔

سوپور پر تازہ ترین حملہ آج صبح سویرے ہوا تھا۔ اس حملے کا بہانہ یہی تھا کہ چند خطرناک چھاپہ مار مجاہدین یہاں پناہ لئے ہوئے ہیں اور لوگوں نے گھروں میں اسلحہ اور گولہ بارود کے انبار لگا رکھے ہیں۔

سوپور پر یہ حملہ صبح سویرے اُس وقت ہوا تھا جب مساجد میں فجر کی نماز پڑھائی جا رہی تھی۔ فوجی دندناتے ہوئے شہر کی بڑی جامع مسجد میں گھس گئے تھے اور نمازیوں پر فائر کھول دیا تھا...... صرف اس ایک مسجد میں بارہ نمازی شہید ہوئے تھے۔ دوسری مسجدوں اور شہر کے کئی علاقوں میں خون خرابہ ہوا تھا۔ اس مرتبہ سوپور کے شہریوں نے بھی مقابلہ کیا تھا اور دو درجن سے زائد ہندو فوجیوں کو جہنم رسید کر دیا تھا جن میں ایک کرنل بھی شامل تھا۔ عبدالرؤف سے ملنے والی اطلاع کے مطابق فوج کی بھاری نفری نے سوپور کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور سوپور کا پوری وادی سے رابطہ کٹا ہوا تھا۔

سوپور پر اس وحشیانہ کارروائی کی خبر پورے کشمیر اور جموں میں پھیل گئی تھی۔ ہر جگہ ہنگامے شروع ہو گئے تھے اور اگلے دن کے لئے ہڑتال کی کال دے دی گئی تھی۔

شام ہوتے ہی جموں میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ یہ علاقہ گنجان آبادی اور تنگ گلیوں پر مشتمل تھا اس لئے یہاں زیادہ گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔ لوگ گھروں میں بند ہو کر بیٹھ گئے تھے البتہ شہر کی بڑی سڑکوں اور شاہراہوں پر شہر کے نوجوانوں اور پولیس میں پتھراؤ، لاٹھی چارج اور آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔

میری حالت اُس شیر کی سی تھی جسے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ سوپور پر فوج کے حملے اور

وہاں ہونے والی تباہی کی خبر نے مجھ پر لرزہ سا طاری کر دیا تھا۔ میں وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہاں جس سے رابطے کی توقع تھی اُسے بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ میں نے عبدالرؤف سے کسی اور مجاہد تنظیم یا کسی ٹھکانے کے بارے میں کچھ پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس سلسلے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ مجاہدین کی مختلف تنظیموں کی سرگرمیوں کے بارے میں سنتا تو رہتا تھا مگر وہ کسی کے ٹھکانے سے واقف نہیں تھا۔

''ایک آدمی ہے جس کے ذریعے مجاہدین کی ایک تنظیم سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔'' عبدالرؤف نے کہا۔

''کون ہے وہ...... کہاں ہے؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''وہ امر محل کے علاقے میں رہائش پذیر ہے۔'' عبدالرؤف نے جواب دیا۔ ''امر محل شہر کے دوسری طرف دریائے توی کے قریب ہے۔ اور اس وقت وہاں پہنچنا ممکن نہیں۔ کل صبح کوشش کی جا سکتی ہے۔''

''کل صبح تک تو پتہ نہیں کیا ہو جائے...... میں ابھی اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے امر محل کا راستہ سمجھا دو! میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''تم اکیلے وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔'' عبدالرؤف نے جواب دیا۔ ''شہر میں ہنگامے ہو رہے ہیں۔ کل دن میں تمہیں وہاں پہنچانے کی کوشش کروں گا۔''

''ٹھیک ہے......'' میں گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

عبدالرؤف نو بجے کے قریب آیا تھا۔ اُس نے کھانا ہمارے ساتھ کھایا تھا اور گیارہ بجے کے قریب وہ اپنے گھر چلا گیا۔ میں اور سیتا دیر تک بیٹھے اس صورتحال پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔

شہر میں ہنگامے جاری تھے۔ فائرنگ کی آوازوں کے ساتھ کبھی کبھی زوردار دھماکے بھی سنائی دے جاتے۔ ایک دو مرتبہ گلی میں کچھ لوگوں کے دوڑنے کی آوازیں بھی سنائی دی تھیں۔ آدھی رات کے بعد فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں بتدریج کم ہوتی چلی گئیں اور پھر پورا شہر، شہر خموشاں کی تصویر بن گیا۔ ہر طرف مکمل خاموشی اور گہرا ناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے اس شہر سے زندگی کا نام و نشان تک مٹ گیا ہو۔

سیتا کے چہرے سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس صورتحال سے وہ خاصی پریشان اور خوفزدہ تھی۔ شاید وہ اپنوں کے خلاف میرا ساتھ دے کر پچھتا رہی ہو۔ میں نے یہی سوال پوچھا تو وہ ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔

''میں بالکل نہیں پچھتا رہی...... تم مجھے مل گئے مجھے کسی اور بات کی پرواہ نہیں۔ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔''

میں اُسے گھور کر رہ گیا۔ اس وقت رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ سیتا دوسری چارپائی پر کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ وہ اُٹھ کر میری چارپائی پر آ

گئی اور مجھے اپنی بانہوں کے حصار میں لیتے ہوئے بولی۔

''مجھے ڈر اس بات کا ہے کہ کوئی تمہیں مجھ سے چھین نہ لے۔''

''ایک بات بتاؤ......'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم اس لئے مجھے وہاں سے نکال کر لائی ہو کہ کوئی مجھے تم سے چھین نہ لے۔ اور کیا یہ غلط ہے کہ تم مجھے یہاں سے بھی نکال کر کہیں دُور لے جانا چاہتی ہو...... کسی ایسی جگہ جہاں کوئی......''

''یہ درست ہے۔'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''میں نے جب تمہیں بے ہوش اور زخمی حالت میں پہاڑوں میں پڑے ہوئے دیکھا تھا تو نجانے میرے دل میں یہ احساس کیوں جاگ اُٹھا تھا کہ تم وہی ہو جس کی مجھے تلاش تھی۔ میری جوانی کے سپنوں کی تعبیر...... میں تمہیں اُٹھا کر غار میں لے گئی۔ تمہاری ٹانگ پر زخم دیکھتے ہوئے مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ تم مسلمان مجاہد ہو۔ لیکن پریم دین دھرم اور ذات پات کو کب دیکھتا ہے؟ میں جانتی تھی کہ پولیس یا فوج تمہاری تلاش میں ہو گی لیکن میں نے تمہاری حفاظت اور مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اسی وقت یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ تم اچھے ہو جاؤ گے تو تمہیں کہیں بہت دُور لے جاؤں گی۔ اور پھر اتفاق سے اُن دو ہندو فوجیوں نے مجھے گھیر لیا۔ تم نے جس طرح اُن سے میری عزت اور جان بچائی اس سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

میں یہ جان چکی تھی کہ تم وہ خطرناک مجاہد لیڈر ہو جو بھارتی فوج کو سب سے زیادہ مطلوب ہے۔ کسی مسلمان مجاہد کو پناہ دینا سنگین جرم ہے اور تم کوئی عام مجاہد نہیں...... تم تو وہ تھے جس نے بھارتی فوج کو سب سے زیادہ جانی اور مالی نقصان پہنچایا ہے۔ تمہیں پناہ دینے والے کو تو ایسی سزا دی جاتی جس سے دوسرے بھی عبرت حاصل کرتے۔ لیکن میں اپنے من کے ہاتھوں مجبور تھی اور تمہیں ہر قیمت پر بچانے اور وہاں سے نکالنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اور پھر حالات اس تیزی سے تبدیل ہوئے کہ ہمیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ ہاں...... میری نیت یہی تھی کہ میں تمہیں یہاں سے نکال کر ان ہنگاموں سے بہت دُور لے جاؤں گی۔ لیکن......''

''لیکن کیا......؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''میرے ماما کی بستی میں جو کچھ ہوا اُس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔'' سیتا بولی۔ ''اُن درندوں نے چاچا قربان علی کو گولیوں سے چھلنی کر دیا...... نیلم جیسی بے گناہ اور معصوم لڑکی کو برہنہ کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور کسی غیرت مند نے اُسے بچانے کی کوشش کی تو اُسے بھی مار دیا گیا۔ اب عبدالرؤف سے ملنے والی خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ اُنہوں نے نیلم کو بھی مار ڈالا اور پھر سوپور میں آج صبح جو کچھ ہوا اور اب یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیشِ نظر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''میں تمہارے راستے کی رکاوٹ نہیں بنوں گی اور نہ ہی تمہارے پیروں کی بیڑیاں بن کر رہوں گی...... بلکہ میں بھی قدم بہ قدم تمہارے ساتھ رہوں گی۔ انگوری کی طرح......''

سیتا کی سچائی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

''ٹھیک ہے......'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہاری سچائی اور تمہارے فیصلہ سے مجھے خوشی ہوئی۔ بہر حال اگلا قدم ہم صورتحال کے تحت ہی اُٹھائیں گے۔''

سیتا کے چہرے پر طمانیت سی آ گئی...... وہ میرے بازو پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گئی تو میں نے بڑی آہستگی سے اپنے آپ کو اُس سے الگ کیا اور دوسری چارپائی پر لیٹ گیا۔

ہم صبح چھ بجے عبدالرؤف کے ساتھ نکلے تھے۔ میں نے سیتا کو منع کیا تھا کہ وہ یہیں رہ کر میرا انتظار کرے مگر وہ کسی طرح نہیں مانی اور میرے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔

اُس وقت سڑکوں پر سناٹا تھا۔ اِکا دُکا لوگوں کی پیدل آمد و رفت تھی۔ موٹر سائیکل یا سائیکل پر کوئی دُودھ والا سڑک پر سے گزر جاتا یا کبھی کوئی گاڑی بھی نظر آ جاتی۔ البتہ سڑک کے ہر موڑ پر پولیس والے بڑی تعداد میں نظر آ رہے تھے۔ ہر پولیس پارٹی کے ساتھ ہندو فوجی بھی تھے۔ جگہ جگہ پولیس اور فوج کی گاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

کل آدھی رات تک شہر میں ہنگامے جاری رہے تھے اور توقع تھی کہ کچھ دیر بعد پھر ہنگامے شروع ہو جائیں گے جن سے نمٹنے کے لئے پولیس اور فوج نے پورا بندوبست کر رکھا تھا۔

ہمیں راستے میں دو تین جگہ روکا گیا۔ عبدالرؤف کی درویشانہ شخصیت ہر جگہ ہمارے کام آئی۔ اُس نے مجھے اپنا بیٹا اور سیتا کو اپنی بہو ظاہر کیا اور اس طرح ہم پولیس والوں کی کڑی پوچھ تاچھ سے بچتے رہے۔

دریائے توی کے قریب امر محل بہت خوبصورت عمارت تھی۔ اُس کا ڈیزائن ایک راجہ کی فرمائش پر ایک فرانسیسی آرکیٹیکٹ نے تیار کیا تھا۔ نہ وہ راجہ رہا تھا نہ آرکیٹیکٹ۔ لیکن یہ محل اپنی جگہ پر موجود تھا اور بلاشبہ اسے جموں کی خوبصورت ترین عمارت ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ آج کل یہاں میوزیم قائم ہے جس میں لائبریری کے علاوہ آرٹ کے بہترین شاہکار جمع ہیں۔

اس طرف رہائشی بنگلے ہی تھے۔ عبدالرؤف ہمیں ایک بنگلے میں لے گیا جہاں ہماری ملاقات پرویز نامی ایک ایسے شخص سے ہوئی جو اناج کا بیوپاری تھا۔ میرا اور سیتا کا تعارف ہونے پر وہ چونک گیا۔

ہم نے ناشتہ وہیں کیا۔ اس کے ایک گھنٹے بعد عبدالرؤف واپس چلا گیا۔ اُس روز شہر میں ہنگامے تو ہوئے تھے مگر زیادہ زور نہیں پکڑ سکے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے ایک گھنٹے بعد پرویز ہمیں لے کر بنگلے سے روانہ ہو گیا۔ ہم مختلف راستوں پر ہوتے ہوئے دریا کی طرف نکل گئے۔ چٹانوں میں ایک جگہ دریا کے کنارے دو آدمی ڈونگے (کشتی) پر ہمارے منتظر تھے۔ اس معمولی سی کشتی پر تیز رفتار دریا پار کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا مگر وہ دونوں آدمی ماہر ملاح تھے۔ وہ بڑی مہارت سے رات کی تاریکی میں ڈونگے کو تیز و تند لہروں پر کھینچتے ہوئے دوسرے کنارے

تک لے گئے۔

توی کے دوسرے کنارے باہو قلع کا ہیولہ ہمارے سامنے تھا۔ سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کر بنایا گیا یہ قلعہ جموں کی قدیم ترین یادگار سمجھا جاتا تھا۔ پرویز ہمیں قلعہ کے دوسری طرف ایک اور کھنڈر نما عمارت میں لے گیا۔ یہاں ہماری ملاقات ایک مقامی مزاحمتی تحریک کے لیڈر عبدالرحمٰن سے ہوئی۔ پرویز ہمیں وہاں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

عبدالرحمٰن میرا نام سن کر ہی متاثر ہو گیا تھا۔ البتہ سیتا کے نام پر وہ کچھ چیں بہ جبیں ہوا تھا۔

''اس کی تم فکر مت کرو۔ یہ بھارتی فوجیوں کے لئے دوسری انگوری ثابت ہوگی۔'' میں نے رحمٰن کو سیتا کے بارے میں سب کچھ بتا کر مطمئن کر دیا۔

عبدالرحمٰن کے ساتھ اس کھنڈر میں چار لڑکے اور تھے اور وہ کسی خاص چھاپہ مار کارروائی کا منصوبہ بنا رہے تھے اور کل صبح اپنے کچھ اور ساتھیوں کا بھی انتظار تھا۔

مجھے اپنے درمیان پا کر عبدالرحمٰن اور اُس کے ساتھی بہت خوش ہو رہے تھے۔ عبدالرحمٰن نے وہ منصوبہ میرے سامنے رکھ دیا۔ میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ منصوبہ اگرچہ بے حد خوفناک تھا مگر اس پر عمل کر کے بھارتی فوج پر ایک کاری ضرب لگائی جا سکتی تھی۔

''اب اس پارٹی کی قیادت تم کرو گے کمانڈر شمروز!'' عبدالرحمٰن نے کہا اور پھر تفصیل سے اُس جگہ کے بارے میں بتانے لگا جہاں یہ کارروائی کی جانے والی تھی۔

صبح دس بجے تک عبدالرحمٰن کے دوسرے ساتھی بھی پہنچ گئے۔ اس طرح ہماری کل تعداد چودہ ہو گئی تھی۔ ایک گھنٹے بعد ہم لوگ کھنڈروں سے نکل کر دریائے توس کے متوازی پہاڑوں کی طرف چل پڑے۔ سیتا میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور ہم دبے لفظوں میں اس منصوبے کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے جا رہے تھے۔

عبدالرحمٰن کا منصوبہ واقعی بڑا خوفناک تھا...... جموں شہر سے کئی میل دُور پہاڑیوں میں گھری ہوئی جھیل مانسر اس خطے کے لوگوں کے لئے قدرت کا حسین تحفہ تھی۔ اس جھیل کے اطراف کی پہاڑیوں میں تین چار قدیم مندر تھے جن کی یاترا کے لئے ہندو دُور دُور سے آتے تھے۔ جھیل کے جنوبی ساحل پر ایک خوبصورت ٹورسٹ بنگلہ تھا۔

عبدالرحمٰن کے کہنے کے مطابق بھارتی فوج کے کچھ اعلیٰ افسران آج رات اس ٹورسٹ بنگلے میں جشن منانے والے تھے۔ یہ جشن ہر مہینے کی پہلی اتوار کی شب منایا جاتا تھا جس میں راگ رنگ اور عیاشی کا ہر سامان موجود ہوتا تھا۔

عبدالرحمٰن نے بہت سوچ سمجھ کر اس منصوبے کی پلاننگ کی تھی اور اس کی قیادت میرے سپرد کر دی تھی۔ اور رحمٰن کی اطلاع کے مطابق آج رات تو جموں کا کور کمانڈر بھی اس محفل میں شریک ہونے والا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو گیا تو کم از کم اس خطے میں بھارتی فوج کی کمر ٹوٹ جائے گی اور کچھ عرصہ تک ان کی سرگرمیاں محدود ہو جائیں گی۔

ہم دن بھر تپتے ہوئے بنجر پہاڑوں میں سفر کرتے رہے۔ دوپہر کو ایک چھوٹی سی ندی کے پاس رُک گئے۔ یہ واحد ندی تھی جو ہمارے راستے میں آئی تھی۔ کانٹے دار سوکھی ہوئی جھاڑیوں اور کیکٹس کے پودے بکثرت تھے اور کسی قسم کا سبزہ ان پہاڑیوں پر نہیں تھا۔

صبح کھنڈروں میں آنے والے عبدالرحمٰن کے ساتھی کچھ کھانے پینے کی اشیاء ساتھ لے آئے تھے جن میں بھنے ہوئے کابلی چنے بھی تھے۔ ندی کے کنارے پر بیٹھتے تو عبدالرحمٰن نے وہ سب چیزیں تمام ساتھیوں میں بانٹ دیں تاکہ اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتے رہیں۔

تقریباً ایک گھنٹہ وہاں آرام کرنے کے بعد ہم آگے روانہ ہو گئے اور سورج غروب ہونے سے پہلے جھیل مانسر کے جنوب میں واقع پہاڑی پر پہنچ گئے۔ آگے جانا خطرناک تھا۔ عبدالرحمٰن مجھے ایک طرف لے گیا اور ایک چٹان کے پاس جھاڑیوں میں لیٹ کر مجھے ایک بار پھر بریف کرنے لگا۔

بہت خوبصورت منظر تھا۔ کشمیر سے نکلنے کے بعد میں نے پہلی مرتبہ ایسی حسین جگہ دیکھی تھی۔ وسیع و عریض جھیل کا نیلگوں پانی رخصت ہوتی ہوئی دُھوپ میں پگھلے ہوئے سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ جھیل کے اطراف میں گہرا سبزہ تھا سایہ دار اور پھلدار درختوں کی بھرمار تھی۔ سیاحوں کے لئے لاتعداد پرائیویٹ ہٹ بنے ہوئے تھے۔ غالباً ایک طرف تین چار اوپن ایئر ریسٹورنٹ اور اشیائے خورد و نوش کے سٹال بھی تھے۔ اس طرف کچھ کاریں اور دوسری گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔

اسے مقدس جھیل سمجھا جاتا تھا۔ اس کے کناروں پر لوگوں کے لئے لاتعداد چھپر بھی بنے ہوئے تھے جو لوگوں کے اشنان کے لئے مخصوص تھے۔ جھیل میں کچھ شکارے اور ڈونگے بھی تیر رہے تھے۔ جھیل کے کناروں پر بہت سے لوگ بھی دکھائی دے رہے تھے اور میں جانتا تھا کہ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے بہت سے لوگ واپس چلے جائیں گے اور صرف وہی لوگ رہ جائیں گے جنہوں نے یہاں ہٹس کرائے پر لے رکھے تھے۔

جھیل کے جنوبی کنارے پر وہ ریسٹ ہاؤس تھا جو آج کی شب کے لئے فوجی افسروں کے لئے مخصوص تھا۔ ریسٹ ہاؤس کی عمارت خاصی بڑی تھی اور اُس کے سامنے اور اطراف میں بہت لمبے چوڑے خوبصورت لان تھے جنہیں دُور دُور تک قناتوں نے گھیر رکھا تھا۔ ریس ہاؤس کے دوسری طرف دو بڑے فوجی ٹرک اور دو جیپیں کھڑی تھیں اور کئی فوجی وہاں کام کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ تمام لانز میں میزیں اور کرسیاں بچھائی جا رہی تھیں۔

میں گہری نظروں سے ریسٹ ہاؤس کے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہم سے کچھ آگے پہاڑی کا ایک حصہ پھیلی ہوئی ٹانگ کی طرح آگے کو نکلا ہوا تھا۔

''کیا خیال ہے کمانڈر؟'' عبدالرحمٰن نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''وہ آگے کو نکلی ہوئی پہاڑی اور یہ جگہ۔'' میں نے اپنے آگے زمین پر ہاتھ مارا۔ ''یہ دونوں

جگہیں ایسی ہیں جہاں سے ریسٹ ہاؤس اور اس کے لانز کو ٹارگٹ بنایا جا سکتا ہے۔ اور اگر حملہ بھرپور ہو تو وہاں پر موجود بہت کم لوگوں کے زندہ بچنے کی اُمید کی جا سکتی ہے۔'' میں نے ریسٹ ہاؤس کی طرف اشارہ کیا۔

''ہمارے پاس مشین گنوں کے علاوہ دو راکٹ لانچر اور دو مارٹر گنیں بھی ہیں۔'' عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ ''اگر واقعی حملہ بھرپور ہو تو اُن میں سے کوئی نہیں بچے گا۔''

ہم دیر تک پلاننگ کرتے رہے اور بالآخر یہ طے پایا کہ ریسٹ ہاؤس پر حملہ رات بارہ بجے کے قریب کیا جائے جب محفل عروج پر ہو۔ میں نے کہا اور عبدالرحمٰن نے تائید میں گردن ہلا دی۔

سورج غروب ہونے کے دو گھنٹوں بعد تمام مجاہدین کو پہاڑیوں پر پھیلا دیا گیا۔ میں، سیتا اور عبدالرحمٰن اکٹھے ہی تھے اور ہم پتھروں سے ٹیک لگائے بیٹھے وقت گزرنے کا انتظار کرتے رہے۔

جنگل میں منگل کا سا سماں تھا......

جھیل کے پرلی طرف پرائیویٹ ہٹس میں کیروسین آئل لیمپوں اور لالٹینوں کی مدھم روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ جھیل کی پرسکون سطح پر دو تین شکارے تیر رہے تھے۔ اُن پر بھی لالٹینوں یا کیروسین لیمپوں کی مدھم روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ مگر سب سے دلفریب منظر تو ریسٹ ہاؤس کا تھا جہاں رنگ برنگی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ریسٹ ہاؤس میں روشنی کے لئے غالباً جنریٹر کا انتظام کیا گیا تھا۔

ریسٹ ہاؤس کے لان کسی نائٹ کلب کا منظر پیش کر رہے تھے۔ ہیجان خیز موسیقی کی آواز فضا میں پھیل رہی تھی۔ تقریباً بیس میزیں تھیں اور ہر میز پر دو دو چار چار مہمان موجود تھے۔ اُن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ تمام مرد بھارتی سینا کے اعلیٰ فوجی افسر تھے جو سادہ لباس میں تھے۔ یہ سب ہندو سورما تھے جو کشمیر فتح کرنے نکلے ہوئے تھے۔ ان درندہ صفت بھارتی فوجیوں نے جموں اور کشمیر کو شکار گاہ بنا رکھا تھا۔ یہ دن میں مظلوم اور بے گناہ کشمیری مسلمانوں کا شکار کرتے تھے اور راتوں کو اس طرح رنگ رلیاں مناتے تھے۔

اُن کے ساتھ جو عورتیں تھیں وہ جوان تھیں اور حسین بھی۔ یہ فاحشہ عورتیں تھیں جنہیں ان سورماؤں کا دل بہلانے کے لئے یہاں لایا گیا تھا۔ اُن کے لباس ایسے تھے کہ ان کے بدن ان لباسوں کی قید سے پوری طرح آزاد ہونے کے لئے مچلے جا رہے تھے۔

ہر میز پر چکن اور ہرن کے بھنے ہوئے گوشت کے ساتھ انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ اس علاقے میں ہرن بکثرت پائے جاتے تھے اور ان فوجی افسروں کے لئے ہرن خاص طور پر شکار کر کے لائے گئے تھے۔ شراب کی بوتلیں بھی ہر میز پر موجود تھیں اور شراب پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی۔ باوردی فوجی، ویٹر اور اردلی وغیرہ بھاگ بھاگ کر اپنے افسروں کے احکامات بجا لا رہے تھے۔

کھانے کی خالی پلیٹیں اُٹھا لی گئیں۔ میزوں پر صرف شراب کی بوتلیں رہ گئی تھیں۔ بلکہ ہر میز

پر کچھ اور بوتلیں سرو کر دی گئیں۔ موسیقی کی دھن بدل گئی۔ ایک فوجی آفیسر ایک لڑکی کو بازو سے پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ فوجی آفیسر لڑکی کے ساتھ ناچتے ہوئے اس طرح لڑکھڑا رہا تھا جیسے شراب چڑھ گئی ہو۔ لڑکی نے میز پر سے شراب کا گلاس اُٹھا کر اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اُس آفیسر نے شراب کا ایک گھونٹ بھرا اور گلاس لڑکی کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے اُس نے شراب لڑکی کے گریبان کے بلاوز میں انڈیل دی۔

دوسروں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ وہ لڑکی بھی قہقہے میں شامل ہو گئی۔ آفیسر نے اپنے ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھے اور بلاوز ایک جھٹکے سے نیچے کھینچ دیا۔ لڑکی کا بالائی حصہ برہنہ ہو گیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے قہقہے لگانے لگی۔

عبدالرحمٰن مجھ سے تقریباً دس گز کے فاصلے پر بائیں طرف تھا اور سیتا میرے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ بے حیائی کا یہ منظر اُس نے بھی دیکھا۔

''انتہا ہو گئی بے غیرتی کی......'' وہ بڑبڑائی۔

''یہ تمہارے ہی سورما ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''انہوں نے کشمیر کو شکار گاہ بنا رکھا ہے۔ یہ اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ اور جب کوئی فوجی اخلاق اور انسانیت سے اس طرح گر جائے تو وہ بہادری کا کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ کشمیر میں جگہ جگہ ان کی پٹائی ہو رہی ہے اور یہ سب کچھ دیکھ کر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اب یہ لوگ زیادہ عرصہ تک کشمیر میں نہیں ٹک سکیں گے۔ انہیں بہت جلد اپنا بوریا بستر سمیٹنا ہو گا۔''

''یہ میرے لوگ نہیں......'' سیتا بولی۔ ''بلکہ اب میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ان وحشیوں پر پہلی گولی میں چلاؤں۔''

''پہلی گولی تم ہی چلاؤ گی......اطمینان رکھو!'' میں نے کہا اور ایک بار پھر سامنے دیکھنے لگا۔

منظر کچھ اور کھل گیا تھا۔ ہیجان خیز موسیقی میں مختلف جگہوں پر پانچ چھ عورتیں نیم عریاں لباس میں رقص کے نام پر مختلف زاویوں سے جسموں کی نمائش کر رہی تھیں۔ آفیسر بھی اُٹھ اُٹھ کر اُن کے ساتھ بھونڈی حرکتیں کر رہے تھے۔ پھر دوسرے مرد اور عورتیں بھی اپنی جگہوں سے اُٹھتی گئیں۔ رقص کرنے والی عورتوں نے اپنے جسموں کے اُوپر کے لباس اُتار دیئے تھے۔ اُن کے تھلتھلاتے ہوئے بدن مردوں میں مزید ہیجان پیدا کر رہے تھے۔

اپنے قریب ہلکی سی آہٹ سن کر میں نے تیزی سے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ وہ عبدالرحمٰن تھا۔

''کمانڈر!'' اُس نے سرگوشی کی۔ ''بے حیائی کی یہ محفل عروج پر ہے۔''

''ہاں! تم اپنی جگہ پر چلو......'' میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ ''میری طرف سے پہلے فائر کی آواز کے ساتھ ہی بھرپور حملہ شروع کر دینا۔''

عبدالرحمٰن سینے کے بل رینگتا ہوا دوبارہ اپنی جگہ پر چلا گیا۔ میں نے ایک بار پھر ریسٹ

ہاؤس کی طرف دیکھا۔ قناتوں کے باہر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کچھ باوردی فوجی ٹہل رہے تھے۔ وہ یقیناً گارڈ ڈیوٹی پر تھے۔ ریسٹ ہاؤس کے پرلی طرف کئی کاریں اور جیپیں کھڑی تھیں۔ تین ہیوی ٹرک بھی تھے۔

ریسٹ ہاؤس کے برآمدے اور لان میں بے حیائی اور بے غیرتی کا مظاہرہ عروج پر پہنچ چکا تھا اور میرے خیال میں رنگ رلیاں منانے والے ان اعلیٰ ہندو فوجی افسروں اور عورتوں کی تعداد ساٹھ اور ستر کے درمیان رہی ہوگی۔ اُن میں تین سکھ آفیسر بھی تھے۔ اُن کے سروں پر بندھی ہوئی پگڑیاں اُن کی قومیت کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

’’پہلے کبھی رائفل چلائی ہے نا؟‘‘ میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

’’ہاں...... میرے ماما کے پاس بھی ایسی ہی سب مشین گن تھی۔‘‘ سیتا نے اپنی رائفل پر ہاتھ مارتے ہوئے سرگوشی میں جواب دیا۔ ’’اُس نے مجھے یہ رائفل چلانا سکھائی تھی۔ پہلی مرتبہ فائر کیا تھا تو کندھے پر بڑے زور کا جھٹکا لگا تھا۔‘‘

’’تو پھر رائفل کو مضبوطی سے تھامو اور چلا دو پہلی گولی۔‘‘ میں نے کہا۔

ہم دونوں سینے کے بل لیٹے پوزیشن لئے ہوئے تھے۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا رائفل پر اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

’’رائفل کو مضبوطی سے پکڑو اور ٹرائیگر دبا دو!‘‘ میں نے اُس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

سیتا کے جسم میں معمولی سی حرکت پیدا ہوئی اور پھر فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اُٹھی...... سیتا نے ٹرائیگر تو دبا دیا تھا مگر رائفل کا رُخ بھی ذرا سا اُوپر کو اُٹھ گیا تھا اور گولیاں ریسٹ ہاؤس کا رُخ کرنے کی بجائے آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کو نشانہ بنانے کے لئے بلندیوں کی طرف چلی گئی تھیں۔

فائرنگ کی آواز گونجتے ہی ریسٹ ہاؤس کے لان میں بھگدڑ سی مچ گئی اور ٹھیک اُسی وقت دونوں پہاڑیوں پر پھیلے ہوئے مجاہدین نے بھی فائر کھول دیا۔ اُن کے ہتھیار انگارے اُگلنے لگے۔ عبدالرحمٰن بھی سب مشین گن سے ریسٹ ہاؤس کی طرف گولیاں برسا رہا تھا۔

سیتا کی رائفل جھٹکا لگنے سے اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ میں نے لپک کر رائفل اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔

’’شاباش......‘‘ میں نے اُس کا کندھا تھپتھپایا۔ ’’اب تمہیں کوئی خوف نہیں آنا چاہئے۔ دبا دو ٹرائیگر۔‘‘

سیتا کا خوف واقعی دُور ہو گیا تھا اور اب وہ بڑی نپی تلی فائرنگ کر رہی تھی۔ میں نے بھی اپنی سب مشین گن سنبھال کر فائر کھول دیا۔ ریسٹ ہاؤس کے لان میں عجیب تماشا نظر آ رہا تھا۔ کچھ لوگ اپنے آپ کو بچانے کے لئے ریسٹ ہاؤس کی عمارت کی طرف بھاگ رہے تھے کچھ بدحواسی میں ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ اُن کے ٹکرانے سے دونوں طرف کی قناتیں گر گئیں تھیں

اور کئی لوگ قناتوں کی رسیوں سے اُلجھ کر گر رہے تھے۔

وسیع لان میں کئی لاشیں گری تھیں۔ اُن میں مرد بھی تھے اور برہنہ عورتیں بھی۔ میزیں اور کرسیاں اُلٹ گئی تھیں۔ بوتلوں کی شراب گھاس کی آبیاری کر رہی تھی۔

ایک زخمی عورت نے اُٹھ کر بھاگنا چاہا مگر کسی طرف سے آنے والی گولی نے اُس کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑا دیئے اور وہ ڈھیر ہو گئی۔

ریسٹ ہاؤس کی طرف سے محافظ فوجیوں نے بھی پہاڑیوں کی طرف فائرنگ شروع کر دی تھی لیکن ہماری طرف سے فائرنگ زیادہ شدید تھی۔ سب مشین گنوں کے علاوہ ہمارے آدمی اب مارٹر گنیں بھی استعمال کر رہے تھے۔ گولے اِدھر اُدھر گر کر پھٹ رہے تھے۔ ایک گولہ ریسٹ ہاؤس کی چھت پر گرا جس سے چھت کا وہ حصہ اُڑ گیا۔

عبدالرحمٰن سے پرلی طرف بیٹھے ہوئے مجاہد نے راکٹ داغ دیا۔ راکٹ ریسٹ ہاؤس کی عمارت سے ٹکرا کر پھٹا اور دیوار میں سوراخ کرتا ہوا اندر چلا گیا۔ ایک اور راکٹ پھٹا اور اس کے ساتھ ہی تاریکی چھا گئی...... غالباً بجلی کا جنریٹر بھی زد میں آ گیا تھا۔ اندھیرا ہونے سے پہلے میں نے عورتوں اور مردوں کی کئی لاشیں گرتی دیکھی تھیں۔ ہماری طرف سے فائرنگ اندھیرا ہونے کے بعد بھی کئی منٹ تک جاری رہی۔ فائرنگ کے شور میں چیخوں کی آوازیں بھی واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔ اور پھر اندھیرے میں چلایا گیا مارٹر کا ایک گولہ کسی ٹرک پر گرا۔ ٹرک کے پرخچے اُڑ گئے اور شعلوں نے قریب کھڑی ہوئی دو جیپوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔

عبدالرحمٰن سینے کے بل تیزی سے رینگتا ہوا میرے قریب آ گیا۔

’’فائرنگ جاری رکھیں کمانڈر؟‘‘ اُس نے پوچھا۔

’’اب کوئی فائدہ نہیں...... اپنے آدمیوں کو واپسی کا حکم دے دو!‘‘ میں نے کہا۔

عبدالرحمٰن نے پتلون کی جیب سے ایک پستول نکالا اور اُس کا رُخ اوپر کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔ روشنی کی لکیر آسمان کی طرف اُٹھتی چلی گئی اور پھر تاریکی میں سرخ رنگ روشنی کا ایک چھوٹا سا گولہ نمودار ہوا جو پھلجھڑی کی طرح بکھر گیا۔

یہ اپنے ساتھیوں کو واپسی کا اشارہ تھا۔ ہمارے آس پاس موجود مجاہد اپنا اپنا اسلحہ سنبھالے پہاڑیوں کے اندر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

’’تم دونوں میرے ساتھ آؤ کمانڈر!‘‘ عبدالرحمٰن چیخا۔

میں نے سیتا کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم دونوں عبدالرحمٰن کے پیچھے دوڑنے لگے۔

ہمیں تعاقب کا خطرہ نہیں تھا۔ رنگ رلیاں منانے والے فوجی افسروں کے اس ٹولے کی حفاظت کے لئے چند فوجی تھے جن کے پاس صرف سب مشین گنیں تھیں۔ اُنہوں نے اگرچہ جوابی فائرنگ کی تھی لیکن وہ لوگ بھی ہماری فائرنگ کی زد پر تھے۔ اُن میں سے اگر کوئی بچ بھی گئے ہوں گے تو رات کی تاریکی میں ان پہاڑیوں میں ہمارے پیچھے آنے کی جرأت نہیں کریں

گے۔ لیکن ہم جلد سے جلد اس علاقے سے دُور نکل جانا چاہئے تھے۔

ہم دو گھنٹوں تک مسلسل دوڑتے اور تیز رفتاری سے چلتے رہے۔ غیر ہموار راستوں پر کئی مرتبہ ہمیں ٹھوکریں لگی تھیں۔ سیتا تو دو مرتبہ گر بھی چکی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بری طرح تھک گئی تھی اور بار بار لڑکھڑا رہی تھی۔

بالآخر ہم ایک جگہ رُک گئے۔ سیتا آگے کو جھک کر بیٹھ گئی۔ اُس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ میری اور عبدالرحمٰن کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد ہم اپنی کیفیت پر قابو پا سکے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہم اس وقت نشیبی علاقے میں تھے۔ ہمارے اردگرد کیکٹس کے پودے پھیلے ہوئے تھے اور دُور دُور تک پہاڑیاں تھیں۔

ہم تینوں ہی تھے۔ گروپ کا کوئی اور لڑکا ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا۔ وہ لوگ مختلف سمتوں میں نکل گئے تھے۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا اُس نے دونوں ٹانگیں آگے کو پسار لی تھیں اور قدرے پیچھے جھک کر دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹکا رکھی تھیں۔

''مجھے پیاس لگ رہی ہے۔'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن لگتا ہے یہاں کہیں پانی نہیں ملے گا۔''

عبدالرحمٰن بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کندھے پر لٹکی ہوئی پانی کی بوتل اُتار کر سیتا کی طرف بڑھا دی۔ ہم جب باہو قلعہ کے قریبی کھنڈروں سے مانسر جھیل کی طرف روانہ ہوئے تھے تو چار پانچ مجاہدین کے پاس پانی کی بوتلیں دیکھی گئی تھیں۔ اور پھر مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ عبدالرحمٰن کے پاس بھی ایسی کوئی بوتل موجود تھی۔

سیتا نے ایک دو گھونٹ بھرنے کے بعد بوتل میری طرف بڑھا دی۔ بوتل کا وزن بتا رہا تھا کہ اس میں پانی کی مقدار زیادہ نہیں تھی۔ میں نے بھی صرف دو گھونٹ بھرنے کے بعد بوتل عبدالرحمٰن کی طرف بڑھا دی۔ اُس نے بھی ایک دو گھونٹ بھرے اور ڈھکنا بند کر کے بوتل دوبارہ کندھے پر لٹکا لی۔

''میں تو سمجھا تھا کہ تم وہاں سے بھاگ نکلو گی یا کہیں دبک کر خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگو گی۔ لیکن تم تو بہت بہادر ثابت ہوئیں۔'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پہلا جھٹکا تو میرے لئے واقعی نا قابل برداشت تھا۔'' سیتا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''جب ہر طرف سے فائرنگ شروع ہوئی تو ایک لمحہ کو میرا دل چاہا تھا کہ وہاں سے بھاگ نکلوں۔ لیکن تم نے میری ہمت بڑھائی اور میں نے رائفل پر ہاتھ جما دیئے۔''

''ایسے موقع پر بھاگنے کی کوشش کا نتیجہ خوفناک موت کی صورت ہی میں نکلتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پشت پر گولی کھانے سے بہتر ہے کہ آدمی سینہ سپر ہو کر جان دے دے۔''

''یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''آئندہ ایسا کوئی موقع آیا تو سینہ تان کر کھڑی

ہو جاؤں گی۔''

''معاف کرنا سیتا جی......'' عبدالرحمٰن نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے بارے میں، میں کچھ شبہات میں مبتلا تھا۔ لیکن اب مجھے اپنے آپ پر شرمندگی ہو رہی ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔''

''میں نے اپنے بھائی کو معاف کر دیا۔'' سیتا اس مرتبہ کھل کر مسکرا دی۔

''دراصل میرا نام سن کر کوئی بھی یقین نہیں کرے گا کہ مجھے حریت پسندوں سے ہمدردی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اب میں اپنے آپ کو انہی میں سے ایک سمجھتی ہوں۔ اور آپ لوگوں کی تحریک میں رہتے ہوئے اپنی جان تک دے دُوں گی۔ اور اُمید کرتی ہوں کہ اس کے بدلے میں مجھے اس آزاد دھرتی پر دفن ہونے کے لئے دو گز جگہ تو مل ہی جائے گی۔''

''آپ نے حریت پسندوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیوں کیا؟'' عبدالرحمٰن نے پوچھا۔

''یہ کہانی زیادہ پیچیدہ نہیں۔'' سیتا نے جواب دیا اور اپنے ماما کی بستی میں پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں بتانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ ''شمروز کے کردار اور اس کی باتوں نے بھی مجھے متاثر کیا اور تب مجھے ادراک ہوا کہ میں نے غلط دھرتی پر، غلط گھر میں اور غلط وقت پر جنم لیا تھا۔ مجھے تو سرزمین کشمیر کے کسی مسلمان گھرانے میں جنم لینا چاہئے تھا جہاں ہوش سنبھالتے ہی میرے ہاتھوں میں بندوق ہوتی اور میں اپنے ہزاروں مجاہد بھائیوں کے ساتھ دشمن سے برسرپیکار ہوتی اور لوگ مجھے انگوری کے نام سے جانتے۔''

''انگوری......'' عبدالرحمٰن بولا۔ ''آپ تو اُس عظیم مجاہدہ سے ملی ہوں گی سیتا جی؟''

''نہیں...... میں انگوری سے نہیں ملی۔ لیکن وہ واقعی بہت عظیم مجاہدہ تھی۔'' سیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

سیتا نے انگوری کو نہیں دیکھا تھا لیکن اُس کے بارے میں سن سن کر وہ اُس سے بے حد متاثر ہوئی تھی اور دو تین روز سے تو وہ اکثر اُسی کا تذکرہ کرتی رہتی تھی۔

ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا اور پھر ہم اُٹھ کر آگے چل پڑے۔ عبدالرحمٰن کا خیال تھا کہ جموں میں بھارتی فوجی ہائی کمان کو اس واقعہ کی اطلاع مل گئی ہو گی اور ہو سکتا ہے کہ فوجی دستے ہماری تلاش میں پہاڑوں کی طرف روانہ ہو چکے ہوں۔ حالانکہ اس کی توقع کم تھی۔ کیونکہ بھارتی فوجی رات کی تاریکی میں پہاڑوں کی طرف جانے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ البتہ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے ہماری تلاش شروع کر دی جائے۔ جموں کشمیر میں بھارتی فوج کے پاس ایسے روسی گن شپ ہیلی کاپٹر بھی موجود تھے جن میں لگے ہوئے آلات سے رات کی تاریکی میں بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ ہیلی کاپٹر بلندی پر پرواز کرتے ہوئے ہمیں تلاش کر سکتے تھے اس لئے ہم جلد سے جلد کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جانا چاہتے تھے۔

ہم بنجر اور ویران پہاڑیوں میں تیز تیز چلتے رہے۔ سیتا نے اپنی رائفل کندھے پر لٹکا رکھی تھی اور میں نے اُس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

اور پھر میرے وہ بدترین خدشات درست ثابت ہوئے...... فضا میں ہیلی کاپٹر کے پروں کی ہلکی سی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دینے لگی...... عبدالرحمٰن چیخا۔

''کمانڈر...... بھاگو...... اس طرف۔''

وہ ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے سیتا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر ایک طرف دوڑ لگادی جہاں کچھ اُونچے ہیولے سے نظر آرہے تھے۔ ہیلی کاپٹر کی آواز واضح ہوتی جارہی تھی۔ اور پھر وہ ہیلی کاپٹر نظر آگیا...... وہ گن شپ ہیلی کاپٹر نہیں تھا۔ اُس کے نیچے سرچ لائٹ نصب تھی۔ کاپٹر کے پیندے سے پھوٹنے والی دھار نیچے آتے ہوئے پھیلتی چلی گئی تھی اور ایک وسیع علاقہ تیز روشنی کی زد میں تھا۔

عبدالرحمٰن ایک چٹان کی کھوہ میں دبک گیا تھا۔ ہم اس سے کچھ فاصلے پر تھے اور ہمارا رُخ بھی کسی قدر دوسری طرف تھا۔ ہم سے چند گز آگے کیکٹس کے درختوں کا ایک جھنڈ سا تھا۔ جھنڈ سے چند گز دُور سیتا لڑکھڑا کر گری۔ ہیلی کاپٹر قریب آرہا تھا...... میں نے جھک کر سیتا کا ہاتھ پکڑا اور اُسے گھسیٹتا ہوا کیکٹس کے جھنڈ میں لے گیا۔

کیکٹس کے پودے ڈنٹھل کی صورت میں بالکل سیدھے ہوتے ہیں اور اُن پر چھوٹی چھوٹی پتیاں بھی برائے نام ہی ہوتی ہیں۔ اس لئے ان پودوں کا سایہ بھی گھنا نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارے کپڑے گہرے رنگ کے تھے اس لئے یہ اُمید ہی کی جاسکتی تھی کہ ہمیں اُوپر سے نہیں دیکھا جاسکے گا۔

میں نے سیتا کو ساتھ لیتے ہوئے کیکٹس کے پودوں کے جھنڈ میں چھلانگ لگادی۔ سیتا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں بھی بے اختیار کراہ اُٹھا تھا...... کانٹوں سے میرے ہاتھ اور بازو چھل گئے تھے۔ چہرے پر بھی ایک خراش آئی تھی۔ اور غالباً سیتا کو بھی کانٹے ہی چبھے تھے اس لئے وہ چیخی تھی۔

سیتا میرے ساتھ لپٹ گئی تھی۔ ہم دونوں بے حس وحرکت پڑے رہے۔ ہیلی کاپٹر بلندی پر پرواز کرتا ہوا ہماری طرف ہی آرہا تھا۔ اور پھر تیز روشنی کا وہ وسیع وعریض دائرہ ہم سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے سے گزر گیا...... ہیلی کاپٹر کے کافی دُور نکل جانے کے بعد بھی ہم بے حس و حرکت پڑے رہے۔ اور پھر پہلے میں نے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سیتا کو ہٹا کر آہستہ آہستہ اُٹھتے ہوئے پیچھے کی طرف رینگنے لگا۔ سیتا بھی اسی طرح رینگتے ہوئے پودوں کے جھنڈ سے باہر آگئی۔ وہ کراہ رہی تھی۔ میرے جسم پر بھی خراشیں آئی تھیں جن میں شدید جلن ہورہی تھی۔ عبدالرحمٰن بھی اپنی کمین گاہ سے نکل آیا تھا۔ ہم چند لمحے وہاں کھڑے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے اور پھر تیزی سے ایک طرف چلنے لگے۔

ہم نے ریسٹ ہاؤس پر جس شدت سے فائرنگ، راکٹ اور گولے برسائے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں اچھا خاصا جانی نقصان ہوا تھا۔ کئی لاشیں تو میں نے اپنی آنکھوں سے گرتے ہوئے دیکھی تھیں۔ وہ سب فوج کے اعلیٰ افسران تھے۔ اُن میں سے کئی یقینی طور پر مارے گئے ہوں گے۔ کمانڈ ہیڈ کوارٹر میں اطلاع ملتے ہی کہرام مچ گیا ہوگا۔ جس طرح رات ہی میں ہیلی کاپٹروں کے ذریعے ہماری تلاش شروع ہوگئی تھی اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ ہر قیمت پر ہمیں پکڑنا چاہتے تھے اور مجھے یقین تھا کہ فوج کے کئی دستے بھی ہماری تلاش میں پہاڑیوں میں پہنچ گئے ہوں گے تاکہ ہمیں زیادہ دُور جانے کا موقع نہ مل سکے۔

ہم کہیں رُکے بغیر تیز تیز چلتے رہے۔ اس دوران ایک مرتبہ اور ہمیں ہیلی کاپٹر سے بچنا پڑا تھا۔ لیکن اس کے بعد ایسی کوئی صورتحال پیش نہیں آئی تھی۔

سیتا کی بری حالت ہورہی تھی لیکن میں اُسے ہاتھ سے پکڑے کھینچتا رہا۔ شہر کی رہنے والی ناز ونعم میں پلی ہوئی لڑکی ایک ایسی افتاد میں مبتلا ہوگئی تھی جس سے نبرد آزما ہونے کی وہ کوشش کر رہی تھی۔ پو پھوٹنے لگی تھی۔ اُس وقت تک ہم جموں شہر سے میلوں دُور دریا کے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ اس علاقے میں کچھ دُور تک درخت بھی تھے۔ ہم تھوڑی دیر دریا کے کنارے پر رُکے اور پھر تازہ دم ہوکر آگے بڑھنے لگے۔ اب ہمیں درختوں اور اُونچی چٹانوں کی آڑ بھی حاصل تھی۔ اگر کوئی ہیلی کاپٹر اس طرف آبھی جاتا تو ہم آسانی سے کہیں چھپ سکتے تھے۔

دن کی روشنی پھیل گئی اور پھر دُھوپ نکل آئی۔ ہم دریا کے ساتھ ساتھ چٹانوں میں چلتے رہے۔ دُھوپ جیسے جیسے تیز ہورہی تھی چٹانیں تپ رہی تھیں اور گرمی میں اضافہ ہورہا تھا۔ میری قمیض پسینے میں تر ہوگئی۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا اُس کی بھیگی ہوئی قمیض بھی جسم سے چپکی ہوئی تھی۔ عبدالرحمٰن کی حالت بھی ہم سے مختلف نہیں تھی۔

''اور کتنی دُور جانا ہے...... کوئی ٹھکانہ ہے یا ہم اسی طرح ویران پہاڑوں میں بھٹکتے رہیں گے؟'' سیتا نے ایک جگہ رُک کر کہا۔ اُس کا سانس پھول گیا تھا اور وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔

''اب ہم اپنی منزل کے قریب پہنچنے والے ہیں۔'' عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ ''زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔'' اور پھر واقعی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم ایک غار میں پہنچ گئے۔ وہ غار بھی عجیب طرح کا تھا۔ ایک ندی سے دوسری طرف سنگلاخ چٹانوں میں گہرائی کی طرف ایک تنگ سی سرنگ تھی۔ تقریباً دس فٹ ڈھلان اُترنے کے بعد ہموار جگہ تھی اور وہیں سے غار دائیں طرف مُڑ گیا تھا جو کافی کشادہ اور سرنگ کی طرح بہت طویل تھا۔ دوسری طرف تقریباً بیس گز آگے روشنی نظر آرہی تھی۔ اُس سرنگ میں بھی اُوپر کسی طرف سے پانی بہہ رہا تھا جس سے تقریباً ڈیڑھ فٹ چوڑی ندی سی بن گئی تھی۔

''یہی جگہ مناسب رہے گی۔'' عبدالرحمٰن ایک صاف سی جگہ دیکھ کر رُک گیا۔ ''یہاں پانی بھی ہے اور ہوا بھی آرہی ہے۔''

سیتا ایک دم ڈھیر ہوگئی اُس نے جانوروں کی طرح ندی میں منہ لگا کر پانی پیا اور پھر پشت کے بل لیٹ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہی ہمارے حواس ٹھکانے آ سکے تھے۔ ہمارے کپڑے پسینے میں بھیگے ہوئے تھے اور غار کے کھلے حصے سے آنے والی ہوا سے جسم میں ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا۔

عبدالرحمٰن نے پتلون کی جیب سے ایک چھوٹی سی پوٹلی نکال کر سامنے رکھ دی۔ اُس میں بھنے ہوئے سفید کابلی چنے تھے۔ میری پتلون کی جیب میں بھی چنے موجود تھے جو میں نے نکال کر اُس کھلی ہوئی پوٹلی میں ڈال دیئے۔ ہم تینوں نے چنے کھائے اور پیٹ بھر کر پانی پی لیا۔

''یہ غار کہاں پر ہے...... میرا مطلب ہے قرب و جوار میں کوئی آبادی ہے یا......'' سیتا نے رحمٰن کی طرف دیکھتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''یہاں سے پانچ میل دُور مستواری نام کا ایک قصبہ ہے۔'' عبدالرحمٰن بتا رہا تھا۔ ''جموں سے ٹرین پر سوار ہوں تو دس بارہ میل کے فاصلے پر مستواری پہلا ریلوے سٹیشن ہے۔ قصبہ زیادہ بڑا نہیں ہے۔ ہندوؤں، سکھوں، ڈوگروں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی ہے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہم اس قصبے میں پہنچ جائیں گے۔ وہاں دو تین گھر ہمارے محفوظ ٹھکانے ہیں۔ دو چار روز وہاں رہ کر صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد ہی کوئی اگلا قدم اُٹھائیں گے۔''

''ٹھیک ہے...... فی الحال تو آرام کرنے کو جی چاہتا ہے۔'' میں نے کہا اور دیوار سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پسار لیں۔ سیتا مجھ سے پہلے ہی آنکھیں بند کر چکی تھی۔

''ٹھیک ہے...... تم لوگ کچھ آرام کر لو۔ میں جاگ رہا ہوں۔'' رحمٰن نے کہا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد میں بھی دیوار سے ٹیک لگائے اونگھنے لگا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ رحمٰن نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ تھی اور آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی جیسے کسی نے مٹھی بھر مرچیں جھونک دی ہوں۔

''اُٹھ جاؤ کمانڈر...... باہر کوئی آ رہا ہے۔'' رحمٰن نے سرگوشی کی۔

میں اُچھل پڑا۔ میری نیند کافور ہوگئی۔ میں نے لپک کر رائفل اُٹھا لی اور سیتا کو بھی جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

''اُس طرف......'' عبدالرحمٰن نے سرگوشی کی۔ ''اُس تاریک گوشہ میں۔'' ہم تینوں بڑی پھرتی سے غار کے ایک تاریک گوشے میں دبک گئے۔ سیتا کو پیچھے کر دیا گیا تھا اور میں اور عبدالرحمٰن رائفلیں سنبھالے آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگے۔

غار کے ندی والے دہانے کی طرف سے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی جو لمحہ بہ لمحہ قریب پہنچ رہی تھی......!

○○○

قدموں کی آواز سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کم از کم دو آدمی تھے جو بڑے محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ہم نے اپنی رائفلیں بالکل تیار کر رکھی تھیں۔

ہم تاریکی میں تھے اور ہماری نظریں غار کے موڑ کی طرف لگی ہوئی تھیں جہاں سے گزر کر ہم بھی اس طرف آئے تھے۔ قدموں کی آہٹ بالکل قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر ایک انسانی ہیولہ موڑ گھوم کر سامنے آ گیا۔ وہاں بھی روشنی زیادہ نہیں تھی لیکن اُس انسانی ہیولے کا لباس دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان سا ہوا تھا کہ وہ پولیس یا فوج کی وردی نہیں تھی۔

''لگتا ہے اس طرف کوئی نہیں آیا۔'' ایک آواز سنائی دی۔

''ہو سکتا ہے اس طرف کا کسی کو خیال نہ آیا ہو اور وہ دوسری طرف گئے ہوں۔ بہرحال ہمیں یہاں تھوڑی دیر آرام کا موقع مل جائے گا۔'' یہ دوسری قدرے بھاری سی آواز تھی۔

''یہ اپنے ہی لڑکے ہیں۔'' عبدالرحمٰن نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ان میں ایک تو وقاص ہے۔ تم یہیں رُکو! میں معلوم کرتا ہوں۔'' عبدالرحمٰن کسی قدر آگے بڑھ گیا اور پھر اُس نے سرگوشیانہ انداز میں وقاص کا نام لے کر پکارا۔

''کون ہے...... ادھر کون ہے؟ سامنے آ جاؤ......!'' وہی بھاری آواز غار میں گونجتی ہوئی سنائی دی۔

''میں ہوں...... عبدالرحمٰن۔'' رحمٰن کہتے ہوئے مزید آگے بڑھ گیا۔ اور پھر وہ دونوں بھی آگے آ گئے۔ اُن میں ایک وقاص تھا اور دوسرا حمید۔ یہ دونوں بھی رات کی چھاپہ مار کارروائی میں ہمارے ساتھ شامل تھے۔ میں اور سیتا بھی تاریکی سے نکل کر سامنے آ گئے۔ ہمیں دیکھ کر اُن دونوں کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

وہ دونوں ندی کے کنارے پر بیٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگے اور پھر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اُن دونوں کے چہروں سے تھکن نمایاں تھی۔

''کس طرف سے آ رہے ہو تم لوگ......؟'' کچھ دیر بعد رحمٰن نے وقاص کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہم لوگ دھتریال کی طرف نکل گئے تھے۔'' وقاص نے جواب دیا۔ ''لیکن اُس طرف خطرہ محسوس کر کے ہم طویل چکر کاٹتے ہوئے اس طرف آ گئے۔ کیونکہ ہمارے خیال میں یہی جگہ سب سے محفوظ تھی۔ اچھا ہوا تم لوگ بھی یہاں پہنچ گئے ہو۔ ہر طرف تو راستے بند ہو چکے

ہیں۔ جموں شہر اور اس کے نواحی علاقوں کو فوج نے پوری طرح گھیرے میں لے لیا ہے کیونکہ ان کے خیال میں ریسٹ ہاؤس پر حملہ کرنے والے اگر وادی شہر اور اُس کے نواح ہی میں کسی طرف چھپے ہوئے ہیں۔ لیکن تمہارے لئے ایک بری خبر بھی ہے۔''

''وہ کیا......؟'' عبدالرحمن نے بے تابی سے پوچھا۔

''فیروز اور بشیر ہمارے ساتھ نہیں رہے۔'' وقاص نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' رحمن نے اُسے گھورا۔

''ہم پانچ آدمی پہاڑیوں سے بھاگ کر مانسر جھیل کے دوسری طرف چلے گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم نندانی کی طرف نکل جائیں گے۔ لیکن پہاڑیوں میں بھٹک کر ایک طویل چکر لگانے کے بعد دوبارہ جھیل کی طرف پہنچ گئے۔ اُس وقت تک شہر سے فوج اور پولیس کی ایک بڑی نفری مانسر جھیل پر پہنچ چکی تھی اور فوجی دستے پہاڑیوں میں گھس آئے تھے۔ ایک جگہ ہمارا تصادم ہو گیا۔ بشیر اور فیروز گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ عباس پکڑا گیا۔ میں اور حمید کسی طرح ان پہاڑیوں سے نکل کر نندانی کی طرف نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن نندانی کی طرف بھی خطرہ محسوس کر کے اس طرف آ گئے۔''

''عباس پکڑا گیا ہے تو بہت برا ہوا۔'' عبدالرحمن بولا۔ ''ویسے کچھ پتہ چلا اُن کے کتنے آدمی مارے گئے تھے؟''

''کچھ پتہ نہیں......'' وقاص نے جواب دیا۔ ''اچھے خاصے مارے گئے ہوں گے۔ وہ سب اعلیٰ افسر تھے اس لئے تو پوری ہائی کمان پاگل ہو رہی ہے۔ کئی پلاٹون پہاڑوں میں ہمیں تلاش کر رہی ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے یہ جگہ بھی محفوظ نہیں ہے۔ تلاش کا دائرہ وسیع کیا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ یہاں تک پہنچ جائیں آپ لوگوں کو یہاں سے نکل جانا چاہئے۔''

''ہم شام کا اندھیرا پھیلتے ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔ تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟'' عبدالرحمن نے پوچھا۔

''ہم لوگ بھی ندی کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے نواحی شہر کی طرف نکل جائیں گے اور اگر موقع ملا تو وہاں سے سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔'' وقاص نے جواب دیا۔

وہ لوگ دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ اُن کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ایسی صورتحال میں ستواری بھی ہمارے لئے محفوظ نہیں تھا۔ وہ ریلوے سٹیشن جموں سے دس بارہ میل ہی کے فاصلے پر تھا۔ اگر جموں شہر کو سیل کر دیا گیا تو ستواری کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے اس خدشے کا اظہار کیا تو عبدالرحمن بولا۔

''رسک تو لینا پڑے گا کمانڈر! اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ ان بنجر پہاڑوں میں دور دور تک کوئی بستی نہیں۔ اگر تلاش کا سلسلہ یہاں تک پہنچ گیا تو ہم زندگی بھر ان پہاڑوں سے نہیں

نکل سکیں گے۔''

وہ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہم لوگ پروگرام بناتے اور رد کرتے رہے اور بالآخر یہی طے پایا کہ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی یہاں سے نکل کر ستواری کا رُخ کیا جائے۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی ہم روانہ ہو گئے۔ تقریباً ایک میل تک ہم سب دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ اکٹھے ہی چلتے رہے۔ اور پھر ہم تینوں نے راستہ بدل لیا اور وقاص اور حمید دریا کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے گئے۔

پہاڑوں میں پانچ میل کا وہ فاصلہ طے کرنے میں ہمیں تقریباً ایک گھنٹہ لگا تھا اور اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ قصبہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ عبدالرحمن نے ہمیں کھیتوں میں روک دیا اور اپنی رائفل بھی ہمارے حوالے کر کے خود قصبے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُس کی واپسی تقریباً دو گھنٹوں بعد ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک اور ادھیڑ عمر آدمی بھی تھا جو ہمارے لئے کھانا بھی لے آیا تھا۔

وہ سکندر تھا۔ اُس سے ملنے والی اطلاعات بڑی خوفناک تھیں...... سکندر کے کہنے کے مطابق آج صبح سویرے ایک فوجی پارٹی اس طرف آئی تھی۔ بعض مسلمانوں اور مشتبہ کردار کے حامل ہندوؤں کے گھروں کی تلاشی بھی لی گئی تھی۔ فوج تو دو تین گھنٹوں بعد واپس چلی گئی تھی لیکن سادہ لباس میں چند آدمی اب بھی قصبے میں موجود تھے جن کے بارے میں سب ہی کو یہ شبہ تھا کہ ان کا تعلق انٹیلی جنس سے ہے۔

دوسری خوفناک اطلاع یہ تھی کہ رات کو ہمارے دو آدمی پکڑے گئے تھے۔ عباس تو رات ہی کو پکڑا گیا تھا جبکہ دلاور نامی نوجوان صبح سویرے ان پہاڑیوں میں فوجیوں کے ہاتھ لگا تھا اور دلاور نے تشدد کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور یہ بتا دیا تھا کہ یہ منصوبہ عبدالرحمن نے تیار کیا تھا اور چھاپہ مار کارروائی کی قیادت شمروز نے کی تھی۔ اس کے ساتھ سیتا نام کی ایک ہندو لڑکی بھی تھی۔ دلاور نے یہ بھی شبہ ظاہر کیا تھا کہ وہ لوگ باہو قلعہ کے نواحی کھنڈرات میں ہیں یا جموں کے مغرب میں واقع وشنو دیو کے غاروں والے مندر میں پناہ لے سکتے ہیں۔ اور یہ اتفاق تھا کہ وشنو دیو کے مندر والے غار شہر کے مخالف سمت میں سینتیس میل کے فاصلے پر تھے اور باہو قلعہ بھی شہر کے دوسری طرف تھا۔ جبکہ ہم پہاڑیوں میں طویل چکر کاٹتے ہوئے مخالف سمت میں آ گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہماری تلاش کے لئے تمام تر توجہ اُس طرف ہو گی۔

سکندر کے کہنے کے مطابق آج صبح جموں سے پٹھانکوٹ جانے والی ٹرین کو بھی جموں سٹیشن سے روانگی کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ شہر اور اُس کے نواحی علاقوں کو مکمل طور پر سیل کر دیا گیا تھا اور ہماری تلاش میں پورے شہر میں گھر گھر تلاشی لی جا رہی تھی اور ہمارا اُس طرف رُخ کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔

سکندر سے ملنے والی اہم ترین خبر یہ تھی کہ رات کو ہماری چھاپہ مار کارروائی میں سترہ فوجی آفیسر مارے گئے تھے جن میں تین بریگیڈیئر، پانچ کرنل اور میجر اور کیپٹن وغیرہ تھے۔ کئی آفیسر

شدید زخمی ہوئے تھے۔ ان فوجی آفیسروں کے ساتھ مرنے والی عورتوں کی تعداد سولہ تھی۔ جبکہ کئی عورتیں شدید زخمی ہوئی تھیں۔ عبدالرحمن کے کہنے کے مطابق جموں کے کور کمانڈر کو بھی اس محفل میں شریک ہونا تھا مگر وہ کسی وجہ سے نہیں آ سکا تھا اور اُس کی قسمت ہی اچھی تھی کہ وہ وہاں سے دُور ہی رہا تھا۔

سکندر کے کہنے کے مطابق آج صبح ہی سے دہلی سے ہیلی کاپٹروں کی آمد و رفت لگی ہوئی تھی۔ کئی منتری اور اعلیٰ ترین سرکاری حکام صبح سویرے ہی دلی سے جموں پہنچ گئے تھے۔

ستواری ریلوے سٹیشن پر فوجیوں کی ایک پارٹی صبح ہی سے موجود تھی۔ وہ ہر شخص پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے اور بعض بے گناہوں کو پکڑ کر مارا پیٹا بھی گیا تھا۔

سکندر کے کہنے کے مطابق ان حالات میں ہمارا قصبے میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اُس نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ہم وہاں رُکنے کی بجائے آگے روانہ ہو جائیں۔ دس میل آگے ایک اور گاؤں اور ریلوے سٹیشن تھا۔ شاید وہاں صورتحال بہتر ہو۔

سکندر نے ہمارے لئے خچروں کا بندوبست کر دیا اور ہم آبادی سے دُور رہتے ہوئے آگے روانہ ہو گئے۔ لیکن اگلا گاؤں بھی ہمارے لئے محفوظ نہیں تھا۔ اس طرح ہم وہاں بھی رُکے بغیر آگے نکل گئے۔ اس طرح ہم خچروں پر رات بھر سفر کرتے ہوئے سامبا پہنچ گئے۔

سامبا ایک بڑا قصبہ تھا اور نواح میں پہاڑی سلسلہ بھی بتدریج ختم ہوتا جا رہا تھا۔ آگے میدانی علاقہ تھا اور سرسبز فصلیں لہراتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ سامبا کے نواح میں ایک جگہ ہمیں پناہ مل گئی۔ وہ دن اور رات ہم نے وہیں گزاری اور اُس سے اگلے روز ہم عبدالرحمن سے رخصت ہو کر پٹھان کوٹ کی طرف جانے والی بس پر سوار ہو گئے۔ ہمارے ساتھ دو بوڑھی عورتیں اور دو آدمی بھی تھے۔ سیتا اُن عورتوں کے ساتھ تھی اور میں اُن دو بوڑھے آدمیوں کے بیچ میں بیٹھ گیا تھا۔

جسمیر گڑھ میں بس رُکی تو پولیس کی بھاری نفری نے بس کو گھیرے میں لے لیا اور بس سے اُترنے والے ہر مسافر سے پوچھ گچھ کی جانے لگی۔ دو پولیس والے بھی بس میں گھس آئے تھے۔ مجھ سے بھی کچھ ایسی باتیں پوچھی گئیں جن کے بارے میں مجھے پہلے سے سمجھا دیا گیا تھا۔ میں کہاں سے آیا ہوں؟ مجھے کہاں جانا ہے؟ میرے رشتے داروں کے نام کیا ہیں اور وہ کیا کام کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ میرے ساتھ بیٹھا ہوا بوڑھا نواب دین بھی اس آڑے وقت میں بڑا کام آیا تھا۔ اُس نے سامبا کے ایک پولیس آفیسر کا نام بھی لے دیا کہ ہم اُس کے رشتہ دار ہیں۔ ہمارے بارے میں اُس سے معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

خدا خدا کر کے سہ پہر کے قریب بس پٹھان کوٹ پہنچ گئی۔ بس سے اُترتے ہوئے بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ آس پاس کھڑے ہوئے چند پولیس والے اور کچھ سادہ لباس، مسافروں کو کڑی نظروں سے گھور رہے تھے۔ جموں کی طرف سے آنے والے ہر شخص کو مشتبہ نگاہوں سے

دیکھا جا رہا تھا۔

جموں کی طرف سے آتے ہوئے پنجاب کا پہلا بڑا شہر پٹھان کوٹ ان چند شہروں میں سے ایک تھا جس کی تعمیر میں مغلوں نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ کشمیر کی گزرگاہ پر واقع ہونے کی وجہ سے اس شہر کو دلی سے کشمیر جانے والے مغل شہنشاہوں اور شہزادوں کے ایک پڑاؤ کی حیثیت حاصل تھی۔ ہر مغل شہزادے نے حسب توفیق یہاں اپنی نشانیاں اور یادگاریں قائم کی تھیں۔ شہر کا سب سے خوبصورت پارک (شاہی باغ) اب بھی شہنشاہ جہانگیر کے عہد کی یاد دلاتا ہے۔ دُور تک پھیلا ہوا یہ شہر قدیم و جدید فن تعمیر کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔ یہاں قدیم تہذیب بھی دیکھنے کو ملتی ہے اور جدید ثقافت بھی۔

اس شہر کی زیادہ آبادی سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ دوسری قومیں بھی آباد ہیں۔ مگر عبادت گاہوں میں زیادہ تعداد سکھوں کے گردواروں اور ہندوؤں کے مندروں کی ہے۔ جبکہ شہر کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی چند مساجد بھی ہیں۔

وہ دوپہر کا وقت تھا اور شدید گرمی تھی۔ لو کے تھپیڑے چل رہے تھے۔ ہم ان دونوں بوڑھی عورتوں اور بوڑھے مردوں کے ساتھ چلتے رہے۔ سیتا نے مسلمان عورتوں کی طرح دوپٹے سے گھونگھٹ نکال رکھا تھا۔ یہاں اگرچہ اُسے پہچان لئے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا لیکن وہ اپنے آپ کو ایک مسلمان عورت پوز کر رہی تھی اور اس خیال سے اُس نے غیر مردوں سے پردہ ضروری سمجھا تھا۔

تانگہ اسٹینڈ پر کوچوان شہر کے مختلف علاقوں کی آوازیں لگا رہے تھے اور لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اپنے تانگوں کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک تانگے والا محلہ فیروز پورہ کی آوازیں لگا رہا تھا۔ ہم اُس کے تانگے پر بیٹھ گئے۔ میں اُن دو بوڑھوں کے ساتھ آگے بیٹھ گیا جبکہ سیتا عورتوں کے ساتھ پیچھے بیٹھ گئی تھی۔ اُن کا سامان، ایک گٹھڑی جس میں سامبا کی کچھ سوغاتیں تھیں، میں نے اپنی سیٹ کے آگے پیروں کے قریب رکھ لی تھی۔

شدید گرمی کے باوجود شہر کی سڑکوں پر ٹریفک کا اژدھام تھا۔ بازاروں میں خوب رونق تھی۔ تانگہ مختلف سڑکوں پر ہوتا ہوا تقریباً پون گھنٹے میں محلہ فیروز پورہ میں ایک مسجد کے قریب رُک گیا۔ عمر دین نامی ایک بوڑھے نے کرایہ ادا کیا اور ہم نیچے اُتر آئے۔ میں نے وہ گٹھڑی سر پر اُٹھا لی اور اُن کے پیچھے چلنے لگا۔ سیتا بھی میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

فیروز پورہ میں ایک مین بازار اور دائیں بائیں لاتعداد گلیاں تھیں۔ بعض گلیاں تو کافی کشادہ تھیں اور بعض گلیاں اس قدر تنگ تھیں کہ تین آدمی پہلو بہ پہلو بمشکل چل سکتے تھے۔ زیادہ آبادی سکھوں اور مسلمانوں کی تھی۔ ہندو بھی نظر آ رہے تھے۔

تقریباً ایک فرلانگ تک مین بازار میں چلنے کے بعد ہم ایک کشادہ گلی میں داخل ہو گئے۔ سرخ اینٹوں کے مکان قدیم فن تعمیر کی عکاسی کر رہے تھے لیکن بیشتر مکانوں میں اپنی ضرورت

اور عہد حاضر کے مطابق تبدیلیاں کر لی گئی تھیں۔ زیادہ تر مکان دومنزلہ تھے۔ اس کشادہ گلی میں تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک اور گلی میں داخل ہو گئے اور دائیں طرف والے چوتھے مکان کے سامنے رُک گئے۔

دستک کے جواب میں دروازہ جلد ہی کھل گیا۔ اس مرکزی دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی ایک طرف بیٹھک کا دروازہ تھا اور دوسری طرف اوپر جانے کے لئے سرخ اینٹوں والی سیڑھیاں۔

بیٹھک کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر پنکھا چل رہا تھا مگر کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ عمر دین نے مجھ سے گٹھڑی لے لی۔ مجھے اور سیتا کو بیٹھک میں بٹھا کر وہ سب لوگ اندر چلے گئے۔ سیتا نے چہرے پر سے گھونگھٹ ہٹا دیا بلکہ دوپٹہ اُتار کر ایک کرسی پر ڈال دیا اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ پسینے سے اُس کا چہرہ بھی تر ہو رہا تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

ایک دیوار پر قریب قریب خانہ کعبہ اور مسجد نبویؐ کی رنگین تصاویر فریم میں آویزاں تھیں۔ دوسری دیوار پر کسی کمپنی کا کیلنڈر آویزاں تھا۔ کمپنی کا نام ہندی میں چھپا ہوا تھا۔ فرش پر ایک پرانا سا قالین بچھا ہوا تھا اور فرنیچر بھی درمیانے درجے کا تھا جس سے گھر والوں کی مالی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک ادھیڑ عمر عورت ایک ٹرے اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹرے میں دو گلاس اور ایک شیشے کا جگ تھا جو لیموں کے شربت سے لبریز تھا۔ اس عورت کے اندر داخل ہوتے ہی سیتا نے جلدی سے دوپٹہ اُٹھا کر سر پر ڈال لیا اور میں بھی کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اُس عورت کو سلام کیا۔

عورت نے ٹرے تپائی پر رکھ کر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، سیتا کو گلے سے لگا کر پیشانی پر بوسہ دیا۔ ''بیٹھو تم لوگ۔ کھڑے کیوں ہو؟'' وہ باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''پانی پیو! دھوپ سے آئے ہو۔ پیاس لگ رہی ہوگی۔''

ہم دونوں بیٹھ گئے اور ایک ایک گلاس اُٹھا لیا۔ گلاس خالی ہوئے تو اُس عورت نے جگ اُٹھا کر انہیں دوبارہ بھر دیا۔

''میں عبدالرحمٰن کی ماسی زبیدہ ہوں۔'' وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولی۔ ''مجھے عمر دین نے تم لوگوں کے بارے میں تھوڑا سا بتا دیا ہے۔ یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے کہ تم دونوں نے ہمارے گھر کو رونق بخشی۔'' وہ اگرچہ اُردو میں بات کر رہی تھی مگر لہجہ کشمیری تھا اور پنجابی زبان کے الفاظ بھی بکثرت استعمال کر رہی تھی۔ ''اس کو اپنا ہی گھر سمجھنا بیٹا! اور کوئی تکلف نہ کرنا۔ جس چیز کی بھی ضرورت ہو بلاتکلف کہہ دینا۔''

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ بوڑھا عمر دین دروازے میں نمودار ہوا۔ اُس کے پیچھے دونوں عورتیں اور دوسرا بوڑھا بھی تھا۔

''اچھا زبیدہ بیٹی...... اب ہم چلتے ہیں۔'' عمر دین نے کہا۔ ''عبدالرحمٰن نے ایک امانت ہمارے سپرد کی تھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں وہ امانت تم تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔'' اُس نے بات کرتے ہوئے میری اور سیتا کی طرف دیکھا تھا۔

''ایسی کیا جلدی ہے ماما جی...... روٹی کھا کے جانا۔ ابھی تو بہت تیز دھوپ ہو رہی ہے۔'' زبیدہ نے کہا۔

''ساری زندگی دھوپ میں جلتے ہوئے گزری ہے۔ اب یہ ہمارا کیا بگاڑ لے گی؟ روٹی ہم محمد شفیع کے ہاں کھا لیں گے۔'' عمر دین نے جواب دیا۔ زبیدہ کے اصرار کے باوجود وہ نہیں رُکے۔ اُن سب نے ہم دونوں کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور رخصت ہو گئے۔

''عمر دین میرا ماما ہے۔'' زبیدہ نے بتایا۔ ''اس کا بیٹا محمد شفیع یہاں سرکاری نوکری کرتا ہے۔ سامبا میں ان کی تھوڑی سی زمین ہے۔ یہ ہفتہ دس دن میں یہاں آتے رہتے ہیں۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''تم لوگ نہا دھو لو۔ میں اتنے میں آٹا گوندھ کر روٹیاں پکا لیتی ہوں۔ آؤ...... میرے ساتھ آؤ۔''

ہم زبیدہ کے ساتھ بیٹھک سے باہر آ گئے۔ بڑا لمبا چوڑا پختہ صحن تھا جس کے عین وسط میں اُونچا اور گھنیرا نیم کا درخت لگا ہوا تھا۔ اُس کا گہرا سایہ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ دو کمرے سامنے تھے اور دو دائیں طرف۔ دونوں طرف برآمدے تھے۔ ایک طرف باورچی خانہ تھا اور اوپر جانے والی سیڑھی کے ساتھ ایک غسل خانہ تھا۔

''ایک غسل خانہ تو یہ ہے۔'' وہ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اور کمرے میں بھی غسل خانہ ہے۔ آؤ بیٹی...... تم میرے ساتھ آ جاؤ! ٹھہرو میں تولئے لا دیتی ہوں۔''

زبیدہ ایک ہی سانس میں بہت کچھ کہے جا رہی تھی۔ وہ بات کرتی ہوئی ایک کمرے میں گھس گئی اور تھوڑی دیر بعد دو دُھلے ہوئے تولئے لے آئی۔

''لو بیٹا!'' اُس نے ایک تولیہ میری طرف بڑھا دیا۔ ''تم یہاں نہا لو! اور بیٹی تم اس کمرے میں چلی جاؤ۔ میں جلدی سے روٹیاں پکا لوں۔ تم لوگوں کو بھوک لگ رہی ہوگی۔''

میں تولیہ لے کر سیڑھیوں کے ساتھ والے غسل خانے میں گھس گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک پانی کے ڈونگے بھر کر اپنے اُوپر ڈالتا رہا اور جب نہا کر باہر نکلا تو زبیدہ کھانا تیار کر چکی تھی۔ اُس نے نیم کے سائے میں تپائی اور چار کرسیاں بچھا دی تھیں اور پھر کھانا بھی وہیں لگا دیا تھا۔ وہ خود بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شامل تھی۔ اور اس وقت پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ وہ گھر میں اکیلی تھی۔

''بچے کہاں ہیں ماں جی؟'' میں نے پوچھا۔ اور پھر مجھے لگا جیسے میں نے اُس کے زخم پر اُنگلی رکھ دی ہو۔

زبیدہ کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ چہرے پر ناقابل بیان کرب کے تاثرات بکھر گئے۔

"بچے......؟" وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ "اللہ نے سب کچھ دیا مگر اس نعمت سے محروم رکھا۔ عبدالرحمٰن میری بہن کا بیٹا ہے۔ مگر اُسے میں نے ہی اولاد کی طرح پالا ہے۔"

اُس کے دکھ کو محسوس کر کے میں نے موضوع بدل دیا اور پھر باتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ زبیدہ جموں کی رہنے والی تھی۔ اُس کا پورا خاندان وہاں تھا۔ کچھ رشتے دار سامبا، اکھنور، کٹھور اور پٹھان کوٹ کے علاوہ پنجاب کے دوسرے شہروں میں بھی آباد تھے۔ اُس کا شوہر الطاف اُس کا فرسٹ کزن تھا۔ زبیدہ شادی کے بعد پٹھان کوٹ آ گئی اور کچھ عرصے بعد وہ عبدالرحمٰن کو بھی اپنے پاس لے آئی۔ وہ خود بے اولاد تھی۔ اُس نے عبدالرحمٰن کو اولاد ہی کی طرح پالا اور گریجویشن تک تعلیم دلائی۔

عبدالرحمٰن اپنے والدین سے ملنے کے لئے جموں جاتا رہتا تھا۔ وہ جموں اور کشمیر میں بھارتی غاصبوں کے خلاف مجاہدین کی سرگرمیوں سے بڑا متاثر تھا۔ جموں اور کشمیر کے ہر باشندے کی طرح وہ بھی اپنے وطن کی آزادی کے خواب دیکھنے لگا اور بالآخر مجاہدین کی ایک تحریک میں شامل ہو گیا اور کئی کئی روز تک گھر سے غائب رہنے لگا۔ پولیس اُس کی گرفتاری کے لئے جموں میں اُس کے والدین اور دوسرے رشتے داروں کے گھروں پر چھاپے مارتی رہتی تھی۔ ایک موقع پر پولیس اُس کے والد کو پکڑ کر لے گئی اور اُسے تشدد کر کے ہلاک کر ڈالا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن نے گھر آنا چھوڑ دیا مگر بھارتی سامراج کے خلاف اُس کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔

"دو دن پہلے جموں میں جو کچھ ہوا اُس نے ہندو سرکار کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔" زبیدہ کہہ رہی تھی۔ "کل یہاں شہر میں ہندو سرکار اور فوج کی اعلیٰ قیادت کے خلاف بہت زبردست مظاہرہ ہوا تھا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے کہ فوج کو باغیوں کی سرکوبی کے لئے جموں اور کشمیر بھیجا گیا تھا مگر یہ لوگ وہاں جا کر رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ لوگ مطالبہ کر رہے ہیں کہ فوج سے کالی بھیڑوں کو نکالا جائے اور جموں کی فوجی ہائی کمان اور دیگر اعلیٰ افسران کو گرفتار کر کے اعلیٰ سطح پر اس واقعہ کی تحقیقات کرائی جائے۔ آج کے تمام اخبارات بھی جموں ہی کے حوالے سے خبروں سے بھرے ہوئے ہیں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "مانسر جھیل ریسٹ ہاؤس پر کارروائی میں جن مجاہدین نے حصہ لیا تھا اُن میں عبدالرحمٰن کا نام بھی شامل ہے اور یہ کہا جا رہا ہے کہ اس چھاپہ مار کارروائی کی قیادت نوجوان مجاہد لیڈر شمروز نے کی تھی جو کشمیر میں بھی بھارتی فوج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکا ہے۔ اور آج مجھے دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ کشمیر کا وہ سپوت میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔"

زبیدہ کی بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔ عبدالرحمٰن کو اُس نے پالا تھا، اُس نے اس شہر سے گریجویشن کیا تھا۔ یہاں کے بہت سے لوگ اُسے جانتے تھے۔ اور اب جموں میں فوجی افسروں کے قتل عام میں بھی اُس کا نام لیا جا رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ یہ جگہ ہمارے لئے محفوظ نہیں تھی۔ پولیس اُس کی تلاش میں کسی وقت بھی ادھر کا رُخ کر سکتی تھی۔ میں نے زبیدہ سے یہی

سوال کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ عبدالرحمٰن نے جب مزاحمتی تحریک میں شمولیت اختیار کی تھی تو اُس کے بعد اُس نے یہاں آنا چھوڑ دیا تھا اور ہم نے بھی یہ مشہور کر رکھا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ گیا ہوا ہے۔ یہ بات تو چار سال پرانی ہو چکی ہے۔ اُس نے جب بھی کوئی کارروائی کی جموں ہی میں اُس کے والدین اور رشتے داروں کے گھروں پر چھاپے مارے گئے۔ یہاں کبھی کسی نے اُس کے بارے میں آ کر نہیں پوچھا۔ ویسے......" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ "خدانخواستہ ایسا کوئی وقت آیا تو ہم تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچنے دیں گے۔ آس پاس کے تمام گھر مسلمانوں کے ہیں۔ تم لوگوں کو اس طرح غائب کر دیا جائے گا کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔" بظاہر اُس کی بات سے میں مطمئن ہو گیا تھا مگر اندر سے مطمئن نہیں تھا اور ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

ہمارے ساتھ سمبا آنے والے بوڑھے عمر دین نے زبیدہ کو ہمارے بارے میں بہت مختصر سا بتا دیا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ میرے ساتھ یہ لڑکی سیتا ہے اور اپنوں سے بغاوت کر کے میرے ساتھ مل گئی ہے۔ اور میں شمروز ہوں۔ اور اب میں نے اُسے اپنے اور سیتا کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا اور یہ بھی درخواست کی کہ ہمیں عذرا اور سلطان کے نام سے پکارا جائے تاکہ ہمارے اصل ناموں سے کسی کو شبہ نہ ہو سکے۔

شام چھ بجے کے قریب زبیدہ کا شوہر عبدالعزیز بھی آ گیا۔ اُس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ سر کے بال اگرچہ سفید ہو چکے تھے مگر صحت قابل رشک تھی۔ ہمارے بارے میں جان کر اُس نے بڑی گرمجوشی کا اظہار کیا۔ عبدالعزیز ایک ملٹی نیشنل فارماسیوٹیکل کمپنی میں ملازم تھا جس کا ایک دفتر پٹھان کوٹ میں بھی تھا۔ اس کمپنی کے جموں اور کشمیر کے معاملات کو اس دفتر سے ہینڈل کیا جاتا تھا۔

اس شام پڑوس کی کچھ عورتوں اور رشتہ داروں کی آمد و رفت بھی شروع ہو گئی۔ میں تو عبدالعزیز کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھا رہا جبکہ سیتا زبیدہ کے پاس تھی جہاں خواتین کی آمد و رفت تھی۔ گھر میں آنے والے مہمانوں کو یہی بتایا جا رہا تھا کہ ہم جالندھر سے آئے ہیں اور چند روز یہاں رہ کر چلے جائیں گے۔

مکان کے نچلے حصہ میں اگرچہ چار پانچ کمرے تھے مگر ہمارے لئے اُوپر والے حصے میں انتظام کر دیا گیا تھا۔ اوپر بھی وسیع و عریض صحن تھا اور صرف تین کمرے تھے۔ ایک کمرہ تو سیڑھیوں کے بالکل ساتھ تھا جس کی ایک بڑی کھڑکی گلی کی طرف کھلتی تھی۔ کھڑکی میں کھڑا ہو کر سامنے والے مکان کی اُوپری منزل کے مکینوں سے بڑی آسانی سے بات کی جا سکتی تھی۔ دو کمرے صحن کے دوسری طرف تھے۔ ہمارے لئے انہی میں سے ایک کمرے میں انتظام کیا گیا تھا۔ اوپر والے صحن کا آدھا حصہ کھلا ہوا تھا جس کے کنارے پر ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ نچلے صحن میں

نیم کے درخت کی شاخیں اُوپر والے صحن سے بہت اُوپر تک چلی گئی تھیں۔

ہم رات گیارہ بجے کے قریب اوپر آئے تھے۔ اس کمرے میں ڈبل بیڈ کے علاوہ دو تین کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ اٹیچ باتھ رُوم تھا۔ زبیدہ اور عبدالعزیز جانتے تھے کہ ہم میاں بیوی نہیں ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہم بہت عرصے سے اکیلے رہ رہے ہیں۔ انہیں ہمارے کردار پر کوئی شبہ نہیں تھا اور اس لئے ہمارے لئے ایک ہی کمرے میں انتظام کیا گیا تھا۔

مانسر جھیل والے ریسٹ ہاؤس پر چھاپہ مار کارروائی کے بعد آج تیسرا دن تھا اور یہ سارا وقت بھاگ دوڑ کرتے ہوئے ہی گزرا تھا۔ کہیں آرام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ تھکن نے ہم دونوں کو نڈھال کر رکھا تھا۔ سیتا تو موقع ملتے ہی آرام دہ بستر پر لیٹتے ہی سو گئی تھی لیکن مجھے تھکن کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔

میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز اس صورتحال کا جائزہ لے رہا تھا جس سے ہم گزر کر آئے تھے۔ ہمارے ہاتھوں سترہ اعلیٰ فوجی آفیسر ہلاک ہو گئے تھے اور کئی زخمی ہوئے تھے۔ حریت پسندوں کی تلاش کے لئے جموں شہر اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں کو سیل کر دیا گیا تھا اور ہماری تلاش کا دائرہ وسیع تر کیا جا رہا تھا۔ زیادہ توجہ کشمیر کی طرف جانے والے راستوں پر دی جا رہی تھی۔ چھاپہ مار کارروائی میں میرا نام سامنے آنے کے بعد بھارتیوں کو یقین ہو گا کہ میں کشمیر کی طرف ہی جانے کی کوشش کروں گا اس لئے زیادہ توجہ اس طرف دی جا رہی تھی۔ یہ تو اُنہوں نے سوچا بھی نہیں ہو گا کہ میں وہاں سے بہت دُور ایک محفوظ جگہ پر آ چکا ہوں۔ ایک اور بات جو مجھے سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ اب میں واقعی اپنے محاذ سے بہت دُور آ چکا تھا۔ اس رات تو سیتا نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی میرے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی اور مجھے کشمیر کی قتل گاہ سے بہت دُور لے جانا چاہتی تھی۔ لیکن پھر اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ میرے راستے کی رُکاوٹ نہیں بنے گی اور ہندو سامراج کے خلاف جنگ میں میرے پہلو بہ پہلو رہے گی۔ اور اُس نے اپنی اس بات کو سچ بھی ثابت کر دکھایا تھا۔ مانسر جھیل کے ریسٹ ہاؤس پر چھاپہ مار کارروائی خودکشی کے مترادف تھی۔ لیکن سیتا نے ہمارا ساتھ دیا تھا اور تین دن تک بھوکی پیاسی ہمارے ساتھ پہاڑوں میں بھٹکتی رہی تھی۔

سیتا کے کردار پر اگرچہ مجھے کوئی شبہ نہیں تھا لیکن میں اپنے محاذ سے اس قدر دُور نکل آیا تھا کہ فی الحال فوری طور پر واپسی کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری تلاش میں چپہ چپہ چھانا جا رہا تھا اور ان حالات میں جموں یا کشمیر کی طرف واپسی کا رُخ اختیار کرنا ممکن نہیں تھا۔

شہر کی کسی عمارت پر لگے ہوئے گھڑیال نے تین بجے کا اعلان کیا۔ میں نے گردن گھما کر سیتا کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ اُس کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔ نیند میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ میں چند لمحے اُس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا اور بالآخر نیند کو مجھ پر ترس آ

ہی گیا......

صبح نو بجے میری آنکھ کھلی تو سیتا بستر پر نہیں تھی۔ باتھ رُوم کا دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا اور ظاہر ہے وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ میں کچھ دیر کروٹیں بدلتا رہا اور پھر اُٹھ کر باتھ رُوم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی سے نہانے کے باوجود دماغ کی تپش کم نہیں ہوئی تھی۔ میں باتھ رُوم سے نکلا ہی تھا کہ سیتا کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں چائے کے کپ اُٹھا رکھے تھے۔

''اوہ......تم اُٹھ گئے؟'' وہ چائے کے کپ چھوٹی میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں تو سمجھی تھی کہ تمہیں جگانے کے لئے جھنجھوڑنا پڑے گا۔''

ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے اور چائے پینے لگے۔ عبدالعزیز آٹھ بجے اپنی ڈیوٹی پر جا چکا تھا۔ اور زبیدہ اپنے کمرے میں کسی پڑوسن سے باتیں کر رہی تھی۔

اور پھر دس بجے کے قریب ہم بھی نیچے آ گئے۔ اُس وقت زبیدہ اکیلی تھی۔ اُس نے ہمارے لئے ناشتہ تیار کر دیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں اور سیتا شہر کی صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے گھر سے رخصت ہو گئے۔ زبیدہ نے زبردستی سیتا کو دو ہزار روپے دے دیئے تھے تا کہ ہم ضرورت کی چیزیں خرید لیں۔

گرمی کے باوجود بازاروں میں رونق تھی۔ شہر کی زندگی معمول کے مطابق تھی۔ البتہ وہ علاقہ جہاں اعلیٰ حکام کے سرکاری دفاتر تھے اُس طرف ہند سرکار کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے۔ ایک مخصوص طبقہ تھا جو جموں میں مانسر جھیل پر اعلیٰ فوجی افسروں کے قتل عام پر حکومت کے خلاف مظاہرے کر رہا تھا جبکہ عام شہریوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، تاہم ہر جگہ موضوع یہی تھا۔ لوگوں کے پاس صرف اخباری معلومات تھیں اور وہ انہی پر تبصرے کر رہے تھے۔

ہم دو بجے تک بازاروں میں گھومتے رہے۔ سیتا نے ضرورت کی کچھ چیزیں خریدیں۔ میں نے جموں سے شائع ہونے والا ایک انگریزی اخبار بھی خرید لیا۔ ہمیں بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی لیکن ہم نے ایک جگہ چاٹ کے علاوہ کچھ نہیں کھایا کیونکہ زبیدہ نے کہا تھا کہ دوپہر کا کھانا ہم گھر پر کھائیں گے۔ اور پھر تین بجے کے قریب ہم گھر پہنچ گئے۔

کھانے کے بعد میں اخبار لے کر نیم کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ چوتھے دن کے باوجود اخبار انہی خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ کئی زخمی فوجی افسران اور ان عورتوں کی تصویریں تھیں جن کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے وہ گھائل ہوئے تھے۔ اس واقعہ کی تحقیقات کے لئے اُس روز اعلیٰ سطح کی ایک کمیٹی قائم کر دی گئی تھی اور ترجمان کے بیان کے مطابق تحقیقات میں کچھ پیش رفت ہوئی تھی۔

ایک اور خبر نے مجھے چونکا دیا۔ اُس رات کی چھاپہ مار کارروائی میں حصہ لینے والا بلال نام کا ایک لڑکا جموں سے کئی میل دُور اودھم پور شہر سے پکڑا گیا تھا اور اُس نے انتہائی تشدد اٹھانے کے بعد تفتیشی افسروں کو بتایا تھا کہ شمروز سرینگر کی طرف جا چکا ہے جہاں وہ کسی فوجی کیمپ پر ایک

اور کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ پکڑے جانے والے مجاہدین نے میرے اور دوسرے ساتھیوں کے بارے میں بھارتی افسروں کو گمراہ ہی کیا تھا۔

ہم تقریباً ایک ہفتہ زبیدہ اور عبدالعزیز کے مہمان رہے۔ کشمیر کی طرف واپسی کا چانس نہیں تھا۔ سیتا نے بالآخر مجھے اپنے ساتھ راجستھان چلنے پر مجبور کر دیا۔ اور پھر اس سے اگلے روز ہم اپنے مہربانوں سے رخصت ہو گئے۔ زبیدہ اور عبدالعزیز نے ہماری ضروریات کے لئے ایک معقول رقم بھی ہمیں دے دی تھی۔

پٹھان کوٹ سے رخصت ہو کر ٹرینوں اور بسوں میں سفر کرتے ہوئے ہم تیسرے روز شام کو پنجاب کی سرحد سے نکل کر راجستھان کے شہر ہنومان گڑھ پہنچ گئے۔

یہ میری زندگی کا ایک نیا موڑ تھا اور مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میرے لئے کیا تھا.....؟

○○○

سرفروش مجاہدوں کی داستان

''انگارے'' ابھی جاری ہے،

بقیہ واقعات کے لئے جلد دوئم کا مطالعہ کریں